ماہنامہ

کرن

اگست 2013

عید مبارک

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے
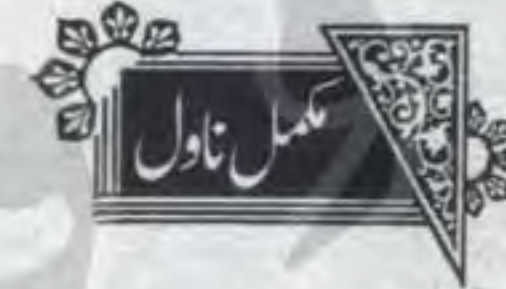
جشنِ آزادی مبارک

مستقل سلسلے

اگست 2013
جلد 36 شمارہ 5
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

قیامِ پاکستان کے سلسلے میں مشیت ایزدی ہمارے ساتھ تھی۔
اللہ ربُ العزت نے آزادی کی یہ نعمت اپنے خاص ماہ رمضان المبارک کے خاص دن جمعتہ المبارک اور خاص تاریخ ستائیسویں شب، شبِ قدر میں مرحمت فرمائی۔
آزادی کا دن بھی ہماری عید ہے۔ ہمارا قومی تہوار ہے۔ یہ خوشی اور شکرانے کا دن۔
اس بات میں کوئی تضاد، کوئی اختلاف نہیں کہ اسلامی تقویم ہی احسن تقویم ہے۔ اس میں بے حد و حساب فیوض و برکات اور ثمرات و فضائل پوشیدہ ہیں۔ رمضان کردار سازی اور تزکیہ نفس کا مہینہ ہے وطن سے محبت کو ایمان کا حصہ بنائیں اور نظریہ پاکستان کے بنیادی خدوخال اور اللہ تعالیٰ سے کیے گئے وعدے کی تجدید اور اپنی نافرمانیوں کی توبہ صدق دل سے کریں تو ان شاءاللہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ اور ہم اقوامِ عالم میں اپنا کھویا ہوا وقار اور مقام حاصل کر کے ناکام ریاست اور بٹی ہوئی قوم کا لیبل ہٹا پائیں گے۔
ادارہ اپنی قارئین بہنوں کو عید الفطر اور چودہ اگست کے پُرمسرت موقع پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

اس شمارے میں،

- "عید کے رنگ" مشہور شخصیات سے شاہین رشید کے سوالات،
- "ماورا" سے شاہین رشید کی گفتگو،
- "میری بھی سنیے" میں سنبل اقبال،
- "آواز کی دُنیا" سے حوریہ فہیم کی باتیں،
- "مقابل ہے آئینہ" میں اس ماہ فوزیہ ثمر بٹ مقابل ہیں،
- نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کے ناولز کی اقساط،
- فاخرہ گل کا "میرے ہمنوا کو خبر کرو" طویل مکمل ناول،
- انیلا کرن کا مکمل ناول،
- حنا یاسمین اور فرحین اظفر کے دلکش ناولٹ،
- رفاقت جاوید، عفیقہ محمد بیگ، حمیرہ خان، دیا شیرازی، اُمِ ایمان اور اُمِ مریم کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

تحفت،

عالمی تہواروں اور رسومات سے متعلق معلوماتی کرن کتاب "رسومات اور تہوار" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

حمد باری تعالیٰ

بنتے ہیں ہر سوال کے پیکر نئے نئے
کھلتے ہیں پھول ذہن میں اکثر نئے نئے

کس نے سیاہ رات کو تارے عطا کیے
پھر ان میں رکھ دیے چکر نئے نئے

کرتا ہے کون پھول کو خوشبو سے ہمکنار
رکھتا ہے کون آنکھ میں منظر نئے نئے

کس قاعدے سے پھیلتی جاتی ہے کائنات
ذرّوں سے نکلے آتے ہیں جوہر نئے نئے

روزِ ازل سے ہیں وہی گنتی کے چند رنگ
بنتے ہیں جن سے اَن گنت منظر نئے نئے

ہر چیز کہہ رہی ہے کوئی اور ہے یہاں
جس کی رضا کے فضل ہیں ہم پر نئے نئے

امجد یہ سب یقین بھی، سارے گماں بھی
سب ہیں اُسی جمال کے، مظہر نئے نئے

امجد اسلام امجد

حکمت رسول مقبولؐ

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

کہہ دیا لاتقنطوا اختر کسی کے کان میں
اور دل کو سربسر خو تمنا کر دیا!

سات پردوں میں چھپا بیٹھا حسنِ کائنات
اب کسی نے اس کو عالم آشکار کر دیا

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اب عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

ہری چند اختر

لو پھر آگئی عید

رحمتوں و برکت کا مہینہ رمضان المبارک ہے اس کا انعام عید الفطر ہے۔ رمضان کے آتے ہی عید کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ بازار سج جاتے ہیں رونقیں بڑھ جاتی ہیں اور جب عید کے دن سب سج بن کر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ تو وہ منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے تو جب سب سجیں بنیں تو پھر ہمارا میگزین کیوں کسی سے پیچھے رہے۔ عید ہو اور کرن میں عید سروے نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

یہ سب لوگ جنہیں آپ اسکرین پہ دیکھتے ہیں، ریڈیو پہ سنتے ہیں۔ جن کے ڈرامے دیکھتے ہیں اور جن کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جن کے ٹاک شو دیکھے بغیر آپ رہ نہیں سکتے سروے کے ذریعے ہم نے انہیں آپ کے گھروں تک پہنچا دیا ہے۔

ہم نے عید کے حوالے سے ان شخصیات سے کچھ سوال کیے تھے دیکھتے ہیں انہوں نے کیا جواب دیے۔

سوالات:

1 عید الفطر پر کیا جانے والا کوئی ایسا کام جس نے آپ کو سچی خوشی سے ہمکنار کیا ہو؟

2 عید پر ملنے والی یادگار عیدی؟

3 اب تک منائی جانے والی عیدوں میں یادگار عید؟ خوشی کے حوالے سے یا پریشانی کے حوالے سے؟

عید کے رنگ

شاہین رشید

حامد میر (صحافی+اینکر جیو نیوز)

1 " بہت سے کام اچھے ہوتے ہیں، جو بتائے نہیں جاتے ہر عید پر غریب لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا اچھا لگتا ہے اور سب کو کرنا چاہیے اور عید کے دن لاہور جا کر والدین کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر بہت سکون ملتا ہے لیکن اگر کسی وجہ سے لاہور نہ جا سکوں تو پھر بہت تکلیف محسوس کرتا ہوں۔"

2 " بہت سال پہلے جب والد صاحب عید کے دن پانچ روپے دیا کرتے تھے تو اس کی بہت خوشی ہوتی تھی اسے خرچ کرتے تھے مگر وہ ختم ہی نہیں ہوتے تھے تو آج تک ان پانچ روپے کی عیدی کی لذت برقرار ہے اور پھر عید پر والد صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ اب کوئی نہیں ہے عیدی دینے والا، نہ ان جیسی چاہت کرنے والا۔"

3 " 2005ء میں جو زلزلہ آیا تھا تو 2005ء کی عید میں نے زلزلہ کے متاثرین کے ساتھ گزاری تھی مظفر آباد میں اسی طرح 2010ء میں جب سیلاب آیا تھا تو میں نے خیبر پختونخواہ کے متاثرین کے ساتھ عید گزاری تھی اور یہ دونوں عیدیں میرے لیے یادگار ہیں۔"

شہود علوی

1 " یہ تو جناب نیکی کے زمرے میں آتا ہے اور نیکی کر کے میرے خیال میں جتانی نہیں چاہیے۔ نیکی ضائع ہو جاتی ہے۔"

2 " میں گزشتہ سال رمضان اور پھر عید کے دنوں میں اپنے گھر والوں سے دور امریکہ میں تھا۔ تو عید کے دن میری ماں نے میرے لیے ایک دعا ای میل کی آپ یقین جانیے وہ دعا میرے لیے عید کا بہترین تحفہ تھی۔"

3 " جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ گزشتہ سال عید میں نے امریکہ میں گزاری نیویارک میں تھا۔ فیملی سے دور اور سوچ رہا تھا کہ اس دفعہ کی عید کتنی بور اور تنہائی میں گزرے گی اور یہ سوچ کر ہی مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ میں کتنی بری عید گزارنے والا ہوں۔ مگر آپ یقین کریں کہ وہاں میرے اتنے فینز تھے کہ انہوں نے عید کے تینوں دن میری اتنی دعوتیں کیں اور میرا اتنا خیال رکھا کہ میرے لیے یہ عید کے تینوں دن یادگار بن گئے۔"

عاصمہ شیرازی : اینکر (ڈان نیوز)

1 " وہ تو پھر ایسا کام ہے، جو بتایا نہیں جا سکتا۔ عید خدا کی طرف سے گفٹ ہے مسلمانوں کے لیے اور اس کو منانے کا سب کو حق، اصل ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم عید پر ان لوگوں کا خیال رکھیں جنہیں سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ جن کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ عید کو اہتمام کے ساتھ منا سکیں ان لوگوں کے لیے کچھ کر کے ہی سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

2 " جو اپنے والدین کے ہاتھ سے عیدی لینے کا مزا آتا تھا وہ اب نہیں آتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے تھے تو ابو عید کے دن "نئے نوٹ" لے کر آتے تھے اور ہمیں دیتے تھے ابو نے عید کی نماز پڑھ کر آنا اور پھر نئے نئے نوٹ بچوں میں بانٹنے تھے ابو کے ساتھ گزری عیدیں بہت یاد آتی ہیں۔"

3 " شادی کے بعد کی ساری عیدیں یادگار ہیں۔

لیکن شادی کے بعد کی پہلی عید بہت یادگار تھی اس لیے کہ شادی سے پہلے میں عید کا دن سو کر گزارتی تھی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن شادی کے بعد جب پہلی عید آئی اور میاں صاحب نے سجنے سنورنے کو کہا' چوڑیاں پہننے کو کہا تو مجھے اتنا اچھا لگا کہ میری زندگی میں بھی کوئی ہے جسے میری فکر ہے۔ جیسے میرا خیال ہے میرے میاں بہت روایتی قسم کے ہیں اور عید پر اپنی بیگم کو روایتی دیکھنا چاہتے ہیں۔"

مصطفیٰ چوہدری

1 "عیدالفطر پر روزے رکھ کر عید منانا سچی خوشی سے ہمکنار کرتا ہے سچی بات ہے کہ روزے رکھ کر دل کو بہت تسکین ہوتی ہے۔ بڑا اچھا لگتا ہے جب عید کی نماز کے بعد سب یکجہتی کے ساتھ گلے لگتے ہیں۔ کاش ایسا ہمیشہ ہو۔"

2 "بچپن میں ملنے والی عیدیاں ہی یادگار ہوتی تھیں جب والدین اور آنٹیاں عیدی دیا کرتی تھیں والد صاحب سے نئے نئے نوٹ لے کر خرچ کرنے کا مزا ہی کچھ اور تھا اب تو ہم بڑے ہو گئے ہیں اب ہم خود عیدیاں دیتے ہیں۔"

3 "عیدیں ساری ہی یادگار ہوتی ہیں (جیسے ہر گزرنے والا لمحہ یادگار ہوتا ہے) تو کوئی ایسی عید نہیں کہ خاص طور پر اس کا ذکر کیا جائے۔"

فائزہ حسن (فنکارہ)

1 "پچھلے کچھ سالوں سے عید پر میں خود گھر پر "کھیر" بناتی ہوں اور مٹی کے پیالے میں ڈال کر لوگوں کو بھجواتی ہوں اور میرے خیال سے یہ بہتر ہے ان مٹھائیوں اور کیک سے جو لوگ بازار سے خرید کر ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ میرے خیال میں جب ہم اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی کوئی چیز دیتے ہیں تو اپنائیت کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔"

2 "عیدی تو ایسی کوئی یادگار نہیں ملی پر میاں صاحب سے اکثر قیمتی تحفے مل جاتے ہیں۔"

3 "شادی کے بعد پہلی عید ذرا پریشر میں گزری تھی ۔کیونکہ بہت زیادہ لوگوں سے ملنا پڑ گیا تھا اور بہت ٹپ ٹاپ سے رہنا پڑا تھا۔"

یاسر نواز (ڈائریکٹر)

1 "میں کوئی فرشتوں والے جواب نہیں دوں گا۔ بلکہ آپ کو ایک سچا واقعہ سناتا ہوں اپنے بچپن کا' جب ابو حیات تھے تو ہم نماز کے لیے ہمیشہ لیٹ ہو جایا کرتے تھے اور ہمیشہ ہمیں ساڑھے گیارہ بجے والی نماز پڑھنی پڑتی تھی جو کہ عوامی مرکز کے پاس والی مسجد میں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے رات کو اٹھ کر اپنے گھر کی ساری گھڑیاں' آدھا گھنٹہ آگے کر دیں صبح جب اٹھے اور فوراً" تیار ہوئے اور نماز پڑھنے کے لیے نکلنے لگے تب میں نے سب کو بتایا کہ ابھی بھی جماعت کھڑی ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اس طرح ہم نے 7:30 والی نماز اپنے ٹائم پر پڑھ لی اور سچ پوچھیں تو وقت پر نماز کی ادائیگی پہ مجھے سچی خوشی حاصل ہوئی۔"

2 "بچپن میں جب ہم حیدر آباد میں تھے تو وہاں محلے داری والا سلسلہ تھا سب ایک دوسرے سے پیار محبت سے پیش آتے تھے۔ چونکہ محلے داری والا سلسلہ تھا تو چھوٹے ہونے کی وجہ سے محلے کے گھروں میں جا کر عید مبارک کہا کرتے تھے اور انتظار کرتے تھے کہ ہمیں "عیدی" ملے پھر ہم اپنی عیدی گھر کے قریب پرچون والے کی شاپ کے باہر ٹینٹ میں بیٹھ کر 2 نمبر کوکا کولا پیتے تھے۔ واہ..... کیا مزے کے دن تھے اور جو عیدی بچ جاتی تھی اس سے لٹو اور پتنگ وغیرہ خرید لیا کرتے تھے۔"

3 "اب تو عید اور بھی مزے کی ہو گئی ہے اب جب ہم اپنے بہن بھائیوں کے بچوں کو دیکھتے ہیں ماشاء اللہ سب کے بچے بڑے ہو رہے ہیں اور اب وہ ہماری طرح عیدی کا انتظار کرتے ہیں اور اب تو بچوں کو پیسے خرچ کرنے کی عقل بھی آتی جا رہی ہے۔ میرا بیٹا فرید اور میری بیٹی صلہ کچھ دن پہلے یہ بحث کر رہے تھے کہ ہم نے اس عید پہ کیا کیا خریدنا ہے تو ان کو دیکھ کر اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے۔ ویسے میں اس عید پہ پتنگ خرید کر لاؤں گا اور سب بچوں کے ساتھ پتنگ اڑا کر اپنا بچپن دیکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری یہ خوشیاں برقرار رکھے اور سب کو ہمت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔"

حسن صہیب آر جے دبئی، ہم آواز ریڈیو

1 "عیدالفطر کے موقع پر ہم سارے، بہن بھائی اور

والدین ایک ہی دستر خوان پہ کھانا کھاتے ہیں سال کے دیگر دنوں میں ہمیں ایسا موقع نہیں ملتا کیونکہ سب مختلف جگہوں پہ ہوتے ہیں اور سب کی اپنی اپنی پڑھائی اور جاب ہوتی ہے تو بس عید کا دن میرے لیے انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے کہ پوری فیملی ایک ساتھ ہوتی ہے اور یہی میری سچی خوشی ہے۔ مگر اب دو سال سے ایسا نہیں ہو رہا تو میں بہت اداس رہتا ہوں۔"

2 "گزشتہ سال عید الفطر پہ مجھے "ہاف سیلری" ایکسٹرا ملی تھی عیدی کے طور پر اور یہ میرے لیے ایک یادگار عیدی ہو گئی کیونکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور اس ایکسٹرا سیلری سے میں نے خوب شاپنگ کی تھی۔ اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے۔"

3 "گزشتہ دو سال سے اپنی فیملی کے بغیر عید گزار رہا ہوں۔ ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے اور اس سال کا بھی کچھ پتا نہیں ہے کہ ہم سب ایک دستر خوان پہ ہوتے ہیں یا نہیں تو مجھے تو ابھی سے بہت اداسی ہو رہی ہے۔ عید کے دن میں سب کو بہت مس کرتا ہوں اور ان دنوں کو بہت یاد کرتا ہوں جب ہم سب اکٹھے ہوا کرتے تھے۔"

ہما کاشف : (آر جے ایف ایم 105)

1 "ہر عید پر ضرورت مند لوگوں کی مدد جتنی ہو سکتی ہے کرتی ہوں اور دوسروں کی مدد کر کے ہی مجھے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں ہمیں عطا کی ہوئی ہیں اس کے شکرانے کا بہترین طریقہ ہی یہی ہے کہ ہم اس کے ضرورت مند بندوں کی ان کی ضرورت کے وقت مدد کریں۔"

2 "یادگار عیدی تو بچپن کی ہی ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جو عیدی ملا کرتی تھی وہ اکثر امی لے لیتی تھیں کہ ابھی جمع کرا دو بعد میں لے لینا اور بعد میں مل بھی جاتی تھی اور اب کہاں رہی یادگار عیدی۔ کیونکہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں لہٰذا اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہمیں اپنے چھوٹوں کو عیدی دینی پڑتی ہے۔"

3 "ویسے تو خوشیوں کے ساتھ بہت سی یادگار عیدیں ہیں۔ لیکن اس سال ہم خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ افسوس کے ساتھ عید منائیں گے۔ کیونکہ رمضان المبارک سے ایک دن قبل میرے نانا انتقال فرما گئے۔ میری امی بہت اداس اور افسردہ ہیں۔ اس لیے اس عید کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ اور اس سال ایک اور پریشانی کہ میری میڈ جو گھر کی صفائی ستھرائی میں ہر رمضان کو میری بہت مدد کرتی تھی اب اس کی شادی ہو گئی ہے۔ تو اب اس عید پر سب کچھ مجھے خود کرنا پڑے گا۔"

فصیح باری خان (رائٹر)

1 "سچی خوشی سے ہمکنار کرنے والے کام ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں جو انسان خود سے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے کو پتا نہ چلے۔"

2 "یادگار عیدیاں تو بہت سی ہیں لیکن وہ عیدی بہت خاص تھی جب میں نے اپنے ایک بہت ہی کنجوس رشتے دار سے لڑ جھگڑ کر وصول کی تھی۔"

3 "میرے لیے وہ ساری عیدیں یادگار ہیں جس میں میری امی میرے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔"

شائستہ فرید

1 "صرف عید الفطر ہی نہیں میری ویسے بھی عادت ہے کہ لوگوں کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ لیکن میں کسی سے ذکر نہیں کرتی بس جو کچھ کرنا ہوتا ہے خاموشی سے کر دیتی ہوں اور یہی میری خوشی ہوتی ہے۔"

2 "فرید نے جب مجھے پہلی عیدی دی تھی وہ میں نے بہت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔ جب فرید سے میرا ریلیشن بنا تھا یعنی منگنی بھی نہیں ہوئی تھی تب انہوں نے مجھے عیدی دی تھی اور وہ عیدی تھی 100 روپے اس کے بعد سے وہ مجھے ریگولر عیدی دیتے ہیں۔"

3 "شادی کے بعد تو پہلی عید ہوگی اور یہ کس طرح کی ہوگی بعد کی بات ہے۔ لیکن اب تک منائی جانے والی عیدوں میں بچپن کی عیدیں بہت یادگار ہوتی تھیں بڑے ہونے کے بعد تو کوئی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی اور اب تو ویسے بھی ہماری عید آفس میں ہی گزرتی ہے۔ نو سال ہو گئے جاب کرتے ہوئے اور نو سال سے عید کا دن آفس میں گزرتا ہے۔ رات کو گھر جاتے ہیں اور تھک کے سو جاتے ہیں۔"

فرید رئیس

1 "عید کا تہوار اس لحاظ سے اہم ہوتا ہے کہ سب سے ملنے ملانے کا موقع ملتا ہے اور سب کے ساتھ عید گزار کر ہی سچی خوشی ملتی ہے۔ عام دنوں میں کہاں ایسے مواقع آتے ہیں (کہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوں)"

2 "وہ بچپن کی عید جس میں نانی، دادی اور دیگر رشتے دار عیدی دیا کرتے تھے اس عیدی کی نہ صرف بہت زیادہ خوشی ہوتی تھی بلکہ اس کی اہمیت بھی بہت تھی اور اب تو بزرگوں میں کئی بزرگ رخصت ہو چکے ہیں تو ان کے ہاتھوں سے لی جانے والی عیدی ہی یادگار ہے۔"

3 "وہ تمام عیدیں یادگار ہو جاتی ہیں جو اپنوں کے ساتھ منائی جاتی ہیں جو اپنوں کے ساتھ رہ کر منائی جاتی ہیں اور سب کی اپنی اپنی یادیں ہوتی ہیں تو کوئی ایک عید ایسی نہیں ہے کہ جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے۔"

✲ ✲

ماوراسے ملاقات

شاہین رشید

خوب صورت خدوخال، معصوم چہرہ، مظلومیت والے کردار اور پھر بہترین پرفارمنس لوگ کیسے نہ متاثر ہوں۔ یہ ہیں "ماورا" جنہوں نے "یہاں پیار نہیں ہے"، "میں گناہ گار نہیں" اور "اک تمنا لاحاصل سی" میں اپنی بہترین اداکاری سے سب کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی ہے اور ان تینوں سیریلز میں ماورا اتنا روئی ہیں اور ان پر اتنا ظلم ہوا ہے کہ اب اگر یہ کسی مزاحیہ یا ہلکے پھلکے رول میں آئیں تو شاید لوگوں کو ہضم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ماورا ایک بہترین پرفارمر ہیں، لیکن اگر یہ اسی طرح کے رونے پیٹنے کے مظلوم رول کرتی رہیں تو دو طرح سے نقصان ہو گا ایک تو یہ کہ ماورا اس طرح کے رول کی عادی ہو جائیں گی اور پھر لوگ بھی شاید ان کو کسی اور رول میں قبول نہ کریں اس لیے ماورا کو اپنے بارے میں ضرور کچھ سوچنا ہوگا۔ آج کل آپ انہیں "میرے ہرجائی" اور "اک خلش سی" میں دیکھ رہے ہیں۔

★ "کیسی ہیں ماورا اور کیا مصروفیات ہیں؟"

✻ "جی اللہ کا شکر ہے اور ماشاءاللہ مصروفیات تو کافی ہیں۔"

★ "آپ کا ایک سیریل "اک تمنا لاحاصل سی" میں آپ پر ظلم کی انتہا دکھائی گئی تھی۔ اس میں حقیقت کتنی ہے کیا ایسی ساس ہوتی ہے اس دور میں؟"

✻ "ہاں جی..... میرے خیال میں آج کے دور میں بھی ایسی ساس ہوتی ہے اور خاص طور پر ہمارے اس طبقے میں ایسی ساسیں ضرور ہوتی ہیں جو پڑھا لکھا نہیں ہے۔"

★ "اور اگر خدانا خواستہ آپ کو ایسی سسرال اور ساس اصل زندگی میں بھی مل گئیں تو؟"

✻ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ میں کسی پڑھے لکھے بندے سے ہی شادی کروں گی لڑکا پڑھا لکھا ہو گا تو یقیناً گھر والے بھی پڑھے لکھے ہوں گے۔"

★ "اور پڑھائی کیا چل رہی ہے؟"

✻ "پی آئی ایف ڈی یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں جو کہ اسلام آباد میں ہے اور کام کے سلسلے میں کراچی آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

★ "تو کراچی میں مستقل قیام کیوں نہیں ہے؟"

✻ "اس لیے کہ میری مما اسلام آباد میں ہوتی ہیں اور میں مما کے بغیر رہ نہیں سکتی اس لیے جب کام ہوتا ہے تو کراچی چلی جاتی ہوں۔ اسلام آباد میں مما کے پاس رہ کر مجھے پڑھائی میں بہت آسانی ہو جاتی ہے کیونکہ میرے زیادہ تر کام تو میری مما ہی کر دیتی ہیں۔"

★ "مزا آ رہا ہے یا کچھ مشکلات بھی ہو رہی ہیں، ڈرامے حقیقت سے قریب ہوتے ہیں؟"

✻ "آنے جانے میں تھوڑا پرابلم ہوتا ہے لیکن مجھے کام کرنے میں بہت مزا آ رہا ہے اور جہاں تک حقیقت کے قریب کی بات ہے تو ایک سیریل میں نے کیا تھا "یہاں پیار نہیں ہے" تو اس کی اسٹوری اچھی تو بہت تھی مگر تھوڑی حقیقت سے دور بھی تھی بے شک بہن بہن کی دشمن اور کزن کزن کی دشمن ہوتی ہیں مگر ذرا کم ہوتی ہیں اور "اک تمنا لاحاصل سی" حقیقت سے قریب تھا اور ڈرامے کی کہانیاں ہمارے معاشرے کی ہی کہانیاں ہوتی ہیں بس انہیں ذرا بنا سنوار کر پیش کر دیا جاتا ہے اور سچ بتاؤں میں نے خراب ساسیں بھی دیکھی ہیں اور خراب بہوئیں بھی میں نے بہت دیکھی ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ساس بے چاری کچھ بھی نہیں کہتی بہو کو مگر پھر بھی ساس بری کہلاتی ہے۔ اور بعض جگہوں پر ساس بھی بری ہوتی ہے جیسے ڈرامے میں دکھایا گیا۔ اصل میں کئی مائیں اپنے بیٹے کے ساتھ کسی کو شیئر نہیں کرنا چاہتیں۔"

★ "آپ ابھی غیر شادی شدہ ہیں تو "اک تمنا لاحاصل سی" اور "میں گناہ گار نہیں" جیسے رول کرتے وقت مشکل ہوتی ہے؟"

✻ "شروع میں عجیب سا بھی لگتا تھا اور مشکل بھی تھوڑی ہوتی تھی۔ مگر اب ایسا کچھ نہیں لگتا۔ جب پہلا سیریل کیا تو اس میں دلہن بنی تو بہت عجیب سا لگا تھا مگر جب انسان یہ سوچ لے کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ محض ایک کردار ہے اصل زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہے تو پھر پرفارم کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ لیکن ڈراما سیریل "اک تمنا لاحاصل سی" کرتے وقت میں بھی سچ مچ ڈیپریشن میں چلی گئی تھی۔"

★ "کیوں؟"

✻ "کیونکہ میرا کردار اتنا ڈپریسنگ تھا کہ کیا بتاؤں روز روز رونا مار پیٹ صلواتیں سننا۔ تو مجھے حقیقت میں بھی لگتا تھا کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے میرے ساتھ آپ خود سوچیں کہ مسلسل تینتیس دن تک ہم سب شوٹ کر رہے تھے۔ بے شک مار پیٹ سچ میں نہیں ہوتی تھی مگر مجھے رونا تو سچ میں ہی آجاتا تھا۔ ہاں ایک سین میں مجھے صبا آپا نے سچ کا تھپڑ مارا تھا اور اس کو دیکھ کر کتنے ہی لوگوں نے لکھا کہ کیا یہ رئیل تھپڑ تھا تو میں

نے سب کو بتایا کہ ہاں یہ حقیقی تھپڑ تھا اور میں نے خود کہا تھا کہ آپ مجھے تھپڑ ماریں تاکہ میں ایکسپریشن دے سکوں تو سچ مچ کا تھپڑ کھا کر ایکسپریشن تو میں نے دے دیے لیکن تکلیف بھی کافی ہوئی تھی۔"

★ "مزید سوالات سے پہلے کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

* "جی میرا نام "ماورا" ہے اور سرنیم میں اس لیے نہیں لگاتی کہ ہم بہنوں کے نام اتنے یونیک ہیں کہ لوگ ہمیں فوراً" پہچان جاتے ہیں۔ میری تاریخ پیدائش 28 ستمبر 1992ء ہے۔ مما مجھے "چٹکی" اور عروہ مجھے "ببلو" بلاتی ہے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہے میرا نمبر دوسرا ہے بھائی ہم دونوں سے چھوٹا ہے اور میرے والد آرمی میں تھے تو بہت جگہ گھومنے پھرنے کا موقع ملا اور دلچسپ بات بتاؤں کہ عروہ کراچی میں پیدا ہوئی میں پشاور میں اور بھائی نوشہرہ میں پیدا ہوا ہے ہم پنجابی ہیں اور سرگودھا سے ہمارا تعلق ہے۔"

★ "آپ نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ آپ شادی کریں گی تو لو میرج کریں گی کیوں؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔"

* "اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل شادی کرنا بہت رسکی ہو گیا ہے اور میری مما کا بھی یہی خیال ہے کہ شادی اس سے کرنی چاہیے جس کو ہم جانتے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ لو میرج فیملی فرینڈز میں ہو۔ یا ان میں ہو جن کی پوری فیملی کو ہم جانتے ہوں جانے بغیر شادی کرنے سے بعد میں بہت سے پرابلمز جنم لینے لگتے ہیں۔ اب ارینج میرج کا زمانہ نہیں رہا۔"

★ "ہوں۔۔۔ اس فیلڈ میں کیسے آئیں۔ شوقیہ، اتفاقیہ یا عروہ کی وجہ سے آئیں؟"

* "بس اتفاقیہ کہہ لیں۔ اس فیلڈ میں تو میں بہت بچپن سے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ساتویں یا شاید آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی تو پی ٹی وی کے لیے میں نے ایک شو ہوسٹ کیا تھا اور وہ بھی لائیو شو تھا اور میرا پہلا شو تھا۔"

★ "اچھا گڈ۔۔۔ اتنا کانفیڈنس ہیں تھا آپ میں؟"

* "جی بالکل تھا۔۔۔ کیونکہ اسکول میں میں ان کاموں میں بہت تیز تھی کمپیئرنگ کرنا ہوسٹنگ اداکاری، تو کافی پر اعتماد تھی میں اور میں نے تو گورنمنٹ لیول پہ بھی کچھ شوز ہوسٹ کیے تھے جن میں پرائم منسٹر بھی آتے تھے اور صدر بھی آتے تھے۔ تو اس طرح کے کام میں بہت بچپن سے کر رہی ہوں۔"

★ "پھر اداکاری تک کیسے آئیں؟"

* "اداکاری میں عروہ کی وجہ سے آئی اور یہ نہیں کہ عروہ نے کہا ہو بلکہ ہوا یہ کہ عروہ وی جے تھی اے آر وائی میوزک کی تو جب میں سیکنڈ ایئر کے امتحان سے فارغ ہوئی تو کراچی آئی اور عروہ کے ساتھ اسٹوڈیو گئی تو وہاں مجھے ڈرامہ سیریل "میرے حضور" کی آفر آ گئی اور یوں میں اسی فیلڈ میں آ گئی۔ ورنہ فرسٹ ایئر تک تو میں بھی اے ٹی وی کے میوزک پروگرام کی ہوسٹنگ کرتی تھی۔"

★ "گھر والوں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا اس فیلڈ میں آنے پر؟"

* "نہیں نہیں بالکل نہیں۔۔۔ کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ مما تو بہت خوش ہیں۔۔۔ اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا پہلا پروجیکٹ "میرے حضور" تھا جو ندیم صدیق کا پروجیکٹ تھا اور وہ "ایکسپریس ای" سے ہوا تھا اور اس سے مجھے بہت پہچان ملی تھی اور اس سیریل کو دیکھ کر مختلف پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے مجھ سے رابطہ کیا اور کام کا سلسلہ بنا اور آپ کو بتاؤں کہ "میرے حضور" سے پہچان ملی لیکن جو سیریل بہت زیادہ ہٹ ہوا اور جس کے ذریعے سے عام لوگوں نے بھی مجھے بہت زیادہ پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی وہ "یہاں پیار نہیں ہے" تھا۔"

★ "میں نے دیکھا ہے کہ آپ ڈر خوف اور رونے دھونے والے رول زیادہ کرتی ہیں کیوں؟ کوئی مشاہدہ ہے یا قدرتی صلاحیت ہے؟"

* "میرے جتنے بھی سینئر آرٹسٹ ہیں وہ مجھے کہتے ہیں کہ تمہارے اندر کچھ ہے کہ تم ایسے رول بہت اچھے کر لیتی ہو۔۔۔ مگر میں ایسا نہیں مانتی، کیونکہ جب میں پہلا سیریل کر رہی تھی تو مجھ میں خود اعتمادی تو تھی مگر اداکاری کی skills بہت کم تھی اور ندیم صدیقی بھائی نے بہت پالش کیا مجھے اور جب میں فہیم برنی کے سیریل میں کام کر رہی تھی تو نگیٹو رول کے لیے انہوں نے بہت پالش کیا۔"

★ "آپ کو خود کیا اچھا لگتا ہے۔ نگیٹو یا پوزیٹو رول کرنا؟"

* "پوزیٹو رول کرنا تو میرے خیال میں سب ہی لڑکیوں کو اچھا لگتا ہے اور انہیں تو بہت ہی اچھا لگتا ہے جو ہیروین ہوتی ہیں اور لیڈنگ رول کرتی ہیں۔ اب جیسے "میں گناہ گار نہیں" اور "اک تمنا لاحاصل سی" میں کہانی ہی مجھ پر بیس Base کرتی تھی تو مجھے یہ کردار کر کے بہت اچھا لگا اور جب میں نے "یہاں پیار نہیں ہے" میں نگیٹو رول کیا تو مجھے اتنی نفرت ملی کہ کیا بتاؤں، لوگ مجھے سڑک پر روک کر کہتے تھے کہ اوہو۔۔۔ آپ کتنی بری ہیں آپ کو شرم نہیں آتی اپنی بہن کا گھر اجاڑتے ہوئے۔ تو پوزیٹو رول کو اتنا فیم نہیں ملتا جتنا نگیٹو کو ملتا ہے۔ خیر مجھے تو دونوں ہی قسم کے رول پسند ہیں۔ بس رول پاور فل ہوں خواہ نگیٹو ہو یا پوزیٹو ہو۔"

★ "سنا تھا کہ آپ کسی فلم میں بھی کام کر رہی ہیں؟"

* "جی بالکل آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ پاکستانی فلم ہے اور "کم بخت" نام ہے اس کا۔ اسے حمزہ علی عباسی بنا رہے ہیں۔ وہ بہت اچھے اداکار بھی ہیں مگر اب وہ بحیثیت ڈائریکٹر کے کام کر رہے ہیں اور کافی ہائی لیول کی پروڈکشن ہے۔ اس میں ہمایوں سعید ولن کا رول کر رہے ہیں اور میرے ساتھ "شہریار منور" لیڈ رول کر رہے ہیں ساتھ میں احسن خان بھی ہیں۔"

★ "آپ اتنی چھوٹی ہیں کہ آپ کے ساتھ لیڈنگ رول میں سب ہی بڑے لگتے ہیں؟"

* "لیکن شہریار منور اتنا بڑا نہیں ہے وہ صرف 25۔24 کا ہی ہے اس لیے لوگوں کو محسوس نہیں ہو گا۔ بس دیکھیں کہ فلم میں کتنی کامیاب ہوتی ہوں میں۔"

★ "شوبز میں کوئی برائی ہے یا لوگوں کا پروپیگنڈا ہے؟"

* "نہیں کوئی برائی نظر نہیں آتی، محض پروپیگنڈا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اچھے لوگوں کے لیے یہ فیلڈ بہت اچھی ہے کیونکہ جو لوگ خود اچھے ہوں ان کو کوئی کچھ نہیں کہتا اور جب شوٹ ختم کر کے میں اسلام آباد آتی ہوں تو سب کو بہت مس کرتی ہوں کیونکہ میرے لیے تو سب فیملی کی طرح ہوتے ہیں خواہ وہ ندیم بھائی ہوں، احسن بھائی، سمیع بھائی۔ ان سب سے تو میری بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے مجھے سب سے فیملی والا پیار ہی ملا ہے۔"

★ "اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"

* "کچھ بھی نہیں بالکل بھی کچھ نہیں کرتی مجھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ خوب کھاتی پیتی ہوں مگر موٹی نہیں ہوتی مجھے کھانے پینے کا بہت شوق ہے اور اگر کھانا وقت پر نہ ملے تو بہت غصہ بھی آتا ہے اور چڑچڑی بھی ہو جاتی ہوں بس مجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانا چاہیے۔"

★ "تحفے دینا اچھا لگتا ہے یا تحفے لینا اور آپنی لائف میں سب سے بہترین تحفہ کس کا تھا؟"

* "مجھے تحفے دینا اور لینا دونوں ہی پسند ہیں اور میں اس لیے اپنی برتھ ڈے بہت اہتمام سے مناتی ہوں۔ ضروری نہیں کہ کوئی مجھے تحفے میں بڑی بڑی چیزیں دے مجھے کوئی پیار سے پھول بھی دے دے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور اب تک کی لائف میں سب سے اچھا تحفہ میری مما نے مجھے دیا ہے اور انہوں نے حال ہی میں مجھے گاڑی لے کر دی ہے تاکہ مجھے یونیورسٹی جانے میں مشکل نہ ہو۔"

★ "تنقید ہوتی ہے آپ کے کام پر؟"

* "ابھی تک تو نہیں ہوئی لوگ تعریف ہی کرتے ہیں اور میرے لیے کہتے ہیں کہ میں ایک ورسٹائل فنکارہ ہوں۔ میں نے جب نگیٹو رول کیا تو میرے خیال سے میں نے کچھ زیادہ ویری ایشن نہیں دی لیکن پھر بھی لوگوں نے پسند کیا اور میں ویری ایشن والے رول کرنا چاہتی ہوں کیونکہ لوگوں کو مجھ سے بہت اچھی پرفارمنس کی امیدیں ہیں۔"

★ "ہاتھ میں پیسہ ہو تو خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ آپ فضول خرچ ہیں یا پیسہ بچاتی ہیں؟"

* "تھوڑی فضول خرچ ہوں اور فیملی پر ہی خرچ کرتی ہوں۔ مگر میں اتنی فضول خرچ نہیں ہوں جتنی عروہ ہے۔ میں کبھی کبھار بھائی اور مما کے لیے شاپنگ کر لیتی ہوں مگر عروہ تو ہم سب کو شاپنگ کروا رہی ہوتی ہے بہت سخی ہے اور صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ دوستوں پر بھی بہت خرچ کرتی ہے ماشاء اللہ سے۔"

★ "جو کردار آپ کر رہی ہوتی ہیں اس میں آپ کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے یا نہیں؟"

* "جن دنوں میں ڈرامہ کر رہی ہوتی ہوں وہ کردار میری شخصیت کا ہی پارٹ ہوتے ہیں کیونکہ میں کردار میں بہت زیادہ انوالو ہو جاتی ہوں اور یہ نہیں سوچتی کہ میں حقیقت میں کیا ہوں۔ میرا ایک سیریل "بہتان" بہت جلدی آن ایئر ہونے والا ہے اس میں میں نے نگیٹو رول کیا ہے اور جن دنوں میں یہ کردار کر رہی تھی ان دنوں ہر کسی سے میری لڑائی ہو رہی ہوتی تھی۔ کیونکہ ڈرامے میں ہر کسی سے لڑ رہی ہوتی تھی۔ تو کردار آپ کے مزاج پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔"

★ "فیوچر پلان کرتی ہیں؟"

* "ہاں کرتی تو ہوں مگر بہت زیادہ نہیں اور ابھی تو یہی ہے کہ بیچلر ختم کرنا ہے اداکاری کو ساتھ ساتھ رکھنا ہے۔ کیونکہ اداکاری کو میں نہیں چھوڑ سکتی اس لیے کہ مجھے اپنے پروفیشن سے بہت پیار ہو گیا ہے۔ بس یہی میرا فیوچر پلان ہے۔"

★ "اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ اور مختلف سمجھتی ہیں؟"

* "میں اپنے آپ کو ایک عام انسان ہی سمجھتی ہوں، لیکن پھر بھی میں اپنے آپ کو دوسروں سے بہت مختلف سمجھتی ہوں۔ اس لیے کہ جب میں دیکھتی ہوں کہ لوگ کام کر رہے ہیں تو وہ لوگ صرف کام کر رہے ہوتے ہیں اور جو تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہوتے ہیں وہ صرف پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ میں نے اپنی

پریکٹیکل لائف میں اتنا کچھ دیکھ لیا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی ان لوگوں سے بہت مختلف ہے کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے تجربات حاصل کر لیے ہیں۔۔۔ اب دیکھیں نہ میں کتنی کم عمری سے کام کر رہی ہوں اور کام کر کے بہت سے تجربات حاصل ہوئے تو ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مجھ پر بہت مہربان ہے ہر چیز مجھے وقت سے پہلے مل جاتی ہے۔"

★ "اللہ کی مہربانیاں تو اپنی جگہ ہوتی ہی ہیں۔ لیکن کسی بھی فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خوب صورتی کا بھی تو عمل دخل ہوتا ہے کیا خیال ہے؟"

* "عمل دخل ہوتا ہے، لیکن میرا نظریہ یہ ہے کہ ظاہری خوب صورتی سے زیادہ انسان کے اندر کی خوب صورتی ہونی چاہیے۔ اگر آپ اچھے انسان نہیں ہیں تو آپ کتنے ہی خوب صورت کیوں نہ ہو جائیں لوگ آپ کو نہیں پوچھیں گے اور ہمارے کتنے ہی آرٹسٹ ہیں جو بہت زیادہ خوب صورت نہیں ہیں لیکن وہ اتنے اچھے اور اتنے نرم مزاج کے ہیں کہ ان کو کاسٹ کیا جاتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے آرٹسٹ کافی خوب صورت ہوتے ہیں لیکن ان کا رویہ اچھا نہیں ہوتا تو انہیں کوئی کانسٹ نہیں کرتا اس لیے اندر کی خوب صورتی کی ویلیو زیادہ ہوتی ہے۔"

★ "کبھی عام لوگوں میں جانے سے کوئی مسئلہ ہوا؟"

* "ہاں ہوتا ہے۔ اس وقت جب آپ اپنی فیملی کے ساتھ کہیں نکلیں۔ ایک مرتبہ میں اپنی فیملی کے ساتھ مووی دیکھنے گئی تو ضرورت سے زیادہ لوگ میرے اردگرد آ گئے گو کہ یہ بہت blessing تھا لیکن پھر ہم اپنی فیملی کے ساتھ انجوائے نہیں کر سکتے۔"

★ "فارغ بیٹھنا کیسا لگتا ہے؟"

* "اچھا تو لگتا ہے مگر کبھی کبھی۔ میری مما کہتی ہیں کہ زندگی میں کام ہو تو یہ انسان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے۔ فارغ بیٹھنا اچھی بات نہیں ہے۔"

★ "کھیلوں سے لگاؤ ہے؟"

* "بہت لگاؤ ہے کھیلوں سے مجھے کرکٹ اور فٹ بال بہت پسند ہے اور جب کرکٹ میں ہمارے کھلاڑی کوئی کارنامہ انجام دیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

★ "گھر کے کاموں سے دلچسپی ہے؟ کچن میں جاتی ہیں؟"

* "گھر کے کاموں سے دلچسپی بہت کم ہے پکانا بھی کچھ خاص نہیں آتا۔ البتہ میں چائے بہت اچھی بناتی ہوں اور باقی اپنے مطلب کی چیزیں جیسے نوڈلز وغیرہ بنا لیتی ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ماورا سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☼ ☼

ناولٹ "وہ اک پری ہے" کی پندرہویں قسط اس ماہ شامل اشاعت نہیں قارئین پندرہویں قسط انشاءاللہ اگلے ماہ پڑھ سکیں گے۔

میری بھی سنیے

سنبل اقبال

شاہین رشید

1 پورا نام؟
سنبل اقبال۔

2 پیار سے کیا بلاتے ہیں؟
مانو۔

3 تاریخ پیدائش اور سال؟
30 اگست 1989ء۔

4 شہر؟
اپنا شہر لاہور۔

5 بہن بھائی میرا نمبر؟
ہم دو بہنیں ہیں اور میں بڑی ہوں۔

6 تعلیم؟
گریجویشن۔

7 شادی؟
اس سوال سے لوگوں کو بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ تو میرا جواب ہے کہ جب نصیب میں ہوگی ہو جائے گی۔

8 میری پسند ہوگی یا؟
100 فیصد میرے والدین کی پسند ہوگی۔ مگر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔

9 شوبز میں متعارف کرایا؟
ثاقب ملک صاحب نے۔

10 میں ایسے کردار کرنا چاہتی ہوں؟
جو گیٹ اپ والے ہوں اور کوئی مجھے پہچان نہ سکے

اور جب لوگوں کو معلوم ہو کہ یہ سنبل تھی تو لوگ حیران رہ جائیں۔

11 مجھے وہ لوگ اچھے لگتے ہیں؟
جو وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ جو وقت کی پابندی نہیں کرتے مجھے بالکل پسند نہیں ہیں ایسے لوگ۔

12 میری خواہش ہے کہ؟
میں حسینہ معین کے ڈراموں میں کام کروں۔

13 مجھے دیکھ کر اکثر لوگ کہتے ہیں؟
کہ لگتا نہیں کہ آپ پنجابی فیملی سے ہیں۔ اتنی اسمارٹ۔۔۔۔ ہوتی نہیں پنجابی لڑکیاں۔

14 فیلڈ پر کشش کب لگی؟
جب پہلے کمرشل کے پندرہ ہزار روپے ملے۔۔۔۔ اتنے سارے ایک دم سے خوب شاپنگ کی ہم دونوں بہنوں نے اور اب تو مزے ہی مزے ہیں۔

15 کب زیادہ بھوک لگتی ہے؟
(قہقہہ)۔۔ لوگوں کو کام کی تھکن سے بھوک لگتی ہے مجھے غصے میں بھوک زیادہ لگتی ہے، ہے نا حیرت کی بات۔

16 میں چاہتی ہوں کہ؟
اداکاری میں عظمیٰ گیلانی جیسا مقام حاصل کروں۔

17 کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ؟
کہ آج کوئی شوٹ نہ ہو اور میں آرام سے گھر بیٹھ کر مزے کروں اور گھر والوں کے ساتھ وقت گزاروں خوب گھوموں پھروں۔

18 ایک سین جو ابھی تک یاد ہے؟
ایک رومینٹک سین تھا جس میں مجھے عدنان جیلانی کا ہاتھ پکڑنا تھا مگر وہ سین مجھ سے ہو ہی نہیں رہا تھا تو مجھے عدنان جیلانی نے کہا کہ لگتا ہے آپ نے کبھی کسی لڑکے کا ہاتھ نہیں پکڑا۔۔۔۔ اور سچ میں ایسا تھا۔۔۔۔ مگر شکر ہے کہ پھر وہ سین آرام سے ہو گیا۔

19 تقریبات جو مجھے پسند ہیں؟
شادی بیاہ کی تقریبات بہت پسند ہیں۔ بہت شوق سے جاتی ہوں اور خوب انجوائے کرتی ہوں۔

20 حیران ہوتی ہوں؟
ان لوگوں پر جو میرے اس فیلڈ میں آنے پر میری مخالفت کرتے تھے آج لوگوں سے میرا تعارف کراتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ وقت اور رتبہ بدل دیتا ہے انسان کو۔

21 تقدیر یا تدبیر کس پر یقین ہے؟
دونوں پہ۔۔۔۔ میرا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ 40 فیصد قسمت میں لکھا ہوتا ہے اور 60 فیصد انسان خود محنت کرتا ہے۔ مگر پھر یہ بھی سوچتی ہوں کہ قسمت ہی تو محنت کراتی ہے۔

22 محبت کے بارے میں میری رائے؟
بس جی ایک ہی بار ہوتی ہے بار بار ہونے والی محبت محبت تو نہیں ہوتی۔

23 میں بھروسہ کرتی ہوں؟
ان پر جو آپ کے کلوز فرینڈ ہوں خواہ وہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے۔ ویسے اگر آپ سروے کریں یہ لڑکے لڑکیوں کو بھروسے کے قابل بتائیں گے اور لڑکیاں لڑکوں کو مگر میں ایسا نہیں سوچتی۔

24 میں چاہتی تھی کہ؟
کہ پائلٹ بن کے جہاز اڑاؤں۔۔۔۔ مگر سب خواب کب پورے ہوتے ہیں۔

25 آج کے دور میں فائدہ مند کیا ہے کریڈٹ کارڈ یا اے ٹی ایم کارڈ؟
مجھے تو ہمیشہ سے کریڈٹ کارڈ ہی فائدہ مند لگتا ہے۔
26 اگر سیل فون ایجاد نہ ہوتا تو؟
ہائے تو کتنی مشکل ہو جاتی اور پھر آج کل جیسے حالات ہیں اس کے لیے تو سیل فون ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔
27 ایک ملک جہاں جانے کی خواہش ہے؟
سوئٹزر لینڈ۔۔۔۔ بہت تعریف سنی ہے میں نے۔
28 حکومت اگر ایک سہولت مفت دے دے تو؟
تو۔ تو پھر میڈیکل کی سہولت لینا چاہوں گی۔ کیونکہ آج کل معمولی سے معمولی بیماری کا علاج بھی بہت مہنگا ہے۔
29 اس فیلڈ کی کوئی خاص بات؟
کہ گھر آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔۔۔۔ کبھی جلدی تو کبھی بہت دیر ہو جاتی ہے۔
30 شوہر کے لیے میری سوچ؟
پڑھا لکھا ہو اور نرم طبیعت کا مالک ہو غصہ کا تیز نہ ہو۔
31 گھر آتے ہی دل چاہتا ہے؟
کہ اپنی ماں کے گلے لگوں اور سارا دن کے واقعات ان کے گوش گزار کروں۔
32 دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟
جب میرا غصہ آوٹ آف کنٹرول ہو جاتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ زور زور سے چیخوں۔
33 میری بری عادت؟
غصے میں آجاتی ہوں اگر کوئی میری ضد کو پورا نہ کرے۔
34 میں سخت خلاف ہوں؟
اس بات کے کہ اپنی کوئی ضرورت پوری کرنے کے لیے رشوت کا سہارا لیا جائے۔
35 موت سے ڈرتی ہوں؟
نہیں بالکل نہیں۔۔۔۔ اسے تو ایک دن آنا ہی ہے۔ جس طرح سب چلے جاتے ہیں ہم بھی چلے جائیں گے۔

36 لوڈشیڈنگ کے لیے میرے تاثرات؟
اللہ بیڑہ غرق کرے ان کے ای ایس سی والوں کا۔
37 صبح اٹھتے ہی پہلی نظر کس پر پڑتی ہے؟
گھڑی پر۔۔۔۔ کہ کہیں مجھے دیر تو نہیں ہو گئی۔
38 میرے لیے غیر یقینی تھا؟
اس فیلڈ میں آنا اور پھر شہرت پانا۔ عزت پانا اور لوگوں کی محبتوں کو حاصل کرنا۔
39 میں فضول خرچ ہوں؟
جی ہاں میں فضول خرچ ہوں اور زیادہ تر خرچ کپڑوں اور پرفیومز پر کرتی ہوں۔
40 24 گھنٹوں میں میرا پسندیدہ وقت؟
عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت۔
41 بہت سکون سے سوتی ہوں؟
جب بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں اور ڈھیر سارا کام کر کے آتی ہوں۔ پھر بستر پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہوں۔
42 میرا پسندیدہ مشغلہ؟
مجھے موویز دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ فارغ اوقات میں کوئی نہ کوئی مووی ضرور دیکھتی ہوں اور اچھی فلموں کو دیکھ کر بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔
43 بھوک میں میری کیفیت؟
چپ چاپ بیٹھی رہتی ہوں۔ اگر شوٹ پہ ہوتی ہوں کہ کسی کو کیا پریشان کروں۔۔۔۔ لیکن پیٹ میں سے گڑگڑ کی آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ جلدی کچھ ڈالو پیٹ میں۔
44 گھر کا پسندیدہ کونا؟
کونا نہیں ہے۔ ڈرائننگ روم اور اس کا صوفہ جہاں بیٹھ کر آرام سے مووی اور ڈرامے دیکھتی ہوں۔
45 آئینہ دیکھتی ہوں تو؟
تو اللہ کا بہت شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے اور پھر جب میں اپنا جائزہ لیتی ہوں تو مجھے اپنی آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں۔
46 شرمندہ ہو جاتی ہوں؟
جب مجھے کوئی کام کہتا ہے اور میں بھول جاتی ہوں

اور جب وہ سامنے آتا ہے تو بے ساختہ کہتی ہوں۔ ارے آپ نے تو مجھے فلاں کام کہا تھا اور میں بھول ہی گئی۔

47 گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟
پاپا کے.... کبھی کبھی بہت غصہ کرتے ہیں۔

48 مجھ سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے؟
آپ کی عمر کتنی ہے پوچھتی ہوں کہ کیوں پوچھ رہے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ اپنی عمر سے کافی چھوٹی لگتی ہیں اور اسکرین پہ اپنی عمر سے بڑی لگتی ہے۔

49 کوئی سوتے میں اٹھا دے تو؟
بہت غصہ آتا ہے۔ مجھے سخت چڑ ہوتی ہے اور جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہوں۔

50 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
نہیں بری نہیں لگتی، نصیحت عموماً" بڑے ہی کرتے ہیں اور بڑوں کی باتوں کا برا نہیں مانتی.... ہاں چھوٹے کریں تو؟.... پھر۔

51 موبائل سروس آف ہو تو؟
تو بہت الجھن ہوتی ہے۔ بہت کوفت ہوتی ہے۔ کیونکہ اب موبائل کے بغیر گزارا نہیں ہے۔

52 شہرت مسئلہ بنتی ہے؟
مجھے شہرت اچھی لگتی ہے۔ میرے لیے کبھی بھی مسئلہ نہیں بنی۔ بلکہ جب لوگ پاس آتے ہیں پہچان کر تعریف کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔

53 پہلی بار ملنے والے میں کیا دیکھتی ہوں؟
آنکھیں دیکھتی ہوں اور ان کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ کیونکہ آنکھیں بہت کچھ کہہ دیتی ہیں۔

54 کچھ چیزیں جو ہر وقت بیگ میں ہوتی ہیں؟
سیل فون کاسمیٹکس اور پرفیوم جس کے بغیر گزارا نہیں ہے میرا۔

55 گھر والے اکثر ناراض ہو جاتے ہیں؟
جب میں ان کا کہنا نہیں مانتی میری عادت ہے پر کیا کروں۔

56 کھانے کس قسم کے پسند ہیں؟
مرچ مسالے والے.... ہوں بہت مزا آتا ہے۔ اور اپنے ملک کے کھانوں کی تو کیا ہی بات ہے۔ پوری دنیا میں ان کے جیسا ذائقہ نہیں ہوتا۔

57 پسندیدہ ناشتہ؟
صرف جوس کا ایک گلاس۔

58 اپنے سرہانے کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟
ڈھیر ہوتا ہے میری سائیڈ ٹیبل پہ.... جس میں سیل فون میری گھڑی پانی کی بوتل پرفیوم اور بہت سی چیزیں اور کوئی کتاب بھی۔

59 لوگ اکثر میری تعریف کرتے ہیں کہ؟
یہ لڑکی بہت پابند ہے وقت کی اور اس کی وجہ سے ہمیں بھی جلدی آنا پڑتا ہے۔

60 میرا چہرہ چغلی کھاتا ہے؟
جب میں جھوٹ بولتی ہوں فوراً" سب کو پتا چل جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔

61 قسمت بدل سکتی ہے؟
جب ہم سچے دل سے دعا کریں۔

62 موڈ خراب ہو تو ٹھیک کون کرتا ہے؟
کوئی بھی نہیں.... خود بخود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔

63 اپنے لیے شاپنگ کرتے وقت کیا سوچتی ہوں؟
کچھ بھی نہیں جو چیز پسند آجاتی ہے بلا جھجک خرید لیتی ہوں۔

آواز کی دنیا سے

حوریہ فہیم

شاہین رشید

رمضان المبارک کی مناسبت سے ہم نے معروف نعت خواں حوریہ فہیم سے بات چیت کی۔ ان کی آواز کے مداح ایک عرصے سے ان کے بارے میں پڑھنا چاہ رہے تھے۔ باوجود مصروفیت کے حوریہ فہیم نے ٹائم دیا اس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں۔

★ "جی حوریہ کیسی ہیں اور کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے۔ ایک پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے جا رہی تھی لیکن آپ کے لیے میرے پاس ٹائم ہے۔"

★ "شکریہ، کس پروگرام کی ریکارڈنگ ہے؟"

✳ "جی ابھی تو آڈیو ریکارڈنگ کے لیے جا رہی ہوں نعت کی اور اس کی ویڈیو بعد میں بنے گی۔ تو چونکہ رمضان المبارک کی آمد آمد ہے لہٰذا اس کی تیاریاں چل رہی ہیں۔"

★ "آپ کا پہلا نام حوریہ رفیق قادری تھا اب حوریہ فہیم ہے۔ مطلب شادی ہو گئی ہے۔ تو شادی کے بعد لڑکیاں نام تبدیل کیوں کر لیتی ہیں؟"

✳ "بس اکثر لوگ تبدیل کر لیتے ہیں۔ اکثر نہیں بھی کرتے.... یہ تو اپنی مرضی پر منحصر ہے۔"

★ "اسلام میں ہے کوئی پابندی۔۔۔۔؟"

٭ "نہیں جی۔۔۔ اسلام میں کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ ہی میرے میاں صاحب کی طرف سے کوئی پابندی ہے۔ بس ہو گیا تبدیل تو ہو گیا۔"

★ "یہ آسانی بھی ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو پتا چل جاتا ہے کہ یہ لڑکی اب شادی شدہ ہے۔ کیا کرتے ہیں آپ کے میاں صاحب؟"

٭ "بنک میں جاب کرتے ہیں۔"

★ "گڈ۔۔۔ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں پھر آپ کے کام کی طرف آتے ہیں؟"

٭ "ہماری مادری زبان اردو ہے اور میرے والدین کا تعلق "جبل پور" انڈیا سے ہے۔ میرے والد ایکسائز میں مارکیٹنگ سپروائزر ہوا کرتے تھے۔ اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ میں کراچی میں 17 ستمبر 1983ء میں پیدا ہوئی ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ میری شادی دسمبر 2007ء میں ہوئی اور میری ایک بیٹی ہے۔ جس کا نام عائشہ فاطمہ ہے جو ابھی ڈیڑھ سال کی ہے اور میں اسلامک اسٹڈیز میں گریجویٹ ہوں۔"

★ "اپنے بہن بھائیوں میں آپ کو ہی شوق ہے نعت خوانی کا یا اور لوگ یعنی بہن بھائی بھی اس سے منسلک ہیں؟"

٭ "پہلے ہم چاروں بہنیں مل کر پڑھا کرتے تھے۔ مگر شادی کے بعد سب اپنی اپنی ذمہ داریوں میں مصروف ہو گئیں۔ تو پھر وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی ویسے جب ہم کسی محفل میں ایک ساتھ مدعو ہوتی ہیں تو پھر مل کر پڑھتی ہیں۔"

★ "بچپن سے یہی خواب دیکھا تھا کہ نعت خواں بننا ہے یا کچھ اور خواب بھی تھے؟"

٭ "جو میرا خواب تھا الحمدللہ وہ اللہ نے پورا کر دیا ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں جب "کے جی ٹو" میں تھی تب سے نعتیں پڑھ رہی ہوں اور بچپن سے ہی یہ بات ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ اس میں آگے جانا ہے میرے ماموں، میری امی اور میرے پاپا نے مجھ پر بہت محنت کی ہے۔ خاص طور پر میرے ماموں مجھ پر بہت محنت کرتے تھے (حال ہی میں ان کا انتقال ہوا ہے) ہر مقابلے میں مجھے لے جاتے تھے۔"

★ "تو سب کچھ کیسا لگتا تھا اور کس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھیں آپ؟"

٭ "وقت بہت تیزی سے گزر تا گیا اور اتنی تفصیل تو میں بتا بھی نہیں سکتی لیکن میں آپ کو یہ بتاؤں کہ پہلے میں اسکول کے مقابلوں میں جاتی تھی اور جو ججز تھے وہ سب سینئر نعت خواں ہوا کرتے تھے۔ جیسے خورشید بھائی مرحوم، فصیح الدین سہروردی صاحب، صدیق اسماعیل صاحب وغیرہ وغیرہ۔ ویسے میں بچپن سے ہی فصیح الدین سہروردی صاحب سے بہت متاثر ہوں اور ان کو میں نے بہت زیادہ کاپی کیا ہے جب میں کلاس تھری میں تھی۔ اس زمانے میں ان کی نعت "خسروی اچھی لگی نہ سروری اچھی لگی" بہت مشہور ہوئی تھی تو ان کے اسٹائل میں پڑھنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ پھر ادیب رائے پوری صاحب سے ایک جگہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنی نعتیں پڑھنے کے لیے دیں اور انہوں نے پھر مجھے میلاد کی نجی محفلوں میں بھیجنا شروع کیا اور بس پھر سلسلہ چلتا رہا۔"

★ "ریڈیو ٹی وی پہ بھی انہی لوگوں کے تعاون سے آئیں ہوں گی؟ اور کیا کیا کیا؟"

٭ "ریڈیو پہ تو اتنا نہیں گئی میں، البتہ جس زمانے میں میں نے نعتیں پڑھنا شروع کیں اس وقت صرف پی ٹی وی ہی ہوتا تھا اور پی ٹی وی کے لیے میں نے بہت کوشش کی ہر دفعہ آڈیشن کے بعد کہتے تھے کہ ہم مینہوز کی نعتیں ریکارڈ کرتے ہیں۔ بچوں کی نہیں کرتے تو میں مایوس ہو کر واپس آجایا کرتی تھی۔ پھر "ایس ٹی این" میں 1995ء میں پہلی مرتبہ میری نعت ریکارڈ ہوئی تھی۔ شعیب صدیقی صاحب نے کی تھی۔ پھر ایس ٹی این میں ہی ایک محفل میلاد کا انعقاد ہوا جس میں مجھے پڑھنے کا موقع ملا۔ پھر آل پاکستان مقابلہ

نعت خوانی میں میں نے 1996ء میں حصہ لیا اور سندھ کی نمائندگی کی اور اگرچہ مجھے شروع کے تین پرائز میں سے تو کچھ نہیں ملا تھا لیکن منظور الکونین صاحب نے میرے لیے آواز اٹھائی کہ اس بچی نے اتنا اچھا پڑھا ہے تو اسے کچھ انعام کیوں نہیں دیا گیا۔ وہ سب لوگوں پر بہت ناراض ہوئے۔ پھر 1998ء میں ایک بار پھر گئی۔ تب بھی مجھے کوئی پرائز نہیں ملا۔ پھر 1999ء میں گئی تو پھر مجھے فرسٹ پرائز ملا اور بہت خوشی ہوئی اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میں نے اتنا بڑا مقابلہ جیتا تھا۔ پھر جناب میں کالج میں آگئی اور پی ای سی ایچ ایس سے میں نے انٹر کیا اور سرسید کالج سے بی اے کیا اور جب اے آر وائی شروع ہوا تو مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ خواتین میں میں پہلی لڑکی تھی جس نے اے آر وائی کے لیے نعت پڑھی۔ بس اس کے بعد سے مسلسل اے آر وائی اور کیو ٹی وی کے لیے حمد و نعت پڑھ رہی ہوں۔"

★ "آپ بتا رہی ہیں کہ آپ کے جی ٹو کلاس سے پڑھ رہی ہیں حمد و نعت تو بہت چھوٹی عمر ہوتی ہے تو گھر والوں کو کیسے پتا چلا کہ آپ میں یہ صلاحیت ہے؟"

* "ہمارا گھرانہ ہمیشہ سے ہی محفل نعت کا انعقاد کرتا چلا آرہا ہے۔ میری نانی کے گھر بہت محفلیں ہوتی تھیں میرے نانا ہر ماہ کے فرسٹ ویک میں نعت خوانی کا اہتمام کیا کرتے تھے تو بچپن سے یہ سب کچھ دیکھتی آرہی تھی تو میں بھی پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ تب گھر والوں کو آئیڈیا ہوا کہ حوریہ کی آواز بھی اچھی ہے اور پڑھتی بھی سر میں ہے تو یوں سمجھیں کہ مجھے آواز اور ادائیگی ورثے میں ملی ہے۔"

★ "گھر کا ماحول مذہبی حمد و ثناء پر زور نجی محفلوں میں جانا تو اتنے مذہبی گھرانے کی لڑکی کو میڈیا میں آنے کی اجازت کیسے ملی۔ کیونکہ اسکرین پہ تو سب نظر آرہا ہوتا ہے؟"

* "یہ سب میرے ماموں کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور میڈیا میں آنے کی اجازت اس لیے بھی مل گئی کہ میری فیلڈ گانے وغیرہ کی نہیں ہے۔ اداکاری کی نہیں ہے ماڈلنگ کی نہیں ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو شاید کبھی بھی اجازت نہ ملتی اور میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس معاملے میں نہ میرے گھر والوں کی طرف سے کوئی روک ٹوک ہے نہ میرے سسرال کی طرف سے کوئی پابندی ہے اور چونکہ ایسی سختی نہیں ہے کہ ٹی وی نہ دیکھو باہر نہ نکلو تو اس وجہ سے میں آپ کو نظر آرہی ہوں۔"

★ "ہمارے مذہب میں تو خواتین کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں ہے تو آپ.....؟"

* "میں کسی غلط کام کے لیے باہر نہیں نکلتی.... میں نے بتایا نا کہ شوبز سے میرا تعلق نہیں ہے۔ حمد و نعت جنہیں لوگ سننا چاہتے ہیں میں وہی پڑھتی ہوں۔"

★ "ربیع الاول ہو اور پھر رمضان المبارک۔ آپ سب کی ڈیمانڈ بڑھ جاتی ہے تو لفظ یہ استعمال کیا جاتا ہے کہ "سیزن" شروع ہو گیا ہے تو ایسا ہی ہے کیا؟"

* "سیزن کسے کہتے ہیں؟ موسم کو ہی کہتے ہیں نا اور لفظ سیزن کو مثال کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہوتا ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے گھروں میں تو پورے سال ہی میلاد ہوتا ہے ہاں ان دو مہینوں میں اضافی بوجھ پڑ جاتا ہے ہر جگہ پروگرام ہو رہے ہوتے ہیں ہر جگہ ہمیں بلایا جا رہا ہوتا ہے۔ تو ہم سب کو پراپر ٹائم تو نہیں تھوڑا تھوڑا ٹائم ضرور دے دیتے ہیں اور ان دنوں کے لیے تو لوگ سفارشیں کر کے ٹائم لے رہے ہوتے ہیں۔ رمضان المبارک میں گھریلو محفلیں تو نہیں ہوتیں البتہ میڈیا میں بہت بلائے جا رہے ہوتے ہیں ہم۔"

★ "سنگرز کے لیے کہا جاتا ہے کہ معاوضہ لیتے ہیں۔ آپ لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ ہدیہ لیتے ہیں خود ڈیمانڈ کرتے ہیں یا لوگ اپنی خوشی سے جو دے دیں قبول ہوتا ہے؟"

* "میں کسی سے کچھ نہیں مانگتی، جو اپنی خوشی سے مجھے کچھ دے دے تو میں انکار بھی نہیں کرتی۔ کیونکہ اگر انکار کرو تو وہ لوگ ناراض ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی زیادہ کرتا ہے تو میں ناراض ہو جاتی ہوں۔"

★ "مگر میں نے تو بہت سے نعت خواں دیکھے ہیں جو باقاعدہ ڈیمانڈ کرتے ہیں کہ اتنے ہزار لیں گے اور اتنا ٹائم دیں گے؟"

* "ہاں لینے کا ٹرینڈ تو ہے کیونکہ یہ بھی ایک فیلڈ بن چکی ہے اور وہ لوگ جن کو اپنا گھر چلانا ہوتا ہے۔ جن کے پاس کوئی جاب نہیں ہے تو پھر وہ ڈیمانڈ کرتے ہیں لیکن جہاں تک میرا معاملہ ہے تو مجھ پر اللہ کا بڑا کرم ہے اور جہاں تک ٹائم کی بات ہے تو ٹائم تو میرا بھی فکس ہی ہوتا ہے ایک گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ دیتی ہوں۔"

★ "کبھی گلوکاری کی طرف رجحان ہوا، آواز بھی اچھی ہے اور شکل بھی اچھی ہے آپ کی؟"

* "آپ یقین کریں کہ بہت آفرز آئی ہیں۔ لیکن اس وقت جب میں کافی چھوٹی تھی، شاید کلاس 7th میں تھی۔ پی ٹی وی نعت کے لیے تو نہیں بلاتا تھا کہ آپ چھوٹی ہیں لیکن مجھے بچوں کے پروگرام کے لیے کہا جاتا تھا کہ آپ "پیروڈی" کیجیے، تو میرے چھوٹے ماموں کہتے تھے کہ ابھی چھوٹی ہے۔ گانے دو کوئی فرق نہیں پڑتا پھر انہی لوگوں نے مجھے "میوزک چیلنج" کے لیے بلایا، میرا آڈیشن لیا۔ میں کامیاب بھی ہو گئی مگر میرے بابا کو یہ بات پسند نہیں آئی تو بس ایک ہی بار پروگرام کیا اور پھر چھوڑ دیا کہ نہیں اس طرف نہیں آنا ہے۔ پھر اداکاری کے لیے غزلوں کے لیے بہت کہا گیا۔ آرٹس کونسل جاتی تھی تو ایک دو ڈائریکٹرز نے کہا کہ آپ سے اداکاری کروانی ہے ہم نے تو میں صاف کہہ دیتی ہوں کہ نہیں مجھے کچھ نہیں کرنا صرف نعت پڑھنی ہے۔"

★ "ویسے میوزک پسند ہے اور شادی بیاہ کی محفلوں میں گاتی ہیں؟"

* "پہلے تھا کسی زمانے میں مگر اب بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ مزا ہی نہیں آتا سننے کا چھوٹی تھی تو بہت کچھ سن بھی لیتی تھی مگر اب دل نہیں چاہتا اور ہم پہلے اپنے گھر کی شادیوں میں گایا کرتے تھے مگر اب ہمارے گھر کا ماحول بہت change ہو گیا ہے۔ اب ہمارے گھر کی شادیاں عام گھر کی شادیوں کی طرح نہیں ہوتیں اب میلاد وغیرہ ہوتا ہے۔ سادگی ہوتی ہے اور اب گانا وغیرہ گا کر دل کو سکون نہیں ملتا اب اس میں دل نہیں لگتا۔"

★ "امیج بھی تو بن جاتا ہے نا.... اس لیے بھی انسان احتیاط کرتا ہے کہ لوگ باتیں نہ کریں؟"

* "نہیں آپ امیج کی بات نہ کریں۔ انسان کے اپنے اندر کی بھی تو بات ہوتی ہے۔ کچھ احساسات ہوتے ہیں پرسنلی تو انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ میری گاڑی میں نعتوں کی ہی سی ڈیز لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار ریڈیو لگا لیا تو سن لیا — ورنہ نہیں۔"

★ "کبھی سرکاری محفلوں میں آپ کو مدعو کیا گیا؟"

* "میں ایک مرتبہ پریزیڈنٹ ہاؤس جا چکی ہوں وہ بھی چار سال پہلے گئی تھی اور سچ بتاؤں وہاں بھی تو "پرچیاں" چل رہی ہوتی ہیں کہ ہمیں بلائیں میرے لیے تو پتا نہیں کیسے اتفاق سے ہی فون آگیا کہ آپ کو آنا ہے۔"

بقیہ 264 پر

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیحہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں' مدیحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خودسر لڑکی ہے' وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے' جس کے پیش نظر فائزہ بیگم' نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں' لیکن مدیحہ پاکستان جانے سے انکار کردیتی ہے' جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے' مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے' مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا' بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے' لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے' جو اسے کام کی آفر کرتا ہے' جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے' اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے' وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے' وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے' وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے' اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا' اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۳۴
چونتیسویں قسط

"مریم! کیا بات ہے؟ تم پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل پریشان نظر آرہی ہو مگر بتا نہیں رہیں؟ کیا وجہ ہے آخر؟ کیا پریشانی ہے تمہیں؟"

وہ کافی بے دلی سے اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب عابدہ خاتون کمرے میں اس کے پاس چلی آئی تھیں اور مریم ان کی بات پر چونک کر متوجہ ہوئی۔

"ارے نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے بھلا؟" اس نے ذرا سا جھک کر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اپنی چادر اٹھائی اور ان کے سامنے لاپروا نظر آنے کی کوشش کی۔

"پریشانی نہیں ہے مگر کچھ تو ہے نا جس نے تمہیں اس قدر اپ سیٹ کر رکھا ہے؟ تمہارا کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں ہے ورنہ تم تو سب کی طرف دھیان رکھتی تھیں سب کا خیال ہوتا تھا تمہیں؟ مگر پچھلے کچھ دنوں سے تو میں ایسا کچھ بھی نہیں دیکھ رہی؟ تمہیں تو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں ہے؟ عدیل بھی اسی بات کو نوٹس کر رہا تھا۔ مگر اس نے تم سے کہا نہیں کیونکہ وہ سمجھ رہا ہے کہ تم شاید جاب کی وجہ سے تھک گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو تم جاب چھوڑ دو ہمارا گزارا ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اپنے رب تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ آئندہ سے بھی اچھا اور بہتر گزارا ہو گا، اپنے ذہن پہ کوئی بھی پریشانی سوار مت کرو۔"

عابدہ خاتون نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اسے تسلی دی تھی اور مریم چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے رک گئی۔ "امی پلیز آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ میں نے کہا نا میں بالکل ٹھیک ہوں بس یہ موسم کی وجہ سے کچھ سستی سی ہو رہی ہے ورنہ اور تو کچھ نہیں ہے اور جاب کا کیا ہے؟ میں کون سا پہاڑ توڑتی ہوں جا کر؟ اکیڈمی میں جا کر پڑھاتی ہوں اور واپس آجاتی ہوں، بس اتنی سی جاب ہے میری اور آپ کہتی ہیں کہ وہ بھی چھوڑ دوں؟ ہونہہ یہ تو خود گھر آئی روزی، رزق کو ٹھکرانے والی بات ہے۔"

مریم نے انہیں پوری پوری تسلی دینے کی کوشش کی تھی اور عابدہ خاتون اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے اس کی بات کا اور اس کے لہجے کا سچ ڈھونڈتی رہ گئی تھیں۔

"آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں! سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں بس آپ کی دعا کے ساتھ ساتھ اب اجازت بھی چاہیے میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہی ہوں پلیز!"

مریم ان کو کندھوں سے تھام کے ایک بھرپور تسلی دیتے ہوئے بولی اور پھر وال کلاک کی سمت دیکھا وہ واقعی کافی لیٹ ہو رہی تھی۔

"ہوں! ٹھیک ہے خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین!" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر اسے رخصت کی اجازت دی تھی اور مریم کے دل کا بوجھ اور پریشانی قدرے کم ہو گئے تھے اس لیے وہ گھر سے رخصت ہوئی تھی اور بڑے سکون سے بس اسٹاپ تک پہنچی تھی مگر بس اسٹاپ تک پہنچتے ہی اس کا سارا سکون رخصت ہو گیا تھا۔

کیونکہ سامنے ہی جودت آفندی چمچماتی ہوئی کار سے ٹیک لگائے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا اور جس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہے اور جس کو سوچ کر ہی مریم کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی جسم کانپ گیا تھا اب وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

کیونکہ اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال تھا آخر یہ بس اسٹاپ ان کے گھر اور محلے سے دور ہی کتنا تھا بھلا اور اگر وہ یہاں کوئی تماشا بناتا تو مریم کو اندازا تھا کہ اس کے باپ اور بھائی کی عزت چند سیکنڈ میں ہی مٹی میں رل سکتی تھی اور اس کا صاف ستھرا بے داغ دامن پل میں غلیظ اور داغ دار ہو سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھنے کی اور عقل اور تحمل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور خود کو لاتعلق اور لاپروا ظاہر کرتے ہوئے

اس کے سامنے سے گزر جانا چاہا تھا مگر وہ اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر گاڑی سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

"سنو!" اس نے پیچھے سے اسے آواز دی تھی اور مریم کے قدم جہاں کے تہاں جم گئے البتہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ تو پھر بھی نہیں ہوا تھا۔

"میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو مجھے بس تمہارا تھوڑا سا ٹائم چاہیے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

جودت نے شاید پہلی بار سکون اور تحمل سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار مریم نے بے ساختہ پلٹ کر اسے دیکھا کیونکہ اسے اس لوفر اور آوارہ شخص کی بات کا ذرا بھی یقین نہیں تھا۔

"دیکھو! مجھے غلط مت سمجھو میں اس وقت یہاں تمہیں تنگ کرنے کے ارادے سے نہیں آیا میں واقعی کسی کام سے آیا ہوں۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو ورنہ مجھے زیادہ نہ سہی مگر تھوڑا بہت تو تم جانتی ہی ہو گی؟ شرافت کی زبان کے علاوہ بھی مجھے ایک اور زبان آتی ہے۔ جس کو سمجھ نہ آئے اسے وہی سمجھانی پڑتی ہے اور اس چیز کو تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تم شرافت کی زبان ہی سمجھ جاؤ تو بہتر ہے کیونکہ یہ ایریا تمہارا ہے اور یہاں مجھ سے کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو یقیناً "تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے بہت برا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو خود بدنام کرو گی اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ بات ختم ہوتے ہی تم جہاں کہو گی میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ تم سے وعدہ پکا والا وعدہ، پلیز ٹرسٹ می۔"

جودت نے اتنی لمبی چوڑی بات پہلے کبھی نہیں کی تھی اور جب کی تو مریم دیکھنے اور سوچنے پہ مجبور ہو گئی۔

"لیکن میں تمہارا یقین کیسے کر لوں؟" مریم نے زبان کھولی بھی تھی تو ذرا سخت لب و لہجے میں۔

"جیسے بھی کرو کرنا تو تمہیں پڑے گا ہی کیونکہ اگر نہیں بھی کرو گی تو مجھے کیا فرق پڑے گا بھلا نقصان الٹا تمہارا ہی ہے۔ یو نو زبردستی کرنا مجھے آتا ہے تمہیں ہاتھ سے پکڑ کر یا بانہوں میں اٹھا کر گاڑی میں بٹھانا مشکل نہیں ہے میرے لیے سو پلیز ڈارلنگ کم آن۔"

اس نے بڑے لاپرواہ اور غیر سنجیدہ سے انداز میں کہتے ہوئے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول دیا تھا جو مریم کے لیے گاڑی میں بیٹھنے کا ایک اشارہ تھا، ایک ایسا اشارہ جس پہ عمل کرنے کا وہ کبھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ لیکن اس اشارے سے انکار بھی اسے کھڑے کھڑے رسوا کر سکتا تھا اور وہ یہ رسوائی افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

سو اس نے اپنی نگہبانی رب کو سونپتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے اور جودت آفندی کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی اور جودت اس کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پہ آبیٹھا اور پھر محض چند سیکنڈز میں ہی اس کی گاڑی وہاں سے فراٹے بھرتی ہوئی ہوا ہو گئی تھی۔

اس نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ رکھی تھی لیکن وہاں سے بہت دور آ کر اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی اور گردن موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھی مریم کو دیکھا وہ بالکل سامنے ونڈ اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی "کتنی اچھی لگ رہی ہو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی۔" جودت نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال صاف کہہ دیا تھا اور مریم کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی کیونکہ جودت کا لہجہ ہی کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ مریم کو اپنے آس پاس خطرے کا الارم بجتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی بھلا؟ اب جو بھی تھا وہ برداشت کرنا اور چپ رہنا تھا۔

"دل چاہ رہا ہے، تمہیں دور بہت دور لے جاؤں شہر سے بھی دور جہاں تمہارے اور میرے سوا کوئی بھی نہ ہو۔ جہاں میرا شوق اور میری دیوانگی اور تمہارا حسن اور تمہاری پاکیزگی ایک ہو جائیں جہاں سارے فاصلے اور ساری دوریاں مٹ جائیں۔" جودت بڑے دلبرانہ انداز اور لہجے میں اپنے دل کا حال کہہ رہا تھا اور مریم چپ چاپ سب سن رہی تھی اور اندر ہی اندر ضبط کے گھونٹ پی رہی تھی۔

"کیا خیال ہے تمہارا؟ چلو گی میرے ساتھ جنت کی سیر کو؟" جودت نے اب کی بار اسے باقاعدہ مخاطب کیا تھا۔

"دیکھو جودت آفندی! تم نے جو وعدہ کیا ہے اس پر غور کرو اِدھر اُدھر کی باتیں مت کرو ورنہ اسی گاڑی سے کود کر مر جاؤں گی مجھے اپنی عزت سے زیادہ اپنی جان پیاری نہیں ہے۔"
مریم کا لہجہ اور الفاظ انتہائی سخت تھے اور جودت بے ساختہ اس کی دھمکی پر مسکرا دیا تھا۔
"اونہوں! کیسی باتیں کرتی ہو سویٹ ہارٹ ایسے بھلا مرنے دوں گا تمہیں' تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے نہ دنیا دیکھی ہے' نہ دیوانہ دیکھا ہے اور بنا دیکھے تم مر جاؤ یہ تو مجھے اور بھی دیوانہ کرنے والی بات ہو گی' ہے نا۔"
وہ مریم کو بڑی گہری اور مستانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور لبوں کی مسکراہٹ اور بھی مستی بھری ہو گئی تھی۔
"مگر تم نے وعدہ۔" مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر جودت نے بات کاٹ دی تھی۔
"ہاں! میں جانتا ہوں کہ میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے اور اسی وعدے پہ تم نے مجھ پہ ٹرسٹ کیا ہے اسی لیے' اسی لیے تو ابھی تک دل کے مجبور کرنے کے باوجود بھی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اس پہ بھی غور نہیں کیا کہ تم میرے کتنے قریب بیٹھی ہو حالانکہ بہت عرصے سے شوق تھا کہ تمہاری سانسوں کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کر کے دیکھوں مگر شکر ادا کرو کہ تم سے وعدہ کر بیٹھا ہوں۔"
جودت نے جیسے آہ بھری تھی اور مریم اس کی بات پہ قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔
"لیکن تمہیں اتنا بتا دوں کسی لوفر' آوارہ' دیوانے کے وعدے کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کسی وقت بھی توڑ سکتے ہیں کیونکہ ان کا خود پہ اختیار جو نہیں ہوتا۔"
جودت نے اگلی بات کہہ کر اسے پھر سے پل میں ہراساں کر دیا تھا اور مریم کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر قہقہہ لگا کر ہنسا اور گاڑی کو ایک دم بریک بھی لگا دیے تھے۔
"ارے ڈونٹ وری یار! آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ گاڑی کا ڈور کھول کر نیچے اتر آیا تھا' لیکن مریم لاہور کے سب سے بڑے اور مہنگے ترین ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی پارک دیکھ کر وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔
"نہیں! تم نے جو بھی بات کرنی ہے یہیں کرو' میں اندر نہیں جاؤں گی۔" وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں تھی۔
"اف یار! جہاں اتنا بھروسہ کر لیا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی تمہاری قسم میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنے والا اور نہ ہی میں نے کوئی روم بک کروا رکھا ہے۔ بس میں نے تم سے بات کرنی ہے اور تو کچھ نہیں۔"
وہ آخر میں خاصے معنی خیز لہجے میں بولا تھا اور مریم شرم سے کٹ کے رہ گئی تھی۔
"آ جاؤ یار! ورنہ مجھے ٹیبل یہیں روڈ پہ لگوانی پڑے گی۔" جودت نے جھنجلا کر اصرار کیا تھا۔
"تو پھر ہم لوگ فیملی ہال میں بیٹھیں گے۔" مریم نے شرط رکھی تھی۔
"اوکے اوکے! لیکن فیملی کہاں ہے؟" جودت نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کے لیے آگے پیچھے دیکھا اور وہ اگنور کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور پھر جودت اپنے وعدے کے مطابق کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر اسے اپنے ساتھ لیے فیملی ہال میں آ گیا تھا۔
"ہاہاہا! اتنے بڑے ہال میں بیٹھ کر بات نہیں کرنی چاہیے بلکہ میچ کھیلنا چاہیے قسم سے مزا آ جائے گا۔" جودت نے ریسٹورنٹ کے فیملی ہال میں داخل ہو کر اسے گھوم پھر کر دیکھتے ہوئے خاصے دلچسپ اور انجوائے کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
"پلیز سر!" ویٹر نے اسے متوجہ کرتے ہوئے اسے کرسی پیش کی تھی۔
"ہوں! تھینکس۔" وہ سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پلٹ کر کرسی پہ بیٹھ گیا تھا کیونکہ مریم اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

"کیا لو گی؟" جودت اس سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان دونوں میں یہ سلسلہ برسوں سے چلا آ رہا ہو۔
"نو تھینکس! میں گھر سے ناشتا کر کے آئی ہوں۔" اس نے حسب توقع نفی میں جواب دیا اور مجبوراً جودت نے محض جوس آرڈر کیا تھا جس کے بعد ویٹر وہاں سے چلا گیا اور وہ دونوں اس ہال میں اکیلے بیٹھے رہ گئے تھے کیونکہ یہ صبح کا وقت تھا اس لیے فیملی ہال میں ذرا بھی رش نہیں تھا البتہ سپریٹ کیبن اس وقت بھی آباد تھے۔
"ہوں تو ڈیر مریم بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک الجھن میں ہوں جس کو سلجھانے کے لیے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں لیکن اگر تم سچ سچ جواب دو تو۔" اس نے مریم کو سنجیدگی سے کہتے ہوئے مخاطب کیا۔ اور مریم نے جواباً "الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور اس کی الجھن اور سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے جودت کو بات کا سلسلہ جاری رکھنا پڑا۔
"وہ میں دراصل منصور حسین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ بس مجھے اس کے بارے میں ساری معلومات چاہئیں۔" اس نے اپنی الجھن آخر کہہ ہی ڈالی تھی مگر مریم کی الجھن ابھی بھی دور نہیں ہوئی تھی۔
"کون منصور حسین؟" مریم کا سوال جودت کو چونکا گیا تھا۔
"کیا مطلب؟ کیا تم منصور حسین کو نہیں جانتیں؟" جودت کو حیرت ہوئی تھی۔
"مجھے کیا پتا تم کس کا پوچھ رہے ہو؟ کون منصور حسین؟" مریم کو جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔
"وہی منصور حسین جس نے اس روز میری بائیک کو اپنی گاڑی سے ٹکر ماری تھی اور تمہیں اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کے لے گیا تھا۔" جودت نے اسے یاد دلایا تھا اور مریم بری طرح چونک گئی تھی۔
"وہ۔۔۔؟ وہ تو۔۔۔" اس کے منہ سے بے ساختہ دل آور شاہ کا نام نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے فوراً "لب بھینچ لیے تھے کیونکہ اسے اندازا ہو چکا تھا کہ جودت آفندی اس کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا اور اس کے ذریعے معلومات لینا چاہتا ہے لیکن مریم بروقت عقل آ جانے پر سنبھل سی گئی تھی۔
"کیا وہ تو؟ کون ہے وہ؟" جودت نے اس کے لفظوں پہ غور کیا تھا اور بڑی تیزی سے استفسار کیا تھا۔
"میرا مطلب ہے کہ وہ تو مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میرے لیے تو وہ اتنا ہی اجنبی تھا جتنے کہ تم۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے میری عزت کو عزت سمجھا تھا اور میری ہیلپ کی تھی اسی لیے وہ میرے لیے اہم تھا' لیکن میرے نزدیک جو بھی تھا بہت اچھا انسان تھا وہ۔" مریم نے بڑے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس کی تعریف کی تھی جبکہ جودت تپ اٹھا تھا۔
"جتنا اچھا انسان ہے وہ' یہ ہم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ بس تم اتنا بتاؤ کہ تم اسے کتنا جانتی ہو؟" جودت نے پھر اس کا جاننے پہ زور دیا تھا اور مریم تھی کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔
"میں کب جانتی ہوں سے۔۔۔؟ مجھے کیا پتا کہ وہ کون تھا اور کون نہیں۔۔۔؟ اس نے تو مجھے میرے گھر کے قریب ڈراپ کیا اور چلا گیا۔۔۔ نہ اس نے میرا نام پوچھا۔۔۔ نہ میں نے اس کا نام پوچھا بس اتنا جانتی ہوں اس کو' اب مجھے کیا پتا اس کا نام منصور حسین ہے یا کچھ اور۔" وہ خاصے خفگی بھرے انداز میں بولی تھی اور جودت چند ثانیے کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔
"دیکھو۔۔۔! وہ ہمارا بہت بڑا دشمن ہے۔۔۔ ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے اس نے۔۔۔ اس کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے میرے لیے۔۔۔ پلیز ہیلپ کرو میری۔۔۔" جودت نے زچ ہو کر التجا کی تھی مگر مریم دل آور شاہ کو چھوڑ کر اس کی ہیلپ کیسے کر سکتی تھی بھلا۔۔۔؟ اس کی نظر میں جو دل آور شاہ کا مقام تھا وہ جودت آفندی کا کبھی مر کے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

"اگر وہ اتنا ہی برا دشمن ہے تمہارا۔۔۔ تو تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟" مریم نے نقطہ اٹھایا تھا۔
"کیسا دھوکا۔۔۔؟" مریم اس سے اصل مسئلہ اگلوانا چاہتی تھی۔
"یہی تو مسئلہ ہے کہ بتا نہیں سکتا۔۔۔ اس نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ ہم اپنے آپ سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہے۔" جودت کچھ بھی بتانہ چلنے پہ خفگی اور جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔
"علیزے کون ہے؟" اچانک مریم کے ذہن میں علیزے کا نام گونجا تھا اس نے بے ساختہ پوچھ بھی لیا تھا' لیکن جودت اس کے سوال پہ ٹھٹک گیا تھا۔
"علیزے؟ تت۔۔۔ تم علیزے کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟"
"میں علیزے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اس روز تم نے ہی اس آدمی سے علیزے کے بارے میں پوچھا تھا تبھی مجھے خیال آیا کہ علیزے کون ہے۔۔۔؟ جس کا تم پوچھ رہے تھے۔۔۔؟" مریم نے اسے وضاحت دی تھی اور وہ پھر سے کچھ دھیما پڑ گیا تھا۔
"نہیں! کوئی نہیں چلو میں تمہیں ڈراپ کردوں۔" وہ عجیب الجھے ہوئے اور بے چین سے انداز میں کہتا کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے لہجے اور اس کے انداز سے جھلکتی کچھ دیر پہلے والی شوخی و شرارت کہیں غائب ہو چکی تھی' وہ واقعی اس معاملے کو لے کر بہت سیریس نظر آرہا تھا جس پہ مریم حیران ہوتی ہوئی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے گاڑی تک چلی آئی تھی۔۔۔
"کہاں ڈراپ کروں؟ گھر یا اکیڈمی" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
"اکیڈمی۔۔۔!" اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔
اور جودت نے اپنے وعدے کے مطابق گاڑی کا رخ اکیڈمی کی طرف موڑ دیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼
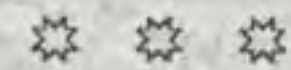
وہ خود گاڑی سے اترنے کے بعد اس کی سائیڈ پہ آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ اور علیزے بمشکل اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور اس نے گاڑی کا ڈور بند کر دیا تھا۔
علیزے نے بڑی عجیب اور کھوئی کھوئی نظروں سے شاپنگ مال کی بلند و بالا عمارت کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر چند سیکنڈز دیکھنے کے بعد نظروں کا زاویہ اپنے آس پاس کی طرف موڑ دیا پارکنگ لاٹ میں بہت گہما گہمی تھی' بہت رش تھا' نئی سے نئی گاڑیاں تھیں' نئے سے نئے لوگ تھے۔ اور ان لوگوں کے ہنستے مسکراتے تازہ دم چہرے تھے جو علیزے کی نظروں کو بہت بھلے لگ رہے تھے' وہ ان چہروں کو' ان لوگوں کو' ان گاڑیوں کو اور اس آزاد اور کھلے ماحول کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی' اس کا دل چاہ رہا تھا یہ گہما گہمی اور رش یونہی رفتہ رفتہ بڑھتا رہے اور وہ یونہی حسرت سے کھڑی دیکھتی رہے کیونکہ اس کے لیے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا ایک خواب بن گیا تھا۔ اور آج جبکہ وہ یہ خواب واقعی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی تو اسے اپنی آنکھوں پہ ہی یقین نہیں آرہا تھا۔
"چلو!" دل آور نے چند سیکنڈ اس کے چلنے کا انتظار کیا تھا مگر جب وہ ایک ہی جگہ پہ کھڑی رہی تو اسے مجبوراً اس کو مخاطب کرنا پڑا اور وہ چونک کر متوجہ ہوئی اس کو اپنے انتظار میں کھڑے دیکھ کر آہستگی سے سر جھکاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔
وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاپنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتیک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاپنگ کا آغاز ہی ڈریسز وغیرہ سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

مگر علیزے کے لیے یہ کام بہت ہی مشکل تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا لے۔۔۔؟ دل آور کی موجودگی میں اسے اپنا آپ بے بس لگ رہا تھا۔ وہ اسے تذبذب کا شکار دیکھ کر اس کی پرابلم سمجھ گیا' اس لیے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔
"دیکھو! تمہیں کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ تم اپنی پسند اور مرضی سے جو بھی چاہو خرید سکتی ہو' تمہارا کام ہے چیز پسند کرنا اور میرا کام ہے چیز کی قیمت ادا کرنا۔۔۔ آگے پیچھے کی سوچیں تم مت سوچو' بس اپنی چیزوں کی طرف دھیان دو۔" دل آور نے اسے پیسوں کی طرف سے بے فکر رہنے کے لیے تسلی دی تھی۔ "مم۔۔۔ مگر مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا نہیں؟ میں نے اکیلے تو کبھی کچھ بھی نہیں لیا۔ پہلے تو مما' یا پھر رجو ہیلپ کر دیتی تھیں۔" علیزے نے خاصی بے چارگی سے کہا اور دل آور کو اس کی یہ پرابلم بھی حل کرنی پڑی تھی۔
"ہوں! ڈونٹ وری یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ ذرا توقف سے کہتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور پھر پندرہ سوٹ اس نے مختلف بوتیکس سے علیزے کے ساتھ مل کر خریدے اور پسند کیے تھے' جن کے ساتھ میچنگ لیدر بیگز اور میچنگ سینڈلز اور شوز بھی تھے اس لیے اب کپڑوں اور جوتوں کے بعد باقی دیگر چیزیں رہ گئی تھیں۔
"اور کیا کیا لینا ہے؟ ساتھ ساتھ بتاتی جاؤ۔" وہ ایک لیڈی کاسمیٹکس شاپ کے سامنے رک گیا اور علیزے ٹھٹک گئی اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے کیا کیا لینا ہے۔ اس لیے چپ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔
"میں نے کچھ کہا ہے شاید؟ دل آور نے پھر اسے متوجہ کیا تھا۔
"ہوں۔۔۔ ہاں وہ انفیکٹ اپنے لیے کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ بھی لینے کا مجھے ذرا بھی سینس نہیں ہے' میرے لیے تو ساری چیزیں رجو ہی پسند کر کے لے کر جاتی تھی۔ اس لیے مجھے نہیں پتا کہ کیا کیا لینا ہے۔"
علیزے نے جواب گول مول کر دیا تھا' مگر وہ جو آج گھر سے سب کچھ لے کر آنے کا ارادہ کر کے نکلا تھا وہ کوئی بھی چیز مس کر کے جانے والا نہیں تھا اس لیے علیزے کے معذوری ظاہر کرنے کے باوجود اس لیڈیز کاسمیٹکس شاپ میں داخل ہو گیا تھا اور مجبوراً علیزے کو بھی اس کے پیچھے اندر آنا پڑا اور جیسے جیسے وہ اس کے لیے میک اپ اور دیگر ضرورت کی اشیا نکلواتا جا رہا تھا علیزے کھڑے کھڑے پانی ہوتی جا رہی تھی' اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ پھوٹ آیا تھا اور سیلز گرلز علیزے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
"سر! کیا یہ آپ کی وائف ہیں؟" جیسے ہی دل آور نے کاسمیٹکس سے بھرے ہوئے دونوں بیگ اٹھائے تھے تو ایک سیلز گرل پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔
"کیا آپ کو میری یہ شاپنگ دیکھ کر نہیں لگ رہا کہ یہ میری وائف ہیں؟" اس نے شاپنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"ہوں! لگ تو یہی رہا ہے سر اس لیے تو پوچھا ہے۔" وہ سیلز گرل مسکرائی تھی۔
"تو پھر ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ یہ میری وائف ہیں۔" دل آور نے لاپروا اور سرسری سے انداز میں بتایا تھا۔
"پھر تو واقعی بہت خوش قسمت ہیں یہ۔ ایسا کیئرنگ ہزبینڈ کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔"
اس سیلز گرل نے خاصے رشک آمیز لہجے میں کہا تھا اور اس کی بات پہ جہاں دل آور کے قدم رکے تھے وہیں علیزے کے دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی اور پھر دل آور کی سمت دیکھے بغیر اس شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔
"تھینک یو!" دل آور بے حد آہستگی سے کہتا ہوا پلٹ کر شاپرز اٹھا کر اس کے پیچھے ہی نکل آیا تھا' علیزے کا رخ باہر کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اب مزید ٹھہرنا نہیں چاہتی اس لیے دل آور بھی سر جھٹک کر لب بھینچتا ہوا اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر گیا اور دونوں کے قدم گاڑی کے قریب آ کر ہی تھمے۔ لیکن دونوں کے درمیان

بات پھر بھی نہیں ہوئی تھی اور واپسی کا سفر ہنوز خاموشی میں ہی گزر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
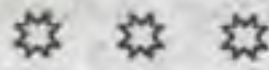
زری! جاگ رہی ہو؟" نگارش اس کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دیتی ہوئی اندر آگئی۔ جبکہ زری کی طرف سے کوئی بھی جواب موصول نہیں ہوا تھا' وہ بستر پہ جس کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے وجود میں ذرا بھی حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے نگارش دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب بیڈ پہ ہی آبیٹھی۔

"زری!" نگارش کو پتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے اور جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہی۔

"زری! میں جانتی ہوں کہ تم جاگ رہی ہو لیکن پھر بھی جواب نہیں دے رہیں لیکن اس طرح چپ رہنے سے کیا ہوگا۔؟ ادھر میری طرف دیکھو تو سہی جواب تو دو۔" نگارش نے زری کو کندھے سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑنا چاہا تھا لیکن زری کو ہاتھ لگاتے ہی وہ پریشان ہوگئی۔

اسے بہت تیز بخار تھا اور نگارش کو خبر ہی نہیں تھی۔

"زری! تمہیں اتنا تیز بخار ہے اور تم نے بتایا ہی نہیں؟" نگارش پریشانی اور تشویش نے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھنے لگی۔

"کوئی بخار نہیں ہے مجھے۔ ٹھیک ہوں میں۔" زری نے سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

"مگر زری! یہ کیا پاگل پن ہے؟ اپنے آپ سے کیا دشمنی ہے بھلا؟ خود کو کیوں سزا دے رہی ہو؟" نگارش نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور خاصی خفگی کا اظہار کیا۔

"اپنے آپ سے ہی تو دشمنی ہے اور اب اپنے آپ کو ہی تو سزا دینی ہے۔ زری کو مار ڈالنا ہے جیتے جی یار ڈالنا ہے۔ اب زندگی جینے کا کوئی سبب بھی تو نہیں ہے نا؟" زری تکیے کے سہارے اٹھ کر ذرا سی نیم دراز ہوگئی تھی اور اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئی اپنی ڈبڈباتی آنکھوں کے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

"زری! یہ کیسی باتیں کررہی ہو تم؟ زندگی جینے کا یہ کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے نا؟ بچھڑنے والوں کے ساتھ دنیا بچھڑ نہیں جاتی اور مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ ملتا وہی کچھ ہے' جو انسان کے نصیب میں ہوتا ہے۔ تمہیں جو نہیں مل رہا اس پہ صبر کو لو کہ وہ تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جاؤ گی۔ تمہیں اپنے نصیب پہ صبر آجائے گا بس ایک بار اپنے آپ کو تسلی تو دو اپنے دل کو سمجھاؤ تو سہی"

نگارش نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے سمجھانے کی ہی کوشش کی تھی مگر اب وہ سمجھنے والی اسٹیج پہ نہیں تھی۔ اب اس کا دکھ تسلی' دلاسوں بھری حدود سے نکل چکا تھا۔ اب اس کے دکھ کے دامن میں محض بے صبری تھی' آنسو تھے' اور آہیں تھیں۔

اب تو اسے تسلی بھی ایسے لگتی تھی جیسے گولی لگ گئی ہو۔ اور اسی لیے وہ نگارش کی تسلی پہ بلبلا اٹھی تھی۔ اسے بہت درد ہوا تھا۔

"کیسے سمجھاؤں بھابھی؟ کیسے سمجھاؤں؟ اور کب تک تسلیاں دوں اپنے آپ کو؟ کب تک بہلاؤں اپنے دل کو؟ نہیں بھابھی نہیں اب نہیں بہلایا جاتا مجھ سے۔ اور۔ اور اب صبر بھی نہیں ہوتا۔ اب کی بار کوئی تک نہیں ٹوٹا کوئی دل نہیں ٹوٹا اب کی بار میں خود ٹوٹ گئی ہوں' بکھر گئی ہوں۔ میرا صبر اور میرا ضبط سب کچھ بکھر گیا ہے بھابھی۔ میرے بس میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہو چکے ہیں' بالکل خالی۔" زری اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتی ہوئی تڑپ تڑپ کر رو پڑی تھی۔

"پلیز زری! بس کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اس طرح رونے سے تو تمہاری طبیعت مزید خراب

ہوگی، پلیز سنبھالو اپنے آپ کو۔۔۔ اس طرح پاگل بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" نگارش نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"بھابھی! جس شخص کی محبت کو آپ نے اپنے تن کا اوڑھنا بچھونا، اپنے من کا ہنسنا، رونا، اور اپنا دین و ایمان سمجھ لیا ہو، اپنی دنیا اس کی خاطر تیاگ دی ہو، اپنا دل اس کے قدموں کی خاک پہ بھی وار دیا ہو۔ اور وہی شخص ایک روز اگر آپ سے یہ کہہ دے کہ میں مر گیا ہوں، بھول جاؤ مجھ کو، میں تمہارا تھا ہی نہیں، میں پرایا ہوں، راستہ چھوڑ دو میرا۔ تو پھر۔۔۔ تو پھر آپ انصاف کریں بھابھی۔ تو ایسے میں آپ پہ کیا گزرے گی؟ کیسے تڑپیں گی آپ؟ اور کیسے روئیں گی آپ؟ کیا سمجھ جائیں گی؟ یا صبر آجائے گا کیسے ہو گا یہ سب؟ بتائیں مجھے؟

زری نے نگارش کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے متواتر رو رہی تھی مگر نگارش کے پاس اس کے زخمی سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا وہ بے چاری خود بے بس ہو چکی تھی۔

"بھابھی! بولیے نا؟ آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ یا پھر اس کی طرح آپ کے پاس بھی میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے؟ اس نے نگارش کے ہاتھوں کو ایک بار پھر اپنے گرم ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر متوجہ کیا تھا۔

"دیکھو زری! تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ تم فی الحال آرام کرو۔ میں تمہارے لیے چائے اور ٹیبلٹ لے کر آتی ہوں۔ اس ٹاپک پہ پھر بات ہو گی۔" نگارش نرمی سے کہتی اس کے ہاتھوں کو تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ "نہیں! مجھے کچھ مت دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اور نہ ہی مجھے کچھ لینا ہے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ ٹیبلٹ نہ لینے سے مر نہیں جاؤں گی۔ زندہ رہوں گی، دیکھ لیجیے گا مرنے والی نہیں ہوں میں۔"

زری نے نفی میں ہلاتے ہوئے چائے اور ٹیبلٹ سے انکار کر دیا تھا۔

"زری! تم خود سوچو، اگر عبداللہ کو تمہاری اس حالت کا پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ کیا خیال کریں گے وہ؟ اس لیے پلیز جو بات، جو مسئلہ پردے میں ہے اسے پردے میں ہی رہنے دو۔ ورنہ بہت شاک لگے گا ان کو۔ کیونکہ ایسا کوئی مسئلہ تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہو گا؟"

نگارش اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ سمجھتی بھی تو تب نا؟

"بھابھی! مرنے والا کبھی یہ نہیں سوچتا کہ میرے مرنے کے بعد کون کیا سوچے گا؟ اور کون کیا خیال کرے گا؟ وہ اس وقت بس یہ ہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ مر رہا ہے، وہ مٹ رہا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہا ہے۔ اور اس ختم ہونے کا غم اسے کچھ بھی سوچنے نہیں دیتا۔ اس لیے مجھے بھی اس وقت یہی سوچ کھائے جا رہی ہے کہ میں اندر ہی اندر مر رہی ہوں مٹ رہی ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو رہی ہوں اور میرے ساتھ ساتھ میرا دل بھی مر رہا ہے۔ اور اس دل میں پلنے والی محبت بھی مر رہی ہے۔ اس لیے مجھے۔۔۔ کچھ خبر نہیں کہ کون کیا سوچ رہا ہے؟ یا پھر کون کیا سوچے گا؟ بس آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ مجھے تنہا رہنے دیں پلیز!"

اس نے بے تحاشا روتے ہوئے نگارش کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور نگارش چند سیکنڈ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر باہر نکل گئی حالانکہ وہ زری کو بتانے آئی تھی کہ دل آور بھائی نے آج شام کو ان لوگوں کو اپنی طرف انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے کسی سے ملوانا ہے۔

"اب کس سے ملوانا ہے؟ وہ لوگ یہی سوچ سوچ کر تو حیران ہو رہے تھے۔

لیکن زری کی کنڈیشن دیکھ کر نگارش خاموشی سے چپ چاپ کچھ بھی کہے بغیر واپس چلی گئی اور زری اس کے جاتے ہی تکیے میں منہ چھپائے اور زیادہ تڑپ تڑپ کے روئی تھی۔

☆ ☆ ☆
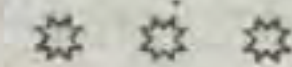
وقار آفندی کے بیڈ روم میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ تینوں نفوس اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے خیال

میں گم بیٹھے ہوئے تھے۔ اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی طرف سے کچھ کہنے کے منتظر تھے۔ مگر کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی کہتا بھی تو کیا کہتا؟

بس وال کلاک کی سوئیوں کی ٹک ٹک تھی جو متواتر سنائی دے رہی تھی اور اسی ٹک ٹک کے دوران ہی اچانک موبائل کی رنگ بج اٹھی تھی اور آذر نے بے ساختہ چونکتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور پھر یونہی ہاتھ بڑھا کے ٹیبل پہ رکھے موبائل پہ بجتی کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی اور ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے دوبارہ سر جھکا لیا۔ مگر اب کچھ کہنے کے ارادے سے سر جھکایا تھا اور تمہید باندھنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔

لیکن کبھی کبھی برے وقت میں اچھے دوستوں کی طرح الفاظ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، تب انسان کو اپنی مدد آپ کے تحت ہی سب کچھ خود سنبھالنا پڑتا ہے، سو اس وقت آذر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے بھی سب کچھ خود ہی سنبھالنا تھا۔

"ڈیڈ! ان فیکٹ میں آپ کو اپنی فیلنگز اور اپنے اموشنز بیان کر کے نہیں بتا سکتا اور نہ ہی آپ لوگوں میں سے کوئی اس چیز کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے پلیز میری آپ سے یہی ریکویسٹ ہے کہ آپ مجھے مجبور مت کریں۔ میں کومل سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے دل و دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ میں اس معاملے میں خود کو بہت بے بس پا رہا ہوں۔ پلیز آپ ممی بابا سے بھی کہہ دیں وہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔" بالآخر اس نے جو دل و دماغ میں تھا وہ کہہ ہی دیا۔

اور اس کی بات پہ وقار آفندی نے نظروں کا زاویہ بدل کر آسیہ آفندی کی سمت دیکھا تھا جیسے ان سے کچھ کہنے کی التجا کی ہو اور وہ آسیہ آفندی تھیں جو ان کی نظروں کے زاویے بھی سمجھتی تھیں۔

"لیکن بیٹا! تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ دینا اس مسئلے کا کوئی حل بھی تو نہیں ہے نا؟ کومل اس گھر کی بڑی بیٹی ہے۔ اچھی ہے۔ خوب صورت ہے اور سب سے بڑی بات کہ تمہاری ہم عمر بھی ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا؟ جودت اور زین وغیرہ تو ہیں ہی اس سے چھوٹے اور دانیال کے لیے تو تم پہلے ہی حرمت کا کہہ چکے ہو اس لیے تم خود سوچو پھر کومل کی نسبت کس سے ٹھہرائی جائے۔" آسیہ آفندی نے اسے ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

"ممی! یہ میرا مسئلہ نہیں ہے میرا مسئلہ اپنی ذات ہے، میں دوسروں کو دیکھوں یا اپنے آپ کو دیکھوں؟" آذر کا لہجہ بے بس سا ہو رہا تھا اور آسیہ آفندی کے ساتھ ساتھ وقار آفندی بھی اسے دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں بیٹا! اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مارنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنوں کی خاطر انسان کو اپنے آپ کی بھی قربانی دینی پڑ جاتی ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات وغیرہ کو دبا کر دوسروں کے جذبات اور احساسات کی قدر کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آپ کی بجائے دوسروں کو دیکھنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے انسان کے اندر حوصلہ، ظرف، صبر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ ہر کوئی ایسی قربانی نہیں دے سکتا اور مجھے پتا ہے کہ تمہارے اندر حوصلہ بھی ہے ظرف بھی ہے اور صبر بھی ہے تم اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مار سکتے ہو تم یہ قربانی دے سکتے ہو ورنہ یہ گھر جو پہلے ہی اتنا بکھر چکا ہے تمہارے اس انکار سے مزید تنکا تنکا ہو جائے گا اور بڑی حویلی کی تباہی پورا شہر دیکھے گا۔"

آسیہ آفندی اس کو ہر ممکن طریقے سے سمجھانا چاہتی تھیں اور آذر کے دل پہ اک سایہ سا لہرا گیا تھا۔ (اور آذر آفندی کے دل کی تباہی کون دیکھے گا؟) آذر دکھ کی شدت سے محض سوچ کے رہ گیا تھا۔

"ممی! مجھے کچھ وقت چاہیے، میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے خاصے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

"کیا کچھ وقت کے بعد تمہاری فیلنگز اور تمہارے اموشنز بدل جائیں گے؟ یا پھر یا پھر تم بدل جاؤ گے؟" آسیہ

آفندی آج یہ مسئلہ حل کر کے ہی اٹھنا چاہتی تھیں اسی لیے آذر کو دیکھتے ہوئے ذرا توقف سے پھر گویا ہوئی تھیں۔
"دیکھو بیٹا! یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ کچھ وقت کے بعد بھی نہ تمہاری فیلنگز اور ایموشنز بدلیں گے اور نہ ہی تم بدلو گے اور جب سب کچھ وہی رہنا ہے تو پھر کچھ وقت کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے فیصلہ ہی کرنا ہے نا؟ کل بھی اور آج بھی تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ فیصلہ تم آج ہی کر لو؟" انہوں نے ڈائریکٹ آذر کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا اور آذر نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے سر اٹھا کر آسیہ آفندی اور وقار آفندی کی طرف دیکھا تھا۔
"آپ کیا چاہتی ہیں آنی؟ کہ میں یہ شادی کر لوں؟" اس نے جیسے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔
اور اس کے سوال پہ آسیہ آفندی نے وقار آفندی کو دیکھا تھا جن کے چہرے پہ اقرار نظر آ رہا تھا۔
"ہوں! تو پھر ٹھیک ہے یہ فیصلہ میں آپ لوگوں پر چھوڑتا ہوں میرے لیے ممی پاپا سے بڑھ کر آپ اور ڈیڈ ہیں آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہو گا اگر میری ذات کی تباہی سے بڑی حویلی تباہی سے بچ سکتی ہے تو آپ لوگ بچا لیں میں قربانی کے لیے حاضر ہوں۔" آذر یکدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان دونوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتا ہوا پلٹ کر بیڈ روم سے نکل گیا تھا۔
"آذر!" آسیہ آفندی نے بے ساختہ پکارا مگر وہ اب ٹھہر نہیں سکتا تھا اور وہ وقار آفندی کی طرف دیکھ کے رہ گئی تھیں جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں کیونکہ آذر کو انہوں نے اپنے سگے بیٹوں سے بھی بڑھ کے چاہا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت پہ بھی خاص توجہ دی تھی۔
اس لیے آذر کی شخصیت اور ذہانت کا سہرا وقار آفندی کے سر ہی جاتا تھا اور آذر کی بھی سب سے زیادہ انڈرسٹینڈنگ ان ہی کے ساتھ تھی اسی لیے آذر کے انکار پہ اسرار آفندی اور ثروت بیگم نے یہ مسئلہ ان ہی کے سامنے رکھا تھا اور مجبوراً وقار آفندی اور آسیہ آفندی کو اسے بلا کر سمجھانا پڑا تھا حالانکہ اس کے جذبات سے وہ دونوں بھی بہت اچھی طرح واقف تھے، لیکن وہ بھی کیا کر سکتے تھے بھلا۔
انہوں نے بھی سارے حالات مدنظر رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی، جس کے نتیجے میں یہ ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ ان پہ چھوڑ گیا تھا اور انہوں نے اللہ کا نام لے کر یہ فیصلہ کومل کے حق میں سنا دیا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ بڑی حویلی کے تمام افراد ہی بہت خوش ہوئے تھے اک سوائے آذر آفندی کے۔

☼ ☼ ☼
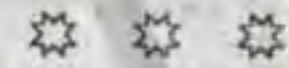
شام کے قریب زری کا بخار قدرے کم ہو چکا تھا۔ اسی لیے نگارش اسے باہر لان میں بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس ہی چلی آئی تھی۔
"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" نگارش نے قریب آ کر باقاعدہ اس کی پیشانی اور کلائی کو چھو کر دیکھا تھا اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں اب ذرا ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اس لیے وہ تھوڑی ریلیکس ہو گئی تھی۔
"کچھ کھاؤ گی؟ لے کر آؤں تمہارے لیے" نگارش کو پتا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔
"نہیں! ضرورت نہیں ہے۔" زری کا جواب تلخ سا محسوس ہو رہا تھا نگارش اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔
"تمہارے ساتھ چلو گی اس کے گھر؟"
"کس کے گھر؟" نگارش کے عجیب سے لب و لہجہ پہ زری نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔
"تمہارے وکیل صاحب کے گھر۔"

"کیوں؟ اس وقت کیوں؟" اسے حیرانی ہوئی تھی۔
"یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اس وقت کیوں جانا ہے؟ بس اتنا پتا ہے کہ اس نے صبح فون کر کے ہمیں اور نبیل بھائی کی فیملی کو انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں کسی سے ملوانا ہے اب "وہ کسی" ــــ کون ہے؟ یہ ہم میں سے کسی کو بھی خبر نہیں ہے؟" سبھی اپنے اپنے ذہن میں ایک ایک سوالیہ نشان لیے گھوم رہے تھے۔
"بہرحال جو بھی ہے، جانا تو ہے ہی۔ اس لیے میں ذرا فریش ہونے کے لیے جا رہی تھی مگر سوچ رہی ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو آخر تم بھی تو دیکھو کہ وہ کس سے ملوانا چاہ رہا ہے؟"
نگارش نے بات کرتے کرتے زری کو بھی چلنے کا اشارہ کیا تھا حالانکہ زری اس کی بات سن کر الجھ سی گئی تھی اور باقی سب کی طرح اسے بھی حیرانی ہوئی تھی کہ وہ آخر کس سے ملوانا چاہ رہا ہے اور ایسا کون سا رشتہ ہے اس کا جس کو وہ لوگ نہیں جانتے۔
"کیا خیال ہے تمہارا چلو گی ہمارے ساتھ؟" نگارش نے الجھی ہوئی زری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
"نہیں! میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ آپ لوگ چلے جائیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔
"تو کیا تم اب کبھی بھی اس کے گھر نہیں جاؤ گی؟ اور اگر نہیں جاؤ گی تو باقی سب کو کیا جواب دو گی کہ تم اس کے گھر کیوں نہیں جاتیں مدیحہ جاتی ہے، میں جاتی ہوں، نبیل بھائی اور عبداللہ جاتے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں جاتیں؟ کیا وجہ بتاؤ گی سب کو؟" نگارش نے ذرا خفگی سے پوچھا تھا اور زری چپ ہو گئی تھی۔
"لیکن! بلایا تو اس نے آپ لوگوں کو ہے نا تو آپ لوگ جائیں میرا جانا ضروری تو نہیں ہے۔" اس نے پھر ذرا توقف سے جواب دیا تھا۔
"اس نے تمہیں بھی بلایا ہے۔" اس کے جواب پہ نگارش جھنجلا کر بولی تھی۔
"مجھے بھی؟" اب کی بار وہ ٹھٹکی تھی۔
"ہاں! تمہیں بھی کیونکہ اس نے عبداللہ سے کہا ہے کہ بھابھی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آ جانا اس لیے اب اس کی اس بات کا مطلب تم خود ہی سمجھ سکتی ہو کہ بھابھی تو چلو میں ہو گئی تو پھر بھابھی کے ساتھ یہ "وغیرہ" کون ہے؟ ورنہ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ بھابھی کو لے کر وقت پہ آ جانا" نگارش نے دل آور کی بات کا مفہوم اخذ کیا تھا اور زری کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔
"تو کیا اب میں اس کی باتوں سے اس کے لفظوں کے مطلب ڈھونڈ کر اس کے گھر جاؤں گی؟" زری کا لہجہ بھرا گیا تھا۔
"ہاں! یہ تو ہے آخر وہ وکیل صاحب ہیں تمہارے۔ صاف بات کہنے کا تو پیشہ ہی نہیں ہے ان کا۔" نگارش ذرا غصہ کھائے ہوئے تھی اور زری پھر سے بپھر گئی۔
"نہیں ہیں وہ میرے وکیل صاحب ــــ وہ وقت اور تھا جب مجھے اس کو اس کے نام سے بلاتے ہوئے شرم آتی تھی میں جھجکتی تھی اسے دل آور یا پھر شاہ کہتے ہوئے۔ اس لیے اسے اس کے پیشے کے حوالے سے بلاتی تھی مگر اب ــــ اب وہ مر چکا ہے تو زندہ میں بھی نہیں ہوں اب وہ بھی میرے لیے کچھ اور نہیں صرف دل آور شاہ ہے جیسے سب کے لیے ہے، ویسے ہی میرے لیے بھی ہے۔ وہ جو اک "خاص" بات تھی وہ ختم ہو چکی ہے اب یہاں کچھ بھی نہیں رہا۔"
زری بپھرے ہوئے لہجے میں کہہ کر رو پڑی تھی اور نگارش عبداللہ کی گاڑی گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

کیونکہ عبداللہ نے اسے گھر آنے سے پہلے کال بھی کی تھی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے تیار ہو جائیں لیکن وہ تیار ہونے کی بجائے یہاں زری کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اس لیے اسے اندازا تھا کہ اب عبداللہ غصہ ضرور کرے گا کیونکہ ٹائم کافی زیادہ ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے؟ تم لوگ ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو؟ تیار نہیں ہوئیں؟" عبداللہ کو اُلجھن ہوئی تھی۔

"وہ بس میں تیار ہونے کے لیے جا ہی رہی تھی کہ زری کو دیکھ کر رک گئی تھی' زری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کہتی ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں میں نہیں جا رہی۔" نگارش نے زری کے سنبھلنے تک بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

"ارے کیوں؟ کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔" عبداللہ خاصی فکرمندی سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"ہاں! صبح بہت تیز بخار تھا اسے لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ پہلے سے بہتر ہے۔" نگارش نے اسے تسلی دی تھی۔

"لیکن پھر بھی ایک بار ڈاکٹر کو تو دکھا لینا چاہیے تھا۔ اٹھو زری ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں بعد میں کہیں اور چلیں گے۔" عبداللہ نے اسے فوراً" اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نن... نہیں بھائی! اس کی ضرورت نہیں ہے' میں اب کافی ٹھیک ہوں۔" زری نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"کیا واقعی سچ کہہ رہی ہو؟" عبداللہ نے پورا یقین چاہا تھا۔

"جی! سچ کہہ رہی ہوں۔" وہ اثبات میں بولی تھی۔

"ہوں! تو پھر جلدی سے اٹھو اور چینج کر کے آ جاؤ' ہمیں بس پانچ منٹ میں نکلنا ہے۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"مگر بھائی!" زری التجائیہ سے لہجے میں بڑبڑائی تھی۔

"اگر مگر کچھ نہیں! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے تمہیں گھر پہ اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو گی' بس بات ختم۔" عبداللہ نے جاتے جاتے پلٹ کر جواب دیا اور اندر چلا گیا تھا اور زری نگارش کو دیکھ کے رہ گئی تھی جو عبداللہ کے پیچھے ہی اندر کی سمت قدم بڑھا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

علیزے کی شاپنگ کا سارا سامان گل نے ہی شاپنگ بیگز سے نکال کر وارڈ روب' ڈریسنگ ٹیبل اور باتھ روم میں سیٹ کیا تھا اور یہ کام کرتے ہوئے گل بھی اندر سے بہت خوش تھی کہ چلو شکر ہے کہ علیزے بی بی کی زندگی بھی رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام پر سیٹ ہو رہی ہے' ورنہ وہ لوگ تو اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہتے تھے' لیکن اب انہیں بھی تسلی ہو گئی تھی کہ ان شاء اللہ اک دن علیزے بی بی بھی اپنے شایان شان زندگی بسر کرے گی اور گزشتہ تمام دکھ' تمام اذیتیں اور تمام تکلیفیں بھول جائے گی اور اللہ کی خاص رحمت ہو گی اس کی ذات پہ۔

کیونکہ اس کے صبر و برداشت کا پیمانہ بہت وسیع تھا۔ اور اک نہ اک دن اللہ انسان کو اس کے صبر و برداشت کا صلہ ضرور دیتا ہے سوائے بھی یہ صلہ ضرور ملے گا ان لوگوں کو پورا پورا یقین تھا۔

"گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کچھ دیر میں کپڑے چینج کر کے تیار ہو جائیں میرے کچھ مہمان آ رہے ہیں ان سے ملنے کے لیے۔" گل وارڈ روب بند کر کے پلٹ رہی تھی جب اندر داخل ہوتے ول آور کی آواز پہ ٹھٹک کر رک گئی تھی کیونکہ علیزے سامنے ہی تو بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی گل کو مخاطب کر کے پیغام دے رہا تھا اور گل کے لیے تو یہ بھی ایک حیرت کا مقام ہی تھا۔

"گل! اپنے صاحب جی سے کہو میں جانتی ہوں۔ اس لیے آپ فکر نہ کریں' میں کچھ دیر میں کپڑے چینج کر کے تیار ہو جاؤں گی۔" علیزے نے بھی جواباً" اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا اور گل ان کے سوال و جواب پہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔

"گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کہ میں نیچے انتظار کر رہا ہوں جب بلاؤں تو وہ نیچے آ جائیں۔" اس نے ایک اور پیغام دیا تھا۔

"گل! اپنے صاحب جی سے کہو آپ جب بھی بلائیں گے میں آ جاؤں گی۔" اس نے فوراً" پیغام کا جواب دیا تھا۔

"ہوں! شکریہ۔" وہ کہتے ہوئے لب بھینچ کر پلٹا اور بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور علیزے گہری سانس خارج کر کے رہ گئی تھی۔

"اب کیا کرنا ہے بی بی جی؟ مہمان تو بس آتے ہی ہوں گے۔" گل کو بھی پتا تھا کہ نبیل اور عبداللہ اپنی فیملی کے ساتھ آ رہے ہیں۔

"تم میرے لیے کپڑے نکال دو' میں شاور لے لوں۔" علیزے سنجیدگی سے کہتی بیڈ سے اٹھ گئی تھی اور گل اثبات میں سر ہلا کر وارڈ روب سے اس کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج کوئی ہنر' کوئی روش' کوئی طریقہ تو بتاؤ...
کہ دل ٹوٹے بھی نہ' وہ ملے بھی نہ اور چین آ جائے...

ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے آ کر اس کے گھر کے ڈرائیو وے پہ رکی تھی اور زری کے دل سے پھر ایک سایہ سا گزرا تھا کیونکہ وہ آج بھی ڈرائیو وے پہ ہمیں ان کی گاڑی کے سامنے کھڑا تھا اور عبداللہ گاڑی کا انجن بند کر کے گاڑی سے نیچے اتر آیا اور ان کے ہاتھ ملانے تک وہ دونوں بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

"السلام علیکم ول آور بھائی! کیسے ہیں آپ؟" نگارش بھی اس کے قریب آ کر ٹھہر گئی۔

"وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے' میں ٹھیک ہوں' آپ سنائیں آپ سب کیسے ہیں؟" اس نے بڑے تحمل اور سکون سے جواب دیا تھا' زری اسے اک نظر دیکھ کر رخ پھیر گئی تھی کیونکہ وہ اسے آج بھی پرایا ہی نظر آیا تھا اور اس سے پہلے کہ نگارش کچھ کہتی اچانک ہی دوبارہ گیٹ کھلا تھا اور نبیل کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

"لو جی! وہ لوگ بھی آ گئے۔" عبداللہ نبیل کی گاڑی دیکھ کر مسکرایا۔

"بڑے وقت پہ پہنچے ہو دونوں" ول آور کا دل اندر سے بے حد افسردہ سا ہو رہا تھا کیونکہ وہ آج اپنے جان سے عزیز اور شہ رگ سے بھی قریب تر دوستوں کو ایک ناقابل یقین دھچکا دینے جا رہا تھا' جس کا اسے بے پناہ افسوس تھا اور پھر اس افسوس کے باوجود اسے اپنے آپ کو کمپوز بھی کرنا پڑ رہا تھا اس لیے جس اذیت کا وہ شکار تھا وہ اسے اپنے چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا تھا اور یہ بھی اس کے لیے ایک اذیت ہی تھی۔

"کیا خیال ہے بھائی؟ ہم لوگ واپس چلیں؟ ول آور بھائی تو راستہ دینے والے نہیں لگ رہے؟" مدیحہ نے نبیل اور عبداللہ کو مخاطب کیا تھا اور ول آور بے ساختہ چونک گیا تھا۔

"ارے نہیں نہیں یار! آؤ آپ لوگ اندر آ جاؤ میں کافی دیر سے آپ لوگوں کا ہی تو انتظار کر رہا تھا۔" ول آور

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

فوراً" راستے سے ہٹ گیا تھا اور پھر وہ سب اس کے ساتھ چلتے اندر آگئے تھے۔

"ارے بیٹا! میں تو تمہارے اس طرح اچانک سب کو ایک ساتھ بلانے پہ پریشان ہی ہوگئی تھی صبح سے سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ تم نے کیوں بلایا ہے اور آخر کس سے ملوانا ہے؟ میں تو تم سے فون پہ ہی پوچھنے والی تھی لیکن نبیل نے ہی منع کردیا تھا۔" فائزہ بیگم نے آج پہلی بار کچھ بولنے میں پہل کی تھی اور دل آور نے بمشکل مسکرانے کی ناکام سی کوشش کی تھی ورنہ اس سے نہ تو مسکرایا جارہا تھا اور نہ ہی منہ سے کچھ کہا جارہا تھا مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا اب ان کو گھر بلا کر خود چپ ہو کر تو نہیں بیٹھنا تھا نا۔

"ہوں! ابھی آپ بیٹھیں کھانا کھائیں کچھ ریلیکس کریں پھر آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے آپ کو کس سے ملوانا ہے۔" دل آور نے بات کو غیر سنجیدگی سے لیا تھا۔

"لیکن بھائی! اس طرح تجسس کے مارے تو کھانا بھی نہیں کھایا جائے گا؟" مدحیہ ذرا سا جھنجلائی تھی۔

"لیکن! اس طرح تجسس ختم ہوجانے کے بعد بھی تم سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔" دل آور کو ان سب کے رد عمل کا پہلے سے ہی کافی اچھی طرح سے اندازا تھا۔

"ارے! ایسا کون سا تجسس ہے۔ جس کی دونوں صورتیں ہی خطرناک ہیں' جاننا بھی اور نہ جاننا بھی؟" مدحیہ جان بوجھ کر دل آور کا موڈ خوشگوار کرنے کے لیے حد سے زیادہ ایکسائٹڈ ہورہی تھی۔

"بس ہوتا ہے کبھی کبھی! ایسا بھی ہوتا ہے۔ اینی وے! آپ لوگ فی الحال کھانا کھالیں کھانا تیار ہے یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ زلفی! زلفی! گل سے کہو کھانا لگادے۔" دل آور مدحیہ سے کہتے ہوئے زلفی کو پکارنے لگا۔

"جی صاحب جی! ابھی کہہ دیتا ہوں۔" وہ سر ہلا کر فوراً" چلا گیا۔

اور پھر ٹھیک دس منٹ کے بعد گل نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا تھا اور وہ سب ڈائننگ روم میں آگئے تھے۔ سبھی ہلکی پھلکی باتوں کے دوران ٹھیک ٹھاک طریقے سے کھانا کھا رہے تھے لیکن ایک صرف وہ تھا یا زری تھی جس سے کھانے کا نوالہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا کہ اک بے ارادہ سی نظر اٹھی تھی اس کی طرف اور پھر وہی نظر اس کی مرجھائی ہوئی صورت دیکھ کر درد سے کراہ کے جھک گئی تھی۔

اور یہی حال زری کا بھی ہوا تھا اس کی نظر بھی بے اختیار اس پہ جا پڑی تھی اور اس کو یوں چپ چپ اور بوجھل سا دیکھ کر اس کی نظر بھی پانیوں سے دھندلا گئی تھی۔

"کیا بات ہے دل آور ے؟ تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟" نبیل نے اس کے سامنے کھانا جوں کا توں رکھے دیکھا تو اسے خاصی تشویش ہوئی تھی۔

"بس یار! ایسے ہی... دن میں کھانا کافی لیٹ کھایا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے۔" دل آور نے اسے ٹالنے کے لیے کہا اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیے تھے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" عبداللہ کو بھی فکر ہوئی تھی۔

"ہوں! بالکل ٹھیک ہے۔ بس تم لوگ کھانا کھاؤ پھر بات ہوتی ہے۔" اس نے انہیں ریلیکس کیا تھا اور کچھ دیر بعد

کھانے سے فارغ ہو کر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آبیٹھے تھے۔

"تمہاری کیسی طبیعت ہے بیٹا؟ بخار کم ہوا؟" فائزہ بیگم نے زری کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے اس کی کلائی کو چھو کر دیکھا تھا۔

"جی! پہلے سے بہتر ہوں میں تو گھر پہ ہی رہنا چاہ رہی تھی' لیکن بھائی اور بھابھی نے ہی نہیں رکنے دیا' بخار کی وجہ سے خاصی تھکن ہو رہی ہے۔" زری کی آواز اور لہجہ بھی خاصا نڈھال لگ رہا تھا دل آور اس کی بات سن کر رخ پھیر گیا تھا تاکہ نظر دوبارہ اسے دیکھنے کی غلطی نہ کرے!

"ہاں! تو اچھا کیا ہے نا انہوں نے' بخار کی حالت میں تمہیں گھر پہ کیسے چھوڑ آتے؟" فائزہ بیگم نے ان کی حمایت میں جواب دیا تھا۔ اور ذرا فاصلے پہ بیٹھے دل آور کو مزید شرمندگی ہوئی تھی۔

"ایم سوری! میری وجہ سے آپ سب کو زحمت اٹھانا پڑی ہے' لیکن مجبوری تھی آپ سب کو یہاں بلانا اور بتانا بھی ضروری تھا کیونکہ آپ لوگ میرے لیے پریشان تھے آپ کو فکر تھی کہ میں اکیلا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میری تنہائی اور میرا اکیلا پن شیئر کرنے کے لیے کوئی اور بھی ہے ایک ایسا رشتہ جو انسان کے ہر اچھے اور برے وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہے اور ساتھی کہلاتا ہے اس لیے اپنے اسی رشتے سے ملوانے کے لیے میں نے آپ سب کو یہاں بلایا ہے۔ امید ہے کہ اگر آپ لوگوں کو زیادہ اچھا نہ لگا تو زیادہ برا بھی نہیں لگے گا۔" دل آور کو زندگی میں پہلی بار کچھ کہتے ہوئے اتنی پریشانی اور پشیمانی کا سامنا ہو رہا تھا۔ ورنہ وہ بات کہتے ہوئے ڈرنے اور جھجکنے والا آدمی نہیں تھا اس کی تو ہر بات کھری اور دوٹوک ہوتی تھی۔

"دل آور ے! تم کیا کہہ رہے ہو ہمیں کچھ سمجھ نہیں آرہا؟" عبداللہ کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی الجھے ہوئے بیٹھے تھے۔

"ہوں! مجھے پتا ہے کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں سمجھو گے اور نہ ہی میں تم لوگوں کو سمجھا پاؤں گا' لیکن پھر بھی بتانا تو ہے ہی۔" اس نے کہتے ہوئے سب کو چائے سرو کرتی گل کی طرف دیکھا تھا۔

"جاؤ گل! علیزے بی بی کو اپنے ساتھ لے آؤ۔" اس نے علیزے کو سب کے سامنے لانے کا حکم دے ہی دیا تھا اور وہ سب حیران پریشان سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے؟ اور ہو کیا رہا ہے۔

"جی صاحب! ابھی لے آتی ہوں؟" گل ٹرے اک سائیڈ پہ رکھ کے پلٹ کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی اور پھر محض پانچ منٹ لگے تھے گل کی واپسی کو اور ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہونے کو! کیونکہ گل کے ساتھ علیزے بھی تھی جو ان سب کے سامنے سنگ مرمر کی مورت کی طرح آکھڑی ہوئی تھی۔

رفاقت جاوید

نذرِ عشقِ جاں

"السلام علیکم!" علیزے اندر سے بہت کنفیوژ بھی تھی مگر کیا کرتی زندگی کا یہ لمحہ بھی تو اک دن فیس کرنا ہی تھا سو اپنے اندر ہمت تو لائی ہی تھی اور وہ لے ہی آئی تھی۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے بمشکل اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور دل آور اپنے آپ کو کنٹرول کرتا ہوا صوفے سے اٹھا اور علیزے کے قریب اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔

"علیزے! ان سے ملو یہ میرے بہت ہی گہرے دوست نبیل حیات کی مدر ہیں۔ فائزہ آنٹی اور میرے لیے بھی بالکل میری ماں کی طرح ہیں اور فائزہ آنٹی! یہ ہے علیزے میری بیوی مسز دل آور شاہ۔"

اس نے علیزے کو فائزہ بیگم سے متعارف کرواتے ہوئے باقی تمام افراد پہ جیسے انتہائی تباہ کن بم پھوڑ دیا تھا اور بیٹھے بیٹھے ان سب کے دل و دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے اور آس پاس سب کچھ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"مسز دل آور شاہ؟" زری کے ہونٹ ذرا سا کپکپائے تھے اور پھر وہیں کے وہیں ساکت و صامت بھی ہو گئے تھے۔

"دل آور! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم ہوش میں تو ہو نا؟" عبداللہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں وہ آپ سب سن رہے ہیں یہ کوئی مذاق نہیں ہے یہ ایک سچ ہے ایک ٹھوس حقیقت ہے یہ میری بیوی ہے اور میں آپ سب کو اپنی بیوی سے ملوا رہا ہوں آج سے چار دن پہلے ہی ہمارا نکاح ہوا ہے اور یہ نکاح صرف نکاح ہی نہیں ہے اسے لوگ لو میرج بھی کہتے ہیں اس لیے مجھے یہ بتانے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ یہ میری اور علیزے کی لو میرج ہے اور اس لو میرج کو اپنے انجام تک پہنچانے میں اماں نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور یہ لو میرج ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی آخری سانسوں کے دوران اسپتال میں ہوئی ہے حالانکہ اماں میری شادی کہیں اور کرنا چاہتی تھیں انہوں نے کسی اور کو پسند کر رکھا تھا۔

مگر مجھے..... مجھے..... علیزے پسند تھی اس لیے اس وقت علیزے آپ سب کے سامنے علیزے دل آور شاہ کے روپ میں موجود ہے۔" دل آور نے اپنی طرف سے انہیں بہت سکون، ٹھہراؤ اور تفصیل سے جواب دیا تھا اور اس کے جواب پہ وہ سب اپنی جگہ سے کھڑے ہونے پہ مجبور ہو گئے تھے لیکن ان سب میں صرف زری تھی جس سے اپنے قدموں پہ کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا مگر اس کے ہونٹ ابھی تک ایک ہی لفظ پہ اٹکے ہوئے تھے۔

"مسز دل آور شاہ۔" اس کے منہ سے یہ نام، یہ حوالہ اک سسکی کی طرح برآمد ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا سے گئے تھے۔

"زری!" ان سب نے بے ساختہ چونک کر زری کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ عشق کا پیکر عرش سے فرش پہ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا تھا اور وہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

زری اچانک کھڑے قد سے تیورا کے گری تھی اور منہ کے بل گرنے کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لت پت سی ہو گئی تھی جس پہ ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کیونکہ سامنے کا منظر ناقابل یقین تھا۔

"زری!" عبداللہ تڑپ کے اس کی طرف لپکا تھا اور بڑی تیزی سے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر سیدھا کیا تھا اس کی پیشانی، ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جو عبداللہ کے ہاتھوں کو بھی رنگین کر گیا تھا۔

"زری!" عبداللہ نے اسے جھنجھوڑا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا ہو۔ اور دوسری طرف دل آور شاہ تھا جسے اپنی رگوں سے زندگی زری کے خون کی طرح بہتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جبکہ نبیل حیات عشق کے اس انکشاف پہ جہاں کا تہاں پتھر ہوا کھڑا تھا.....!!

(باقی آئندہ)

☼ ☼

مخلوق خدا سے بے لوث و والہانہ پیار اور جذبہ ایثار کا دوسرا نام ہے، میرے دل پر حکمرانی کرنے والی ڈاکٹر شہربانو تم کب سے غائب ہو؟ فلائنگ کے بعد میں تو گھوڑے بیچ کر سو گیا تھا۔ جو تمہارے اٹھنے کی مجھے خبر تک نہ ہوئی۔"

اسکواڈرن لیڈر سکندر نے اپنی بیگم شہربانو سے فون پر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"چور گھر بار لوٹ کر چلے جائیں لیکن آپ کو خبر نہ ہو گی۔ ماشاء اللہ کیا نیند پائی ہے؟ میں دو بجے سے ہسپتال میں ہوں جناب۔"

"نیند میری مجبوری ہے ورنہ تمہاری نسل کا ڈی ایم او مجھے فلائینگ سے روک لے گا۔ بس تم وقت پر پہنچ جانا آج تم خوب انجوائے کرو گی۔ میں تمہارا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا تو شہربانو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رہ گئی۔

"چودہ اگست کا فنکشن مل کر نہ گزارا تو زندگی کا مزا ہی کیا؟ تمہارا Aerobatics show نہ دیکھا تو سمجھو کہ دنیا میں کچھ نہ دیکھا۔" وہ محبت آگیں لہجے میں بولی۔

"اب سرتاج مجھے اجازت دیجیے۔ کیونکہ میں بہت بزی ہوں۔ اپنے ملک کی آبادی میں چار بچوں کو آزادی سونپ کر اضافہ کر رہی ہوں۔"

"لیڈی ڈاکٹر سے شادی کرنے کا تمام جذبہ شوق مدھم پڑ جاتا ہے۔ جب تم مجھ پر اپنے پروفیشن کو فوقیت دینے لگتی ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"سدباب کر لو۔" وہ قہقہہ لگا اٹھی۔ "آج ایسی محبت بھری باتیں چکر کیا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

"ٹولیٹ جان من، اب تم میرے خون میں شامل ہو چکی ہو۔ اگر ڈاکٹر ہونے کے ناتے کچھ کر سکتی ہو تو مجھ پر احسان عظیم کر ڈالو۔" وہ چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

تو شہربانو نے ہنستے ہوئے اللہ حافظ کہا اور ریسور کریڈل پر رکھ کر بڑبڑائی۔ "خدا خیر کرے۔" تین افسران کی بیگمات اور ایک ایئرمین کی بیگم اس وقت گائنی وارڈ میں ایڈمٹ تھیں اور ڈیوٹی پر ڈاکٹر شہربانو تھی۔ جسے ایمرجنسی میں رات کے دو بجے ہسپتال آنا پڑا تھا۔

جبکہ آج چودہ اگست یوم آزادی منانے کا پروگرام سکندر اور بچوں کے ساتھ تھا مگر وہ اپنی ڈیوٹی پر رتی بھر نالاں نہ تھی۔ حسب معمول باری تعالیٰ کی تخلیق میں اپنی شرکت پر شاداں فرحاں تھی۔

فون رکھ کر اس نے ایک راؤنڈ لیا اور واپس آ کر کرسی پر بیٹھ کر بیتے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ جب سکندر نے پراعتماد لہجے میں اس سے پسندیدگی کا مختصراً" اظہار کر کے ایسا تاثر دیا تھا کہ جیسے اسے پسند کرنا گویا احسان عظیم کرنے کے مترادف ہو۔ وہ یہ محسوس کر کے تڑپ اٹھی تھی کہ کس قسم کا بے حس اور بے پروا انسان ہے کہ عورت کی فیلنگز کی کوئی اہمیت ہے نہ وقعت۔

اس کے اس ٹھنڈے ٹھار رویے کی وجہ سے وہ اضطراری کیفیت میں مبتلا اپنی خالہ کے پاس چلی گئی۔ مشورہ لینا مقصود تھا کیونکہ اس کے خالو حال ہی میں پاکستان ایئر فورس سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ایل پی آر کا ایک سال ریزیڈنشل ایریا میں گزار رہے تھے۔ اس نے عالم تذبذب میں سکندر کا پرپوزل ان کے گوش گزار کر کے اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا تو وہ مسکرا دیں اور نہایت ملائمت سے تسلی بخش انداز میں بولیں۔

"بیٹا یہ دھرتی کے باشندے نہیں ہیں، یہ وہ مجاہد ہیں۔ جو ہواؤں کے دوش آکاش کی رفعتوں میں کمند ڈال کر خود کو اعلا و ارفع سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا فلائنگ ہے۔ کسی بیماری کی وجہ سے اگر انہیں وقتی طور پر گراؤنڈ کر دیا جائے تو یہ بجھ سے جاتے ہیں۔ ہر صبح فلائنگ سے پیشتر ان کا بلڈ پریشر، شوگر لیول یعنی ان کا ہر طرح کا چیک اپ ہوتا ہے۔ اگر کسی کی آنکھیں شب بے داری کی چغلی کھا رہی ہوں یا چہرے پر ذہنی ردوکد کی ہلکی سی رمق بھی ہو تو سائیکاٹرسٹ

سے فلائنگ کی اجازت نہیں ملتی تو برہمی اور عجلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ فلائنگ سے محبت و عشق ہی انہیں اس پروفیشن میں لاتا ہے اور پھر جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر ان کا عشق جنون اور دیوانگی تک جا پہنچتا ہے۔

پھر دل میں کسی قسم کا ڈر نہ نائیٹ فلائنگ میں چودھویں کے چاند کی ملگجی خاموش اور پرسکون روشنی میں کسی قسم کا خوف خطر رہتا ہے۔ بیٹا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ شوہر تو وہ ذات ہے کہ اگر مٹی کے ایک ذرے کو بھی اس نام سے پکارا جائے تو وہ بھی پہاڑ بن کر مدمقابل کھڑا ہو جائے گا۔ یہ تو پائیلٹ کی بات ہو رہی ہے۔"

خالہ اسے نہایت پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس وقت وہ انہیں بہت معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ ڈاکٹر کہیں سے معلوم نہ ہو رہی تھی۔

"خالہ اس کا مطلب ہے انکار! اس قدر خود پرست، خود پسند اور خود غرض انسان کی بیوی بننے سے کنواری رہنا بہتر ہے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"خالہ جانی، ڈاکٹر لڑکی کی شادی ڈاکٹر سے ہی مناسب رہتی ہے۔ یہ رشتہ خصلتوں کے علاوہ بھی بے جوڑ ہے۔ انڈر اسٹینڈنگ کا مسئلہ رہے گا عمر بھر۔"

"بیٹا ایک پائیلٹ کو ریجیکٹ کر رہی ہو۔ یقین جانو یہ دل کے برے نہیں ہوتے۔ تمہارے خالو کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ بے پناہ خوبیاں ہیں ان میں۔" وہ عقیدت مندانہ انداز میں بولیں۔

"آئیڈیل ہے میری زندگی۔"

"خالہ آپ بھول گئیں شاید، خود ہی تو کہا کرتی تھیں انہیں کسی کا پابند ہو کر رہنا قطعاً" پسند نہیں۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے عمل کو سراہتے ہوئے بڑے سے بڑا فیصلہ فوری حتمی اور آخری ہوتا تھا ان کا جلد بازی کی وجہ سے آپ ہر وقت ان سے نالاں رہتی تھیں۔" وہ یاددہانی کرانے لگی۔

"تو بیٹا ان خوبیوں کی وجہ سے تو ہم زندگی میں بہت کامیاب رہے۔" وہ پرستائش لہجے میں بولیں۔

"اب یہ پروفیشن اور اپنی ملک سے پیار ہی تو ہے کہ ان کی پہلی بیوی فلائنگ تھی۔ جس سے بے پناہ لگاؤ اور عقیدت تھی۔ دوسری بیوی تمہاری یہ خالہ ہے جس سے بے تحاشا محبت ہے۔ اب وہ زبان سے اعتراف نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ تو نہ ہوا کہ ان کے دل میں میں بستی نہیں۔ بیٹا جی! یہ اسپیشل بریڈ ہے۔ ان کا مذاق، طنز و مزاح اور ان کی باتیں اور شرارتیں بھی اسپیشل ہی ہیں۔"

"خالہ ایسے گیان ہو رہا ہے جیسے پائیلٹ نہ ہوا پارس کا پتھر ہو گیا قیمتی اور انمول۔" وہ مذاقاً" بولی۔

"پتھر چاہے کتنا ہی نایاب اور مہنگا ہو۔ محسوس کرو تو سنگینی کا احساس ہوتا ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گی۔ تجربہ کر دیکھو۔ دل پھینک ایسے کہ اگلے لمحے شادی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اسے نبھاتے ہیں۔

بیٹا جی ایک فائٹر پائیلٹ کو ایک جگہ پر ساکت و جامد ہونا اور پیچھے مڑ کر ماضی میں گم ہو جانا نہیں آتا۔ ان کے قدموں نے آگے سے آگے بڑھنا سیکھا ہے۔ اسی جبلت کے مابین ہماری آزادی قائم ہے بیٹا۔ یہ خامیاں ہرگز نہیں۔"

"ناٹ اگریڈ خالہ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"بیٹا اپنی حسن عملی، بلند کرداری، بہادری اور جرأت کے سنگ یہ لوگ اپنی جان ہتھیلی پر رکھے اپنے ملک کے ہر ذرے کی سلامتی پر قربان ہونے کے تمنائی و شیدائی نہ ہوں تو یہ خوش نصیب فائٹر پائیلٹ نہ کہلائیں۔ قسم سے ڈرائیور کہلائیں۔ یہ تو وہ قوم ہے جان جنہیں اپنی آسائشات کی پروا رہتی ہے نہ ہی دنیاداری کے اصولوں پر یقین رہتا ہے۔ اپنے ہی فسوں میں مقید یہ لوگ سچی کھری اور خوش و خرم زندگی گزارنے کو اولیت دیتے ہیں۔" وہ عینک صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"کسی سے سروکار رکھتے ہیں نہ ہی دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کرتے ہیں۔"

"خالہ آپ یوں کیوں نہیں کہتیں کہ بے حس

ہوتے ہیں اور حد درجے کے سیل فش۔ اس لیے تو خالو خاندان میں بھی کم ہی گھس اپ ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے جذبات و احساسات سے نابلد ان لوگوں کو کیا نام دوں۔ جس کے سینے میں دل ہی نہیں۔ انسان اور حیوان کی تفریق اور شناخت ان محسوسات کی وجہ سے ہے۔" وہ پژمردگی سے بولی۔

"بیٹا ان کا قصور نہیں۔ ان کی زندگی کا کیا بھروسہ؟ اس لمحے ہے تو اگلے پل نہیں پانی کا بلبلہ ہے ان کی زندگی۔ اپنی زندگی پر بے اعتباری کی وجہ سے وہ کسی سے دل نہیں لگاتے۔" وہ سمجھانے کے انداز میں بولیں۔

"پائلٹ ہر صبح فلائنگ کے دوران موت سے آنکھیں چار کرتا ہے اور وہ اس وقت اپنے رب کے اتنا قریب ہوتا ہے کہ دنیاوی رشتے اور زندگی کی اہمیت اور وقعت ایک تنکے سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقت پا لیتے ہیں کہ زندگی کل کی منتظر نہیں اور دھیرے دھیرے اور دھیمے سروں کو زندگی کا نام دینا خود کو بے وقوف بنانے کے مترادف ہے۔ آج اور اسی پل زندگی ہے۔ کل کا انتظار اور آج کا کام کل پر چھوڑنے کے عمل پر ان کا ایمان نہیں ہوتا۔ جہاز جیسی تیزی، پھرتی اور جلد بازی ہوتی ہے ان میں۔ سکندر بھی تم سے ایسے ہی فیصلے کی امید رکھے گا۔ اس لیے سوچ سمجھ کر فیصلہ جلدی کر لینا۔" وہ نصیحتاً بولیں۔ "کیونکہ وہ رکے گا نہیں۔ مسکرا کر آگے بڑھ جائے گا۔ کسی اور ساتھی کی تلاش میں۔"

"کیوں خالہ جانی میں کسی سے کم ہوں کیا؟ وہ اسکواڈرن لیڈر ہے تو میں کون سا کسی رینک کے بغیر ہوں۔ اسی کے برابر کھڑی ہوں۔ اس لیے میں اس کا خود ساختہ بڑا پن تو تسلیم نہیں کروں گی۔ انڈر اسٹینڈنگ کے بغیر تو دوستی بھی ناکام ہو جاتی ہے۔" وہ بولی۔ "یہ ساتھ تو عمر بھر کا ہے۔ اس میں تشنگی ہوئی تو میں سہہ نہیں سکوں گی روبوٹ بن کر اس کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی خالہ۔ میں انسان ہوں پارس کا پتھر نہیں ہوں۔"

"باؤلی ہو گئی ہو بغیر سوچے سمجھے کیا جانے والا فیصلہ بعد میں پچھتاووں کی صورت میں سامنے آ کر تڑپاتا جاتا ہے۔ سٹیبل لائف گزارو گی اور تمہیں کیا چاہیے۔" خالہ تلملا کر بولیں۔ "دو چار سال بعد کوئی نہیں پوچھے گا۔

سیٹل لائف کے ساتھ توجہ، پیار اور ہمدردی چاہیے۔ پھول، خوشبو ہنسی اور خوشی چاہیے۔ اس کے بغیر ازدواجی زندگی عذاب الٰہی ہے۔ یہ منسٹری اس کی شریک سفر بن کر سمجھ پاؤ گی۔ کچھ باتیں زبانی کلامی سمجھانا بہت مشکل ہوتی ہیں جانی۔ تمہارے جیسی بولڈ لڑکیاں ڈرنے لگیں گی تو پھر ہماری ذات ہر پل زمین کی گہرائیوں میں دھنستی چلی جائے گی۔ کل اپنی بیٹی کو بہادر اور حالات سے مقابلہ کرنے والی ہستی کیسے بناؤ گی بزدل لوگ شادی سے گھبراتے ہیں، خوفزدہ رہتے ہیں۔ شکوک و شبہات میں گھرے اپنی جوانی برباد کر ڈالتے ہیں۔ جب وقت گزر جاتا ہے تو پھر پچھتاوا ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اللہ نہ کرے تم پر ایسا وقت آئے۔" وہ افسردگی سے بولے جا رہی تھیں۔

"خالہ جانی آپ خفا ہو گئی ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اگلے دو دنوں میں مناسب اور موزوں فیصلہ کر لوں گی۔ وہ سیر ہے تو میں سوا سیر سے کم نہیں۔"

پھر ایسا ہی ہوا کہ سکندر رات بھر ہوش و حواس پر چھایا رہا۔ خالہ نے جن خوبیوں کو بیان کیا تھا۔ ان میں لاتعداد خامیاں پوشیدہ لگیں۔ جن خامیوں کو گنا تھا۔ ان میں ان گنت خوبیوں نے سر نکالا تھا۔

خالہ نے گھما پھرا کر بہت کچھ بتا دیا۔ بہت کچھ چھپا بھی لیا۔ ذو معنی اور بامعنی دھمکیاں بھی دے ڈالیں۔

"مگر فیصلہ کیسے کروں۔ ہر وقت اونچی اڑان میں بسیرا کرنے والے اس انسان کے ساتھ کیسے زندگی گزاروں گی جنہیں دھرتی والے بہت کمتر اور حقیر نظر آتے ہیں۔ ذرا میرے لیول پر آ کر بات کرے تو بات بنے گی۔"

رات بھر لائحہ عمل مرتب کرتی رہی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ سوچیں بہت قریب تھیں اور ان دونوں کی یکجائی ناممکن تھی۔

وہ سسٹر کی آواز پر چونک کر کھڑی ہو گئی۔ اور تھوڑے توقف کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ہسپتال میں ہے اور سکندر گھر سے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہو گا اور وہ اس کے پاس نہیں۔ اس نے گہرے دکھ سے سوچا اور لیبر روم کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی۔

سکندر کو آج میری کمی اتنی شدت سے کیوں محسوس ہوئی ہے؟ میری راتیں پہلے بھی تو گائنی وارڈ میں گزرتی تھیں کبھی اس لگن سے مجھے احساس نہیں دلایا۔ میری کمی اور ضرورت کا اظہار کیا نہ اعتراض کیا آج اتنی بڑی تبدیلی کیوں آ گئی۔" سکندر کی پیار میں ڈوبی ہوئی باتیں اس کے کانوں میں رس گھولتی رہیں اور سکندر نے گھر سے نکلتے وقت پھر سے پیار بھرا فون کر دیا۔ آفس پہنچ کر بھی یہی سوال کیا۔ کہ کب تک پہنچو گی۔ جہاز میں بیٹھنے سے پہلے تمہارا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔

سکندر دھوکے باز اور فریب دینے والا انسان نہیں۔ ممکنات میں سے ہے کہ وہ ضرور مجھے مس کر رہا ہو گا مگر کیوں؟ اتنے سالوں بعد خوابیدہ احساسات بے دار ہونے کا مقصد کیا ہے۔ اگر اس نے میری تعریف نہیں کی تو برا بھلا بھی تو کبھی نہیں کہا۔ میں روٹھی تو اس نے کبھی منانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے کبھی خفا ہوا ہی نہیں۔ خوش مزاجی میں بھی کمی نہیں دیکھی۔ زندگی کے ہر لمحے سے انصاف کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ اس کے بھی اپنے ہی اصول اور طریقے ہیں۔ دوسروں کی محتاجی اور احسان مندی سے کوسوں دور بھاگنے والا سکندر میرے قریب نہ ہو سکا مگر کبھی مجھے دوری کا احساس بھی تو نہیں ہونے دیا۔

☼ ☼ ☼

"آئی ایم سوری سکندر میں نہیں آ سکتی۔ آدھے گھنٹے کے بعد آپریشن ہو گا۔ پھر ایک گھنٹہ میرا یہاں پر موجود رہنا بہت ضروری ہے آپ اپنی ڈیوٹی نبھائیں مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ لنچ پر آپ کو جوائن کر لوں گی۔ بیسٹ آف لک۔ اللہ تعالیٰ آپ کا نگہبان ہو اللہ حافظ۔"

شہربانو نے ریسور کریڈل پر رکھا اور تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گئی۔ تمام کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ جب باہر نکلی تو خود کو فریش فیل کرتے ہوئے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا اور ساتھ لائیٹ براؤن بالوں کو برش سے سلجھانے لگی۔ دودھیا رنگت میں سندوری آمیزش نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے یہی وجہ تھی کہ اسے پہلی بار دیکھنے والے چونک جایا کرتے تھے کہ یہ نیلی آنکھوں والی اپسرا کہاں سے آئی ہے۔ جب وہ سرو سے قد کو فان کلر کی ساڑھی سے کور کرتی اور میڈلز سے سجا ہوا بلاؤز پہنتی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یونیفارم کے کلر اور اسٹائل کا انتخاب کرتے وقت ڈاکٹر شہربانو کو ہی مد نظر رکھا گیا ہو۔

سکندر سے شادی کسی معجزے سے کم نہ تھی۔ جب یہ مژدہ آفیسرز میس میں سرگوشیوں کی صورت میں ابھرتا ہوا شادی کے کارڈز تقسیم کرنے تک پہنچا تو سکندر کے تمام کورس میٹس نے دانتوں میں انگلیاں دبالی تھیں۔ کیونکہ شہربانو خوب صورت ہونے کے ساتھ پرلے درجے کی شریف النفس ناک چڑھی اور بدتمیز مشہور تھی۔ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے تمام اصولوں سے اسے خوب واقفیت حاصل تھی۔ اس کے چہرے پر عموماً سختی اور لبوں پر ہمیشہ خامشی کی چھاپ لگی رہتی تھی۔ لیکن آنکھوں میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی۔ اس کے مضبوط کردار اور شخصیت کی پختگی کی وجہ سے کوئی شخص اس سے غیر ضروری بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے پروفیشن میں لاجواب ہونے کی وجہ سے اپنے سینئرز کی جانب سے ہمیشہ اس کی عزت افزائی ہوا کرتی تھی۔

اسے جب بھی شام فری ملتی تو وہ اپنے میس کے کمرے سے شان بے نیازی سے ریکٹ گھماتی ہوئی بیڈ منٹن کورٹ کی طرف چل پڑتی تو آتے جاتے

افسران کی نظریں جھک جاتیں۔ جن میں اس کے رعب وداب کے تاثرات نمایاں نظر آتے تھے اور وہ ان سے خود ساختہ قائم ہوئے تعلق اور رابطے کے اصولوں پر نہال ہو ہو جایا کرتی تھی۔

اسکواڈرن لیڈر سکندر مردانگی' وجاہت اور مروت و شرافت کا مجسمہ تھا۔ طبعاً" شوخ مزاج اور صلح کل جو تھا۔ اپنے پروفیشن میں بے مثال جانا جاتا تھا۔

جب اس نے شہربانو سے شادی خانہ آبادی کا فیصلہ اپنے کولیگز کو سنایا تو سب نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے سوالات کی بھرمار کر ڈالی کہ اپنے رشتے کی بات اس سرپھری' بدتمیز اور منہ پھٹ ڈاکٹر شہربانو سے کرنے سے پہلے کتنی بار پانی پی کر اپنی جرات کو سیراب کیا تھا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کتنے مہینے اظہار محبت کی ایکٹنگ کی تھی۔

وہ تو کسی کو گھاس ڈالنے کے بجائے ان کے سامنے پڑی ہوئی ہر نعمت کو نگل جانے والی لڑکی تھی۔ تمہاری کون سی خوبی اسے بھا گئی ہے۔ کچھ تو بتاؤ۔

ان کا تجسس و اشتیاق دیکھ کر سکندر مسکرا کر خاموش رہتا۔ ان کے کسی سوال کا جواب دینا مناسب نہ لگتا تھا۔ کیونکہ شہربانو گرل فرینڈ نہیں تھی' آنے والے کل میں اس کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں تھی۔ وہ یہ انکشاف نہ کر سکا کہ وہ کتنے عرصے سے اسے کن انکھیوں سے دیکھ کر دل میں محبت کا بیج چپکے سے بو کر پسندیدگی سے سینچتا رہا تھا۔ پھر بیج سے کونپل پھوٹی اور دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت کی صورت اختیار کر گئی۔ اب اس کے سائے کی ٹھنڈک میں سستانے کی خواہش نے شب و روز کا چین نگل لیا۔ کیونکہ یکطرفہ محبت تو امر بیل کی حیثیت سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ میرے چند لفظوں کی ادائیگی میں اس درخت کا پتہ پتہ میرے پیار کی گواہی دینے لگا۔ تو وہ نہ شرمائی نہ لجائی' مسکرا کر بولی تھی۔

"پرپوزل قابل غور ہے مگر ایک بات یاد رکھیے گا۔ میرا خاندان ابھی تک اپنی روایات کو مد نظر رکھ کر اپنے بچوں کی زندگیوں کے فیصلے کرتا ہے۔ اختیارات میرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ آپ کا نام اپنے بھائیوں تک پہنچا دوں گی۔ آگے جو بھی ہو۔ آپ کی اور میری قسمت اور نصیب۔" وہ خود اعتمادی سے بولی اور ڈائننگ ہال سے سرعت سے باہر نکل گئی کہ کہیں اسے سکندر سے بات کرتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ خوامخواہ بیس سیکنڈ محو گردش ہو کر اس کی عزت و تکریم کو شعلوں کی نذر نہ کر دیں۔

اس لیے تو سکندر کے دوست سراسیمگی کے عالم میں اسے کریدے جا رہے تھے کہ ہم نے تمہیں اس سے کبھی بات کرتے دیکھا ہے۔ نہ ہی تمہاری زبان سے اس کا نام سنا ہے۔ نہ ہی نگاہوں میں محبتوں کی چنگاریاں نکلتے محسوس کی ہیں۔ پھر آناً" فاناً" یہ معجزہ کیسے سرزد ہو گیا۔ سب شاکڈ تھے۔ معمہ حل کرنا مشکل ہو گیا تھا اور آخر کار سکندر کے ایک جملے نے سب کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ آج کے بعد نو ڈس کشن۔ کیونکہ چند ہفتوں بعد وہ تم سب کی بھابھی کے مقدس رشتے میں بندھنے والی ہے۔ اس کے بعد شہربانو سب کی بھابھی بن گئی۔ ان کی اپنی عزت اور غیرت بن کر بھی وہ کسی سے زیادہ فری نہیں ہوتی تھی۔ اب ان کی نظریں ڈر اور عزت بچاؤ مہم کے تحت نہیں جھکتی تھیں۔ بلکہ احتراماً" زمین بوس ہونے لگی تھیں۔

چند ہفتوں بعد شہربانو اور سکندر میس سے گھر میں شفٹ ہو گئے اور دونوں مل کر گھر کو اپنے رہنے کے مطابق سیٹ کرنے لگے۔ دونوں نے محسوس کیا کہ اپنے گھر کی بات ہی اور ہے۔ چاہے جھونپڑی ہی کیوں نہ ہو؟ اسے بھی اپنی محبتوں سے محل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

☼ ☼ ☼
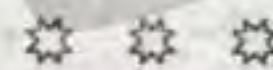
ڈاکٹر شہربانو لیبر روم میں انہماک سے اپنے مریضوں کا معائنہ کر رہی تھی۔ درد میں مبتلا جوان خواتین کبھی چیختی چلاتیں تو کبھی ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر اپنے حوصلے اور دلیری کا اظہار کرتیں تو شہربانو نے انہیں تسلی دیتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ قریب کھڑی سسٹر نے اپنائیت سے پوچھا۔

"میڈم آج کیا بات ہے کہ آپ کی نظریں گھڑی سے ہٹ ہی نہیں رہیں۔ کسی کا انتظار ہے یا کہیں جانے کا پروگرام ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ ان چار عدد بچوں کی تشریف آوری کا انتظار ہے اور پھر جانے کا پروگرام ہے۔"

وہ حسب عادت مسکراہٹ کو دباتے ہوئے خواتین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ان شاءاللہ ایک گھنٹے کی بات ہے۔ سب بخیر و عافیت فارغ ہو جائیں گی۔" اس کے لہجے میں امید و آس کی کھنک تھی۔

"لگتا ہے آج آپ کا سر کے ساتھ چودہ اگست کی خوشی میں اسپیشل پروگرام ہے۔" سسٹر مسکراتے ہوئے بولی۔

"پروگرام تو بہت خوب ہے۔ آج سکندر کو سوتے ہوئے چھوڑنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ آج تو انہیں اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر ناشتا کراتی۔ ان کی کور آل کو بوسے دے کر تیار کرتی اور انہیں اپنی ان گنت دعاؤں کے سائے میں رخصت کرتی۔ مگر میری ڈیوٹی ہی اتنی ڈیمانڈنگ ہے کہ کئی بار سکندر اور بچوں پر زیادتی ہو جاتی ہے اور گلٹ مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ میں نے سوچ لیا ہے اپنی شاہزے کو ڈاکٹر نہیں بناؤں گی۔ یہ پروفیشن ایک شادی شدہ خاتون کو سوٹ نہیں کرتا۔" وہ ہنستے ہوئے ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"میڈم ایسی غلطیاں تو ہر روز ہی سرزد ہوتی ہیں۔ ان پر کیا پچھتانا؟ ہم کون سا یہاں عیاشی کرنے آتے ہیں۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ عام آدمی بھی اپنی آزادی کی خوشی میں سرشار اپنی فیملی کو انجوائے کراتے ہیں۔ میڈم ہم سے تو وہ ہی بہتر ہوئے نا جو آزاد ہونے کے باوجود بھی آزادی کی اہمیت کو جانتے ہیں اور آج کے مبارک دن کی قدردانی میں ہم سے دس ہاتھ آگے ہیں۔"

سسٹر نے ایک خاتون کا بلڈ پریشر لیتے ہوئے کہا۔

"ہم تو آزادی حاصل کر کے بھی مجبوری اور ضرورت کے غلام رہے۔"

اسی وقت ایک خاتون کی طبیعت خراب ہو گئی۔

"سسٹر! جلدی سے بیگم صاحبہ کو آپریشن تھیٹر لے چلو۔" وہ تیزی سے اوٹی کی طرف چل دی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ ایک سے تو اگلے دس منٹ میں فارغ ہو جاؤں گی۔ دوسری بھی تیار ہے۔ تیسری میں بھی دیر نہیں۔ چوتھی میں کچھ ٹائم لگے گا۔" وہ خود کلامی کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ ہر ہر ساعت نظریں گھڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ دل بے چین اور بے تاب سا تھا۔ سکندر کی پیار بھری باتیں کانوں میں گونج رہی تھیں وہی ہوا کہ ایک گھنٹے میں وہ تینوں خواتین سے فارغ ہوئی تو دل ہی دل میں سکندر سے محو گفتگو ہو گئی۔

"سکندر ان شاءاللہ بس تھوڑی دیر بعد تمہارے پاس ہوں گی تمہارا Aerobatics Show نہ دیکھا تو اگلے سال تک پچھتاوا رہے گا قابل تحسین کنٹرول اور قابل فخر بے باکی۔ واہ جہاز نہ ہوا ریموٹ کنٹرول ٹوائے ہو گیا۔ میں نے فضاؤں میں Formation کرتے ہوئے جب بھی تمہیں دیکھا۔ خوشی سے دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور گردن ایسے تن گئی کہ آج تک نیچی نہ ہوئی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں تمہاری شریک سفر ہونے پر مجھے بے پناہ ناز ہے۔ ایسی فیلنگز فائٹر پائیلٹ کی بیوی کے علاوہ اور کوئی بھی بیان نہیں کر سکتا۔ نہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ تم کیا جانو؟" اس نے پھر بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھا اور چوتھی خاتون کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا چیک اپ کرنے کے بعد قدرے مضطرب اور تذبذب میں گھر گئی۔

"لگتا ہے آج یہ ضدی بے بی مجھ پر ترس نہیں کھائے گا۔ بھئی تمہیں دنیا میں جلدی آنے کا شوق نہیں تو ٹھیک ہے۔ محو انتظار ہوں اور کیا کر سکتی ہوں۔ شاید اللہ کو یہی منظور ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"ڈاکٹر صاحبہ میں بہت تکلیف میں ہوں۔ بس میرے پاس ہی کھڑی رہیں۔۔۔ مجھے تسلی رہے گی ورنہ

مرجاؤں گی۔ کچھ کیجیے پلیز۔" ایئر مین کی بیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔ تو شہربانو نے ہمدردی سے اس کا ہاتھ دبایا اور ملائمت سے اس کے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اسے پرسکون دیکھ کر وہ ایک بار پھر سکندر کی باتوں کو سوچنے لگی۔

✿ ✿ ✿
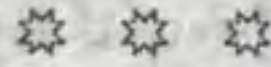
"شہربانو آپ کی فیملی سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ویسے آپس کی بات ہے۔ مجھے ون پرسنٹ بھی ناامیدی نہیں تھی۔" اس کے لہجے میں حیرت کم خود اعتمادی زیادہ تھی۔ "مابدولت بھی تو کسی سے کم نہیں ہیں نا۔ یہ سچائی تو ماننے والی ہے۔"

"بس آپ کا بچاؤ اس وجہ سے ہو گیا کہ آپ نے مجھے اپنی محبت کی جھوٹی داستان سنانے سے پرہیز رکھا اور نہ ہی مجھے کوہ قاف کی پری ہونے کا لقب دیا آئی لائک اٹ۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔

"رشتے طے کرنا کا یہی طریقہ بہترین ہے۔ شہربانو جس کے نام میں اپنی زندگی لکھنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ اسے ان سطحی باتوں سے کیا غرض اصل اور حقیقت شادی سے پہلے ہی کھل کر سامنے آنی چاہیے۔ اور پھر میرا ایک اور اصول ہے کہ اپنے زندگی میں نہ تو کسی شے کو اتنا عزیز و مقدم بنالو کہ چھن جانے پر زندگی ہی چلی جائے۔ نہ دل میں محبت کی گرہ اتنی مضبوط لگالو کہ وہ کبھی کھل نہ سکے۔ پتا چلے کہ لاشعوری طور پر ہی وہ مجبوری اور پاؤں کی زنجیر بن چکی ہے۔ شہربانو میں اک نارمل انسان ہوں بہت کمزور اور ناتواں قلب و ذہن کا مالک۔ میں اللہ کی آزمائش سے بہت خائف رہتا ہوں۔ جو رشتہ دل کے بہت قریب ہوتا ہے اور جو دنیاوی شے اپنی زندگی سے بڑھ کر پیاری ہوتی ہے اوپر والا اسی سے انسان کو آزماتا ہے۔ اسے بھٹی میں کندن بنانے کے لیے چڑھا دیتا ہے۔ شہربانو تم بھی مجھ سے ایسا پیار نہ کرنا کہ میں تمہاری آزمائش بن جاؤں۔ بشر ہونے کے ناتے تم اس پر پوری نہ اتر سکو گی۔ تو اپنے رب کی رفاقت سے محروم ہو کر حسرت زدہ زندگی گزارو گی۔ اپنی ذات کی نفی کر کے اللہ تعالیٰ کو شہ رگ سے زیادہ نزدیک محسوس کرنا بہت بڑے اور کٹھن امتحانوں کے بعد ایسی کیفیت نصیب ہوا کرتی ہے۔ ہم میں اتنا دم خم نہیں اس لیے ہمیں نارمل ازدواجی زندگی گزارنے کے تمام گر اور تمام ٹوٹکے آنے چاہئیں۔ کسی سے اٹیچ منٹ ہونی چاہیے۔ زندگی آسان و سہل اور دلنشیں رہے گی۔"

رشتہ طے ہو جانے پر سکندر نے فون کیا تھا۔ شہربانو اس کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوئی تھی۔ اسے ایسا ہی جیون ساتھی چاہیے تھا۔ جو بالکل خالص ہو۔ جس میں مکاری نہ ہو۔ اپنی خوش بختی پر وہ جھوم اٹھی تھی۔

شعلہ مزاجی کو جیت کا نام دینے والا سکندر اندر سے رب کے کتنا قریب ہے۔ اس کا اسے گمان تک نہ تھا۔

شاید فائیٹر پائیلٹ فطرتاً" ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں اس فارمولے کو شادی کے بعد ہی سمجھ پاؤں گی۔ کیونکہ اب وہ اپنا ہی تو ہے۔ اس کے دل میں طمانیت سرائیت کر گئی تھی۔

✿ ✿ ✿
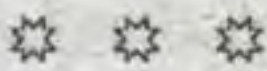
زندگی میں سکون شادی سے پہلے بھی تھا۔ اب تو ایک مرد کا ساتھ تھا جسے وہ دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ انسیت اور اپنائیت کی ٹھنڈک اور محبت کی حدت اس کے ساتھ تھی۔ جس کا سکندر کی طرف سے زبانی اظہار نہ ہوا تھا۔ مگر اعمال منہ بولتی کہانی تھے۔

دونوں اسی روٹین سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی نے بھی انہیں مکمل کر دیا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے زندگی نہایت تناسب سے گزر رہی تھی۔ کہ پوسٹنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نجانے اس پوسٹنگ کا سنتے ہی شہربانو کا دل خوف سے بری طرح کیوں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ خود حیران تھی کہ ایسا کیوں ہے؟ اس نے آج تک کسی

جگہ سے وہاں کے مکینوں سے اور آسائشات سے دل نہیں لگایا تھا۔ اسے بھی ان دنیاوی مادی چیزوں سے والہانہ لگاؤ نہ تھا۔ کسی اٹیچ منٹ کا احساس نہ ہوتا تھا سکندر کی طرح۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی کے محاذ پر فتح مندی کے جھنڈے گاڑے ایک دوسرے کی قربت میں خوش تھے۔ پھر آج بے کلی اور بے چینی کیوں ہے وہ اپنے دل سے بار بار سوال کرتی ہوئی پیکنگ کر رہی تھی۔

اسی عالم میں وہ نئی جگہ نئے رینک کے ساتھ اپنے بچوں اور شوہر کے ہمراہ پہنچ گئی۔ ہسپتال کا سیٹ اپ بھی جانا پہچانا اور مانوس سا لگا تھا۔ گھر بھی اپنا ہی معلوم ہوا۔ میس کا ماحول بھی دیکھا بھالا تھا۔ اور وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگی اسے ذہنی فتور کا نام دے کر وہ پھر سے زندگی کے تمام ہنگاموں میں حصہ لینے کی کوشش کرنے لگی۔

اسے یہاں آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ کہ چودہ اگست کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میس کو خوب سجایا گیا تھا۔ گھروں پر پاکستان کے جھنڈے کئی دن پہلے لہرانے لگے تھے۔ ہمیشہ کی طرح سکندر اپنی مہارت کے جوہر دکھا رہا تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں دیکھتے ہی گم ہوتا اور پلک جھپکتے سامنے آجاتا۔ شہربانو کئی بار اس کے Aerobatics Show دیکھ چکی تھی۔ خوب محظوظ ہوا کرتی تھی۔ بچوں کی خوشی کا بھی ٹھکانہ نہ ہوتا تھا۔ مگر اس بار شہربانو ایمرجنسی میں علی الصبح ہسپتال چلی گئی تھی۔ سکندر سے جلد واپس آنے کا وعدہ کیا نہ ہی الوداع کہا۔ تیزی سے گھر سے نکل گئی۔ سکندر نے کئی بار فون بھی کیا۔ واپس آنے کی التجا بھی کی۔ مگر وہ اپنی ڈیوٹی سے واپس آنے کے لیے تیار نہ تھی۔ چار عدد خواتین اور چار نومولود بچوں کی زندگیوں کا سوال تھا۔ وہ ہسپتال میں اکیلی تھی۔ باقی سب چھٹی پر جا چکی تھیں۔ اس لیے اس کی موجودگی بہت اہم تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈیلیوریز سے فارغ ہو کر اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اسے وقت کے گزر جانے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ سکندر کا شو ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ ابھی تک ہسپتال میں تھی۔ آنکھوں میں تاسف لیے وہ آفس سے نکلنے والی تھی کہ ٹیلی فون کی بیل پر رک گئی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے فون اٹھایا یہ سوچتے ہوئے کہ آج سکندر بار بار فون کیوں کر رہے ہیں؟

دوسری طرف سے ہیلو ہیلو کی صدا کانوں میں گونج رہی تھی مگر زبان قوت گویائی سے محروم تھی۔ کیونکہ یہ آواز سکندر کی نہیں بیس کمانڈر کی تھی جن کی کال کا مطلب تسلی بخش نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس نے سہمتے ہوئے بمشکل ہیلو کہا۔ تو وہ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ذومعنی سی باتیں کر کے فون بند کر گئے وہ فوراً" گھر جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ایسی ہی ذومعنی باتیں وہ دوسروں کے گھروں میں سن چکی تھی۔ سکندر تم کہاں ہو؟ مجھے سچ سچ بتاؤ۔ چھٹی حس چیخ چیخ کر دوہائی دینے لگی تھی اسی عالم میں وہ گھر پہنچی تیزی سے تیار ہو کر وہ آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ اسی وقت سینئرز افسران کی چند بیگمات گھر میں داخل ہوئیں تو ان کے پژمردہ اور بجھے ہوئے چہرے اور روتی ہوئی آنکھوں نے اسے کچھ انوکھا ہونے کا اشارہ دے دیا سکندر کا جہاز کریش ہو گیا تھا جس پر دل یقین نہیں کر رہا تھا۔ ابھی اپنے مشن پر نکلنے سے پہلے ہی تو اس کا فون آیا تھا۔ وہ تو بہت خوش لگ رہا تھا۔ آواز میں ضد کے ساتھ بے پناہ پیار بھی تھا۔ اپنائیت اور انسیت بھی تھی۔ وہ مجھے کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ اس کی سماعتوں سے ٹکراتی ہوئی کئی آوازوں نے اسے بے دم کر دیا۔ اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑکی سے باہر کھلے آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سکندر کے جانے پر ماتم کناں تھا۔ بلا کی خاموشی تھی وہاں۔

"میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا اور تم ہی میرے لیے آزمائش بن گئے۔ تم کہا کرتے تھے کہ مجھ سے اتنا پیار مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کی آزمائش پر پورا نہیں اتر پاؤ گی۔ خود کو ریزہ ریزہ کر کے ہواؤں میں تحلیل ہونے سے بھی اس ذات کو پا نہیں سکو گی۔ کیونکہ تمہارا پیار تمام توجہ اور رجوع فقط میرے گرد و پیش چکر لگاتا رہتا ہے۔ پلیز شہربانو اسے اپنا محور بنالو۔ پھر اس کی ہر آزمائش بہت معمولی محسوس کرو گی۔ پائیلٹ کی زندگی پر بھروسہ کر کے سراسر خسارے میں رہو گی۔ اس فسوں سے باہر نکل آؤ۔"

میں ہی نا سمجھ نکلی۔ تمہیں تو آج اپنے جانے کا الہام ہو گیا تھا۔ جو چھوٹا سا ضدی بچہ بن گئے تھے۔ میں نے تمہاری آخری خواہش کو پورا کیوں نہ کیا۔ اس پر تو تمہارا حق تھا۔ سولی پر لٹکنے سے پہلے ایک قاتل کی بھی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے۔ تم تو اپنے وطن کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے جا رہے تھے۔ یہ میں نے کیا کر ڈالا۔

وہ فضاؤں میں سکندر کو تلاشتی رہی۔ کانوں میں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا تھا کہ اسکواڈرن لیڈر سکندر کریش کر گئے۔ میرا سکندر مجھے سندیسے دیتا سمجھاتا بجھاتا ہوا خالق حقیقی کے پاس چلا گیا۔

وہ متوحش سی ہو کر خالی نظروں سے سب کو دیکھنے لگی اور بے اختیار ہو کر گویا ہوئی۔

"سکندر آج چودہ اگست ہے۔ آزادی کی مبارک بادیں وصول کرنے والا دن۔ تم نے اپنی زندگی کو نیا پن سونپ کر اپنے وطن عزیز کو جو قابل آفرین و پرستائش نذرانہ پیش کیا ہے۔ میں سلیوٹ کرتی ہوں اس جذبہ شوق کو تمہاری محبتوں اور چاہتوں کو آج تم باری تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت میں ہو اور تم خوشی و فخر میں ہلکورے لے رہے ہو گے۔ دنیا کی پستیوں اور تاریکیوں کے باسی تو مجھ جیسے گناہ گار اور بے حس لوگ ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر دنیا سے پیار کیا۔"

قالو انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یونیفارم میں ملبوس ڈاکٹر شہربانو نے دیوار پر آویزاں یونیفارم میں مسکراتی ہوئی سکندر کی پورٹریٹ کو عقیدت مندانہ انداز میں دیکھا اور اپنے لب اس پر رکھ دیے۔

چند دنوں بعد اسے چودہ اگست کی وڈیو مل گئی۔ وہ انہماک سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کس مہارت سے ایروبیٹکس کرتا ہوا بے تحاشا داد وصول کر رہا تھا۔ جونہی ان کا F.6 طیارہ مہمانوں کے سامنے سے نمودار ہوا تو گراؤنڈ کی فضا تالیوں کے جلترنگ سے جھوم اٹھی۔ چیف گیسٹ ایک دم سے کھڑے ہو کر اس کی طرف حیرت و مسرت سے دیکھنے لگے۔

جہاز زمین سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جسے ایک سیکنڈ میں ہزاروں فٹ کی بلندی میں پہنچ کر اپنے کرتب دکھانے تھے۔ مگر ایف۔6 دھوکا دے گیا اور درخت کے ٹوٹے ہوئے سوکھے پتے کی طرح دو میٹر دور رن وے سے قدرے ہٹ کر آگرا۔

سب چونکے اور سب نے گردنیں گھما کر تاسف بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے ان کی نگاہیں آسمان پر F-6 جہاز کی ایروبیٹکس میں کھو گئیں اور ان کے سامنے دو کلومیٹر کے فاصلے پر سکندر کا جہاز مکمل طور پر شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ لیکن ایروبیٹکس شو اپنے شیڈول کے مطابق جاری تھا۔

☆ ☆

فرحین اظفر

دعائے دل

مکمل ناول

رمضان المبارک کی آمد آمد تھی۔

کہیں چہروں پر چمک تھی۔ کہیں عبادات کا نور، کہیں پورے روزے رکھنے کا جنون اور کہیں ایک بھی نماز قضا نہ کرنے کا عہد کہیں شاپنگ کے وعدے اور کہیں تگڑی عیدی وصولنے کے ارادے۔ لیکن ان سب سے بے پروا ایک وجود ایسا بھی تھا۔ جو سوگوار تھا سر سے پاؤں تک حزن رنگ میں ڈوبا ہوا۔ ملال کی آہ میں جکڑا ہوا۔

کسی تصویر کی قید میں بنا پلکیں جھپکائے ماضی کی راکھ کریدتا یادوں کی رنگین تتلیوں کے پیچھے ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں پر ننگے فگار پیر لیے۔

آنکھوں سے ٹپکتا پانی اس منجمد عکس کے نقوش سے پھسلتا ہوا دامن میں گر گر کر جذب ہو رہا تھا۔

جبھی کسی نے دروازے پر دستک دی۔

اس نے بجلی کی سی تیزی سے تصویر دراز میں ڈال کر اپنا چہرہ رگڑ ڈالا۔

"وشی!" آوازیں تواتر سے جاری تھیں۔

"جی مما!"

اس نے سکون سے دروازہ کھول کر اپنی والدہ کو دیکھا۔ جن کے پرسکون انداز میں اسے دیکھ کر ایک ذرا کی ذرا اضطراب کی لہر اٹھی۔

"تم ٹھیک ہو نا۔" اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ جواب دینا غیر ضروری ہی نہیں مشکل بھی تھا۔

"وہ..." وہ رک کر یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ جیسے بات کرنے سے پہلے اس کے متوقع ردعمل کا اندازہ لگانا چاہ رہی ہوں۔

"بیٹا! زیرک تم سے ملنا چاہتا ہے۔" اس کے چہرے پر سنتے ہی ناگواری اتر آئی۔

"کیوں؟" وہ دروازہ یونہی چھوڑ کر واپس پلٹ گئی۔

"ایک بار اس کی بات سن لو۔" وہ بھی اس کے پیچھے ہی اندر آئی تھیں۔

"کیا فائدہ، میرا جواب تو سب کو پتا ہی ہے۔" اس کا انداز حتمی اور اٹل تھا۔ انہوں نے گہری سانس لے کر ہنکارا بھرا پھر بولیں۔

"وہ بھی جانتا ہے۔"

"پھر بھی ملنے آگیا مجھ سے۔ آپ نے روکا کیوں نہیں مما۔" وہ ہنوز رخ موڑے کھڑی تھی۔

"اب اس کا آسان ترین اور فوری جواب تو یہ ہے کہ میں تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہوں۔" وہ اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ گئیں اور ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہنے لگیں۔

"مگر میں پھر بھی تم سے یہ نہیں کہوں گی بلکہ ایک صلاح دوں گی تمہیں۔ اسے تم ایک ماں کی نہیں ایک دوست کی نصیحت سمجھو۔"

وہ بنا کچھ کہے منتظر نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ یہ نعمت خداوندی ہے اور نعمت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اسے ضائع کرکے ناشکری کے مرتکب نہیں ہوتے تم بھی اسے ٹھکرا کر اور اپنی زندگی کے یہ قیمتی دن گنوا کر ناشکری کر رہی ہو۔ جبکہ تم جانتی ہو کہ ایک مقررہ وقت آنے پر یہ نعمت واپس اپنے رب کے پاس چلی جائے گی اور کوئی بھی نہیں جانتا وہ وقت کب آجائے۔ میں نہ تم جیسے طلحہ نہیں جانتا تھا۔"

وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب وہ فرش کو گھور رہی تھیں۔ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں ابھرتے آنسو دیکھ دیکھ کر ان کا دل اب تاب نہیں لا پاتا تھا۔

"آج تو میں اسے واپس بھیج رہی ہوں لیکن تم میری بات پر غور کرنا۔ اگر کسی منزل پر پہنچنا ہو۔ تو راستوں کی کٹھنائیاں خود جھیلنی پڑتی ہیں۔ دھند میں سے راہ نکالنی پڑتی ہے۔ کبھی کانٹوں پر وجود کو گھسیٹنا پڑتا ہے، کبھی گلستان کو چھوڑ کر صحرا کا انتخاب بھی کرنا پڑتا ہے۔ راستے انسانوں کو منتخب نہیں کرتے نہ خود سے سامنے آتے ہیں۔ انسان راہیں ڈھونڈتا بھی ہے اور خوش قسمتی سے ایک سے زائد راہیں کھلی ہوں تو بہتر کا انتخاب بھی خود ہی کرتا ہے۔" ان کے بہ ظاہر پرسکون لہجے کے پیچھے کتنا درد چھپا تھا یہ وہ خود بھی جانتی تھیں اور وشمہ بھی وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی باہر نکل گئیں۔

جاتے سمے انہوں نے دیکھ لیا تھا وہ خود پر ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے اولاد کے غم کا بوجھ از سر نو دل پر محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

طویل کاریڈور کے چکنے فرش پر اس کے قدم بے آواز پڑ رہے تھے اور آنکھوں کی جگمگاہٹ کوریڈور کے اختتام پر پڑے لکڑی کے اس جھولے کو دیکھتے ہوئے بڑھ رہی تھی۔ جس پر بیٹھے ہوتے ہو شخص کی چوڑی پشت اور سیدھے شانے اس کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث تھے۔

اس کے بے آواز قدموں میں تیزی آگئی۔ وہ اچانک سامنے جا کر اسے چونکانا چاہتی تھی مگر سامنے جاتے ہی نہ صرف خود بے طرح چونکی بلکہ پریشان بھی ہو گئی۔

"ارے! یہ کیا ہوا۔" وہ سلام بھول کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"کچھ نہیں۔ کل ذرا سا چکر آیا تو ٹیبل کا کارنر لگ گیا۔"

"علی!" وہ بے قراری سے پیشانی پر ہوئی بینڈیج دیکھتی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں ایکسرے کی طرح اس کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔

"تم نے بم بلاسٹ والی نیوز دیکھی تھی نا۔" علی نے بے اختیار نگاہیں چرائیں۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو علی جانتے بھی ہو کہ تمہاری طبیعت ذرا سی بھی بگڑے تو مجھے اور بابا کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔" وہ ایک دم روانکھی ہو گئی۔

"آئم سوری ہنی۔" اس کے لہجے میں سچ مچ ندامت تھی۔

"اونلی سوری از ناٹ انف، آئندہ اگر تم نے یہ حرکت کی تو میں گھر کے سارے ٹی وی اٹھوا کر باہر پھنکوا دوں گی۔" وہ اس کے بچکانہ انداز پر ہنس دیا۔

"بے کم آن یار! ایسا تھوڑی ہوتا ہے۔" وہ اپنی بات کہہ کر اپنے لہجے پر غور کرنے لگا۔

"کیا ہوا؟" ایمن نے اس کا چپ ہو جانا نوٹ کیا۔

"تم نے دیکھا میں نے کس انداز میں بات کی ابھی۔ تم سے میں ہمیشہ تو اس طرح ——" وہ بات ادھوری چھوڑ کر سوچ میں گم ہو چکا تھا۔

ایمن چند لمحے فکر مندی سے اسے دیکھتی رہی پھر ایک دم بولی۔

"اوہ جسٹ فارگیٹ اٹ علی۔ تم ہمیشہ اسی طرح بات کرتے ہو۔ پھر یوں اچانک چونک کر گم کہاں ہو جاتے ہو چلو اٹھو۔ لنچ کا ٹائم ہو چکا ہے اور میں نے آج خاص طور پر تمہاری پسند کی چیزیں بنوائی ہیں۔" وہ باتیں کرتی ہوئی اس کا بازو تھام کر کوریڈور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچوں میں گم اس کے ساتھ کھنچا چلا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

لان کلیکشن کی ایگزیبشن تھی۔ ملائکہ نے بڑی مشکل سے اسے یہاں آنے پر راضی کیا تھا۔ ورنہ سچ تو یہ تھا کہ ایک حادثے اور ایک شخص کی جدائی نے اسے سرتاپا بدل ڈالا تھا۔

اس کے وجود سے زندگی اور دل سے زندہ دلی نچوڑلی تھی۔

کبھی اس کا وجود مستی اور شوخی سے بھرپور ہوا کرتا تھا۔ اپنے سوشل سرکل اور فیملی میں اس کی موجودگی مسکراہٹوں اور قہقہوں کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

حاضر جوابی اس کی پرسنالٹی کا سمبل تھی لیکن اب —— کہاں کہاں کیا کچھ بدل گیا تھا۔ طلحہ کی موت کے بعد سے —— اور کسی کو یقین آتا نہ آتا۔ اس کا دل و دماغ آج تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا۔ ہاں لیکن اس حادثے نے اس کے وجود پر اداسی ضرور اوڑھا دی تھی۔

جگمگاتی آنکھیں، حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ گلابی لبوں سے رنگت اور نمی روٹھ گئی تھی وہ خشک اور بے رنگ ہو چکے تھے۔ چہرہ ویران اور لہجہ خاموش ہو چکا تھا۔

ہنسی اور خوشی کی تتلیاں اس کے وجود کے نخلستان کو اجاڑ کر جانے کن سمتوں میں پرواز کر گئی تھیں۔ وہ اندر سے اتنی ویران ہو گئی تھی کہ وہی لوگ جو محفلوں میں اسے ساتھ گھنٹوں گزار دیتے تھے اور پتا نہیں چلتا تھا۔ اب چند منٹ سے زیادہ بیٹھتے تو گھبرا جاتے تھے۔

اس نے بہت سے بے حد قریبی ہونے کا دعوا کرنے والے دوستوں کو خود سے دور بھاگتے دیکھا تھا۔ وہ کچھ اور اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔

"ارے وہ دیکھو کیا زبردست پرنٹ اور کلر ہے۔" ملائکہ نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر جان بوجھ کر زور دار ٹھوکا دیا۔ جہاں وہ ایک جھٹکے سے اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر آ گری۔ وہیں اس نے کوفت سے ملائکہ کو دیکھا۔

"تم یہ بات تھوڑا آرام سے بھی کہہ سکتی تھیں۔"

"ہاں کہہ دیتی۔ اگر تم یہیں ہوتیں اور بھئی صاف بات ہے۔ میں نے بھی تو ایک طویل عمر تک تمہاری کہنیوں کی ضربیں اپنی نازک پسلیوں پر روکی ہیں۔ تو جب مجھے یہ گولڈن چانس ملے گا تو میں کیوں مس کروں گی۔" وہ تیز تیز بولتی ہوئی مطلوبہ سوٹ کے سامنے جا رکی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔ میں ییلو کلر نہیں پہنتی۔" اس کا موڈ بری طرح آف تھا۔

"جی نہیں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں ییلو تمہارا فیورٹ کلر ہے اور اسے تم نے ہمیشہ بہت شوق سے پہنا ہے۔"

ملائکہ پر کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ دھڑا دھڑ سوٹوں کی خریداری کے ساتھ میچنگ جیولری اور سینڈلز خریدنے میں لگی تھی۔ دو ایک بار اس نے ٹوکا پھر تھک کر چپ ہو رہی۔

"بس بھی کرو اب اور کتنے سوٹ لو گی۔" یہ آٹھواں سوٹ تھا جو وہ اتنے ہی لگن اور شوق سے پیک کروا رہی تھی۔ جب اس سے رہا نہیں گیا۔

"ہیں یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ آپ اور شاپنگ پر اعتراض! یقیناً" آج سورج کہیں اور سے نکلا ہو گا۔" اس کے سر ہلانے پر وہ مسکرا دی پھر محبت سے بولی۔

"میں صرف تھک گئی ہوں ملائکہ اور کچھ نہیں۔"

"ہم ابھی تمہاری تھکن ختم کرنے کا انتظام کیے دیتے ہیں۔" گاڑی کی پچھلی سیٹ پر شاپنگ بیگز پھینک کر اب وہ سیل پر کھٹا کھٹ میسج ٹائپ کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فش تو بہت مزے دار ہے۔" وہ بڑی رغبت سے فرائیڈ فش کھا رہا تھا۔ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر وہ دونوں ہی تھے۔ بابا کسی کام سے کراچی گئے تھے۔ ان کی واپسی آج رات یا کل صبح متوقع تھی۔

"ہوں میں نے خاص تمہاری پسند سے بنوائی ہے۔"

"کیوں آج کوئی خاص بات ہے کیا۔" ایمن نے جواب نہیں دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ تھی۔

علی نے سر اٹھایا پھر چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد خود بھی کھانے میں محو ہو گیا۔ لیکن بظاہر۔ کبھی کبھی اسے اس لڑکی کا چہرہ بے انتہا پرکشش معلوم دیتا تھا۔ اتنا زیادہ روشن اور جگمگاتا ہوا کہ وہ گھبرا کر اپنی نظر ہٹا لیتا۔ اسے معلوم تھا وہ اپنے دل میں اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہے مگر، خود اسے کبھی اس طرح کی کوئی خاص بات یا جذبات محسوس نہیں ہوئے تھے۔

ایمن اس کی ایک عام سی شکل و صورت لیکن بہت خاص دل رکھنے والی مہربان دوست تھی۔ بس اس سے آگے کچھ سوچنا وہ اپنے محسن کے ساتھ غداری کرنے کے برابر سمجھتا تھا۔ رضا رسول بخش جنہیں وہ ایمن کی دیکھا دیکھی بابا کہہ کر بلاتا تھا۔

عرصہ دراز پہلے اسے بتا چکے تھے کہ وہ اس کے سگے باپ نہیں۔ اسے انہوں نے بہت بچپن میں کہیں سے لے کر پالا تھا۔ یہ بات اس کے لیے جس قدر تکلیف دہ

تھی۔ بابا کی محبت اتنی ہی نرم اور مہربان چھاؤں کی طرح تکلیف دہ سوچوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ہمہ وقت اس کے سر پر سایہ فگن رہتی۔

"تم میرے بیٹے تھے ہو اور رہو گے ہمیشہ لیکن یہ حقیقت جو میں نے آج خود تمہیں بتادی۔ وہ اسی لیے کہ آئندہ کوئی اور تمہیں بتاتا تو تمہیں بہت دکھ پہنچتا۔ میں نے اول روز سے ہی سوچ رکھا تھا کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔" اور وہ تو ہمیشہ سے ہی اپنے بابا کی سمجھ داری اور معاملہ فہمی کا قائل تھا۔

" اس بار رمضان میں پورے روزے رکھنے ہیں تمہیں اور سحری اور تراویح میں بھی کوئی ڈنڈی نہیں مارنی۔" ایمن کی آواز نے اسے حال میں نمودار کیا۔

"ایما!" وہ بے چارگی سے ہنس دیا۔ ایمن بھی اسے دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گرما گرم وانگ ٹانگ کیچپ میں ڈپ کر کے منہ میں ڈالتے ہی اسے طلحہ کے ساتھ کسی زمانے میں لی گئی ٹریٹ یاد آگئی۔ سب سے پہلے یہ عجیب نام والے چھوٹے اور موٹے لذیذ سموسے امی نے کھلائے تھے۔

"اور منگیتر ہونے کے باوجود میں کتنا کم اس کے ساتھ کہیں باہر گئی۔" تاسف زدہ سوچیں آس پاس پھیلے بے ترتیب شور میں اس کا گھیراؤ کرنے لگیں۔ ملائکہ نے یونہی نظر اٹھا کر دیکھا اور تھم سی گئی۔

"اے کہاں کھو گئیں؟" اس نے جان بوجھ کر اس کا ہاتھ دبایا۔

"طلحہ سے انگیج منٹ ہو جانے کے باوجود میں اس کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جاتی تھی۔ ہم نے کبھی ہوٹلنگ نہیں کی۔ اس نے مجھے کبھی کالج سے پک نہیں کیا۔ جیسے دوسری لڑکیوں کے منگیتر کرتے تھے۔" اس کے چہرے پر الجھن اور دکھ کی بڑی واضح ملی جلی تحریر تھی۔ جیسے اسے آج تک طلحہ کا گریز سمجھ میں نہ آیا ہو۔ اس کی بات اس ماحول اور موقع کے لحاظ سے بالکل غیر متوقع اور بہت اچانک تھی۔ ملائکہ کے دل میں بھی ملال ابھرنے لگا۔ تب ہی اس نے وشمہ کو اٹھ کر کاؤنٹر کی سمت جاتے دیکھا۔

"کولڈ ڈرنک لوں گی اور پے منٹ بھی کر دوں گی۔ ڈونٹ وری یار تم کرو یا میں ایک ہی بات ہے۔" ملائکہ کو کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے دیکھ کر وہ تیزی سے بولتی ہوئی چلی گئی۔

ملائکہ مڑ کر چند لمحے تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔ وشمہ نے ابھی چند لمحے پہلے جو بات کی تھی۔ وہ اس چیز کا ثبوت تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود اپنے آپ کو طلحہ کی یاد اور محبت سے آزاد کروانے میں ناکام ہے۔ اس کے دل میں درد بڑھنے لگا۔

وہ خود بھی جانتی تھی اس نے کن دقتوں سے اسے زندگی کی طرف واپس موڑا تھا۔ ورنہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب اسے وشمہ پر کسی چلتی پھرتی لاش کا گمان ہوتا تھا۔ جو لوگ اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اس کی حالت پر مرنے والے ہو چکے تھے اور... سوچوں کی ڈور ایک جھٹکے سے ٹوٹی اور دھیان کی پتنگ ڈولتی ہوئی سامنے نظر آتے وشمہ کے سرخ چہرے پہ جا اٹکی۔

"تم نے زیرک کو یہاں بلایا ہے۔"

"نہیں تو کیوں تم نے کہاں دیکھا؟"

"وہ بل پے کر رہا ہے۔ میں دور سے دیکھ آئی ہوں۔" وہ کمر پر دونوں ہاتھ ٹکا کر اسے گھور رہی تھی۔

"اچھا کمال ہے 'اتنی پبلک میں اسے یہ کیسے پتا چلا کہ ہم نے کیا کیا کھایا ہے۔" ملائکہ معصومیت سے بولی۔

"بکواس مت کرو۔ یہ اتنی دیر سے اسی کو میسج بھیجے جا رہے تھے۔" وہ غصے سے بولتی ہوئی چیئر پر ڈھیر ہو چکی تھی اور یہ آخری بات تھی جو اس نے ملائکہ سے کی تھی۔ کیونکہ وہ زیرک کو آتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اب اسے خاموش ہی رہنا تھا۔

"ہائے فرینڈز... واٹس اپ۔" ذرا دیر بعد وہ ان دونوں کو ڈھونڈتا ہوا وہاں آچکا تھا۔

"آئی تھنک۔ آئی شڈ لیو ناؤ۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں بیگ اٹھایا۔

"سچ۔" ملائکہ نے ملامتی انداز میں اسے دیکھا۔ "گاڑی کی چابیاں دے رہی ہو یا میں کیب میں گھر جاؤں گی۔" زیرک ان دونوں کی شکلیں دیکھتا پاس بیٹھ چکا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ اتنا غصہ آپ کو مجھے دیکھ کر آرہا ہے یا پہلے سے..." اس نے ایک اسٹائل سے جھک کر اس سے پوچھا پھر ملائکہ کو دیکھا۔ اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"جی نہیں آپ کو یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"اور میں حق مانگتا ہوں آپ دیتی نہیں ہیں۔" وہ اطمینان سے کہہ کر ہنس دیا۔

"انف از انف... آئی ایم گوئنگ ٹو ہوم۔" وہ تیزی سے کہہ کر باہر بڑھ گئی۔

"وشی میں بھی آرہی ہوں یار۔" ملائکہ نے بوکھلا کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور زیرک کو گھورتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔

☼ ☼ ☼

رات کی سیاہی فرش سے عرش تک پوری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں ڈوبی ہر خوب صورت چیز قدرت کی صناعی کے شاہکار سے بدل کر بدنما عفریت کا روپ دھار چکی تھی۔ ٹیرس پر کھڑے کھڑے اسے اچانک احساس ہوا۔

"کس قدر اندھیرا ہے اور کتنی تنہائی ہے۔"

ریلنگ کے ٹھنڈے پائپ پر ہتھیلیاں جما کر اس نے ناریل کے اونچے درختوں کے پار کسی چاند کو تلاشنا چاہا مگر اس کی آنکھیں بے دید واپس لوٹ آئیں۔

"اماوس کی راتیں شاید ایسی ہی ہوتی ہیں کالی گھنگھور۔" ذہن کے کینوس پر سیاہ و سفید سوچیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ کوئی خاکہ واضح تھا نہ تصویر نہ تحریر نہ کوئی تسلسل۔

"علی!" کسی نے نچلی منزل سے آواز دے کر اسے چونکایا۔

"میں یہاں ہوں ایما ٹیرس پہ آجاؤ۔" اس نے جھک کر آواز دی۔ پھر اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کو دیکھنے لگا۔ جہاں سے ابھی ایمن کو آنا تھا چند ہی لمحوں بعد اس کا چہرہ مسکراتا ہوا نیم وا دروازے سے طلوع ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کافی کا فل سائز بھاپ اڑاتا ہوا مگ تھا اور دوسرے میں چاکلیٹی فلیور ملا ہوا دودھ جو کہ یقیناً "ٹھنڈا ابھی تھا پھر بھی وہ آگے جھک کر بولا۔

"تھینکس فار کافی"

"جی نہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"آپ کے لیے یہ ہے۔ کافی میں اپنے لیے لائی ہوں۔" اس نے دودھ کا گلاس اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے بے چارگی سے گلاس تھاما پھر ایک بڑا سا گھونٹ بھر کے بولا۔

"ہے تو ٹیسٹی۔" ایمن اسے دیکھے گئی اور کافی پیتی رہی۔ جانے علی کو اس کا ارتکاز محسوس ہوا تھا یا نہیں وہ چپ چاپ دودھ کے بڑے بڑے سپ لیتا رہا پھر ایک دم چونک گیا۔

"ایما! میری یادداشت بہت خراب ہو گئی ہے۔" وہ جو اسے دیکھتے ہوئے جانے کہاں پہنچ گئی تھی ایک دم چونک گئی۔

"یہ خیال کیوں آیا آپ کو۔" وہ اپنے چور سے خائف گڑبڑا کر بول پڑی۔

"دیکھو نا پچھلے ہفتے بابا نے بتایا تھا کہ تمہیں دیکھنے کے لیے کچھ لوگ آئے تھے۔ میں اس دن گھر پر نہیں تھا۔ کیا بنا ان کا مجھے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔" غور سے اس کی بات سنتی ایمن منہ بنا کر رہ گئی۔

"میں سمجھی پتا نہیں کتنی امپورٹنٹ بات کرنی تھی آپ کو۔"

"تو کیا یہ امپورٹنٹ بات نہیں۔" اس نے دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"کم از کم میرے لیے نہیں۔ کیونکہ مجھے ان لوگوں میں بلکہ کسی میں بھی کوئی انٹرسٹ نہیں۔" اس کی نظریں تیزی سے خالی ہوتے مگ پر جمی تھیں۔ حسب توقع وہ بین السطور جھانکتے ہوئے ان کے

لفظ سن چکا تھا اور اندر کا مطلب بھی سمجھ چکا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کوئی ایسا بھی ہے۔ جس میں تمہیں انٹرسٹ ہے اور وہ تمہارے لیے امپورٹنٹ بھی ہے۔"

اس نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"ہاں ہے تو!" وہ اب معنی خیزی سے مسکرا رہی تھی۔ علی نے ایک طائرانہ نظر باہر کے اندھیرے پر ڈالی پھر اسے دیکھا۔

"کیا مجھے اس اہم اور دلچسپ شخصیت کا نام جاننے کے لیے اصرار کرنا پڑے گا۔" ایمن اس کے انداز پر زور سے ہنس دی۔

"خود ہی پتا چل جائے گا آپ کو جلد۔" اس نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اٹھ گئی۔

وہ دیر تک وہیں بیٹھا سر سراتا ہوا پردہ دیکھتا رہا۔ جس کے پیچھے وہ گم ہوئی تھی۔ اسے لگا وہ ایمن کے جواب سے کسی حد تک واقف ہے۔

☼ ☼ ☼

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ وہ بہت عرصے بعد اتنی گہری نیند سوئی تھی۔ ملائکہ کا ساتھ اسے ہمیشہ اسی طرح فریش کر دیتا تھا۔ حالانکہ آج کی اس حرکت پر اسے غصہ بھی تھا مگر، پھر بھی اس نے ملائکہ کی کمپنی کو انجوائے ہی کیا تھا۔

واپسی کا سارا وقت وہ منہ پھلا کر ناراضی کا تاثر دیتی، باہر کی طرف رخ موڑے بیٹھی رہی۔ ملائکہ نے ایک بار بھی اس سے معذرت کی نہ کوئی صفائی پیش کی۔ بس مزے مزے کے لطیفے سناتی رہی اور اسی کا اثر تھا کہ گاڑی سے اترتے وقت اس کا موڈ نا صرف خوشگوار ہو چکا تھا بلکہ وہ پورے خلوص دل سے اسے اندر آ کر چائے پینے کی آفر بھی کر چکی تھی۔ جسے ملائکہ نے آئندہ پر ٹال دیا تھا۔ ہاں لیکن اس کے ہاتھ میں وہ شاپر تھمانا نہیں بھولی تھی۔ جس میں اس کے فیورٹ پیلے رنگ کا دیدہ زیب سوٹ تھا۔

ملائکہ سے اس کی ہمیشہ سے اتنی گہری دوستی نہیں تھی بلکہ اگر سچ کہا جائے تو ایک وقت ایسا بھی تھا جب وہ اس سے ٹھیک ٹھاک خار کھاتی تھی۔

وہ زیرک، بلال اور طلحہ کے گروپ میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی۔ تینوں سے اس کی مشترکہ رشتے داری تھی۔ وہ تینوں اگر اپنے مثلث کے ستون تھے تو شاید ملائکہ ان ستونوں کے درمیان، فلائی اوور کی سی خدمات انجام دیتی تھی۔

اپنی اور طلحہ کی منگنی سے پہلے اسے لگتا تھا کہ شاید طلحہ اسی کو پسند کرتا ہے۔ مگر تھوڑے عرصے بعد ہی ملائکہ کے باہر ملک سے آنے والے کسی رشتے کے کزن سے خوش گوار تصادم ہو گیا یہ تصادم بعد میں محبت کا انتہائی خوبصورت حادثہ ثابت ہوا۔ طلحہ کا پرپوزل خود اس کے اپنے لیے آ گیا اور نہ صرف اس کے دل پر چھائے بدگمانی کے بال چھٹے بلکہ دل محبت کے نئے نئے راگ الاپنے لگا۔

وہ خواب میں بھی ملائکہ کے سنگ نت نئے رنگوں میں گھری کھڑی تھی۔ جب اچانک کسی نے دروازے پر زوردار دستک دی۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ بے طرح گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"وشی! دروازہ کھولو جلدی۔" باہر سے مما کی آواز آ رہی تھی۔

کسی انہونی نے اس کے دل میں پنجے گاڑے اور وہ ہر قسم کے خدشات کو ایک لمحے میں ذہن سے جھٹک کر دروازے تک پہنچی۔

"وشی! پاپا کی طبیعت بگڑ رہی ہے ہسپتال لے جانا ہو گا۔ تم جلدی سے آؤ میں نے ایمبولینس کال کی ہے۔"

مما کے ہاتھ ٹھنڈے اور پسینے سے تر بتر تھے۔ کچھ ایسا ہی حال پاپا کا تھا۔

ان کا سرخ چہرہ ان کی شدید تکلیف کا گواہ تھا۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹتی صوفے تک چلی گئی۔ اور ایک کونے میں گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ اتنا سمٹ کر کہ پہلی نظر میں

اندر داخل ہونے والے لوگوں کو جلدی میں اس پر دھیان دینا بھی یاد نہیں رہا۔

کمرے میں بہت سی جانی پہچانی آوازیں تھیں۔ اس نے بہتے آنسوؤں کی روانی کے بیچ پہچاننے کی کوشش کی۔ اعتصام انکل، زیرک اور بلال۔ لیکن سر اٹھا کر پاپا کا ہوش و خرد سے بے گانہ وجود دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ وہیں کونے میں سمٹی روتی رہی۔ اور کپکپاتے لبوں سے اپنے پاپا کی زندگی کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی۔

اس سے پہلے بھی ایک بہت قیمتی یا شاید دنیا کا سب سے قیمتی رشتہ یونہی ہاتھ سے پھسل کر ریت کی مانند فضاؤں میں بکھرا تھا۔ اس میں اب مزید کسی کو کھونے کی سکت نہیں بچی تھی۔

☼ ☼ ☼

بابا کراچی سے واپس آ چکے تھے۔ مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بی پی حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام تجویز کیا تھا۔

وہ بہت دیر ان کے سرہانے ان کا ہاتھ تھامے بیٹھا رہا۔ دل جیسے بار بار ڈوب سا جاتا تھا اور ایمن اس کے تو آنسو ہی رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ خود بھی بہت چپ چپ سا تھا۔

"ارے تم لوگ ایسے منہ لٹکا کر کیوں بیٹھ گئے ہو۔ ٹھیک ہوں میں، بالکل بھلا چنگا ہنسو بولو باتیں کرو۔" بابا نے ماحول پر طاری بوجھل پن کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جواباً" ایمن ایک گہری سانس لے کر انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ سب آپ کی لاپروائی کا نتیجہ ہے بابا۔ جو آپ میڈیسن لینے میں دکھاتے ہیں۔" وہ خفا تھی اور خفگی کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔ بابا مسکرا دیے۔

"او ہو میری بیٹی تو بہت عقل والی ہو گئی ہے۔"

"کوئی شک ہے۔" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر علی کی ہنسی نکل گئی۔

"اچھا آپ میرے لیے ایک کپ اچھی سی چائے تو لے آئیں۔ اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔" وہ تابعداری سے سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

"آپ نے اپنے فیوچر کا کیا سوچا ہے علی؟" اس کے جاتے ہی بابا نے علی سے پوچھا۔ علی نے چونک کر ان کا ختمی، دو ٹوک، عجلت بھرا انداز نوٹ کیا۔ جو یقیناً" کسی خاص بات کا تمہیدی اشارہ تھا۔

"آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔ میں سمجھا نہیں۔"

"اتنا تو سمجھ گئے ہوں گے کہ میں بزنس کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔" ان کے کمزور لہجے سے بھی شگفتگی جھلک رہی تھی۔

"جی۔" اس نے سر جھکا لیا۔

"میں آپ کی شادی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ اس کے بارے میں کیا سوچا آپ نے۔"

"ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا۔"

اسے بابا سے بات کرتے ہوئے جھجک سی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اس قدر اچانک یہ بات چھیڑی تھی۔

"تو اب سوچ لیجیے بیٹا میری طبیعت آئے دن خراب ہو جاتی ہے۔ میں اپنے دل میں کوئی تشنگی نہیں لے کر جانا چاہتا۔"

"بابا پلیز یہ آپ کیسی باتیں کرنے لگے۔ اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔" بابا اس کے محبت بھرے انداز پر ہنس دیے۔

"تو پھر آپ جلدی سے اپنی پسند بتا دیجیے اگر کوئی ہے تو۔"

"کوئی نہیں بابا، میں نے آج تک کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"ہونہہ اس کا مطلب ہے مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" وہ برجستگی سے بولے۔ علی کے چہرے پر مسکراہٹ چمکنے لگی۔

"میری طرف سے مایوسی کے بعد ہی آپ نے ایسا کیوں سوچا بابا۔ آپ کو تو بہت پہلے ہی کچھ کر لینا چاہیے تھا۔ اتنے سال یونہی گزار دیے۔" بابا اس کی

شرارت کو چند لمحے اس کے چہرے پر ٹٹولتے رہے۔ اس کا لہجہ اور انداز بھی کچھ سنجیدہ تھا۔ہاں مگر ہونٹوں کے گوشوں پر میں سمٹی ایک شرارتی مسکراہٹ سارا راز فاش کر گئی۔

"تو بابا سے شرارت کی جا رہی ہے۔" ان کا کہنا تھا کہ دونوں کی بلند ہنسی کمرے میں گونج اٹھی۔

"واقعی یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔" بابا نے اس کی بات کو بڑھاوا دیا۔

"سوچ لیں اب لوگ کیا کہیں گے۔"

"کچھ تو لوگ کہیں گے' لوگوں کا کام ہے کہنا۔ خیر مزاج بر طرف۔ بیٹے ایک خواہش سمجھ لیں' عرصے سے دل میں پل رہی ہے۔ آپ پوری کر سکتے ہیں۔" وہ پھر سے سنجیدہ ہو چکے تھے۔

"جی بابا کہیے۔"

"بیٹا میں! اس عید کے بعد آپ کا اور ایما کا نکاح یا کم از کم نسبت طے کر دینا چاہتا ہوں۔"

بابا نے ایک لمحے رک کر اس کے تاثرات جانچے۔ اس کے مسکراتے ہونٹ اتنی تیزی سے سکڑے کہ وہ گھبرا سے گئے۔

"کیوں آپ کو میری بات پسند نہیں آئی۔"

"یہ بات نہیں ہے بابا۔" اس نے کچھ سوچ کر گہری سانس لی۔

"پھر کوئی اعتراض۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے نہیں مگر ایما کو ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" بابا بے ساختہ مسکرا دیے۔

"اس نے یہ خود کہا ہے آپ سے۔"

"نہیں بس۔۔۔" اسے ایما کی کل رات والی بات یاد آگئی۔

"میں نے خود ہی اندازہ لگایا ہے۔"

"تو بس پھر سمجھ جائیے کہ وہ کوئی اور کوئی نہیں خود آپ ہیں۔"

☼ ☼ ☼

جانے کتنی دیر گزری تھی یا کتنی صدیاں۔ اسے صوفے پر سکڑ کر منہ چھپائے بیٹھے ہوئے۔ ٹانگیں اینٹھ چکی تھیں۔ بازو اکڑ گئے تھے۔ اور رخساروں پر آنسوؤں کے نشان ثبت تھے۔ کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا اور اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"وشمہ!" یہ ملائکہ کی آواز تھی یقیناً" اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔

"انکل بالکل ٹھیک ہیں' ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" اس نے وشمہ کے بکھرے بال دونوں ہاتھوں سے سمیٹے۔ اس کی گیلی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی۔

"کب سے بیٹھی رو رہی ہو یہاں۔ اٹھو چلو ہاسپٹل چلو۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ انکل نے بلایا ہے تمہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وہ میکانکی انداز میں چلتی ہوئی باہر آئی۔

نیلگوں فضاؤں کی صبح کے آثار ابھی پوری طرح نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ ملائکہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ زیرک ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں بلال بیٹھا تھا۔ وشمہ کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو گرنے لگے۔

طلحہ کے بچھڑ جانے کے بعد سے اس کے دل میں بتدریج بڑھتے ہوئے خوف کا اب یہی عالم تھا۔ کسی کو معمولی سی چوٹ بھی لگ جاتی تو اس کا دل ننھی چڑیا کی طرح سہم جاتا۔ وہ بجائے تکلیف کم کرنے کی تدبیر کے بس ہاتھ پیر چھوڑ دیتی۔ دل لگتا کہ ابھی بند جائے گا۔ پاپا کے روم تک پہنچتے پہنچتے کتنے ہی واقعات اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔

اس وقت کوریڈور میں اس کے چلتے قدموں کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔ پاپا بہت کمزور سے بستر پر لیٹے تھے۔ وہ زور زور سے روتی ہوئی ان سے جالپٹی۔

"ارے اللہ! یہ لڑکی تو ان کی طبیعت بگاڑے گی پھر۔" امی نے بڑھ کر اسے الگ کرتے ہوئے اس کی نادانی پر ماتم کیا۔ پاپا نقاہت سے مسکرائے اور اس کی پیشانی چوم لی۔

"میرے پاس بیٹھنے والے۔ سب سے زیادہ پیار بھی تو میری بیٹی کرتی ہے مجھ سے۔" وہ سوں سوں کرتی چہرہ صاف کر رہی تھی۔

"ادھر دیکھو میری طرف بیٹا۔"

کتنی دیر کے بعد جب کمرے میں صرف وہ مما اور پاپا رہ گئے تھے تب پاپا نے اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا۔

"کتنا روئی ہے میری بیٹی۔ پریشان ہو گئی تھی۔" وہ بے انتہا محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ڈر گئی ہو گی نا کہ کہیں طلحہ کی طرح پاپا بھی۔۔۔" ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

"پاپا پلیز۔" وہ ایک بار پھر رو دی۔ اسے ان سے اس قدر تکلیف دہ بات کی امید نہیں تھی۔

"تو بیٹا جی میری بات مان لو نا۔"

"کیسی بات؟" اس نے ان کا چہرہ دیکھا۔

"مما اب تک خاموش تماشائی تھیں۔ اس بار انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"بیٹا! زیرک ابھی بھی تمہارے انتظار میں ہے۔"

"پاپا۔" اس نے حد درجے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ بے حد کمزور تھے اور چند گھنٹوں پہلے ہی آئی سی یو سے باہر آئے تھے اور اس قدر بیماری کے عالم میں بھی انہیں یہی فکر تھی۔

"بیٹا اپنے پاپا کی فکر کو سمجھو' جو صرف تم سے جڑی ہے اور صرف تم ہی اسے ختم کر سکتی ہو۔" مما نے اس کے کندھے پر شفقت بھرا دباؤ ڈالا۔

اس نے اپنے آپ کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا۔ کبھی کبھی مخلص اور سچی محبتیں کتنا مجبور اور بے بس کر دیتی ہیں۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کتنی بہت سی سوچیں ذہن میں گڈمڈ ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

بابا حیدر آباد والے آفس پابندی سے جانے لگے۔ ان کی طبیعت بھی سنبھل گئی تھی۔ اس دن کے بعد سے ان دونوں کے درمیان ایمن سے متعلق کوئی بات تو نہیں ہوئی البتہ اس کا زاویہ نگاہ ضرور بدل گیا تھا۔

اب وہ جب بھی اس پر نگاہ ڈالتا۔ ایک گہری سوچ اس کا احاطہ کر لیتی تھی۔ کتنی ہی بار اس کی غائب دماغی کو خود ایمن نے محسوس کر کے اسے ٹوکا اور وہ بات ٹال گیا۔

وہ مسلسل ایمن کو اپنی شریک حیات کی کسوٹی میں پرکھتا رہتا۔ اب سے پہلے اگر اس نے ہونے والی بیوی کے بارے میں سوچا نہیں تھا تو اب لاتعداد زاویے اور امکانات کے دائرے اس کی آنکھوں میں ناچنے لگے تھے۔

ایک شریک حیات کتنی اچھی ہو سکتی ہے۔ ایمن کے اندر ہر لحاظ سے مکمل اور وفا شعار بیوی بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ سوائے شکل و صورت کے اور وہ بھی اس کے خیال میں ایسی کوئی گئی گزری نہیں تھی۔ آج کل لوگوں میں گوری رنگت کا جتنا کریز زور پکڑ گیا تھا۔ وہی اب تک اس کے رشتے کی راہ میں رکاوٹ تھا۔

بہر حال علی کو اس کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اس کی باطنی خوبیوں میں دلچسپی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ دلچسپی پسند اور پسند' محبت میں بدلنے میں دیر نہ لگے گی۔ وہ اسی کے متعلق سوچتا ہوا بابا کی خواب گاہ میں داخل ہوا بابا گھر پر نہیں تھے اور اسے ایک ضروری فائل درکار تھی۔ فون پر پوچھ کر وہ مطلوبہ الماری تک پہنچا۔ فائل یا تو وہاں تھی ہی نہیں یا پھر اسے مل نہیں رہی تھی۔ مایوس ہو کر اس نے چند لمحے سوچا پھر چابی گھما کر سیف کھولا۔

ایک لمحے کے لیے کسی خیانت کے احساس نے اس کا دامن تھاما۔ لیکن پھر اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔

"میں کون سا کسی بری نیت سے دیکھ رہا ہوں۔" سیف کھولا تو اس نے یہی سوچ کر تھا مگر سامنے ہی رکھے ایک گولڈن رنگ کے فریم نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے فریم اٹھا کر احتیاط سے کھولا۔ بک اسٹائل کے فریم میں دو بچوں کی تصویریں لگی تھیں۔

"ارے!" وہ محظوظ سا ہو کر مسکرا دیا۔

دائیں طرف والی تصویر ایمن کے بچپن کی تھی۔ بائیں طرف اس کے اپنے بچپن کی اسے جانے کیوں اس تصویر سے کوئی مانوسیت محسوس نہیں ہوئی بلکہ پہلی بار میں تو یوں لگا جیسے وہ کوئی اور بچہ ہے اور اس کے پیچھے اس کا نام درج ہے۔

بابا بتا چکے تھے کہ ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی یادداشت مکمل طور پر غائب ہو گئی تھی جبھی دو سال پہلے کی تقریباً" سبھی چیزیں اور واقعات اس کے لیے انجانے سے ہو گئے تھے۔ اس نے حیرت کے مدھم سے احساس کا شکار ہو کر، فریم آہستہ سے بند کر کے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ فائل دیکھنے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارا مگر اب کی بار کوئی اور چیز اس کی توجہ کھینچ رہی تھی۔ یہ چیز اتنی معمولی نہیں تھی۔ کہ وہ ایک نظر ڈال کر واپس رکھ دیتا۔

وہ ایک سیاہ رنگ کا والٹ تھا۔ جس کے ایک سرے پر سیاہی مائل عجیب سے رنگ کا دھبا تھا اور اندر۔۔۔ اس نے اسی دھیان اور احتیاط سے وہ والٹ کھولا۔ جس دھیان اور احتیاط سے چند لمحے قبل فوٹو فریم کھولا تھا۔

ایک نہایت عام اور بہت پرانے والٹ میں بھلا متوجہ کرنے والی چیز کیا ہو سکتی تھی۔ مدھم پڑے ہوئے سنہری رنگ سے لکھا گیا ایک نام جو کورے سلیٹ کی مانند اونگھتے ذہن پر نوکیلے پتھر کی طرح جا لگا تھا۔ وہ خالی نگاہوں سے اس نام کو چند لمحے تکتا رہا۔

"علی!" اسی پل دروازہ چرچرایا اور کسی نے اندر داخل ہو کر اسے آواز دی۔ اس نے اس آواز کو سنا ہی نہیں۔ وہ یونہی خالی الذہن سا بیٹھا اس نام کو بار بار نوک زبان پر تھام رہا تھا۔ جو ایک پل میں مانوسیت کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔

"علی!" اب کی بار آواز بلند تھی۔ وہ چونک کر پلٹا اور تیزی سے والٹ سائیڈ پاکٹ میں ٹھونس لیا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو یہاں، بابا کے وارڈ روب میں؟" وہ حیران سی نزدیک آئی۔

"ایک فائل تھی۔ ملی نہیں۔ بس اب جا رہا تھا۔"

اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں خود کو نارمل کر کے جلدی سے سیف بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" ایمن بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ لاکھ چھپانے پر بھی اس کے چہرے اور گردن پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے۔

"کچھ نہیں۔ شاید گرمی زیادہ لگنے لگی۔" اس نے چہرے پر لکھا مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ پھیرے۔

"تو پہلے کم از کم فین تو آن کر لیتے۔ چلو اب جلدی سے باہر چلو۔ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔" ایمن کے لہجے میں خلوص اور فکر مندی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

موسم صبح سے ابر آلود تھا مگر گرمی اور حبس حد سے زیادہ۔ اس نے جیسے ہی پاپا کے کمرے میں قدم رکھا۔ زیرک کو وہاں موجود پایا۔ اس نے اپنی پیشانی پر پسینہ پھوٹتے محسوس کیا اور فضا میں حبس بڑھتے ہوئے بھی۔ وہ پاپا کے بالکل پاس بیٹھا ہوا تھا اور پاپا چپکے چپکے اس سے جانے کیا کہہ رہے تھے۔ وہ جھک کر سنتے ہوئے دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے دروازے میں ہی رک کر سوچ میں پڑ گئی۔

"اب میں پاپا سے کیا کہوں۔ پتا نہیں انہوں نے اسے کچھ بتا نہ دیا ہو۔" غصہ پوری آب و تاب سے اس کے چہرے پر سجا تھا۔

"ارے، آؤ وشمہ! بیٹا وہاں رک کیوں گئیں۔"

آہٹ پر دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو پزل محسوس کیا۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی پاپا۔" سوال برمحل تھا مگر صورت حال کی وجہ سے اسے بے محل لگنے لگا۔

"طبیعت ٹھیک ہے بالکل۔ آج تو ڈاکٹر ڈس چارجنگ کا بھی کہہ رہے تھے۔" وہ خوشدلی سے کہنے لگے۔ مگر زیرک جو صرف اس پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ اسے کنفیوز کر رہا تھا۔ جھکی جھکی نگاہیں، قدم

رکے رکے سے کے مصداق وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کیا۔

"پاپا! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"ا۔۔۔ اکیلے میں۔" اس نے ایک اڑتی پڑتی نگاہ زیرک پر ڈالی۔ وہ بنا کچھ کہے اٹھ گیا۔

"انکل میں اب چلتا ہوں شام میں آؤں گا پھر۔ ان شاء اللہ۔" وشمہ سر جھکائے ترچھی نگاہوں سے اسے کمرے سے باہر جاتا دیکھتی رہی اور دروازہ بند ہوتے ہی تیزی سے ان کے نزدیک آئی۔

"پاپا! میں نے آپ کی بات مان تو لی تھی۔"

"کون سی والی؟"

"پیچ۔۔۔" وہ جھنجلائی۔

"زیرک والی۔"

"ہاں تو۔"

"آپ نے تو صرف انگیجمنٹ کا کہا تھا اور مما تو پتا نہیں کیا کیا ارادے کر کے بیٹھی ہیں۔" وہ رو دینے والی ہو گئی۔

"ہاں تو اس میں کیا برائی ہے۔"

"کوئی برائی نہیں ہے۔ میں نے کب کہا کہ برائی ہے۔"

"تو تم مانتی ہو کہ اس میں اچھائی ہی اچھائی ہے۔" پاپا دھیرے دھیرے سے مسکرائے۔

"پاپا پلیز ابھی شادی وادی کا مت سوچیں آپ مما سے بھی کہہ دیں میں۔۔۔" وہ رک گئی۔ پاپا نے اس کے چہرے پر الجھن دیکھی۔ بے اختیار اس پر پیار آیا۔

"ٹھیک ہے میں آپ کی مما کو سمجھا دوں گا ڈونٹ وری۔" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اطمینان محسوس کر کے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

ایمن اسے ساتھ لے کر ٹیرس پر آ گئی تھی۔ اور جانے کتنی دیر باتیں کرتی رہی۔ آج شاید اسے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ لیکن علی کو ایک مستقل بے چینی اور اضطراب گھیرے میں لیے رہا۔

ایک نام کی تکرار ذہن میں ہوتی رہی۔ سوچوں کا تمام تر ارتکاز بار بار جا کر اسی کے گرد جمتا رہا۔ اس ارتکاز کے تسلسل کے بیچ، ایمن کی معمولی آواز بھی ہتھوڑے کی مانند لگتی رہی۔

"میرا خیال ہے تمہیں تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہیے۔" اس نے اس کی غائب دماغی محسوس کر لی تھی۔

"ہوں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ ایک دم ہی اٹھا اور کمرے میں چلا گیا۔ ایمن حیرانی سے اس کے طرز عمل پر غور کرتی رہ گئی۔ اصل میں تو اسے اس والٹ کو دیکھنے کی جلدی تھی اور اس الجھن کو رفع کرنے کی بھی جو اس والٹ کو دیکھتے ہی اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے دروازہ لاک کر کے فرصت سے بیڈ پر بیٹھ کر والٹ نکالا۔

اندر پھر سب سے پہلے وہی نام تھا۔ جو اجنبیت کی حدود سے کوسوں پرے، یادداشت کی کھڑکیوں سے جھانک رہا تھا۔

"طلحہ محمد خان۔" زبان نے ایک لمحے میں متعدد بار اس نام کو دہرایا اور اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ والٹ کھولا۔ اندر ایک سیل فون کارڈ تھا اور ایک آئی ڈی کارڈ۔ اس کارڈ پر اس نام کے ساتھ اس کی اپنی تصویر موجود تھی۔ طلحہ محمد خان، ولد یاسین محمد خان۔

وہ بے آواز جنبش کرتے لبوں سے تمام تفصیلات پڑھتا گیا اور یادداشت کے بعد اور اک کے ادھ کھلے دروازوں سے جھانکتی بھیانک ڈراؤنی شکلوں والی حقیقتیں، دل و دماغ کے ڈھنڈار پن میں داخل ہونے کے لیے زور لگانے لگیں۔

اس کے تنفس کا زیر و بم بڑھنے لگا۔ اندھیرے اور روشنی کے رنگ برنگے خانے۔ کبھی دھیان کے الجھے گچھوں سے کوئی ادھ کھلا سرا جا کے اس طویل بے ہوشی سے مل جاتا جس سے باہر آنے کے بعد وہ اپنے بابا اور ایمن سے بالکل اجنبی بن کر ملا تھا۔ جب کہ وہ دونوں اس سے سالوں پرانی شناسائی کے دعوے دار

تھے۔ اور اس بے ہوشی سے پہلے۔۔۔

اس سے پہلے کا کچھ اس نے یاد کرنے کی کوشش بھی کی تو بس، چند ایک منظروں کے سوا کچھ یاد نہ آیا۔

آگ اور خون کا ہولناک منظر، چیخیں، بھاگتے لوگ، سسکتے، رگڑتے جسم، خون کے چھینٹے، بارود کی ناقابلِ برداشت بو اور اس کے جسم میں گھستے ہوئے انگارے، درد، بے اندازہ اور ناقابلِ برداشت اذیت کی لہریں اور اس کی بند ہوتی آنکھیں۔

کبھی اس یاد سے اس کی پرانی شناخت کا کوئی سرا نہ ملا۔ نہ اس نے ڈھونڈا جو بابا نے کہا مان لیا۔ جو ایمن نے بتایا یقین کرلیا۔

ہر بار اس کے سر میں درد کی شدید لہریں اٹھتیں اور ماضی میں جھانکنے کی ہر کوشش کا اختتام بے ہوشی پر ہوتا اور اگلے کئی دن سکون آور ادویات اور پین کلرز کے زیرِ اثر گزر جاتے۔

اس نے عرق آلود پیشانی کو کپکپاتی انگلیوں سے رگڑا۔

آئی ڈی کارڈ پر کراچی کے کسی علاقے کا پتا درج تھا۔

"مٹھی میں بھینچا ہوا کارڈ ہتھیلی پر اترتی نمی سے گیلا ہو گیا تھا۔ اسے کمرے کی دیواروں سے، اس ٹھنڈے ماحول سے وحشت ہونے لگی۔ ذہن میں چیختی ہوئی سیٹیوں اور چند ایک جلتی بجھتی تصاویر کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اضطراری انداز میں گہری گہری سانسیں لیتا باہر نکلا۔ ایک عجیب سی گھٹن اس کا احاطہ کر رہی تھی۔

ذہن بار بار ایک نقطے سے ٹکرا کر واپس پلٹ رہا تھا اور اس کا پلٹنا اس کی گھٹن میں اضافہ کر رہا تھا۔

"طلحہ محمد خان، بسنین محمد خان۔" دو ناموں کی ادائیگی بار بار زبان سے کسی معمول کی طرح جاری و ساری تھی۔ وہ بے سوچے سمجھے گاڑی لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

آج اسے ہر منظر اجنبی لگ رہا تھا۔ ہر شخص انجانا اور ہر بات جھوٹی وہ کون سی گرہ تھی۔ جس پر اس کی ذہنی رو بار بار جا کر لپٹتی تھی مگر، اسے کھولنے سے قاصر تھی۔ شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے، اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کبھی بے حد سخت ہو جاتی اور کبھی بے اختیار ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتا۔ اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ، اس درجہ ٹریفک میں ڈرائیونگ یقیناً "نقصان کا باعث بنتی۔

اس کا بھی کئی بار ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا مگر، کب تک۔

ویسی ہی زوردار دھماکے کی آواز تھی۔ اس کے چاروں طرف آگ کی لپٹیں اور وہی درد انگیز کیفیت، جو انگ انگ میں پھوٹی پڑی تھی۔

بند ہوتی آنکھوں کے پیچھے تمام دروازے کھلتے جا رہے تھے۔

سامنے کا منظر دھندلاتا چلا گیا اور دور کہیں تمام مناظر پر سے دھند ہٹتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے اب تک دل میں کئی بار ایک انجانی سی خوشی نے سر اٹھا کر جگمگاتی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ جو عذیر انکل نے صبح ہاسپٹل پہنچتے ہی اسے سنا دی تھی۔ اسے کتنی ہی دیر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

ایک بہت ہی مشکل معاملہ جسے سلجھاتے سلجھاتے وہ تھک کر ہار ماننے والا ہی تھا۔ اچانک بلا کسی تردد کے خود بخود اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔

ایک ایسی تمنا جسے عمر بھر دل میں پالنے کے باوجود وہ کبھی طلحہ کی زندگی میں مر کر بھی زبان پر لانے والا نہیں تھا۔ ایسی لاحاصل تمنا، اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس کی ناامیدی کو امید میں بدل گئی تھی۔ لاحاصل کو حاصل بنا گئی تھی۔

طلحہ اور روشمہ کی منگنی کی خبر غیر متوقع نہیں تھی۔ غیر معمولی بھی نہیں تھی۔ سب ہی جانتے تھے کہ طلحہ کی امی اور روشمہ کی والدہ آپس میں کزن تھیں۔ دونوں کے والدین ان کی نسبت طے کرنے کے خواہش مند تھے اور زندگی بھر طلحہ کو من پسند زندگی گزارنے کی بے مثال آزادی دینے والی اس کی امی نے اس جگہ پر اس کی ایک نہ چلنے دی تھی۔ اور روشمہ کو اس کے نام کی انگوٹھی پہنا کر ہی دم لیا تھا۔

اپنی منگنی پر سب سے زیادہ ناخوش، خود طلحہ ہی تھا۔

لان میں کھلے دریچے کے پردے سمیٹتے ہوئے اس نے وہاں روشنی آرائشی لائٹس کو بجھتے اور آن کی آن میں سنہری دھوپ کو چمکتے دیکھا۔ گھاس پر پھسکڑا مارے عجیب بےزاری کے عالم میں طلحہ سامنے ہی بیٹھا تھا۔

"طلحہ میرے دوست۔" اس کے دل سے محبت بھری سرگوشی نکلی۔

"آئی مس یو۔" اداسی نے جانے دل کے کس کونے سے نکل کر آنکھوں پر یلغار کر دی تھی اور انہیں قبضے میں لے کر بھگو ڈالا تھا۔

طلحہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ہنوز خفا خفا سا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب تم خوش ہو یا ناخوش یہ تمہارا پرسنل میٹر ہے۔ مگر ٹریٹ تو ہم ہر حال میں لیں گے۔ پہلے ہی اتنے مہینے گزار دیے ہیں تم نے ڈھٹائی دکھاتے ہوئے۔"

اسے بری سی شکل بنا کر چوتھا کینو اٹھاتے ہوئے دیکھ کر اس نے ایک جھپٹا مارا اور کینو اپنے قبضے میں کرلیا۔

نزدیک ہی کین کی کرسیوں پر ملائکہ اور بلال بیٹھے تھے۔ فوراً" تائیدی انداز میں اپنے دو دو من کے سر اوپر نیچے ہلانے لگے۔

طلحہ نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھا۔ یہ سچ تھا کہ منگنی ہو جانے کے کئی مہینے گزر جانے کے بعد بھی وہ اپنے اتنے قریبی دوستوں کو کوئی ٹریٹ دینے کے موڈ میں نہ تھا۔

"ٹریٹ۔" اس نے دوبارہ کینو چھینا۔

"خوشی کی خبر پر دی جاتی ہے۔"

"ارے تو کیا یہ خوشی کی خبر نہیں۔" بلال ڈرامائی انداز میں سہیل وڑائچ کی نقل کرتا ہوا ان لوگوں کی طرف جھک گیا۔

"اگر تیرے لیے ہے تو تو دے ٹریٹ۔"

طلحہ نے بےہودگی کی انتہا پر پہنچ کر جنگلیوں کی طرح اچھا خاصا بڑا کینو منہ میں ٹھونسا اور ٹشو باکس سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"واہ جی واہ، منگیتر تمہاری، منگنی تمہاری، خبر تمہاری اور ٹریٹ دے گا یہ۔" زیرک نے احتجاجی مہم چلانے کی کوشش کی۔

"ایکسکیوزمی یہ سب میرا ہے۔ منگنی منگیتر اور یہ اسٹوپڈ خبر بھی۔ مگر اس میں میری خوشی کہیں نہیں ہے۔"

طلحہ ایک طنزیہ مسکراہٹ سمیت دانت چبا رہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جسے ملائکہ نے تھوڑی دیر بعد توڑا۔

"بس بہت ہو گیا تم ٹریٹ دے رہے ہو یا نہیں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔" طلحہ نے جواب دینے میں ایک سیکنڈ کی دیر نہیں لگائی تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ ہم جا رہے ہیں اور اسی وقت تم سے ملیں گے جب تم ہمیں کسی ریسٹورنٹ میں لنچ یا ڈنر کے لیے بلاؤ گے۔" ملائکہ کو بلال اور زیرک کی طرف دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

زیرک اپنی شرٹ سے نادیدہ مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بلال نے بھی ہاتھ میں پکڑا ہوا کافی کا مگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

طلحہ ان کے انداز دیکھ کر زچ ہو گیا۔ پھر اس نے ملائکہ کو دیکھ کر دانت کچکچائے۔

"او! میر جعفر کی رشتے دار کہاں جانا ہے۔"

"جگہ تمہاری مرضی کی، مینیو ہماری مرضی کا۔" اس نے ڈیل پھینکی۔

"او کے۔" وہ ایک منٹ میں چت ہو گیا۔

بلال کی ہنسی نکل گئی جسے اس نے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ زیرک نے مسکراہٹ دبالی۔

وجہ تھی طلحہ کی تپی ہوئی شکل جو اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"کل پہلا روزہ ہے' بہتر ہو گا آج ہی۔"

"آج ممکن نہیں ہے۔ مجھے ڈیڈ کے ساتھ ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔"

"تو پھر نیکسٹ ویک اینڈ پر افطار ڈنر ڈن۔"

"ڈن" اس نے ملائکہ کی کھلی ہتھیلی پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

طلحہ کی منگنی ہوئے کئی مہینے گزر چکے تھے۔ وہ اپنی منگنی سے ناخوش تھا اور وشمہ کو کچھ خاص پسند نہیں کرتا تھا۔ اس بات سے وہ تینوں ہی واقف تھے۔ اس کی نسبت اس کی امی نے خالصتاً" اپنی پسند سے طے کی تھی۔ وشمہ ایک ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی تھی۔ چلبلی' شرارتی' گریجویشن کی طالبہ۔ کراچی کے سب سے بڑے مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھنے والی۔

وہ لوگ معاشرے کی جس کلاس کے نمائندے تھے۔ وہاں' زیادہ تر لڑکیاں اسی طرح کی ہوتی تھیں۔ اسی لائف اسٹائل کو پسند کرتی تھیں۔ جو ذرا قدامت پسند ہوتیں انہیں زیادہ تر لوگ دقیانوسی' بورنگ اور اولڈ فیشن کے نام سے پکارتے اور لڑکیاں اپنے آپ کو دقیانوسی کہلانا پسند نہیں کرتیں۔

زیرک اور بلال کو بھی ایسی ہی لڑکیاں اٹریکٹ کرتی تھیں۔ جیسی وشمہ تھی یا جیسی ملائکہ' مگر حیرت انگیز طور پر طلحہ نے ایک ہی طرح کی فیشن کی حدوں کو چھوتی' چھوٹے بالوں اور لمبی زبان والی لڑکیوں سے بےزاری کا اظہار کر کے انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

شومئی قسمت کہ اس کی تمام تر فرینڈز حلیے اور بول چال کے لحاظ سے اس کی ذاتی پسند کی ہوتی تھیں۔ اس لیے کوئی بھی دوستی زیادہ عرصہ چل نہیں پاتی تھی۔ یا یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ چلنے نہیں دی جاتی تھی۔ وجہ وہ ہی تینوں ہوتے یا پھر طلحہ کی والدہ۔ وہ خود بے حد آزاد خیال تھیں اور فیشن ایبل بھی۔ اپنے کپڑوں کی ڈیزائننگ میں کمال مہارت اور خود پر دی جانے والی بے حد توجہ نے ان کو ان کی عمر سے کئی سال چھوٹا کر دیا تھا۔ وہ اپنے ہی جیسی بہو لانے کی خواہش مند تھیں اور دیکھا جائے تو یہ ان کی خواہش کوئی بے جا نہ تھی۔

طلحہ نے ان کا کہا مان تو لیا لیکن وہ اپنی امی اور ڈیڈ سے سخت ناراض تھا اور ان تینوں سے بھی خاص طور پر ملائکہ سے جس نے وشمہ سے منگنی کرنے پر آنٹی سے اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کیا تھا اور طلحہ اسے اس ناقابل تلافی جرم کے لیے معاف کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔

باقی رہے بلال اور زیرک۔ تو انہوں نے ایک دوبار طلحہ کی حمایت کرنے کی کوشش بھی کی تو نتیجتاً" نا صرف طلحہ کی امی بلکہ اپنے گھر کے بزرگوں سے بھی سخت سست سننی پڑی۔

فی الحال طلحہ صرف خاموش تھا اور اس کی ناراضی کے مدھم پڑتے نشانات میں بھی یہ بات واضح تھی کہ کئی مہینے گزر جانے کے بعد بھی اس کے دل میں وشمہ کے لیے کوئی نرم گوشہ اب تک نہ بن پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا پہلا عشرہ قریب الاختتام تھا۔ جب ایک دن طے کر کے ان لوگوں نے زبردستی طلحہ سے ٹریٹ لی۔

افطار کے بعد ڈنر ٹھونستے ہوئے تینوں کی زبانیں کترکتر چلتی رہیں۔ جبکہ طلحہ منہ بنائے ہوں ہاں کرتا رہا۔ جسے وہ لوگ قطعی خاطر میں نہ لائے۔ ڈنر کے بعد حسب معمول طارق روڈ کا پروگرام بنا اور یہ وہ واحد پروگرام تھا۔ جس کی تکمیل سے پہلے انہوں نے ملائکہ کو وہیں سے گھر ٹہلا دیا۔

"مجھے پتا ہے تم لوگ اب کہاں جاؤ گے اور کیوں۔" وہ انہیں کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھی۔

"پتا ہے نا تو جاؤ شاباش' جلدی سے گھر چلی جاؤ۔

اچھے بچے گندے کام نہیں کرتے۔" بلال اسے چمکارتا ہوا ڈھٹائی سے ہنس رہا تھا۔

وہ انہیں گھورتی ہوئی چلی گئی۔ مگر جانے سے پہلے طلحہ کے کان میں جانے کیا صور پھونک کے گئی کہ اس کا موڈ آف ہو گیا اور پھر اگلے کئی گھنٹے بحال نہ ہو سکا۔

یہاں تک کہ طارق روڈ کی چمک دمک' رونق بلکہ وہاں شاپنگ کے لیے آئی ہوئی پیاری پیاری "بچیاں" بھی اس کا موڈ ٹھیک نہیں کر سکیں۔

"آخر ایسا کیا کہہ دیا اس نے کہ تمہارا منہ اس حد تک لٹک گیا کہ واپس اپنی جگہ پر جا ہی نہیں پا رہا۔"

جلد ہی وہ لوگ واپسی کے لیے نکل گئے اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ پورا رمضان باقاعدگی سے انجوائے کرنے والے وقت کو انہوں نے بددلی سے گزارا تھا۔

"امی نے کہلوا دیا کہ کسی دن ٹائم نکال کر وشمہ کو بھی عید کی شاپنگ کروا دو۔" طلحہ کا کہنا تھا کہ گاڑی بلال اور زیرک کے قہقہوں سے گونج اٹھی۔

"ایسا کوئی لیٹسٹ جوک نہیں سنایا میں نے تم لوگوں کو۔"

"ایسا کوئی پرانا جوک بھی نہیں سنایا تم نے ہم لوگوں کو۔" بلال فوراً" بولا اور پھر وہی قہقہے۔

"مائی فٹ امی جو دل چاہے کریں۔ میں نہیں کرانے والا اسے کوئی شاپنگ وانپگ۔" وہ لاتعلقی سے کہہ کر باہر دیکھنے لگا۔ زیرک نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ نفرتوں کی حدود پر کھڑے بےزاری کے تاثرات اس کے خوب صورت چہرے سے ہویدا تھے۔ اس کے دل میں بے اختیار طلحہ اور اس لڑکی وشمہ کے لیے ہمدردی کے جذبات نے بیک وقت جنم لیا۔

وشمہ کے جذبات سے وہ ناواقف تھا۔ مگر طلحہ تو اس کا قریب ترین دوست تھا۔ اس کے محسوسات اور زبردستی کے رشتے پر منجمد جذبات اس پر پوری طرح عیاں تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فریقین کی مرضی اور خوشی معلوم کیے بغیر جوڑے گئے اس رشتے کا منطقی انجام کیا ہونے والا تھا۔

ہاں اتنا ضرور جانتا تھا کہ' طلحہ کو اپنی من پسند شریک حیات چننے کا پورا حق حاصل تھا اور وشمہ کا کوئی قصور نہ تھا کہ اسے طلحہ کے سر پر مسلط کیا جاتا۔

☼ ☼ ☼

"تم تو سر تا پا چاہے جانے کے لائق ہو۔" زیرک کے دل نے پہلی بار اسے دیکھ کر سوچا تھا۔ وہ اس کے آفس آئی تھی ملنے کے لیے۔ وہ اس سے ریکونسٹ کرنے آئی تھی کہ وہ طلحہ کو اپنے فرینڈز سرکل میں متعارف کروانے کے لیے ایک گیٹ ٹوگیدر ارینج کر بیٹھی ہے۔ مگر طلحہ نے کسی میٹنگ میں شرکت کی وجہ سے اس پارٹی میں آنے سے معذرت کر لی ہے۔

"میری بہت ساری فرینڈز اور کلاس فیلوز جو انگیج منٹ کے فنکشن میں نہیں آسکے تھے۔ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ تو ان کے اتنے کلوز فرینڈ ہیں۔ اگر آپ کہیں گے تو آئم شیور وہ منع نہیں کر سکیں گے۔"

بے حد پر اعتماد انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"ایکسکیوز می! کیا لیں گی آپ کافی یا کولڈ ڈرنک۔"

"کافی۔" بے تکلفی سے کہہ کر وہ اپنے پرس کی چین سے کھیلنے لگی۔ فون پر آرڈر دے کر واپس پلٹتے زیرک کی نگاہیں اس کے نقوش اور گیسوؤں میں الجھ گئیں۔ بے داغ شفاف سرخیاں چھلکاتی جلد پر میک اپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کانوں میں ننھے ڈائمنڈز اور ہونٹ اس قدر گلابی تھے کہ انہیں کسی لپ اسٹک کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔

کافی آنے تک وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ وہ اسی پر اعتماد انداز میں جواب دیتی رہی جو اس کی کلاس کا خاصہ ہوتی ہے۔

نفی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھوں پر پڑے ہوئے سلکی بالوں کے لچھے ذرا کی ذرا آگے پیچھے ڈول جاتے اور ساتھ ہی اس کا دل بھی۔ زیرک کو لگ رہا تھا ان سنہری' اخروٹی ملائم' ہتھکڑیوں

کے طلسم زدہ چکر سے اس کا دل شاید ہی کبھی باہر آ سکے۔

وہ دل و دماغ کی پوری سنجیدگی اور آمادگی سے کسی کی ہو چکی تھی۔ اور دل آمادہ بہ شرارت' وہ اس کے دوست کی امانت تھی اور دماغی رو مسلسل ترغیب خیانت' وہ اس کے سامنے اپنا معاملہ لے کر آئی تھی اور سامنے بیٹھے بیٹھے اس کا اپنا معاملہ گمبیھر ہو چلا تھا۔

"پھر آپ طلحہ سے کہیں گے نا پلیز۔" کافی ختم ہو چکی تھی۔ وہ جس قدر اطمینان اور اعتماد سے آئی تھی۔ اسی قدر اطمینان اور پر اعتماد انداز لیے وہاں سے جا چکی تھی اور شاید زیرک کا دل بھی۔

☼ ☼ ☼

وہ طلحہ کو چاہنے کے باوجود اس پارٹی میں شرکت کے لیے راضی نہ کر سکا اور وہ بعد میں جتنی بار بھی اس سے ملی' زیرک پر بس ایک شکایتی نظر ڈال کر رہ گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ طلحہ کو مجبور نہ کر سکا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں طلحہ خود ہی وشمہ میں انٹرسٹ نہیں رکھتا تھا اور اس کا اپنا انٹرسٹ نہ چاہتے ہوئے بھی خود بخود وشمہ کی طرف منتقل ہوا جا رہا تھا۔

وہ دوبارہ اس سے تنہائی میں کبھی نہیں مل سکا مگر بلال' طلحہ اور ملائکہ کی موجودگی میں بھی ایک وہی اسے زیادہ سے زیادہ اپنی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا پوائنٹ آف ویو اور دو ٹوک انداز اسے اچھا لگتا تھا اور وہ اس ملاقات کو سوچ کر ہی اگلے کئی دن تک مسحور رہتا۔

طلحہ کی اس کے لیے ناپسندیدگی اپنی جگہ پر تھی اور یہ حقیقت بھی کہ وہ اس کی ہونے والی بیوی ہے۔ اس لیے لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اسے پانے کی خواہش کبھی نہ کر سکا۔ ہاں لیکن دل ہی دل میں اس کی پسندیدگی اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔ وہ اسے سننا چاہتا تھا' اسے دیکھنا چاہتا تھا' محسوس کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کے دل کا راز صرف اس تک محدود نہیں رہا۔ اس کی آنکھوں کی جگمگاہٹ نے کسی اور پر بھی افشا کر ڈالا ہے۔

☼ ☼ ☼

عید نزدیک تھی۔ رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ تفریح بھی جاری و ساری تھی' نماز روزہ بھی اور حسب توفیق نفلی عبادات بھی۔

روز مرہ کے معمول کے پروگرام کے مطابق وہ لوگ شہر کی ایک مشہور اور بڑی مارکیٹ میں رونقوں سے دل بہلانے نکلے تھے۔

"یار ایک سے ایک بچی میری گرل فرینڈ رہ چکی ہے۔ لیکن جو مزا یہاں تاڑنے میں ہے نا' قسم سے اتنی چکنی بچیاں میں نے کسی اور ایونٹ پر یوں سڑکوں پر نکلتی نہیں دیکھیں۔"

بلال خاصے لوفرانہ اسٹائل میں آنکھ مار کر کہہ رہا تھا۔

زیرک اور طلحہ نے خوب حظ اٹھایا اور آئس کریم پارلر میں گھس گئے۔

"اے شٹ یار۔" طلحہ وہاں بیٹھتے ہی سیل اسکرین دیکھ کر بےزار ہو گیا۔

"یار امی کہہ رہی ہیں کال کرنے کے لیے۔"

"تو تم اتنا چڑ کیوں رہے ہو؟"

"یار وہی وشمہ کی شاپنگ کا پرابلم' سیل میں بیلنس بھی نہیں ہے اف' یار تنگ آ گیا ہوں میں۔" اس نے تھک کر گردن کرسی کی پشت پر ڈال دی۔ زیرک ترحم آمیز انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا وہ زندگی میں آخری بار یہ چہرہ دیکھ رہا ہے۔

"میں آتا ہوں لوڈ کروا کے' تم لوگوں کو چاہیے؟" وہ انہیں نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر باہر نکل گیا۔ بلال اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر اس کے نظروں سے اوجھل ہونے پر زیرک کو دیکھا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں' زیرک!" اس کی بات بہت مبہم تھی۔ زیرک نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ریسٹورینٹ میں داخل ہوتی کسی ماہ جبینہ کو دیکھ کر مستعد ہو چکا تھا۔

"کل وشمہ ملی تھی مجھے۔ بتا رہی تھی کہ تم اسے لائیک کرتے ہو۔" اسے یقین تھا اس کی بات پر زیرک کی سیٹی اور سٹی دونوں گم ہو جائیں گی اور یہی ہوا۔

"پاگل ہو گیا وہ ایسا کیسے کہہ سکتی ہے۔" زیرک نے ایک گہری سانس لے کر چہرے کے بدلتے رنگ سنبھالے۔

"کیوں' وہ کیوں نہیں کہہ سکتی۔"

"اسے کون بتائے گا کہ..." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ نظریں ٹیبل پر جمی رہ گئیں اور بلال کی محظوظ مسکراہٹ نے اسے گھیر لیا۔

"کہ..." اس کا ادھورا سوال مکمل بھی تھا اور معنی خیز بھی۔

"کہ تم اسے پسند کرتے ہو' یہی نا۔" زیرک نے ایک گہری سانس لے کر اندر کے ماحول پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اسے یوں لگا بلال نے اسے سب کے سامنے بے پردہ کر دیا ہے۔

"فضول باتیں مت کرو۔" بلال نے بہت کامیابی سے بنا کسی محنت کے اس سے اصل بات اگلوالی تھی۔

"یہ فضول بات ہے۔"

"اور کیا فضول ہی ہے۔" اسے لگ رہا تھا۔ بلال اس کے اندر تک جھانک رہا تھا۔ اب ساری بحث لاحاصل ہی تھی۔ پھر بھی وہ یوں آسانی سے ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

"کیا فضول ہے۔ یہ کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو۔ یا یہ کہ جسے تم پسند کرتے ہو وہ بد قسمتی سے تمہارے عزیز از جان دوست کی منگیتر ہے۔" زیرک نے خود کو بلال کی نظروں میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔

"دونوں ہی باتیں فضول ہیں۔"

"اور دونوں ہی باتیں سچی ہیں... اور تلخ بھی۔" بلال فوراً بولا۔

"اچھا اور کے مان لیا۔ میں پسند کرتا ہوں وشمہ کو تو..." زیرک کے انداز میں ہٹ دھرمی آ گئی۔

"تو کچھ نہیں' میں تو بس یونہی تم سے سننا چاہ رہا تھا۔" بلال نے کندھے اچکا دیے۔

"اور یہ سن کر تمہیں کیا ملا۔ کم از کم خوشی نہیں ملی ہو گی۔"

"میں نے خوش ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

"تو پھر..."

"صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ جتنا بے وقوف تم ہمیں سمجھتے ہو۔ اتنے ہم ہیں نہیں یہ تو تم ہو..." بلال کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کان پھاڑ دینے والے لرزہ خیز دھماکے نے حواس خطا کر دیے۔

ریسٹورینٹ کی چھت اور دیواریں اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ فرنٹ پر موجود گلاس وال زوردار چھناکے سے کرچیوں میں بٹ گئی۔ اور یہ کرچیاں قریبی لوگوں کے چہرے اور جسم میں پیوست ہو گئیں۔

دھماکے کی آواز اتنی زوردار تھی کہ یوں لگا جیسے کان بہرے ہو چکے ہیں' حواس سلب' ذہن خالی صرف چیختے پکارتے لوگ دکھائی دیتے۔ زیرک اور بلال بدحواسی سے اٹھے مگر زیرک کسی کا زوردار دھکا لگنے سے ان ہی نوکدار کرچیوں پر منہ کے بل گرا۔

"اف!" ہتھیلیاں ٹکا کر اٹھنے کی کوشش نے مزید اذیت سے دوچار کیا۔ جبھی بلال اس کے اوپر جھکا۔ اسے اٹھایا اور یونہی دھکم پیل کرتا باہر نکل کر بے اندازہ ایک سمت میں بے تحاشا دوڑتا چلا گیا۔

ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ ایک قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ لوگ کچل رہے تھے۔ اپنی جانیں بچانے کے لیے دوسروں کو دھکیل رہے تھے۔ دوسروں کو پیروں تلے روند رہے تھے۔ دوکانوں کے آگے فٹ پاتھ پر رکھا گیا سامان ٹھوکروں کی زد میں آ کر مین روڈ تک بکھر گیا تھا۔ کوئی کسی کو دیکھ رہا تھا نہ پہچان رہا تھا۔

اس کا اور بلال کا بھی یہی حال تھا۔ بدحواسی کے عالم میں ریلے کے ساتھ بہتے ہوئے' جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑے۔ یوں لگتا تھا ملک الموت پیچھے پڑا ہے۔

بڑی مشکل اور دقت سے لوگوں کے بیچ دھکم پیل میں جگہ بنا کر چند لمحوں کے لیے بگڑتے تنفس کو ہموار کرنے کے لیے رکے تو ایک روح فرسا خیال دل و ذہن

کو لرزا گیا۔

"بلال ' طلحہ۔" اس کے خوفزدہ لہجے میں ایک خدشہ سانسیں لے رہا تھا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ہانپتا ہوا بلال ایک دم سیدھا ہوا۔

"چلو فورا" واپس ابھی چلو۔"

وہ لوگ جائے حادثہ سے دور آچکے تھے۔ آگ کے بلند ہوتے شعلے وہاں سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ شور مچاتے ' جانیں بچاتے معصوم لوگوں کے ہراساں چہروں پر موت کا رقص رقم تھا۔ کون جانے کون ' کس سے کہاں بچھڑ گیا تھا۔

زیرک کو اس تمام منظر کی پروا ایک دم ختم ہو گئی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں سے خون رس رہا تھا اور اب کی بار وہ بلال کا ہاتھ تھام کر واپس مڑ چکا تھا۔

دھماکے کی سمت رخ کرنا ازحد مشکل تھا۔ وہ دونوں حواس باختہ بھی تھے اور خوفزدہ بھی۔ وہ لوگ ' دوسروں کی بالکل مخالف سمت جا رہے تھے۔ آتے جاتے بدحواس لوگوں میں طلحہ کو ڈھونڈتے۔

وہ یقینا" اسی سمت گیا تھا۔ جہاں یہ دھماکہ ہوا تھا۔ لوگوں کے درمیان سے ٹھوکریں اور دھکے کھاتے یہ لوگ بالآخر جائے حادثہ سے کافی نزدیک پہنچ گئے۔ پھر آنکھوں نے جو منظر دیکھا۔ آگے بڑھنے کی تو کیا۔ ملنے جلنے کی بھی طاقت نہ بچی۔ آگ اور خون کا سیلاب کٹی پھٹی لاشیں اور تڑپتے ہوئے زخمی جسم۔ بلال بے ساختہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بری طرح اپنا سینہ مسل رہا تھا۔ زیرک کی اپنی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ بالآخر آگے بڑھنے سے انکاری مردہ قدموں کو انہوں نے واپس موڑ لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ رات گویا سب کی زندگیوں کی طویل ترین اور بدترین رات تھی۔ بلال اور زیرک کے گھر پہنچنے پر طلحہ کے گھر والوں کی مضطرب سوالیہ نظریں ' جس طرح ان کے چہرے کھوج رہی تھیں وہ ' دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ اوپر سے وہ حواس شکن حادثہ۔ ایک بار تو بلال ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر بے طرح رو ہی پڑا۔

بار بار وہی خون آلودہ مناظر یادداشت کا امتحان لینے پتلیوں میں آن ٹھہرتے دونوں کی فیملیز بشمول ملائکہ ' وشمہ اور ان کے گھر والوں کے ' طلحہ کے گھر جمع ہو چکی تھیں۔ وشمہ کے بھائی قاسم اور بلال کے چھوٹے بھائی طلال اور طلحہ کے والد صاحب جائے حادثہ کی طرف فورا" ہی روانہ ہو گئے۔

"زخمیوں کو جناح اور سول لے جایا گیا ہے۔ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ تم بھی فورا" پہنچو تاکہ کپڑوں سے شناخت ہو سکے۔" قاسم کپکپاتی آواز میں زیرک سے کہہ رہا تھا۔

اس کے دل میں چھپا خوف ' زبان کی لڑکھڑاہٹ سے عیاں تھا۔ ایک طرف اس کے بچپن کے عزیز دوست ہراساں تھے۔ تو دوسری جانب اس کی اپنی بہن کا مستقبل۔ زیرک اور بلال کے ماؤف ہوتے دماغ صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ جائے نمازیں بچھ گئیں۔ کتنی ہی ماؤں کے لبوں سے جھڑتے دعاؤں کے پھول ' عرش کی سمت عازم سفر ہو گئے اور تسبیحات انگلیوں پر پریشان۔

پوری رات کا ایک ایک لمحہ گویا انگاروں پر ننگے پیر چل کر طے ہوا اور فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی مایوس چہروں کی واپسی ہوئی۔

"کہیں پتا نہیں چلا۔ سب ہاسپٹل دیکھ ڈالے اور ۔۔۔ اور جنازے بھی۔" قاسم کی آواز بتاتے ہوئے پھٹ گئی۔

طلحہ کی امی ' لبنیٰ یاسین کو غش آگیا۔ پورے گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔

☼ ☼ ☼

ضروری تو نہیں کہ عید ہمیشہ خوشیوں کی پیامبر بن کر آئے۔ ایسی بھی عیدیں ہوتی ہیں۔ بجھے ہوئے چہرے ' روتی آنکھیں اور غم کے پہاڑ جیسے بوجھ تلے ' دم گھٹتے ' رک رک کر چلتے دل۔ رمضان کے بابرکت مہینے میں

یہی بے برکتی پھیلی تھی۔ مبارک ساعتوں میں نحوست اتر آئی تھی اور مضطرب دلوں کو کسی صورت قرار نہ مل سکا تھا۔

کسی نے کب سوچا تھا کہ کل تک بلکہ چند لمحے پہلے تک یہ جیتا ' جاگتا زندگی سے بھرپور وجود یوں لقمہ اجل بن جائے گا کہ آخری وقت میں جی بھر کے دیکھنا بھی نصیب نہ ہو گا۔

یاسین صاحب کی کمر ٹوٹ گئی ' کندھے جھک گئے۔ طلحہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جو بھری جوانی میں کسی بے رحم شخص کے سفاک منصوبے کی بھینٹ چڑھ گیا۔

وہ اور اس جیسے کتنے ہی جوان ' معصوم بچے ' کھلکھلاتی رونقیں پھیلاتی لڑکیاں اور محبت کرنے والی مائیں ابدی نیند جا سوئی تھیں۔ کتنے ہی بچے یتیم ہو گئے تھے۔

نظر کرم فرما ہی دے
دین و دھرم کو دکھا ہی دے
جلتی ہوئی تنہائیاں ' روتی ہوئی پرچھائیاں
کیسی چلی یہ ہوا چھایا یہ کیسا سماں
روح جم سی گئی۔ جسم پگھل سا گیا
ٹوٹے خوابوں کے منظر پر تیرا جہاں چل دیا
نور خدا ' نور خدا
وہ کہاں چھپا ہے ' ہمیں یہ بتا

پھر کتنی عیدیں گزریں یادوں سے جی بہلاتے اور زبردستی مسکراتے۔ دوست کو یاد کر کر کے سب سے چھپ کے تنہائی میں آنسو بہاتے۔

بلال اور زیرک جو بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ ملائکہ کی دل جوئی اور طلحہ کے والدین کی خاطر خود کو سنبھالنے لگے۔

معمولات زندگی اپنے محور کے گرد پلٹے اور یاسین صاحب نے خود کو سمیٹ کر بیگم کو بھی سنبھالا اور کاروبار کی جانب بھی توجہ دی۔ یوں بھی جانے والوں کا غم کب تک منایا جاتا ہے۔ یہ قدرت الٰہی ہے کہ انسان نے اپنا کیسا ہی قریبی ' انمول رشتہ ' کیوں نہ گنوایا ہو۔ اسے جینا پڑتا ہے چاہے مر مر کر ہی۔ آگے چلنا پڑتا ہے چاہے دکھی یادوں کے بوجھل لاشیں کندھوں پر اٹھا کر وہ بھی جی رہے تھے۔ زندگی کے سفر میں آگے بڑھ رہے تھے۔

"وشمہ کیسی ہے؟" ایک دن جب وہ تینوں زیرک کے گھر مل کر بیٹھے تو زیرک کے منہ سے نکلا۔

"ٹھیک ہے ' بے چاری صبیحہ آنٹی اس کے لیے بہت پریشان ہیں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ نہ طلحہ کو بھولنے کو تیار ہے۔ نہ شادی کے لیے۔" ملائکہ تاسف سے کہہ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر افسوس کی جو کیفیت رقم تھی اس سے کہیں بڑھ کر دکھ زیرک کے چہرے پر نظر آیا وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

دل و دماغ میں بے اختیار سالوں پہلے کی وہ بات گھوم گئی جو ' طلحہ کی موت سے چند لمحے قبل ان دونوں میں موضوع گفتگو بن گئی تھی۔ بالکل اچانک اور غیر ارادی طور پر بلال کے لبوں نے جنبش کی۔

"وشمہ کو صرف تم زندگی کی طرف لا سکتے ہو ' زیرک۔" ملائکہ ایک دم اچھل پڑی۔ جبکہ زیرک حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بلال کی آنکھوں میں چمک ابھر رہی تھی اور زیرک جس طرح اسے نظروں میں تنبیہہ کر رہا تھا وہ کچھ اور ہی کہانی تھی۔

"تم لوگوں نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔" ملائکہ بلال سے ساری بات سننے کے بعد منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"چھپاتے تو تب نا جب ہمارے درمیان بعد میں ایسا کوئی میٹر ڈسکس ہوتا۔ یہ تو آج تم سے وشمہ کے بارے میں سن کر مجھے خیال آیا کہ اس کے لیے کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو اس کے ماضی کو اور طلحہ سے اس کی جذباتی وابستگی کو جانتا ہو۔ تو زیرک سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس اسے پسند کرنے کا مارجن بھی ہے۔" بلال تفصیل سے ملائکہ کو سمجھا رہا تھا۔

آنے والے دن زندگی میں یقینا" بہت سی خوشیاں

اور تبدیلیاں لانے والے تھے۔ وہ دریچے پر پردے برابر کرکے مسکرا دیا۔ صبح کاذب کے نمودار ہوتے روشن آثار نے اس کے دل میں امید کی نئی شمعیں روشن کر دی تھیں۔ آج بہت دن بعد اس نے پوری رات طلحہ کی یاد میں گزاری تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بے حد ناراض اور خفا سا بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ دائیں طرف بابا سر جھکائے گومگو سے بیٹھے تھے۔ بائیں جانب کھڑی ایمن امید و بیم کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بھی تھا۔ آپ کو کم از کم ایک بار مجھے سب کچھ بتانا تو چاہیے تھا۔" اس کے لہجے میں کیا کچھ نہ تھا۔ غم، غصہ، پچھتاوا اور ایک عجیب سا اضطراب۔

"میں تمہیں بتا تو رہا ہوں۔ تمہارے ٹھیک ہو جانے کے بعد میں کراچی گیا تھا۔ بہانے سے تمہارے والدین سے ملنے۔ مگر وہاں جا کر پتا چلا کہ وہاں تو سب تمہیں مرحوم تصور کرکے 'صبر کر چکے۔'" آج رضا رسول بخش صاحب اپنے آپ کو سخت مشکل میں محسوس کر رہے تھے۔

"اور آپ نے سوچا کہ میں ان ماں باپ کو زندگی بھر ان کی اکلوتی اولاد سے ملنے ہی نہ دوں وہ تو صبر کر چکے اور میں، میرا کیا قصور تھا۔"

"میں نے کسی بری نیت سے یہ سب نہیں کیا تھا بیٹا تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔" ہار مان کر عاجزی سے کہتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا۔

اسے ایک لمحے کے لیے شرمندگی ہوئی۔ ایمن اپنے بابا کو یوں روہانسا دیکھ کر بے چین ہو گئی۔

"میرا اپنا بیٹا علی یونہی جواں سالی میں ایک حادثے کی نذر ہو گیا۔ میری اذیت کوئی ایسا باپ ہی جان سکتا ہے۔ جس نے اپنا بیٹا کھویا ہو۔ شاید تمہارا باپ۔" ان کے بوڑھے چہرے کی جھریوں میں درد سسکنے لگا۔

"تمہیں ہسپتال میں بے یارومددگار، زخمی پڑا دیکھ کر میں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھوں گا۔ اس وقت تو تم مجھے بالکل علی جیسے لگے۔ وہ عمر میں تم سے کئی سال بڑا تھا۔ مگر اس نے بالکل تمہاری طرح کسی سرکاری ہسپتال کے بستر پر تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا تھا۔ میں اس تک وقت پر نہیں پہنچ سکا اور میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔" انہوں نے ضبط کی انتہائی منازل پر پہنچ کر کانپتے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر ڈالیں۔ ایمن نے ان کے پاس جا کر ان کے کندھے پر دباؤ ڈالا۔

"ہاں تم غصہ کرنے میں حق بجانب ہو۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ میرے بتانے سے کیا فائدہ ہوتا تم یادداشت کھو چکے تھے۔ سب علم ہو جانے پر بھی تو تم الجھ جاتے یا پھر سرے سے وہاں جانا پسند ہی نہ کرتے جو تھے تو تمہارا اپنا خون مگر تمہارے لیے سراسر انجان ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس مجھ سے، ایمن سے اور گھر سے تمہاری حد درجہ انسیت نے میرے دل سے تمہیں کھو دینے کا خوف نکال دیا تھا۔

میرا تمہیں اپنے پاس رکھنے کا کوئی برا مقصد نہ تھا۔ نہ میری نیت میں کھوٹ تھا۔ میں تمہیں اپنا بیٹا بنا کر لایا تھا اور آج بھی تم میرے لیے بیٹے ہی کی طرح ہو۔ میں صرف ایک محروم باپ کے دل کی پیاس بجھانا چاہتا تھا۔ اگر تمہارے خیال میں میں نے غلط کیا تو مجھے معاف کر دو۔" انہوں نے بات مکمل کرکے چہرہ جھکا لیا۔

طلحہ کتنے ہی لمحے بنا کچھ کہے انہیں دیکھتا رہا وہ رو رہے تھے ایک نیکی کرنے پر اس سے معافی مانگ رہے تھے۔ اس کو سہارا دینے پر صفائیاں پیش کر رہے تھے اسے اپنا بیٹا سمجھ لینے پر۔ وہ یقیناً اس کی بے رخی کے حق دار نہیں تھے۔ علی نے بے ساختہ اٹھ کر ان کے ہاتھ تھامے۔

"مجھ سے معافی مانگ کر شرمندہ مت کریں بابا۔ آپ نے جو کیا ٹھیک کیا۔ بلکہ مجھے اس بدگمانی کے لیے معاف کر دیں۔ جس نے آپ کے کردار پر اور آپ کی نیک نیتی پر غلط گمان کیا۔ لیکن اب ..... مجھے جانا ہو گا

بابا۔ اپنے ماں باپ کے پاس۔ ان لوگوں کے پاس جو میری راہ دیکھتے دیکھتے ناامید ہو کر مجھ پر صبر کر بیٹھے اور اور پتا نہیں میری ماں کو بھی صبر آیا ہو گا یا نہیں۔"

اس کے وجود میں ایکا ایکی ایک مضطرب لہر نے سر اٹھایا۔ وہ بے اختیار کھڑا ہو گیا۔

"تم ہر فیصلہ کرنے میں آزاد ہو، خود مختار ہو اور حق بجانب بھی۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ ایک بدنصیب باپ یہاں بھی تمہاری راہ دیکھتا ہو گا۔"

لاکھ ضبط کی کوشش کے باوجود ان کی ڈبڈباتی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر رزق خاک ہو گئے۔ آنسو بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتی ایمن نے یک بارگی اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

رمضان کا پہلا عشرہ اختتام پذیر تھا اور رمضان کے آغاز سے بھی پہلے سے زیرک نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ عید کی شاپنگ وہ اسے خود کروائے گا۔

ناگواری کی شدید لہر کو چہرے پر آنے سے روکتے ہوئے اس نے امی کی بات سنی تھی جو اسے بتا رہی تھیں کہ زیرک لاؤنج میں اس کا انتظار کر رہا ہے۔

پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے وہ شہر کے سب سے بڑے اور مصروف ترین مال میں ایک سے دوسری دوکان کا چکر لگا رہی تھی۔ زیرک ماتھے پر ایک شکن لائے بغیر اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

کچھ بھی تھا لیکن دل میں منہ چھپائے کسی اندھیرے کونے میں بیٹھا خواب آج حقیقت کا روپ دھارے سامنے ہی کھلکھلا رہا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ وشمہ اسے ستانا یا اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہتی تھی، اسے کچھ پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہا تھا جب لبنیٰ آنٹی نے اس سے طلحہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانے کو کہا تھا اور پھر اس کے بعد اسے اس کی شکل دیکھنی ہی نصیب نہ ہوئی۔ ان ہی سوچوں میں وہ اس قدر گم ہوئی کہ فضا میں اٹھنے والے نامانوس شور نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے گڑبڑا کر نا سمجھی سے ادھر ادھر دیکھا۔

سب لوگ ایک ہی سمت دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف تھا، پریشانی تھی۔ اس کے دل میں خوف و اضطراب کی شدید لہر نے سر اٹھایا۔ اس نے بے اختیار زیرک کے ہاتھ تھام لیا۔

"کیا ہوا؟ یہ شور کیسا ہے؟" اس کی آواز حد درجہ پریشان تھی۔ چند لمحوں میں بھیانک خدشات اور بدترین امکانات دل و دماغ میں بل کھا گئے تھے۔ زیرک جو خود بھی وہیں متوجہ تھا۔ ہاتھ تھامنے پر مڑ کر اسے دیکھا۔ وہاں پھیلے ہوئے ہراس کے پیچھے دکھ کا ایک جہان آباد تھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔ جسٹ ریلیکس۔ ایک ایکسیڈنٹ ہوا تھا معمولی سا۔" وہ اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔

"آر یو اوکے؟" وہ ہنوز پریشان سی اس کا چہرہ تک رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا وشمہ، سب ٹھیک ہے۔" زیرک نے یقین دہانی کروائی۔ اس نے گہری سانس لے کر چہرے پر ہاتھ پھیرے۔

"گھر چلیں۔ اگر تم ٹھیک نہیں تو۔" وشمہ نے یکدم اپنی غیر ارادی حرکت کو یاد کرکے شرمندگی سے خود کو کمپوزڈ کیا۔

"نہیں، میں اب ٹھیک ہوں یہ سوٹ دیکھیں۔"

اسے زندگی میں پہلی بار زیرک سے اپنائیت محسوس ہوئی۔ اس کی موجودگی اور وجود نے سہارے اور ڈھارس کا احساس دلایا۔

چند لمحوں بعد وہ خریداری کرکے جیولری شاپس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان گزرنے والے چند لمحوں میں زیرک نے محسوس کر لیا تھا۔ وشمہ پر چھائی بے زاری کی جگہ اطمینان نے لے لی تھی۔ اس نے وشمہ کے صبیح چمکدار چہرے پر مسکراہٹ جلتے دیکھی اور خود بھی مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

رات کافی سے زیادہ بھیگ چکی تھی مگر نیند۔۔۔۔ وہ تو روٹھے بچے کی مانند کٹی کر کے میلوں دور منہ موڑے بیٹھی تھی۔ سحری کے لیے فجر سے پہلے اٹھنا ہوتا تھا اور بے داری کا وقت قریب ہی تھا۔

گہری سانس لے کر اس نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے کمرے کی لائٹ آن تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جاگ رہا ہوگا۔ اس نے دبے قدموں جا کر دستک دی۔

"تم اب تک جاگ رہی ہو۔" وہ دروازے پر اسے دیکھ کر اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولا۔

"تم بھی تو جاگ رہے ہو۔"

"ہاں میں بس کچھ پیکنگ۔" ایمن نے اس کی آواز میں تازگی محسوس کی۔

"کیا سب چیزیں لے جا رہے ہو۔" وہ بیڈ پر بکھرا سامان دیکھنے لگی۔

"اوہ ہونہہ۔ بلکہ میں تو کپڑے بھی نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر۔۔۔۔"

"کیوں کیا اتنے غیر ہو گئے ہم تمہارے لیے۔" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر چکی تھیں۔

"ایمن پلیز کیا تم چاہتی ہو میں دل پر بوجھ لے کر جاؤں۔" اس نے ایمن کا ہاتھ تھام کر اسے بیڈ پر بٹھایا۔

"تو جانا ضروری ہے کیا تم ان سے مل کر آ بھی سکتے ہو۔"

ایمن نے اس کے ہاتھ نہیں چھوڑے اور طلحہ چاہنے کے باوجود اس کی بات کا بے تکا پن جتا نہیں سکا۔ وہ رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور تب پہلی بار یوں لگا جیسے یہاں سے جاتے وقت وہ ایک دھڑکن یہیں چھوڑ جائے گا۔ شاید واپس آنے کے لیے۔

"طلحہ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ نا پلیز۔" اس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑائے۔

"مجھے جانا ہوگا ایما۔ میں رک نہیں سکتا۔ مت روکو مجھے کسی کا قرض ہے مجھ پر چکانا ہوگا جتنی جلد ہو سکے۔" اس کے چہرے پر کسی سوچ کا جالا بننے لگا۔

ایمن اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھتی رہی۔

وہ اسے کتنی جلدی اپنی زندگی کا حصہ سمجھنے لگی تھی اور اتنی ہی جلدی وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ ابھی تو اس نے اس کے منہ سے اپنے لیے پسندیدگی کا ایک حرف تک نہیں سنا تھا۔ محبت تو دور کی خواہش تھی۔ ابھی تو اس کی آنکھوں کے رنگ بھی نہیں بدلے تھے اور وہ جا رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے پاس اپنے اصل کی طرف۔

"کیا تم میری خاطر رک نہیں سکتے۔ تم جانتے ہو تم کیا اہمیت اختیار کر چکے ہو میری زندگی میں۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

بہت مشکل تھا اس سے یہ سب کہنا۔ مگر وہ خاموشی کا پچھتاوا لے کر جینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ واپس آتا یا نہیں مگر لاعلم تو نہ رہتا۔

"ایمن! میں جانتا ہوں تم چاہتی ہو مجھے۔ مگر کہیں اور کچھ اور زندگیاں میری منتظر ہیں۔ وہ دن رات جل جل میرے انتظار کی اذیت میں میرے بچھڑنے کے دکھ میں جیتی اور مرتی ہیں۔ تم ان ماں باپ کی تکلیف کا اندازا نہیں کر سکتیں۔ جن کو ان کے اکلوتے بیٹے کا آخری دیدار تک نصیب نہ ہوا تم ان سے زیادہ قابل رحم نہیں ہو ایما۔" وہ اپنا چہرہ صاف کر کے اثبات میں سر ہلاتی اٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ مگر یاد رکھنا کہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔" وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں۔ طلحہ نے محسوس کیا۔ اس کے دل میں موجود ایما کے لیے نرم گوشہ۔ پھیل کر پورے دل کو اپنے قبضے میں کر رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"شاید میں ایک لاحاصل انتظار سے تھک کر تمہیں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اور اس کوشش کے لیے میں نے پہلا قدم اٹھا لیا ہے۔ شاید میں تسلیم کرنے جا رہی ہوں یہ تلخ حقیقت کہ تم دنیا سے جا چکے ہو۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔"

پگھلتی ہوئی آئس کریم اس کی توجہ کی منتظر تھی اور وہ خود سوچوں میں گم زیرک گاہے بگاہے اس کا چہرہ پڑھ لیتا۔ مکمل استحقاق کے ساتھ کبھی اسے خود سے اس قدر دور دکھائی دینے والا چہرہ کہ وہ اسے پانے کی چاہ میں ایک ہاتھ بھر کا فاصلہ بھی طے کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ رائیگاں مسافتیں اپنے اختتام پر منزل کی صورت صرف آبلہ پائی اور ہجر مسلسل کے سوا کچھ نہیں دیں گی لیکن آج وقت بدل چکا تھا۔ حالات بدل چکے تھے اور ان کا رشتہ بھی۔

گو کہ اس نے اس تبدیلی کی بہت بڑی قیمت چکائی تھی۔ اس کا سب سے قریبی دوست اس دنیا سے جا چکا تھا اس کی دوستی کے آگے اس کی اپنی محبت کی قیمت کچھ بھی نہ تھی۔ وہ بنا مزاحمت کے اپنی محبت کو دوستی پر قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن قسمت کھیل گئی اور ایسا انوکھا لیکن کاری وار کر گئی کہ وہ اپنے زخم مندمل ہونے کا انتظار بھی نہ کر پایا اور خود ہی مداوے کا انتظام ہو گیا۔ خیالات کے بہتے دھارے کو موبائل کی بیپ نے توڑا۔

"کب آؤ گے تم لوگ بہت دل سے شاپنگ کرائی جا رہی ہے۔" ملائکہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

"اچھا سنو میں ذرا طلحہ کے گھر جا رہی ہوں۔ تم بھی وشی کو ڈراپ کر کے وہیں آجانا۔"

"کیوں سب خیریت ہے۔"

"ہاں بس انکل آنٹی کا دل بہل جاتا ہے اور کیا۔" اس نے گہری سانس لے کر فون بند کر دیا۔ وشمہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"دوسری منگواؤں۔" وہ محبت سے اس سے پوچھنے لگا۔ وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلاتی وہی پگھلتی ہوئی آئس کریم کھانے لگی۔

☼ ☼ ☼

ایئر کنڈیشن بس تیزی سے منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ اس نے خود ہی بائی ایئر جانے کے بجائے بس سے سفر کا ارادہ کیا تھا۔ افطار کے بعد کی شہر کی رونقیں بہت دور کہیں پیچھے رہ گئی تھیں اب صرف یہ ویران بیابان علاقے تھے یا پھر یہ سیدھی سڑک۔ وہ تو سحری کے بعد ہی نکل جانا چاہتا تھا مگر بابا نے اصرار کر کے اسے افطار تک روکا تھا۔ اب وہ آنکھیں موندے دو سال پہلے کی وہ پر رونق شام یاد کر رہا تھا جب وہ اپنے دوستوں سے آخری بار ملا تھا۔ بس آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے خیالات کی رو پیچھے بہہ رہی تھی۔

وہ اپنا سیل لے کر ایزی لوڈ کروانے اس کولڈ کارنر سے نکلا تھا اور۔۔۔۔ چند قدم دور جا کر ہی اسے خیال آیا کہ زیرک سے فون کروا کر امی کو وشی کی شاپنگ کے لیے منع کروا دے۔ وہ یہی سوچتا ہوا واپس ہوا تھا۔ مگر اپنے ٹیبل کے پاس پہنچ کر اس نے بلال کے منہ سے وشمہ کا نام سنا تو بالکل غیر ارادی طور پر نزدیکی واز کے پیچھے رک گیا۔ جس پر مصنوعی منی پلانٹ کا قد آدم آرائشی جھاڑ سا لگا ہوا تھا۔ اس نے یہ حرکت بالکل بے سوچے سمجھے کی تھی۔ مگر وہ جو بات کہہ رہا تھا وہ یقیناً" کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہا تھا۔

"وشمہ ملی تھی مجھے بتا رہی تھی تم اسے لائیک کرتے ہو۔" بلال کی بات غیر یقینی حد تک حیران کن تھی۔ اس سے وہاں کھڑے رہنا محال ہو گیا۔ جی چاہا ابھی سامنے جا کر بلال سے حقیقت جان لے۔

"اسے کون بتائے گا کہ۔۔۔۔" زیرک کی نامکمل بات بھی مکمل تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے محسوس کیے۔

"کہ تم اسے پسند کرتے ہو یہی نا۔" وہ لوگ کون سی کسوٹی کھیل رہے تھے۔ طلحہ کی سمجھ سے باہر تھا۔

یہ وہ کیا سن رہا تھا۔ اس کے عزیز از جان دوست کی پسند تھی اس کی منگیتر اس کی ہونے والی بیوی۔ اس کے اندر نا سمجھ میں آنے والی کئی کیفیات گڈمڈ ہونے لگیں۔

"کیا فضول ہے یہ کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو یا یہ کہ جسے پسند کرتے ہو وہ تمہارے دوست کی منگیتر ہے۔"

"دونوں ہی باتیں فضول ہیں۔" زیرک کا لہجہ اس کے دل کی چغلی کھا رہا تھا۔

"اور دونوں ہی باتیں سچی ہیں..... اور تلخ بھی۔"

"اچھا او کے مان لیا۔ میں پسند کرتا ہوں وشمہ کو تو..... " طلحہ فوراً" پلٹ کر وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

دل میں عجیب سے احساسات سر اٹھا رہے تھے۔ کبھی غصے کی لہر دل و دماغ میں اٹھتی کہ زیرک کی اتنی ہمت ہو گئی کہ وہ اس کی متوقع بیوی کو ایسی ویسی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور بلال اور زیرک اس کی غیر موجودگی میں اسے ڈسکس بھی کرنے لگے۔ حد ہو گئی چند لمحوں بعد یہ کیفیت بدل کر کسی اور احساس میں ڈھل گئی۔ دماغ نئے تانے بانے بننے لگا۔

وشمہ خود اس کو پسند نہیں تھی مگر' زیرک تو اسے پسند کرتا تھا۔ تو کیا برا تھا اگر وہ زیرک کا نصیب بن جاتی یقیناً" کچھ نہیں۔

وہ چلتے چلتے اس جگہ سے کافی دور نکل آیا تھا۔ دل ہی دل میں ارادے باندھنے سے اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب ایک دم وہ دھماکہ ہوا۔ بلکہ کتنی دیر تو حواس یوں مفلوج ہوئے کہ سمجھ ہی نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ دل و دماغ ایک جھٹکے سے ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ لمحوں میں ہی پورے جسم کو کسی نے گرم انگارہ سلاخوں سے چھید ڈالا۔ آنکھوں میں شدید مرچیں۔ اور اگلا ایک قدم بھی اٹھانا ممکن نہ رہا۔ بے بسی کے انتہائی مقام پر چکراتے سر اور اذیت ناک تکلیف کے احساس سے مغلوب ہو کر اس نے خود کو وہیں زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔

"ماما!" کسی بچے کی تیز آواز نے اسے ہوش کی دنیا میں واپس گھسیٹ لیا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ دھڑکنوں کی رفتار دگنی ہو چکی تھی۔ اور ہاتھ اس خوف کے زیر اثر مرتعش تھے۔ جسم اور چہرہ پسینے میں بھیگ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

زیرک اور ملائکہ نے جاتے وقت بلال کو بھی وہیں بلا لیا تھا۔ یاسین صاحب اپنے آپ کو طلحہ کی جدائی کے بعد جس قدر تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کا مداوا تو بہر حال نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ لوگ حتی المقدور ان کی تنہائی دور کرنے کی کوشش ضرور کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کے گھر میں جمع ہونے کا یہی مقصد تھا۔

دستک دینے کے چند لمحوں بعد دروازے پر لگی چھوٹی سی کھڑکی کھلی۔

چوکیدار چند لمحے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے سامنے ٹھیک سے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

"کھولو فضل! میں ہوں طلحہ۔" آواز تھی یا بجلی کا کوندا۔ وہ حق دق رہ گیا۔ پھر بجلی کی سی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"بابا' طلحہ بابا' میرا طلحہ بابا۔" وہ بے اختیار ہو کر اس کے سینے سے لگ کر رو پڑا۔ طلحہ نے دھیرے سے ہنس کر اس کی کمر تھپتھپائی۔ اس کی اپنی ہی آنکھیں نم ہو گئیں۔

گھر کے تقریباً" تمام ہی ملازمین جن میں سے زیادہ تر اپنے والدین کے زمانے سے ان کے یہاں ملازم تھے۔ طلحہ کے حسن سلوک کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے۔

آج اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صرف اسے پسند نہیں کرتے تھے وہ اس سے محبت کرتے تھے۔ اور اس کا ثبوت تھا۔ اس کے اور اپنے درمیان حاکم اور محکوم کا رشتہ بھلا کر سینے سے لگا روتا ہوا فضل۔

"بس کرو فضل اب تو آ گیا ہوں۔" وہ خود پر بمشکل قابو پا کر بول پایا تھا۔

"آپ کدھر چلا گیا تھا بابا۔ سب لوگ آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہار گیا۔ رو رو کر تھک گیا صیب اور بیگم صیب....." وہ آنسو صاف کرکے بولتا ہوا اندر بڑھا۔

"آؤ آؤ ہم آپ کو خود اندر چھوڑنے گا۔ ہمارا بس چلے تو اپنے کاندھے پر بٹھا کر لے جائے۔"

وہ تیز قدموں سے اندر بڑھتا چلا گیا۔ اور جس بے اختیاری سے اس سے لپٹا تھا۔ اسی قدر بے ساختگی اور خوشی کے عالم میں بھاگتا ہوا گیا۔ اور جا کر لاؤنج کا دروازہ پورا کھول دیا۔

دروازہ کھلنے کی زور دار آواز پر سب نے پلٹ کر دیکھا اور پھر وہاں سے جو چہرہ طلوع ہوا ایک پل کے لیے وہاں موجود تمام دلوں کی دھڑکن رک گئی۔ ہوا ساکن سانس تھم گئی' پلکیں یوں جھپکنا بھولیں جیسے خواب ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ اس نے لاؤنج میں پہلا قدم رکھا اور کچن سے چائے کی ٹرے لاتی مما کے ہاتھ سے بھری ہوئی ٹرے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

ایک زور دار چھناکا ہوا اور جیسے سب کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ سبھی افراد کے لبوں سے اس کا نام ایک چیخ کی صورت بر آمد ہوا اور وہ سب ہی اٹھ کر اس کی طرف دوڑ پڑے۔

☆ ☆ ☆

آدھے گھنٹے میں خاموش پڑا لاؤنج بھانت بھانت کے چہروں اور آوازوں سے بھر گیا تھا۔

نہ یاسین صاحب کی نم آنکھیں خشک ہوئی تھیں نہ بیگم یاسین کا رونا بند ہوا۔ وہ بار بار دیوانہ وار اسے چوم لیتیں۔ اسے سینے سے لگاتیں اور پہلو سے چپک جاتیں۔ طلحہ بھی بار بار کبھی ماں کو دیکھتا۔ کبھی باپ کے ہاتھ چومتا۔ یوں لگتا تھا صدیوں کی پیاس زندگیوں میں در آئی تھی۔ آج کسی نے دریاؤں کے بند کھول دیے تھے۔

زیرک' بلال اور ملائکہ اسے دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتے تھے۔ ملائکہ تو کئی بار بری طرح رو بھی چکی تھی۔ کبھی قہقہے لگانے لگتی کبھی روہانسی ہو جاتی۔ مٹھائی کے ڈبوں کا چھوٹا سا مینار اور چائے کے ان گنت مگ اور خوشیاں ہی خوشیاں۔

پہلے عشرے میں عید آ گئی تھی۔

وہ رات پچھلی کئی راتوں کا مداوا تھی۔ اس رات کی خوشی۔ گزرنے والے کئی دکھ بھرے دن رات کا بدلہ تھی۔ چہروں پر ہنسی تھی اور آنکھوں میں چمک طلحہ اور زیرک دونوں ہی گاہے بگاہے ایک طرف کونے میں خاموش بیٹھی وشمہ پر ایک نظر پھینک دیتے۔ اس کی بار بار نم ہوتی آنکھیں رگڑنے میں اسے بہت دقت محسوس ہو رہی تھی۔ اور صرف طلحہ ہی تھا جو یہ بات سمجھ نہیں سکا کہ اسے زندہ سلامت دیکھ کر جب ایک دنیا خوشی سے پھولے نہیں سما رہی۔ تو وہ اس قدر خاموش اور سنجیدہ کیوں ہے۔

☆ ☆ ☆

"وشمہ سے تمہارا رشتہ تو ظاہر ہے تمہارے جانے کے بعد ختم ہی ہو گیا تھا۔" دوسرے دن امی اسے اس کے استفسار پر بتانے لگیں۔

"تو ظاہر ہے تمہیں دوبارہ دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو گا کہ کیسے ری ایکٹ کرے۔"

"کیوں اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے۔" اسے سرسری لہجے میں بات سے بات نکالنی مقصود تھی۔

"کیونکہ۔" یاسین صاحب ذرا سا رک کر کھنکھارے۔

"اس کی منگنی ہو چکی ہے اب۔" یاسین صاحب اور ان کی بیگم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"وہ کسی اور کی امانت ہے تم نے اس سے کوئی بات کی کل۔"

"نہیں' کس سے ہوئی اس کی انگیج منٹ۔" اس کے لیے ایک بورنگ ٹاپک اچانک ہی انٹرسٹنگ ہونے والا تھا۔ امی بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"تمہیں افسوس نہیں ہوا۔"

"مجھے افسوس کیوں ہو گا امی۔ آپ جانتی تھیں مجھے اس میں کبھی کوئی انٹرسٹ نہیں تھا۔ ہاں لیکن اب آپ کو مجھے واپس آتا دیکھ کر کم از کم اس معاملے میں ضرور افسوس ہوا ہو گا۔"

"نہیں خیر۔ اب میرے بیٹے سے زیادہ اہم تو کچھ نہیں ہے نا۔"

"تب تو تھا خیر یہ ایک فضول بحث ہے۔ آپ نے

بتایا نہیں۔ کس سے ہوئی اس کی منگنی؟" وہ بے دھیانی سے ان سے بات کرتا اخبار دیکھتا جا رہا تھا۔

"زریک سے۔" انہیں لگا اخبار سے اس کی ساری دلچسپی یک لخت ختم ہو جائے گی اور ہوا بھی یہی۔ انہوں نے بہت احتیاط سے بتایا تھا۔ اس نے اخبار ایک جھٹکے سے نیچے کر کے انہیں دیکھا۔

"زریک سے مما؟"

"ہاں تم۔۔۔ تم اسے کچھ مت کہنا۔ کسی نہ کسی کو تو اس سے شادی کرنی ہی تھی نا!" اپنے تئیں انہوں نے اس کے متوقع غصے کے آگے بند باندھنے کی بہت معصوم سی کوشش کی تھی۔

"ارے امی کیوں کچھ نہیں کہنا۔ میں تو بہت کچھ کہوں گا اور اس زریک کے بچے کو تو چھوڑوں گا نہیں۔" ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ وہ بے اختیار ہنستے ہوئے اخبار پھینک کر اٹھ رہا تھا۔

"ارے جا کہاں رہے ہو؟ بیٹھے رہو نا ابھی میرے پاس۔" ان کا دل پوری رات باتیں کر کے بھی نہیں بھرا تھا۔

"زریک کے پاس، اب دیر سے آؤں گا۔" وہ آواز لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

مٹھی میں کائنات بڑی دیر تک رہی
میری طرف حیات بڑی دیر تک رہی
ڈھلنے لگی تھی رات کہ تم یاد آ گئے
پھر اس کے بعد رات بڑی دیر تک رہی

صبح صادق کے وجود سے پھوٹتے روشنی کے آثار کے ساتھ ہی کچن میں سرگرم رونقیں دم توڑنے لگی تھیں۔ اس نے بھی روزے کی دعا پڑھ کے صدق دل سے روزے کی نیت کی۔ دل کی حالت کچھ دن سے عجیب سی تھی۔ بلکہ شاید اسی دن سے۔ جس دن سے طلحہ واپس آیا تھا۔ وہ ویسا ہی تھا بالکل۔ بس تھوڑا کمزور ہو گیا تھا۔

مگر وشی کے لیے سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ رہی کہ اس نے ایک بار بھی نظر بھر کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

تب سے اب تک کئی سوالیہ نشان اس کی نظروں کے سامنے آتے جاتے، چلتے پھرتے، جلتے بجھتے رہتے تھے اور سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ جب اسے زریک کے ساتھ اس کی منگنی کا پتا چل جاتا تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا۔ کتنا کٹھن تھا اس کا سامنا کرنا۔

وہ جانتی تھی۔ ملائکہ، بلال اور زریک روز اس سے ملتے ہیں۔ ان کی دوستی کے پرانے دن لوٹ آئے تھے۔ وہی بے فکری، سرمستی اور خوشی جوان کی پور پور سے پھوٹتی جسموں میں لہو بن کر بہتی، ہونٹوں پر چہکتی اور نگاہوں میں چمکتی تھی۔ کبھی اتنے دن سے ملائکہ نے اس سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا۔ تو کیا وہ اب تک لاعلم ہو گا ایسا ممکن تو نہیں۔

دعا کے لیے پھیلے ہاتھوں پر گرتے شفاف موتی بے وزن بھی تھے اور بے آواز بھی۔ کیا ضروری تھا سیدھی سادی سی زندگی میں یہ موڑ آتا۔

طلحہ میری زندگی سے گیا کیوں، وہ چلا گیا تو زریک آ گیا کیوں؟ زریک کو میں نے قبول کر لیا تو۔۔۔ طلحہ پھر سے آ گیا۔ کیوں؟ وہ لوگ آپس میں اتنے قریبی دوست ہیں کیوں؟ ایک دوسرے کو کتنا جانتے ہیں وہ لوگ میری ان کے درمیان بھلا کیا حیثیت۔"

زریک تو منٹوں میں طلحہ کے دل سے اپنے متعلق تمام بدگمانیوں کی گرد صاف کر دے گا۔ معتوب صرف میں ٹھہروں گی۔ وہ سوچ سوچ کر روتی رہی اور رو رو کر سوچتی رہی۔

"وشمہ بی بی۔" جانے کتنی دیر گزری تھی۔ جب ملازمہ اسے بلانے چلی آئی۔ اس کے پاس ایک بہت حیرت انگیز اور شاید مشکل پیغام تھا۔

"طلحہ صاحب آئے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے تیزی سے اپنا چہرہ رگڑ ڈالا۔

"مجھے؟ مما کو بتایا۔"

"نہیں انہوں نے منع کر دیا۔ ویسے بھی بیگم صاحب سو گئیں اور صاحب آفس چلے گئے۔"

"اچھا میں آتی ہوں۔"

بال بنا کر اس نے دوپٹا اچھی طرح پھیلا کر اوڑھا اور باہر نکل آئی۔ دل کی دھڑکن میں معمولی سا ارتعاش تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سامنے ہی لاؤنج کے صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا اس کے قدم ذرا کی ذرا تھم گئے۔

"کیا کہے گا اب وہ کیا کہنے آیا ہو گا۔" دماغ میں آتے ان گنت خیالات کو پرے جھٹک کر اس نے قریب جا کے سلام کیا۔

"والسلام کیسی ہو تم۔"

"ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں۔" اخلاقی فرض۔

"ٹھیک ٹھاک بالکل اللہ کا شکر ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر سر جھکا لیا تھا۔ وشمہ جھکی جھکی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ پہلے سے دبلا ہو گیا تھا۔ روزے رکھنے کی وجہ سے چہرہ بھی قدرے مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"میں تم سے کچھ کہنے آیا ہوں۔" بالآخر اس نے سر اٹھایا۔

وشمہ نے عجلت میں اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹائیں۔

"کہیے، کس بارے میں۔"

"تمہارے اور زریک کے بارے میں۔" اس کی نظریں جھک گئیں۔ چہرہ سرخ پڑ گیا اور تیز بھاگتی دھڑکن دھیمی پڑ گئی۔

"پلیز آپ اس بارے میں کچھ مت کہیں۔ مجھے بہت شرمندگی ہے کہ۔۔۔"

"کیسی شرمندگی میں سمجھ نہیں سکا۔"

"لیکن میں سمجھ سکتی ہوں، آپ کی فیلنگز۔" وہ بنا کچھ کہے اسے دیکھتا رہا۔

"مجھے زریک اور سب گھر والوں نے مل کر اس رشتے کے لیے فورس کیا تھا۔" کسی انجانے احساس جرم کے تحت وہ اسے صفائی پیش کر رہی تھی۔

"وشمہ! کیا تم گلٹی فیل کر رہی ہو مجھ سے۔" اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"لیکن کیوں؟ کیا میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد، تم کہیں بھی، کبھی بھی شادی نہ کرتیں۔" اسے حیرت ہونے لگی وشمہ کا رویہ اور انداز دونوں ہی ناقابل فہم اور غیر متوقع تھے۔

"لیکن وہ آپ کے دوست۔"

"سو واٹ، وہ جو کوئی بھی ہو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا یار۔" وشمہ سر اٹھا کے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کو فرق نہیں پڑتا۔"

"نو ناٹ ایٹ آل۔" وہ حیرت سے کندھے اچکا رہا تھا۔ وشمہ کے دل میں کچھ چبھ گیا۔

"دیکھو وشی! مجھے تمہاری اور زریک کی منگنی کی بہت خوشی ہے۔ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ ابھی سے نہیں کافی پہلے سے۔ مجھے یہ بات بہت دیر سے پتا چلی اور اس کے فوراً بعد ہی وہ حادثہ۔۔۔" اس نے رک کر وشمہ کا چہرہ دیکھا۔ اس کے محسوسات کا اندازا لگانا چاہا۔

"میں نے کبھی تمہیں ایک شریک حیات کی نظر سے نہیں دیکھا۔ نہ ہی میں تمہیں اپنانا چاہتا تھا۔ مے بی امی کے مجبور کرنے پر اگر میں تم سے شادی کر بھی لیتا تو تمہیں وہ خوشی نہ دے پاتا جو تم جیسی اچھی لڑکی کا حق ہوتی ہے۔"

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے شانوں کو کسی نادیدہ بوجھ سے آزاد ہوتے محسوس کیا۔

"لیکن مجھے خوشی ہے کہ ایک حادثے نے ہی سہی۔ تمہیں اس شخص سے ملوا دیا۔ جس کی تم واقعی حق دار ہو۔ زریک بہت اچھا ہے۔ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا۔" وہ جانتا تھا اس کی باتیں فی الحال وشمہ کو ناگوار گزریں گی۔ لیکن مستقبل میں جب وہ زریک کے ساتھ ایک مکمل خوشیوں بھری زندگی گزارے گی تو اس کے فیصلے کو ضرور سراہے گی۔

"اور آپ!" وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"دیکھو وشی! ہر شخص کی زندگی کی ترجیحات الگ الگ ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک لائف پارٹنر کے لیے

کچھ اور چیزیں ہیں۔ جنہیں میں ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اگر وہ تم میں نہیں ہیں تو یہ سوچ کر دل چھوٹا مت کرنا کہ تم میں کچھ کمی ہے۔ یقیناً" تم میں وہ سب کچھ موجود ہے۔ جو تمہارے ہونے والے پارٹنر کے نزدیک امپورٹنٹ ہے۔"

"اور آپ کو ایسی شخصیت کی تلاش ہے۔ جن میں آپ کی مطلوبہ خوبیاں ہوں۔"

"نہیں اب مجھے تلاش نہیں ہے۔ میری تلاش ختم ہو چکی ہے۔" وشمہ نے اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن مسکراہٹ ابھرتے دیکھی۔ وہ خود بھی دھیرے سے مسکرائی۔

"او کے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"آج اگر افطار ساتھ کر لیتے۔" وہ اسے کھڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر بولی۔

"ویل! میرے بجائے اگر تم زیرک کو انوائٹ کر لو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ کیونکہ آج کل اسے تم سے وہی شکایت ہے جو کبھی تمہیں مجھ سے تھی، ٹائم کی کمی کی شکایت۔" وہ اسے چھوڑنے باہر تک جا رہی تھی۔ اس کی بات پر ہنس دی۔

"میں آج آپ سب کو انوائٹ کر لیتی ہوں۔ بلال اور ملائکہ کو بھی تب تو آئیں گے نا۔" وہ خوش دلی سے بول رہی تھی۔

دل و ذہن پر پڑا ہوا کوئی بھاری پردہ بہت آہستگی سے سرک گیا تھا۔ اب منظر واضح بھی تھا روشن بھی اور چمکدار بھی۔

کچھ رشتے خون کے ہوتے ہیں۔ کچھ دل کے اور کچھ صرف احساس کے کچھ تعلق ہم خود سے بنانا چاہتے ہیں کچھ تانے بانے زندگی ہمارے نہ چاہنے کے باوجود بنتی ہے مگر سچ ہے رضائے خداوندی سے ہمارے نہ چاہنے کے باوجود، جڑ جانے والے وہ رشتے جو نہ خون کے ہوں نہ دل کے، فقط احساس کے دھاگے میں بندھے ہوں، بہت خوب صورت اور پائیدار ہوتے ہیں۔ اسے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ چاہنے کے باوجود دل کا رشتہ طلحہ سے جڑ نہیں سکا تھا۔ مگر زندگی نے اس کے لیے ایک میٹھے احساس سے گندھا جو رشتہ زیرک سے جوڑا تھا۔ اب اپنی اہمیت اور خوب صورتی پوری شدومد سے واضح کر رہا تھا اور وہ اس کی خوب صورتی کو محسوس کرنے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

چاند رات کی خوب صورتی اپنے جوبن پر تھی۔ مگر ایک اداس دل کسی کی یادوں میں ڈوبا اس خوب صورتی کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ طلحہ نے اداسی کی ایک موہوم سی لہر دل میں محسوس کی اور ٹھٹک کر موبائل دیکھا۔

"کل نہیں، آج۔" وہ کوئی فیصلہ کر کے گنگنایا اور گاڑی باہر نکال کر ایک سائیڈ پر پارک کر دی۔ وہ بلال اور زیرک کے ساتھ ملائکہ کے گھر جانے کے لیے نکلا تھا۔ مگر اب اپنا ارادہ بدل کر ایک جانے پہچانے نمبر پر نظم ٹائپ کر رہا تھا۔

"تمہاری خاطر ردائے دل پر دعائیں تحریر کر رہا ہوں
منافقت کی اداس شب میں
نہ تم اندھیروں سے ہار جانا
میں اپنے حصے کی ساری محبتیں تمہارے چہرے پر لکھ چکا ہوں
میں جانتا ہوں تمہارے رستے بہت کٹھن ہیں
مگر جب کبھی سفر پر جانا تو میری وفاؤں کو ساتھ رکھنا
یہ جان لینا کہ میرے جذبے چراغ بن کر
تمہارے رستے اجال دیں گے

ایک نرم، مہربان مسکراہٹ، لبوں پر چمک اٹھی۔ اس نے لکھا "عید مبارک ہو ایما" اور مہکتی میسج فضاؤں کے سپرد کر کے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ذرا دیر بعد ہی جوابی میسج موصول ہو چکا تھا۔

"عید مبارک ہو کنجوس آدمی۔ آ گئی میری یاد تمہیں ایک کال کرنے میں کیا پوری تنخواہ خرچ ہو جائے گی۔۔۔" وہ زور سے ہنس دیا۔

یہ استحقاق اس کی محبت کی دین تھا اور اس پر اعتبار کا ثبوت بھی۔

☆ ☆

چاند رات

حمیرہ خان

"کیا بات ہے یہ تمہارے منہ کی گھڑی بارہ پر آ کر کیوں رک گئی ہے؟" علی کے قریب بیٹھتے ہوئے رضا نے اپنے اسٹائل میں اس کے خراب موڈ کی وجہ پوچھی تو علی اسے گھور کر رہ گیا۔

"ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو مر جاؤں گا اف۔۔۔ ہائے" رضا نے حسب موقع گانا شروع کیا ہی تھا کہ علی کا زوردار ہاتھ اس کی گردن پر پڑا وہ بلبلا کر علی سے کئی فٹ دور جا کھڑا ہوا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ میں کوئی تمہاری پتی ورتا ستی ساوتری قسم کی بیوی نہیں ہوں جو یہ ظلم و ستم برداشت کروں تمہارے۔"

"کاش کہ تم میری بیوی ہوتے تو ظلم و ستم نہ کرتا بلکہ ایک ہی بار میں تمہارا رام نام ستے کر کے فارغ ہو جاتا۔"

"اور سولی چڑھ جاتے" علی کے دانت پیس کر کہنے پر رضا نے بڑے آرام سے نتائج سے آگاہ کیا۔

"کیا تم کچھ دیر کے لیے اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے؟"

"کتنی دیر کے لیے؟" رضا نے گھڑی دیکھتے ہوئے بڑے مصالحت بھرے لہجے میں دریافت کیا اور اس کی معصومیت پر علی کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دے۔

"ویسے بائی دا وے میاں مجنوں تمہارے اس ناکام عشق میں میرا کیا قصور ہے جو تم سارا غصہ مجھ غریب پر اتارتے ہو؟"

"تمہارے منہ میں گرم گرم پانی اللہ کرے لائٹ اتنی جائے کہ تمہیں میچ دیکھنا نصیب نہ ہو' خدا نہ کرے میرا عشق ناکام ہو۔" موسم اور حالات کی مناسبت سے مناسب بددعائیں دیتے ہوئے علی نے اپنے عشق کو ناکام کہنے کا بدلہ لیا۔

"اچھا یہ تو بتا کہ اس بار کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا میں تیار شیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ مما کی لاڈلی بھانجی صاحبہ اس فرمائش کے ساتھ تشریف لے آئیں کہ "آنٹی پلیز مجھے کالج کے فنکشن کے لیے شاپنگ کرنا ہے علی کو ساتھ بھیج دیں۔"

"ہونہہ سارا سارا دن دوستوں کے ساتھ گزرتا ہے محترمہ کا اور جب شاپنگ کا وقت آتا ہے تو ساری دوستیں جانے کہاں مر جاتی ہیں اس مصیبت کے لیے رہ جاتا ہے تو صرف علی۔" علی نے نسوانی آواز نکال کر علینہ کی نقل کرتے ہوئے اپنا دکھڑا سنایا تو رضا کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

"ہنس لو ہنس لو اللہ کرے اگلے جنم میں تمہیں بھی میری ماما جیسی ڈکٹیٹر ماں اور ان کی علینہ جیسی ایک عدد بھانجی ملے پھر دیکھوں گا کیسے ہنسو گے۔" رضا کی ہنسی پر علی جل ہی تو گیا تھا۔

"توبہ ہے اتنی اچھی سویٹ سی تو ہیں آنٹی انہیں ڈکٹیٹر تو مت کہو" علی کی مما کو کچن سے باہر آتے دیکھ کر رضا نے فوراً" ایک اچھے بھتیجے کا فرض نبھایا۔

"بس بیٹا سوٹ پہننے والا ہی جانتا ہے کہ کالر کہاں چبھتا ہے" علی نے سرد آہ بھرتے ہوئے محاورے کا بیڑا غرق کیا۔

"ارے رضا بیٹا تم کب آئے مجھے پتا نہیں چلا' کھانا بنا رہی ہوں بتاؤ تمہاری پسند کا کیا بناؤں؟" آنٹی یقیناً" اپنے بھتیجے اور بیٹے صاحب کے الفاظ سن چکی تھیں اس لیے خشمگیں نظروں سے بیٹے کو دیکھتی رضا کو آفر کر بیٹھیں نیکی اور پوچھ پوچھ کی عملی تفصیل بنا رضا مزے سے اپنی پسند کا کھانا بتانے لگا اور آنٹی خوشی خوشی پھر سے کچن کی طرف چل دیں۔

"بہت خبیث ہے نمبر بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔"

"ذرہ نوازی ہے جناب کی" وہ ڈھٹائی سے ہنس دیا۔

☼ ☼ ☼

"فری پلیز ایک بار مجھ سے بات کرو پلیز" اس نے کوئی پچاسواں میسج اسی ریکویسٹ کے ساتھ بھیجا جن میں سے صرف پہلے کا جواب آیا تھا۔

"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی"

اس کے بعد سے علی نے ہزاروں ہی دفعہ موبائل چیک کر لیا تھا مگر ان باکس اس کے مطلوبہ میسج سے خالی تھا۔

"کیا مصیبت ہے یار ایک بار بات تو سننی چاہیے' اتنا بھی بڑا جرم نہیں ہے میرا' نہیں تو نہ سہی اب میں بھی میسج نہیں کروں گا" علی نے غصے سے سوچتے ہوئے موبائل صوفے پر اچھال دیا۔

"یار بے شک تمہاری غلطی نہیں ہے لیکن اس کا ناراض ہونا تو بنتا ہی ہے نا اور پھر جہاں محبت ہو وہاں اتنا کیسی' منا لینے میں حرج ہی کیا ہے؟" تھوڑی دیر بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے رہنے کے بعد آخر اس نے پھر موبائل اٹھایا اور خوش قسمتی سے اس بار پہلے ہی میسج پر اس کا جواب آ گیا۔

"تمہاری زندگی میں میری کتنی اہمیت ہے' میں جان چکی ہوں اب کیوں مجھے تنگ کر رہے ہو؟"

علی نے میسج کرنے کی بجائے فوراً" اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔

"ہیلو" دوسری طرف سے روٹھی روٹھی آواز علی کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے سکون کا سانس لیا کہ کم از کم وہ بولی تو۔

"کیسی ہو؟"

"تم سے مطلب؟"

"مجھے مطلب نہیں ہوتا تو اتنی دیر سے میسج اور کال کر کر کے پاگل نہ ہو رہا ہوتا' قسم سے یار بہت ظالم ہو تم' انگلیاں درد کرنے لگی ہیں میری اور تم ہو کہ۔۔۔"

"اور جو تم نے کیا وہ؟ پتا ہے میں نے تین گھنٹے تمہارا انتظار کیا' کتنی بار تمہارے نمبر پر فون کیا کتنے میسج کیے جانتے ہو مجھے کیسا محسوس ہو رہا تھا؟ ایسا لگتا تھا جیسے ہر نظر میرا مذاق اڑا رہی ہو' اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا ہے" فرح کی آواز میں نمی اتر آئی' علی تو پہلے ہی بہت شرمندہ تھا اب اور بھی پشیمان ہو گیا۔

"آئی ایم رئیلی ویری سوری یار میں سمجھ سکتا ہوں' مگر یقین کرو میں نے جان کر ایسا نہیں کیا' وہ عین وقت پر علینہ۔۔۔" سب بتاتے بتاتے اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو خاموش ہو گیا۔

"علینہ۔۔۔ کون علینہ؟؟" فری سب بھول بھال کر اس علینہ نام کی ہستی کے بارے میں جان لینے کے تجسس میں مبتلا ہو گئی۔

"یار وہ کزن ہے میری"

"پہلے کبھی ذکر نہیں کیا تم نے اس کا"

علی دل ہی دل میں اس وقت کو کوسنے لگا جب علینہ کا نام اس کی زبان پر آیا تھا اب ایک ناراضی ختم نہیں ہوئی تھی کہ یہ علینہ کے نام نے نیا پنڈورا باکس کھول دیا۔

"یار میری ڈھیر ساری کزنز ہیں اب میں کس کس کے بارے میں تمہیں بتاؤں' شادی کے بعد خود ہی سب سے مل لینا" اور حسب توقع شادی کے ذکر پر فرح کا موڈ خوشگوار ہو گیا' اس کے بعد وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور مستقبل کے سہانے خواب سجاتے رہے۔

"مگر تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مجھے بلا کر تم آئے کیوں نہیں؟" فرح کو اچانک سے پھر اپنی ناراضی کی وجہ یاد آ گئی۔

"بس یار وہ بتا رہا تھا نا کہ عین وقت پر علینہ کا فون آ گیا کہ آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے' بابا تو آفس تھے مجھے اور ماما کو فوراً" وہاں جانا پڑ گیا جلدی جلدی میں موبائل بھی گھر رہ گیا اور وہاں جا کر موقع ہی نہ مل سکا کہ کسی طرح تمہیں اطلاع کر دیتا۔"

"اللہ مجھے معاف کرنا کیسے کیسے جھوٹ بولنا پڑ رہے ہیں" اس نے فرح کو مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ دل ہی دل میں خدا سے معافی بھی مانگی' مگر وہ کیا کرتا اگر وہ سچ بول دیتا تو علینہ کا نام فرح کو ڈسٹرب کیے رکھتا اور وہ نہیں چاہتا کہ اس قسم کی غلط فہمیاں ان کے درمیان کبھی بھی آئیں وہ فرح سے سچ مچ بہت پیار کرتا تھا۔

کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد انہوں نے اگلی ملاقات کا پلان کر کے بڑے خوشگوار موڈ میں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

محبتوں کی ساری کہانیاں بظاہر ایک سی لگتی ہیں' اپنے آپ کو بھول کر کسی اور کا ہو جانے کی خواہش' کسی کی یاد میں کھوئے ہوئے دن رات' ہجر و وصال' روٹھنا منانا اور پلکوں پر دستک دیتے ڈھیروں خوابوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے محبت کے جذبے کو اپنے لہو سے نکھارنے کے پرعزم ارادے' مگر فرح اور علی کی کہانی میں نئی بات یہ تھی کہ انہوں نے آج تک ایک دوسرے کو دیکھا نہ تھا کبھی ملے نہ تھے بس آواز کا بندھن انہیں مضبوطی سے ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھا۔ علی کو احساس تک نہ تھا کہ انجانے میں وہ جس نمبر کو ملانے جا رہا ہے اس نمبر پر اس کی ملاقات زندگی سے ہو جائے گی' فرح سچ مچ علی کی زندگی بن گئی تھی۔ اس ان دیکھی لڑکی کی آواز کی کشش نے علی جیسے کھلنڈرے مزاج لڑکے کو جیسے باندھ لیا تھا وہ جو ہر رات ایک نیا نمبر ملایا کرتا تھا فرح سے بات کرنے کے بعد کوئی اور نمبر ملانا ہی بھول گیا اور اب تو وہ اپنی ان بے وقوفانہ حرکات پر شرمندہ تھا' کیونکہ اس نے محبت کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔

دن گزرے پھر مہینے اور اب تو ایک سال ہونے کو آیا تھا ان کی بات ہوتے' انہوں نے اب تک ایک دوسرے کی تصویر نہیں دیکھی تھی' تصویر کی اب اہمیت ہی کہاں رہ گئی تھی وہ دل و جان سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے اب تو بس وہ سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ملاقات تھی کہ ہو ہی نہ پا رہی تھی' انہوں نے اب تک تین بار ملنے کا پروگرام بنایا تھا اور بدقسمتی سے تینوں بار ہی انتہائی مجبوری کی وجہ سے علی فرح سے ملنے نہ پہنچ سکا' یہی سب سوچتے علی نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا فرح کی ناراضی دور ہونے کے بعد وہ بے حد پرسکون ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم آدھی رات کو کہاں سے ٹپک پڑے" سحری میں علی کھانے کی ٹیبل پر پہنچا تو رضا کو دیکھ کر سچ مچ حیران ہوا۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ آدھی رات نہیں بلکہ صبح سویرے کا وقت ہے اذان ہونے میں بس کچھ ہی دیر باقی ہے فٹافٹ ٹھونسنا شروع کر دو ورنہ سارا دن میرا دماغ کھاؤ گے' باقی تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ مابدولت رات سے یہیں تشریف رکھتے ہیں۔"

"تم یہاں ہو اور مجھے پتا بھی نہیں۔"

"جناب کو فون پر عشق فرمانے اور روٹھی محبوبہ کو منانے سے فرصت ملے تو اردگرد کی کچھ خبر ہو نا" آنٹی پلیز ایک پراٹھا اور" اس نے علی کی بے خبری پر چوٹ کرتے ہوئے کچن میں موجود آنٹی کو پکار کر پراٹھے کی فرمائش کی۔

"اب تک سستی سے بیٹھے ہو جلدی کھانا شروع کرو ابھی اذان شروع ہو جائے گی" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے ناظمہ (علی کی مما) نے علی کو ٹوکا تو وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

مجھے محفوظ کر لو تم
مجھے محفوظ کر لو نا
کسی کے ہاتھ نہ آؤں
نہ خود اپنا نشاں پاؤں
اگر چاہے میرے ساحر
تو بن جاؤں میرا حافظ
سجا لے رنگوں کی دنیا
مجھے تصویر میں رکھ لے
بنا کے اسم چاہت کا
کسی تعویذ میں رکھ لے
بنا لے خواب تو مجھ کو
حسیں تعبیر میں رکھ لے
چھپا لے اپنی دھڑکن میں
تیری تقدیر میں رکھ لے
مجھے محفوظ کر لو تم
مجھے محفوظ کر لو نا
مجھے خود اپنے کھو جانے کا ڈر ہے

فرح کی بھیجی اس نظم کو اس نے کئی بار پڑھا تھا وہ اس کے خوف اور خدشات سے واقف تھا مگر گھر میں بات کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور وہ موقع تھا کہ ہاتھ آ کر نہ دے رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے میسج ٹائپ کرنا شروع کیا۔

میں نے دنیا میں دیکھا ہے
اپنی ساری قیمتی چیزیں
لوگ حفاظت سے رکھتے ہیں
اسی لیے تو میں نے تیرے
سارے سپنے
اپنی آنکھوں میں رکھے ہیں

جواب میں نے فرح نے مسکراتا ہوا اسمائلی آئی کون بھیجا تو علی بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"بس یار میں چاہتا ہوں اس بار کوئی گڑبڑ نہ ہو' اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ صبح سے ہی گھر سے غائب ہو جاؤں گا" رضا کے کمرے میں بیٹھے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے علی نے اپنا پلان رضا کے سامنے رکھا۔

"لیکن یار بابا اپنی گاڑی لے جاتے ہیں اور عید سے ایک دن پہلے مما کو بھی اپنی گاڑی چاہیے ہوتی ہے' سوچ رہا ہوں میں جاؤں گا کیسے؟"

"میری گاڑی لے جانا" رضا نے فراخدلی کا عظیم مظاہرہ کیا۔

"بڑی مہربانی اس کھٹارا سے تو بہتر ہے میں اپنی بائیک پر چلا جاؤں"

"ایزیو وش" رضا کو شاید آج کچھ زیادہ ہی روزہ لگ رہا تھا' تبھی اپنی پیاری دلاری گاڑی کی شان میں کی گئی گستاخی بھی آرام سے برداشت کر گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے علی تم نے ابھی تک عید کی شاپنگ کیوں نہیں کی؟" وہ افطاری کے بعد نیوز سن رہا تھا تبھی ماما اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"میں اس بار شاپنگ چاند رات کو اپنے فرینڈز کے ساتھ کروں گا مما" ان کا یہی پروگرام بنا تھا کہ وہ اور فرح چاند رات کو ملیں گے اور مل کر شاپنگ کریں گے۔ فرح سے ملنے کے خیال نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی' ناظمہ نے غور سے بیٹے کے چہرے پر پھیلی خوشی کو دیکھا مگر کچھ پوچھا نہیں۔

"اچھا میں عشاء کی نماز پڑھ لوں تمہارے بابا بھی تراویح پڑھ کر آتے ہوں گے"

"ماما" اس نے جاتی ہوئی ناظمہ کا ہاتھ تھام کر روکتے ہوئے پیار سے پکارا

"جی میری جان' بولو؟" وہ اس کے قریب آ بیٹھیں۔

"ماما مجھے آپ سے عیدی چاہیے"

"ارے اتنے بڑے ہو کر عیدی لو گے' ویسے وہ جو ہر عید تم اپنے بابا کی جیب خالی کراتے ہو وہ عیدی نہیں تو کیا ہوتا ہے؟" اس کے بچوں کی طرح عیدی مانگنے پر ناظمہ کو ہنسی آ گئی۔

"بابا سے نہیں نا آپ سے چاہیے' اور وہ والی عیدی نہیں اسپیشل عیدی چاہیے" وہ لاڈ سے ان کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

"مل جائے گی میری جان جو تم چاہو گے تمہیں مل جائے گا آج تک ایسا ہوا ہے کہ تم نے کچھ مانگا ہو اور ہم نے نہ دیا ہو؟" اپنے اکلوتے خوبرو بیٹے کو پیار سے دیکھتے وہ پوچھنے لگیں۔

"آئی لو یو ماما آئی لو یو سو مچ' بس یاد رکھیے گا مجھے یہ عیدی ضرور ضرور چاہیے" وہ یقین دہانی پر بھی اصرار کر رہا تھا' ناظمہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس کے ماتھے پر اپنے پیار کی مہر ثبت کرتے ہوئے جیسے اسے یقین دلانا چاہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جاگ گئے؟"

"سویا ہی نہیں" فون پر رضا کے پوچھنے پر وہ ہنس دیا' جواب میں رضا بھی اس کی بے تابی کا سوچ کر ہنس دیا۔

"اچھا سنو میں گھر سے نکلنے لگا ہوں پھر رابطہ کرتے

ہیں اوکے"

"اوکے" فون بند کرکے اس نے آخری بار آئینے پر نظر ڈالی اور آئینے نے بھی اوکے کا سگنل دیا تو وہ مسکراتا گنگناتا گھر سے چل دیا۔ آج چاند رات متوقع تھی' اور آج اسے فرح سے ملنا تھا فرح کے آنے میں ابھی کئی گھنٹے تھے مگر آج وہ کوئی چانس لینے کو تیار نہ تھا اس لیے یہی سوچا تھا کہ شاپنگ پلازہ کے سامنے والے ریستوران میں کچھ گھنٹے گزار کر فرح کا انتظار کرے گا اس طرح وہ اس سے پہلے پہنچ کر پچھلی باتوں کی تلافی بھی کردیتا۔

"آج تو لگتا ہے خدا نے بھی ہمارے دن کو اسپیشل بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے" موسم اچانک ہی خوشگوار ہوچلا تھا ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور آسمان پر منڈلاتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اور اسپیڈ بڑھادی' اچانک ہی سامنے سے آتا موٹر سائیکل اس سے آن ٹکرایا' غلطی یقیناً" سامنے والے کی تھی جو غلط سمت سے اور بہت لاپرواہی سے آرہا تھا۔

"رضا میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے فوراً" پہنچو۔"

اسے بس یہی سوجھا تھا کہ رضا کو بلالے' وہ رضا کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا جتنی دیر میں رضا وہاں پہنچتا تب تک کسی کے فون کرنے پر ون ون ٹو ٹو کی ایمبولینس بھی آپہنچی تھی علی کے ساتھ ہاسپٹل جاتے ہوئے رضا نے علی کے بابا کو فون کردیا تھا اور ساتھ میں آنٹی کو نہ بتانے کی ہدایت کرتے ہوئے صورت حال کنٹرول میں ہونے کی تسلی بھی دے دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا' شہید محبت ہونے چلے تھے کیا؟" ایک گھنٹے بعد علی کو ہوش آیا تھا رضا اس کا ہاتھ تھامے قریب ہی بیٹھا تھا شرارتی انداز میں شگفتگی سے کہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر چھائی پریشانی علی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی اسے اپنے پیارے دوست اور کزن کی محبت پر ایک دم سے بہت فخر سا محسوس ہوا' اس نے ہولے سے مسکرا کر رضا کی طرف دیکھا۔

"کوئی ہڈی بچی بھی ہے؟" اپنے بازو اور ٹانگ کو پلاسٹر میں جکڑے دیکھ کر اس نے شرارت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بس ایک دو چھوٹے موٹے فریکچر ہوئے ہیں' باقی تو تو ایک دم ہٹا کٹا ہے' یہ بتا بستر کب چھوڑنے کا ارادہ ہے؟ کل عید ہے یار اور تیرا یہ گیٹ اپ عید کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہے"

"آہ" رضا کی بات پر ہنستے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ آہ نکل گئی تھی چہرے پر ہونٹوں کے پاس چوٹ آئی تھی شاید۔

"آنٹی کو نہیں بتایا میں نے تیرے ایکسیڈنٹ کا ڈاکٹر کہہ رہا تھا شام تک ڈسچارج کردیں گے' البتہ انکل اسی وقت آگئے تھے' تب سے یہیں بیٹھے تھے ابھی میں نے انہیں زبردستی گھر بھیجا ہے' اچھا اب ذرا بتا ہوا کیا تھا کیسے ہوا یہ ایکسیڈنٹ؟"

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" رضا کے پوچھنے پر علی کو فوراً" فرح کا خیال آیا تھا۔

"پانچ بجنے والے ہیں' کیوں؟"

"یار پلیز کسی بھی طرح مجھے شاپنگ پلازہ لے چل' میں آج فری کو مایوس نہیں کرسکتا"

"پاگل ہوا ہے کیا' حالت تو دیکھ اپنی"

"پلیز رضا' اگر تم نہیں چلوگے تو میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا" اس نے جیسے دھمکی دی' رضا نے بے بسی سے اسے دیکھا جانتا تھا کہ وہ یقیناً" یہی کرے گا۔

"قسم سے دل کرتا ہے تمہاری لو اسٹوری پر ایک فلم بناؤں' مسٹر مجنوں ان 2013" دو منٹ رک میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں" اور ضروری کارروائی کے بعد وہ مطلوبہ جگہ کی طرف چلے جارہے تھے علی لیٹنے کی پوزیشن میں پچھلی سیٹس پر تھا جبکہ رضا برے برے منہ بناتا ڈرائیونگ کرنے میں مصروف تھا۔ ٹھیک چھ بجے اس نے گاڑی پارکنگ میں پہنچادی۔

علی کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو" فرح کی کال تھی علی نے جلدی سے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم آج بھی نہیں آؤ گے علی؟" اتنی دیر کے انتظار کے بعد وہ اس کی آمد سے مایوس دکھائی دیتی افسردہ لگ رہی تھی۔

"ارے نہیں نہیں میں آگیا ہوں یار' ایک کام کرو پلیز پارکنگ میں آجاؤ' وہاں ایک بلیک گاڑی کھڑی ہے اس کی پچھلی سیٹ پر ایک زخمی آدمی ہے' میرا مطلب ہے پلاسٹر چڑھا ہے اس کے بازو اور ٹانگ پر پلیز ادھر آجاؤ" گاڑی کا نمبر بتانے کے ساتھ علی نے اپنی پہچان کے لیے جو حلیہ بتایا' اسے سن کر رضا کی ہنسی چھوٹ گئی' اس کے ہنسنے پر علی نے اسے غصے سے گھورا مگر سچویشن کا خیال آتے ہی وہ خود بھی ہنسنے لگا۔ رضا گاڑی سے اتر گیا تھا تقریباً" پانچ منٹ بعد اس نے ایک لڑکی کو پارکنگ کی طرف آتے دیکھا وہ گاڑیوں کو دیکھتی ان کی طرف ہی آرہی تھی رضا کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئی۔

"ارے آپ" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

"جی ہم تو یہاں ایک دوست کا انتظار کررہے ہیں مگر آپ یہاں کیسے؟ اگر میں بھول نہیں رہا تو آپ مس کرن ہیں نا جبار صاحب کی بیٹی" رضا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی ہاں اور آپ کا نام۔"

"میں رضا ہوں اور یہ میرا دوست علی" رضا نے ذہن پر زور ڈالنے سے پہلے ہی اپنا اور علی کا تعارف کروادیا تو اس نے پہلی بار پچھلی سیٹ پر موجود علی پر دھیان دیا۔

"تم۔ تم ہو وہ علی جس سے میں بات کرتی تھی" علی کو پہچانتے ہی اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ ناگواری بھی جھلکنے لگی۔

"تم نے مجھے چیٹ کیا"

"او ہیلو میڈم چیٹ میں نے کیا یا تم نے میں نے کم از کم تمہیں اپنا نام تو ٹھیک بتایا تم نے تو نام تک غلط بتایا مجھے یہ بھی کہ تمہاری محبت' سارا کا سارا جھوٹ" اس کے الزام لگانے پر علی کے لہجے میں بھی تنفر سمٹ آیا۔

"تو اب ہم آپ کو کس نام سے پکاریں مس۔ میرا مطلب ہے فرح یا کرن؟" رضا کے پوچھنے پر وہ شرمندہ ہوگئی اور کچھ بھی کہے بنا تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ محبت کے دامن پر بے اعتباری کا داغ لگ چکا تھا سو سب کے ہی دل اداس تھے۔

"مجھے گھر چھوڑ دو پلیز" علی نے تھکے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں لیکن بند آنکھوں تلے بھی وہی چہرہ ابھر آیا تو گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"وہ جھوٹی ہے میرے ساتھ محبت کا ڈراما کررہی تھی" دل میں بار بار یہی خیال آکر اسے بے چین کررہا تھا۔ افطاری راستے میں ہی ہوچکی تھی گاڑی میں رکھی کھجوروں سے دونوں نے روزہ افطار کرلیا تھا اور اب گھر پہنچ کر علی رضا کا سہارا لیتا اپنے کمرے میں آگیا۔

"یہ تمہیں کیا ہوا علی" علی کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی ماں تڑپ ہی تو گئی۔

"میں ٹھیک ہوں امی بس چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہوجاؤں گا' ابھی مجھے ریسٹ کرنا ہے پلیز"

"چلیں آنٹی ہم نیچے چل کر گپ شپ کرتے ہیں اسے فی الحال تھوڑا ریسٹ کرنے دیں" رضا آنٹی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کمرے سے باہر لایا اور دروازہ بند کرکے علی کو تنہائی میں سوچنے کا موقع دیا۔

☼ ☼ ☼

"اچھا تو یہ بات ہے' لیکن یہ تو بہت اچھا ہوگیا نا؟" رضا نے ساری بات آنٹی کے سامنے رکھ دی تو وہ پریشان ہونے کی بجائے مسکراتے ہوئے بولیں تو رضا حیران ہوگیا۔

"کیا اچھا ہوگیا آنٹی آپ کا بیٹا مجنوں بنا پڑا ہے اور آپ خوش ہیں کیسی ماں ہیں آپ؟" رضا نے ان کے ممتا کے جذبے کو للکارا تو وہ ہنس پڑیں۔

"بیٹا جی میں اس لیے خوش ہوں کیونکہ میں جس

لڑکی کے لیے علی سے کئی بار بات کر چکی ہوں وہ کرن ہی ہے، میری بڑی خواہش تھی کہ کرن بہو بن کر میرے گھر آجائے مگر علی تھا کہ مان کے نہ دیتا تھا اور اب انجانے میں اسی لڑکی کو پسند کر بیٹھا" آنٹی کی بات سن کر رضا بھی خوش ہو گیا۔

"لیکن وہ دونوں تو ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے" رضا کو نئی فکر نے آن گھیرا۔

"اگر تم کہو تو میں اس کے امی ابو سے رشتے کی بات کروں کیونکہ ہماری طرح ان کی بھی یہی خواہش ہے کہ کرن ہمارے گھر کی بہو بنے"

"ابھی نہیں آنٹی یہ نیک کام آپ کل تک کے لیے ملتوی کر دیں اور ہاں آپ فکر نہ کریں میں کرتا ہوں کچھ" وہ آنٹی کو تسلی دیتا اٹھ کر جانے لگا۔

"ارے کھانا تو کھاؤ بیٹا"

"ابھی نہیں آنٹی ابھی اور بہت ضروری کام کرنے ہیں" وہ ذہن میں اگلا پلان ترتیب دیتا گاڑی نکال لے گیا۔

☼ ☼ ☼

چاند تو نکلا عید آئی نہیں
میں تو اک بار بھی مسکائی نہیں
میرے ہاتھوں پہ نہ لگی مہندی
بانہیں گجروں نے بھی مہکائی نہیں
رات گزری ہے دنیا سوتی ہے
میری آنکھوں میں نیند آئی نہیں
میرے دکھ سکھ میں میرے ساتھ نہیں
پھر بھی کہتے ہیں وہ ہرجائی نہیں
نہ کوئی دوست نہ کوئی ساتھی
کم ہوئی آج بھی تنہائی نہیں
میرے دل میں خوشی کا نام نہیں
میں نے عید بھی منائی نہیں

بیڈ روم کی بڑی سی ونڈو سے نظر آتے عید کے چاند پر نظریں جمائے وہ غم والم کی تصویر بنی ہوئی تھی، چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور آنکھیں ساون کے بادل کی طرح برس رہی تھیں اس چاند رات کے لیے اس نے کیا کیا پلان کیا تھا مگر سب کچھ بکھر گیا تھا۔

"میں نے دل سے اسے چاہا مگر اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا، کیا چاہتا تھا وہ؟ اس سے شادی سے انکار کر دیا شاید اسی چیز کا بدلہ لیا اس نے، لیکن میں اس سے شادی کے لیے ہاں کیسے کر سکتی تھی جب کہ میں ٹیلی فون پر اپنا دل ہار چکی تھی، اور اس کی مما اشارے کنایوں میں میری اور اس کی شادی کی بات کرتی رہی تھیں حالانکہ وہ اس وقت فون پر مجھ سے شادی کے وعدے اور محبت کا دعوا کر رہا ہوتا تھا، کیا وہ میرا کردار جانچ رہا تھا؟ مگر کیوں اس کو کیا حق ہے اس طرح کرنے کا۔۔۔" ذہن بدگمانیوں کی راہ پر چل نکلا تھا اور اس نے دل کی ہر بات ماننے سے انکار کر دیا تھا، آنسو ایک بار پھر تواتر سے گرنے لگے تھے، اسی لمحے اس کے موبائل پر بیل ہونے لگی، وہ ٹھس سی بیٹھی رہی وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن فون کرنے والا بھی اول درجے کا ڈھیٹ تھا آخر تنگ آکر اس نے بیڈ پر پڑا موبائل اٹھا کر دیکھا اجنبی نمبر تھا پہلے اس نے سوچا لائن کاٹ دے مگر پھر یونہی بے دھیانی میں کال ریسیو کر لی۔

"شکر ہے آپ نے کال تو ریسیو کی" اپنائیت لیے ہوئے اجنبی آواز نے اسے چونکایا۔

"سوری میں نے آپ کو پہچانا نہیں"

"خاکسار کو رضا کہتے ہیں۔"

"اوہ تو اب یہ اس کی صفائیاں پیش کریں گے" غصے سے سوچتے ہوئے کرن نے کال ڈسکنکٹ کرنے کا سوچا

"پلیز پلیز مانا کہ میں اس ڈفر کا دوست ہوں مگر آپ دو منٹ میری بات تو سن سکتی ہیں نا"

"بولیے" جانے کیا سوچ کر کرن اس کی بات سننے کو تیار ہو گئی۔

"دیکھیں کرن میں آپ کو اس حد تک تو جانتا ہی ہوں کہ آپ ایک اچھے گھرانے کی اچھی لڑکی ہیں رہی بات علی کی تو وہ میرا کزن ہی نہیں بچپن کا دوست بھی ہے، آپ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ باتیں چھپائیں لیکن آپ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مخلص تھے اب اتنی سی بات کے لیے آپ لوگ اپنے درمیان بنے اتنے خوبصورت رشتے کو ایسے آرام سے ختم کر دیں گے؟"

"رضا میں نے شروع میں علی سے بات کی تو وہ صرف ایک مذاق تھا میں نے اپنا اصل نام بتانے کی بجائے ایک فرضی نام بتا دیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ہم لوگوں کا تعلق مضبوط ہوتا گیا تو میں نے بہت بار سوچا کہ میں اسے اپنا اصل نام بتا دوں پھر اس کی ناراضی کا سوچ کر نہیں بتاتی تھی لیکن میں نے یہی سوچا ہوا تھا کہ جب ہم ملیں گے تو میں یہ سب بتا کر سوری کر لوں گی" وہ بھیگے لہجے میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی۔

"لیکن آپ نے اسے دیکھتے ہی چیٹر کہہ دیا اور وہاں سے چلی آئیں" رضا نے اسے اس کی غلطی کا احساس دلایا تو وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔

"ہاں میں نے غلطی کی لیکن اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں یہی آیا کہ اس نے جان بوجھ کر مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے الو بنایا" وہ شرمندہ لہجے میں بتانے لگی۔

"آپ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اگر یہ سب صرف مذاق یا آپ کو ڈی گریڈ کرنے کے لیے ہوتا تو وہ ایکسیڈنٹ کے باوجود ایسی ٹوٹی پھوٹی حالت میں آپ سے ملنے نہ پہنچتا" رضا کے کہنے پر اس کے سامنے علی کا پٹیوں میں جکڑا جسم آیا تو یکدم ساری بدگمانیاں ناراضی بھول کر پریشان ہو گئی۔

"اب وہ کیسا ہے؟"

"دروازہ بند کیے مجنوں بنا چاند رات کو شب غم منائے غمگین غزلیں سن رہا ہے" رضا نے پورا نقشہ کھینچ دیا۔

"ایک کام کر سکتی ہیں پلیز؟"

"جی؟"

"کیا آپ دوبارہ اسی پلازہ کی پارکنگ میں آسکتی ہیں؟"

"مگر۔۔۔"

"پلیز تو اگر مگر، آج چاند رات ہے یار آپ دونوں اپنے ساتھ ساتھ میری چاند رات بھی خراب کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔"

"آپ کی کیسے؟"

"ارے یار جب میرے دوست ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے آنسو بہا رہے ہوں گے تو میں کیا خاک چاند رات مناؤں گا۔" رضا کے انداز پر کرن مسکرانے لگی۔

"تو آپ آرہی ہیں نا؟"

"جی آرہی ہوں۔" وہ فوراً فیصلہ کر بیٹھی۔

"گڈ گرل او کے پھر ملتے ہیں وہیں۔"

"او کے۔" موبائل رکھتے ہوئے کرن باتھ روم کی طرف چل دی تاکہ آنسوؤں کے نشان مٹا سکے۔

☼ ☼ ☼

"کون ہے؟" دروازے پر ہونے والی دستک علی کو بہت ناگوار گزری تھی وہ کہہ چکا تھا کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

"میں ہوں اور کس نے ہونا ہے، ذرا اٹھ کر بیٹھو جلدی سے۔" لائٹ آن کر کے رضا نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔" وہ ایسے ہی لیٹا رہا۔

"جانا ہے کہیں۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا۔" علی نے بے زاری سے کہتے ہوئے تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

"اٹھتا ہے کہ اٹھا کے لے جاؤں۔"

"کیا مصیبت ہے تمہیں۔" رضا کے تیور دیکھ کر وہ منہ بناتا ہوا اٹھ بیٹھا گھر سے نکلتے ہوئے رضا نے آنٹی کو سب او کے ہونے کا اشارہ کیا اور علی کو لے کر باہر آگیا۔

"دوبارہ یہاں کس لیے آئے ہیں؟" سارا راستہ منہ بنا کے خاموش بیٹھا علی پارکنگ میں پہنچ کر خاموش نہیں رہ سکا۔

"یار آج چاند رات ہے شاپنگ تو کرنی ہے نا۔"

"بھاڑ میں جائے شاپنگ مجھے واپس گھر لے کر چلو۔" اس کا دل ٹوٹا ہوا تھا ایسے میں رضا کی ایسی حرکت پر وہ چلا کے بولا۔

"السلام علیکم۔" جانی پہچانی آواز پر علی نے چونک کر سائیڈ پر دیکھا، ایک لمحے کو آنکھوں میں چمک ابھری پھر منہ پھیر لیا۔

"وعلیکم السلام آیئے مس کرن آپ آگے آجائیں۔" رضا نے البتہ بڑا پرتپاک استقبال کیا اور آگے کا دروزہ کھول کر اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔

"علی یہ میری پیاری دوست اور بہن ہیں کرن جبار، اور کرن یہ میرا اسٹوپڈ مگر بہت سویٹ سا دوست اور بھائی ہے علی۔" دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظریں چرالیں۔

"بس کرو یار غلطی دونوں کی ہے دونوں اچھے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے سوری کرو اور جھگڑا ختم کرو۔"

"یار قسم سے پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ دو پیار کرنے والے خود ہی ظالم سماج کا رول پلے کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اپنا نہیں تو کچھ مجھ غریب کا ہی خیال کرو۔" اس کے بے چارگی سے بولنے پر وہ دونوں بے ساختہ مسکرانے لگے تو رضا نے سکون کا سانس لیا۔

"اب میں سیدھے سیدھے پوچھتا ہوں، کیا یہ ڈفر آپ کو قبول ہے مس کرن؟" رضا نے کرن کی طرف دیکھ کر معنی خیزی سے کہا تو وہ گھبرا کر علی کو دیکھنے لگی۔

"مسٹر رضا آپ نے ان کا تعارف مکمل نہیں کروایا پہلے میں وہ تعارف مکمل کردوں یہ ہیں مس کرن جبار، مستقبل کی مسز علی، کیوں ٹھیک کہا نا؟" علی نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی اور آخر میں کرن کی تصدیق چاہی تو وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔

"او ہو مبارکاں سلام بھابھی جان۔" رضا نے کرن کو تنگ کرنے کو اوہو کو کچھ زیادہ ہی لمبا کھینچ دیا۔

"کیسی ہو۔" علی اسے سامنے پا کر سارا درد، تکلیف بھول بیٹھا تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں مگر یہ آپ کو کیا ہوا؟" کرن اس کی حالت پر پریشان تھی۔

"کچھ نہیں یار ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ۔"

"کب ہوا کیسے ہوا؟"

"ارے یہ سب چھوڑو یار سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ آج ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں، یار ذرا ڈیش بورڈ میں سے شاپر نکالو۔" علی کو اچانک ہی کچھ یاد آیا، جب اس نے شاپر کھولتے ہوئے اس میں سے پھولوں کے کنگن نکالے تو کرن نے مسکرا کر ہاتھ اس کے سامنے کر دیے وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گجرے پہنانے لگا تو فرح کے گالوں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ فضا میں ہر طرف محبت کا راج تھا اور جہاں محبت ہو وہاں گلے شکوے زیادہ دیر سانس نہیں لے پاتے۔

☼ ☼ ☼
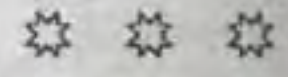
"اہم اہم۔" وہ گاڑی میں بیٹھے ایک دوسرے سے باتوں میں اتنا مگن ہو گئے تھے کہ رضا کے بارے میں بھول ہی گئے، کافی دیر بعد رضا آیا تو اس کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگ تھے، جب باتوں میں مگن ان دونوں نے اس کی آمد کا بالکل نوٹس نہ لیا تو اسے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلانا پڑا۔

"یہ سب کیا ہے؟" علی نے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کم از کم آج تو تم شاپنگ کی پوزیشن میں بالکل نہیں ہو تو میں نے سوچا کیوں نا آج میں اپنی بھابھی کے لیے عید کی شاپنگ کر دوں۔ مردانہ کرتوں کی سیل لگی تھی تو لگے ہاتھوں تمہارے لیے بھی یہ کرتا لیتا آیا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح شرارتی انداز میں بات کرتے ہوئے ڈبے کھول کر کپڑے ان کے سامنے کر دیے۔

"کیسے لگے آپ کو؟" اب وہ ڈائریکٹ کرن سے پوچھ رہا تھا۔

"بہت اچھے ہیں۔"

"پسند کرنے کا شکریہ۔" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھتا آداب بجا لایا، کرن اور علی مسکرانے لگے۔ "اور یہ میں کھانا پیک کرا لایا ہوں، آپ لوگ کھانا کھائیں، میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

"ارے بیٹھیں نا پلیز آپ بھی ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔" فرح کو اس کا اس طرح جانا بالکل اچھا نہ لگا تو روکنے لگی۔

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے کباب میں ہڈی بننا بالکل پسند نہیں دوسری بات یہ کہ میرا اپنا کباب میرا مطلب ہے میری ہونے والی منگیتر بھی میرا انتظار کر رہی ہے اور میں لیٹ بالکل نہیں ہونا چاہتا۔"

"تمہاری ہونے والی منگیتر؟" علی نے تعجب سے پوچھا کیونکہ ایسی کوئی لڑکی اس کے علم میں اب تک نہیں تھی۔

"ہاں یار وہ کل رات ہی ماما نے علینہ کے لیے پوچھا تھا تو میں نے ہاں کر دی۔" اس کی آنکھوں کے جلتے دیپوں میں صرف علینہ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

"اور ہاں میں نے آنٹی سے کرن بھابھی کے بارے میں بات کر لی ہے وہ اپنی بہو گھر لانے کو بے تاب ہیں۔" اس نے علی کو ایک اور سرپرائز دیا۔

"بھابھی صاحبہ چاند رات مبارک ہو۔" اس کے بھابھی کہنے پر کرن شرما گئی، علی نے اس کا شرمایا ہوا حسین روپ اپنی آنکھوں میں بساتے ہوئے بہت پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ رضا ان دونوں کو مگن دیکھ کر مسکراتا ہوا وہاں سے چل دیا کہ سامنے ریستوران میں بیٹھی علینہ اس کی منتظر تھی، علینہ کے خیال سے اس کے اٹھتے قدموں میں اور بھی تیزی آگئی آخر اسے بھی تو اپنی چاند رات حسین بنانا تھی۔

☼ ☼

عتیقہ محمد بیگ

میرے چاند

وہ کب سے دیوار پر لگی اپنی شادی کی تصویر دیکھ رہی تھی کہ ہارون نے اسے کمرے میں آکر چونکایا۔
"تم نے سامان پیک کرلیا ہے تو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔" اس نے دبی آواز سے بات کی وہ یک دم اس کی طرف دیکھنے لگی اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی وہ پریشانی سے بولی۔
"ہارون... کیا میں اپنا قصور جان سکتی ہوں؟ اس نے بمشکل اپنی زبان کو حرکت دی۔
ہارون کے چہرے پر خفگی کا تاثر جھلکنے لگا۔
"پلیز آمنہ میرے پاس فضول باتوں کے لیے اب وقت نہیں ہے۔" اس نے مضبوط لہجے سے جواب دیا۔ وہ پریشانی سے اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔
"میں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جاؤں گی، جب تک آپ مجھے میرا قصور نہیں بتادیں گے۔" اس کی آنکھوں کی نمی اسے صاف صاف دکھائی دینے لگی۔
وہ کرخت آواز میں بولا... " تمہارا کوئی قصور نہیں قصور میرا ہے بس میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے جواب دیا۔
" اس کا مطلب ہے کہ آپ کسی اور کے ساتھ..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی... اور نظریں جھکالیں... آنسو اس کے گالوں پر پھیلنے لگے۔
وہ مزید غصے میں آکر بولا...
"تم جو سوچنا چاہتی ہو... سوچ لو... میں باہر گاڑی میں بیٹھا ہوں... جلدی سے سامان پیک کرکے آؤ" اس نے حکم سنایا... اور غصے سے کمرہ چھوڑ گیا۔
وہ پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئی...
"ہارون... ہارون... میری بات تو سنیے... مجھے میرا قصور تو بتائیے" وہ دروازے کے پاس آکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی... وہ سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔ اور اس نے پلٹ کر نہ دیکھا... جس کے دل و دماغ پر وہ منظر چھایا ہوا تھا۔
وہ گاڑی میں آکر لمبے لمبے سانس لینے لگا... پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ مسلتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھا... اس کے چہرے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی سرخی مائل سی ہو گئیں۔
"بہت محبت کی... تم سے... مگر تم نے میری محبت کی قدر نہیں کی... آخر آمینہ میری محبت میں کیا کمی رہ گئی تھی..." وہ منہ میں بڑبڑایا... اور اپنا سگریٹ جلا کر اس نے اپنے ہونٹوں سے دبالیا۔
"تم سبحان کی بانہوں میں چلی گئیں... مجھے دھوکا دے کر اپنا قصور پوچھ رہی ہو۔" اس نے سگریٹ کا بھرپور کش لیا... اور دھواں چھوڑتے ہوئے آئینے میں اپنے عکس سے بات کی۔
"میں تمہاری اصلیت جان چکا ہوں... تمہیں دبے قدموں اپنی آنکھوں سے سبحان کے کمرے میں جاتے دیکھ چکا ہوں... بے وفا ہو تم... یہ قصور ہے تمہارا۔" اس نے تلخی سے اپنا ہونٹ چبایا... اور ہارن پر ہاتھ رکھ دیا... وہ آج رات آمینہ کو خود سے جدا کرنے کا سوچ چکا تھا... اس لیے ہارن سے اس نے اپنا ہاتھ نہیں اٹھایا... وہ کمرے میں ہارن کی آواز سن

کر مزید بوکھلا سی گئی۔۔۔ اس نے تیزی سے اٹیچی میں اپنے کپڑے رکھے۔ اور پھر کمرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں شادی کی تصویر پر ٹھہر گئیں۔۔۔

"ہارون تم کتنے بدل گئے ہو۔۔۔ میں کب سے تمہارے سامنے روتی رہی۔۔۔ مگر تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔۔۔ پہلے خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے۔۔۔ تو تم بے چین سے ہو جاتے تھے۔۔۔ مگر اب۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا۔۔۔ خدا میری مدد کر مجھ سے ہارون کی محبت مت چھین۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔۔۔" وہ روتے روتے تصویر کو چھونے لگی۔

گاڑی کے ہارن کی آواز آرہی تھی۔۔۔ اس لیے اس نے بجھے دل سے سوٹ کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر نکلنے کے لیے بڑھ گئی۔۔۔

وہ روڈ پر بہت تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔۔۔ آمنہ پریشان ہو کر گاڑی کی اسپیڈ دیکھنے لگی۔۔۔ جس کی رفتار 200 کی رفتار سے مزید بڑھ رہی تھی۔ وہ فکر مندی سے اسے دیکھ کر بولی۔۔۔

"ہارون گاڑی آہستہ چلاؤ۔۔۔ خدانخواستہ کچھ برا نہ ہو جائے۔۔۔" وہ اس کے غصے سے گھبرا رہی تھی۔ وہ طنزیہ مسکراتے بولا۔۔۔

"برا کیا ہو گا۔۔۔ یہی نا کہ میں مر جاؤں گا۔"

"ہارون تمہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔ کیوں بری بری باتیں کر رہے ہو۔۔۔ خدا تمہیں لمبی عمر دے۔۔۔" وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔۔۔ جس کی آنکھیں بہت سرخ ہو چکی تھیں۔

وہ ہنسا۔۔۔ "نہیں۔۔۔ نہیں مجھے اب لمبی عمر کی دعا مت دو۔۔۔ شاید زندگی کا لمبا سفر مجھ سے کاٹا نہ جائے۔۔۔" اس نے ایک اور تیر اس کے دل میں پیوست کیا۔

"ایسی باتیں کر کے تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔۔۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔۔۔ اور اس نے نظریں چرا لیں۔۔۔

"میرے لیے پریشان۔۔۔ سچ کہہ رہی ہو۔۔۔" وہ ہنستا چلا گیا۔۔۔ جیسے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔

"تمہارے لیے پریشان نہیں ہوں گی۔۔۔ تو پھر اور کس کے لیے ہوں گی۔۔۔" اس نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔۔۔ وہ اس کی بات پر خفا سی ہو گئی۔

"تمہیں ایک شعر سنانے کو دل چاہ رہا ہے۔۔۔" اس کے لہجے میں عجیب سا طنز تھا۔۔۔ جس سے آمنہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

قدم رک گئے ہیں آج پھول بکھرتے دیکھ کر
وہ اکثر مجھ سے کہتا تھا محبت پھول جیسی ہے

اس نے آمنہ کی طرف دیکھ کر شعر کے الفاظ ادا کیے۔۔۔

"ہارون پلیز آگے دیکھیے۔۔۔" وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔۔۔ جس کے سامنے ایک گاڑی دوسرے روڈ سے موڑ کاٹتی ان کے سامنے تھی۔

اس نے جلدی سے گاڑی کو بریک لگایا۔۔۔ آمنہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگنے لگی۔۔۔ گاڑی والے نے غصے سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ ہارون نے لاپرواہی سے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی۔۔۔ ابھی گاڑی چلنے ہی والی تھی۔۔۔ کہ پیچھے سے ایک پولیس بائیک نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی کو روکنے کا حکم دیا۔۔۔

پولیس انسپکٹر بائیک سے اتر کر ان کی گاڑی کے پاس آکر رکا۔۔۔ ہارون کی طرف اس نے مسکرا کر دیکھا۔۔۔ اور بولا۔۔۔

"بھائی صاحب۔۔۔ حکومت نے یہ روڈ اکیلے آپ کے لیے نہیں تیار کیا۔۔۔ اپنی زندگی کا خیال نہیں۔ تو دوسروں کی زندگی کا تو خیال کیجیے اس کی نظریں آمنہ پر پڑیں۔

"آپ چالان کاٹنا چاہتے ہیں۔۔۔ تو جلدی کر دیں۔ مجھے کہیں جلدی جانا ہے۔۔۔" اس نے انسپکٹر کو جواب دیا۔

پولیس انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "بھابھی سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟۔۔۔ کیوں بھائی۔۔۔؟" آمنہ

سر جھکائے بیٹھی تھی۔۔۔ پولیس انسپکٹر نے آخر کار پوچھ ہی لیا۔

"آپ کو پرسنل سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔" اس نے مضبوط لہجے سے اس کو جواب دیا۔۔۔ آمنہ کے ہاتھ لرزنے لگے۔۔۔ اس نے گھبرا کر پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھا۔۔۔ کو کہیں مزید کوئی مسئلہ بگڑ نہ جائے۔ پولیس انسپکٹر مسکرا کر بولا۔۔۔

"بھائی جی۔۔۔ غصہ نہ کریں۔۔۔ میاں بیوی میں جھگڑے تو ہوتے رہتے ہیں۔۔۔ غصہ تھوک دیں۔۔۔" پولیس انسپکٹر اپنی عمر کے تجربے سے بھانپ چکا تھا۔۔۔ کہ ہارون بیوی سے خفا ہو کر گاڑی چلا رہا تھا۔۔۔ جس سے حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔۔۔

اس نے غصے سے اپنے والٹ سے ایک ہزار کا نوٹ نکالا۔۔۔ اور پولیس انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

"جائیے جناب۔۔۔ مگر گاڑی تیز چلانے سے پہلے سوچ لیں۔۔۔ کہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔۔۔" پولیس انسپکٹر نے مسکرا کر جیب میں ہزار کا نوٹ رکھ کر جملہ پھینکا۔

ہارون نے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھی۔۔۔ اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے اپنے سفر کی طرف بڑھ گیا۔۔۔ اب گاڑی کی اسپیڈ زیادہ تیز نہ تھی۔ اس کا غصہ کم ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ اس کی وجہ ہوا کی ٹھنڈک بھی تھی جس نے اس کے جلتے احساسات کو سکون دے دیا۔

گاڑی اپنے سفر پر تھی۔۔۔ وہ گاڑی سے باہر دیکھ رہی تھی۔۔۔ روڈ پر ایک آدمی گجرے فروخت کر رہا تھا۔۔۔ اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔۔۔ اور وہ اپنے ماضی میں ڈوب گئی۔۔۔ جہاں وہ باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔۔۔ اور ہارون اس کو آوازیں دیتے ہوئے باورچی خانے میں داخل ہوا۔۔۔

"آمنہ۔۔۔ آمنہ۔۔۔ یہ لیجیے۔۔۔ میں آپ کے لیے گجرے لایا ہوں۔۔۔"

"اوہو۔۔۔ کام تو کر لینے دیں۔۔۔ بعد میں پہن لیتی ہوں۔۔۔" اس نے ہنڈیا میں چمچہ چلاتے جواب دیا۔

"میری جان۔۔۔ بس یہ جلدی سے اپنے ہاتھوں میں پہن لیں۔۔۔" اس نے مسکرا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"آپ بھی گجرے لانا نہیں بھولتے۔۔۔" اس نے گجرے پہن کر ہنڈیا میں چمچہ چلایا۔

"جس دن گجرے لانا بھول گیا۔۔۔ سمجھ لینا۔۔۔ کہ میری لائف میں کوئی اور آگئی۔" اس نے ہنستے ہنستے اسے چھیڑا۔۔۔ اور ٹیبل پر سجی سلاد کی پلیٹ سے کھیرے کے قتلے کھانے لگا۔

"ایسی باتیں مت کرو۔۔۔ میں خفا ہو جاؤں گی۔۔۔" آمنہ نے منہ بسور کر چولہے کی آنچ کم کر دی۔۔۔

وہ مسکرایا۔۔۔ "تو پھر جناب۔۔۔ آئندہ گجرے پہننے سے منع مت کرنا۔۔۔ ورنہ میں کسی اور کو پہنا دوں گا۔۔۔" وہ کھیرے کے قتلے کھاتا ہی چلا گیا۔

وہ چاقو اٹھا کر بولی۔۔۔ "مجھے دھوکہ دے کر بچ کر کہاں جائیں گے۔۔۔ میں آج کی عورت ہوں۔۔۔ اپنا حق واپس لینے کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔۔۔ اور جان لے بھی سکتی ہوں۔۔۔" اس نے بھی شدید لہجے سے جتلایا وہ ہنسنے لگا۔۔۔

"میری جان تو کب سے آپ کی غلام ہے۔۔۔" اس نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

وہ ہاتھ چھڑوا کر فریج کی طرف بڑھی۔۔۔ اس نے دو کھیرے اس کے ہاتھ میں تھمائے۔۔۔

"تو پھر غلام جی۔۔۔ جلدی سے کھیرے کاٹ کر سلاد کی پلیٹ میں سجا کر رکھیے۔۔۔"

"مجھ سے کام لو گی۔۔۔" اس نے معصوم سا چہرہ بنا لیا۔

"کھیرے آپ نے سارے کھا لیے ہیں۔۔۔ اب میں کیا کھاؤں گی۔۔۔" اس نے سلاد کی پلیٹ پر اس کی توجہ دلائی۔

اوکے اوکے جناب۔۔۔ آپ کے لیے بندہ خون کر سکتا ہے۔ یہ تو پھر کھیرے ہیں۔۔۔" اس نے چاقو

پکڑا۔۔۔ اور کھیرے پر تیزی سے چھری چلائی۔۔۔ وہ ہنستی چلی گئی۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر گئی۔
ہارون نے بریک لگایا۔۔۔ جس سے وہ چونکی۔۔۔ گاڑی کے سامنے سے ایک بلی گزر رہی تھی۔۔۔ وہ اپنے ماضی سے پلٹ آئی۔۔۔ روڈ سنسان تھا۔۔۔ اس نے ہارون کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ اس سے لاپروا ہو کر گاڑی چلانے لگا۔۔۔ وہ گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔
"آمینہ مجھے یقین نہیں آرہا۔۔۔ کہ تمہاری اصلیت یہ ہوگی۔۔۔" اس نے گاڑی چلاتے چلاتے اس کی طرف دیکھ کر دل میں سوچا۔ جو اس سے بے خبر گاڑی سے باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی۔
"تم نے میرے کزن کے ساتھ مل کر مجھے دھوکا دیا۔۔۔ سبحان کی عادت سے میں اچھی طرح سے واقف تھا۔۔۔ وہ لڑکیوں کی تعریف کر کے انہیں اپنے جال میں پھانس لیتا تھا۔۔۔ مگر تم کیسے؟"۔۔۔ اس کا دل چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔۔۔ مگر اس کے دل کی آواز کہاں آمینہ تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ تو یہ بھی نہیں جان سکی تھی۔۔۔ کہ اس کا پیارا شوہر اسے طلاق دینے کا بھی سوچ چکا ہے۔
"کاش کہ وہ رات میری زندگی میں کبھی نہ آتی۔۔۔ تم مجھ سے نظریں بچا کر اس کے کمرے میں پوری رات رہیں۔۔۔ اور صبح ہونے سے پہلے ہی تم بستر پر آکر لیٹ گئیں۔۔۔ کیوں تم نے مجھے دھوکا دیا۔۔۔" اس نے گاڑی کی اسپیڈ پھر سے تیز کردی۔۔۔ ایک دم آمینہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔۔۔ اور اس کے چہرے سے غصہ جھلک رہا تھا۔۔۔
"ہارون۔۔۔ پلیز۔۔۔ گاڑی کی اسپیڈ کم کردیں۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے مجبور ہو کر اس کو منع کیا۔۔۔
"میں جلد از جلد تمہیں گھر چھوڑنا چاہتا ہوں۔۔۔" اس نے بغیر اس کی طرف دیکھ کر بتایا۔
"آپ کو میرے ساتھ بیٹھنا بھی برا محسوس ہو رہا ہے۔۔۔" وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

"ہاں۔۔۔ بہت برا۔۔۔" وہ غصے سے اس کی طرف دیکھ کر بولا اور اس نے گاڑی کی اسپیڈ مزید تیز کردی۔۔۔ وہ رونے لگی۔۔۔
اس نے غصے سے ریڈیو آن کردیا۔۔۔ ریڈیو پر گانا بجنے لگا۔۔۔

غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو۔۔۔
میری رات کا چراغ۔۔۔
میری نیند بھی ہے تو
میری زندگی ہے تو۔۔۔

آمینہ نے اپنے آنسوؤں کو پونچھ لیا۔۔۔ وہ غصے سے اب باہر کی طرف دیکھنے لگی۔۔۔ اس نے اپنے دل کو مضبوط کرلیا۔۔۔ کہ اب وہ دوبارہ پلٹ کر ہارون کی طرف نہیں دیکھے گی۔۔۔ جس کو اس کا وجود بہت اذیت دے رہا ہے۔
گاڑی اس نے گھر سے تھوڑی دور روک دی۔۔۔ اس کی وجہ آمینہ کا بھائی طلحہ تھا جو اپنی گاڑی کا انجن کھول کر اپنے کام میں مصروف تھا۔۔۔ وہ آہستگی سے بولا۔۔۔
"میں طلحہ سے ملنا نہیں چاہتا۔۔۔ تمہیں یہاں تک ڈراپ کر سکتا ہوں۔۔۔" اس نے آہ بھر کر کہا۔ وہ خاموشی سے کچھ کہے بغیر گاڑی سے اتر گئی۔۔۔ ڈگی سے اس نے اپنا سوٹ کیس نکال لیا۔۔۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔۔۔ کہ وہ چیخ چیخ کر روئے۔۔۔ اس سے پوچھے۔۔۔ کہ آخر کس وجہ سے وہ اس کو چھوڑ رہا ہے۔۔۔ مگر اس کی زبان میں حرکت ہی نہ رہی۔۔۔ وہ سوٹ کیس گھسیٹ کر آہستہ قدموں سے روڈ سے دوسرے روڈ پر جانے لگی۔۔۔ جہاں اس کا بھائی طلحہ اس کی آمد سے بے خبر گاڑی ٹھیک کر رہا تھا۔
"تم بے وفا ہو۔۔۔ آمینہ۔۔۔" وہ گاڑی میں بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا کہ سیل فون کی رنگ بجنے لگی وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دوسری سیٹ کے نیچے آمینہ کا سیل فون بج رہا تھا۔۔۔ جس کے سیل فون پر سبحان اس کے کزن کا نمبر آرہا تھا۔

اس نے غصے سے کال پک کی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔۔۔ دوسری طرف شہباز کی جگہ بسمہ تھی۔۔۔ بسمہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔۔۔
"بھابھی۔۔۔ آپ نے اس رات ہم دونوں کو بہت سمجھایا۔۔۔ کہ یوں چھپ چھپ کر ملنا بہت بری بات ہے۔۔۔ اس لیے ہم نے نکاح کرلیا ہے۔۔۔ بھابی میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔۔۔ اس رات آپ نے مجھے وقت دیا۔۔۔ مجھے چھپ کر آپ کے گھر نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔ مجھے معاف کردیں۔۔۔" بسمہ لفظ ادا کرتی چلی گئی۔۔۔ اس نے سیل فون کو چھوڑا۔۔۔ اور تیزی سے گاڑی سے اتر کر آمینہ کی طرف بھاگا۔۔۔ جو اپنے گھر کے بہت نزدیک جا پہنچی تھی۔
اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔۔۔ جب ہارون نے پیچھے سے آکر تیزی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔۔۔ وہ گھبرا سی گئی۔۔۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"چلو۔۔۔ گھر چلو۔۔۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔۔۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔۔۔
اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی۔۔۔ اس نے سوٹ کیس اپنے ہاتھ میں پکڑا۔۔۔ اور دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر گاڑی کی طرف چلنے لگا۔۔۔ وہ ہارون کے اس رد عمل پر کچھ نہ بول سکی۔۔۔ اور چپ چاپ اس کے ساتھ چل پڑی۔۔۔ وہ اس سے بے پناہ محبت جو کرتی تھی۔۔۔ اس نے پیار سے دروازہ کھول کر اسے گاڑی میں بٹھایا۔۔۔ اور اس کا سوٹ کیس ڈگی میں رکھ کر گاڑی میں آبیٹھا۔۔۔ اور پیار سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"کیا ہوا؟۔۔۔" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔۔۔ اسے ہارون کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔۔۔ ایک ہفتے سے وہ بری طرح سے پیش آرہا تھا۔۔۔
"میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا۔" اس نے آمینہ کا ہاتھ تھام لیا۔
"میں سمجھی نہیں۔۔۔" وہ پریشانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"بس۔۔۔ اب باقی باتیں گھر چل کر بتاؤں گا۔۔۔"

وہ مسکرایا۔
"نہیں۔۔۔ مجھے ابھی بتائیے۔۔۔" وہ تجسس سے بولی۔۔۔ اس نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔۔۔ اور دوبارہ سے گاڑی سفر پر ڈال دی۔۔۔
"اوہو۔۔۔ گھر جا کر بتاؤں گا۔۔۔ ورنہ یہاں بتادیا۔۔۔ تو تم اپنی امی کے گھر چلی جاؤ گی۔۔۔" وہ مسکرایا۔
"تم آپ بھی تو یہی چاہتے تھے۔ پھر ایسا کیا ہوا۔۔۔ جس سے آپ کا سارا غصہ پل بھر میں غائب ہوگیا۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"اچھا۔۔۔ چلو۔ اچھا سا گانا سنو۔۔۔" اس نے بات کا رخ موڑ دیا۔ اور ریڈیو آن کردیا۔۔۔ جس پر اطلاع دی جا رہی تھی۔۔۔ کہ رمضان کا چاند نظر آگیا ہے۔۔۔ کل روزہ ہوگا۔۔۔
"آپ کو رمضان مبارک ہو۔۔۔" آمینہ نے ساری بات ایک طرف رکھ کر اسے مبارکباد دی تھی۔۔۔ وہ خوش تھی۔۔۔ کہ وہ واپس اپنے گھر جا رہی ہے۔
"خیر مبارک۔۔۔" اس نے خوشی سے جواب دیا۔۔۔ اور دل ہی دل میں خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگا۔۔۔ کہ اس نے اس کی زندگی کا چاند اسے واپس کردیا تھا۔۔۔ اس نے پیار سے آمینہ کی طرف دیکھا۔۔۔ جو اس کی ہر بات کو بھلا کر کل کی افطاری کا پروگرام بنانے لگی۔
"میرا چاند۔۔۔ ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔۔۔ اور آئندہ میں کبھی اسے خود سے جدا نہیں کروں گا۔۔۔ اور یہ "چاند" میرے رب نے صرف میرے لیے ہی بنایا ہے۔۔۔" اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔۔۔ جس سے آمینہ کا دل مطمئن ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ اور جب دل مطمئن ہوتا ہے۔۔۔ تو زندگی کا سفر سکون سے کٹنے لگتا ہے۔۔۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔۔۔ اور ان دونوں کے درمیان آنے والا دکھ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔

☆ ☆

مکمل ناول

انیلا کرن

چاہت کا ڈھب

"معیز نے جاب چھوڑ کر ایم۔ایس کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

ایکوا گرین اور پنک کلر کے بے حد خوبصورت اور اسٹائلش کپڑوں میں ملبوس اپنے چمکدار اور براؤن بال شانوں پر بکھرائے صبوحی بے حد حسین اور تروتازہ نظر آرہی تھی۔ جب اس نے میتھس ڈیپارٹمنٹ کے اسٹاف روم میں اپنے برابر بیٹھی اپنی گہری دوست کنزی کو بتایا۔

وہ اور کنزی تین سال سے اکٹھی جاب کررہی تھیں اور تین سال پہلے ہی ان کے بیچ دوستی کا رشتہ استوار ہوا تھا جو ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا جارہا تھا۔ وہ دونوں اپنی ہر بات ایک دوسرے کو بتانے کی عادی تھیں۔ صبوحی کی شادی چند ماہ قبل اس کی پسند سے معیز کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور ان دنوں اس کی ہر بات معیز سے شروع ہو کر اس پر ختم ہوتی تھی۔

"پھر تم نے کیا کہا؟"

گرم چائے کا مگ لبوں سے لگاتے ہوئے کنزی نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات میں دلچسپی لی تھی۔

"میں نے کیا کہنا تھا۔" صبوحی نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "اگر وہ ایسا کرنا چاہتا ہے تو ضرور کرے۔ گھر کے اخراجات کے لیے میری تنخواہ کافی ہے بلکہ کافی رقم تو میرے اکاؤنٹ میں بھی موجود ہے۔ شادی سے پہلے تو مجھے کم ہی اپنی تنخواہ میں سے رقم خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ بابا اور بھیا ہی ہر ضرورت کے لیے رقم فراہم کردیا کرتے تھے۔"

صبوحی کا تعلق کافی خوشحال گھرانے سے تھا۔ وہ چار بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور اس حساب سے لاڈلی بھی تھی۔ اگر وہ اتنی لاڈلی نہ ہوتی تو اس کے خاندان والے کبھی بھی معیز سے اس کی شادی نہ کرتے۔ کیونکہ وہ معاشی لحاظ سے ان کی نسبت کمزور اور خالصتاً" صبوحی کی پسند تھا۔ مگر ان لوگوں نے صبوحی کی خوشی کی خاطر بہت آرام سے اس کی شادی معیز کے ساتھ کردی تھی۔

"تم نے اپنے گھر والوں کو اس بارے میں بتایا؟"

کنزی نے اس سے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ انہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور معیز نے بھی منع کیا ہے وہ نہیں چاہتا کہ میرے خاندان کے لوگوں کی اس کے بارے میں رائے خراب ہو۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ ہم ان کو اور معیز کے گھر والوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے اور صرف دو سال کی ہی تو بات ہے۔ چٹکی بجاتے ہی گزر جائیں گے۔"

اپنے ایکوا گرین پرس میں سے کچھ تلاش کرتے ہوئے وہ اس بار بھی لاپرواہ انداز میں ہی بولی تھی۔

"تم ایسا کرکے بہت بڑی غلطی کروگی صبوحی۔"

کنزی نے ابھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا۔ جب ان سے تھوڑا سا دور بیٹھی رابعہ نے ان کی گفتگو میں مداخلت کی تھی۔ رابعہ ان دونوں سے بہت سینئر تھی۔ اور بہت سنجیدہ اور ریزرو طبیعت کی مالک تھی۔ اسے ریسرچ ورک کا شوق تھا۔ اور اسی شوق کی وجہ سے

اس نے پہلے ایم۔ فل کیا اور اب پی۔ ایچ ڈی کر رہی تھی۔ اس کے لکھے ہوئے ریسرچ پیپرز اکثر سائنسی جریدوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ صبوحی اور کنزی دونوں ہی اس کی بہت عزت کرتی تھیں۔ مگر اس وقت ایک انتہائی ذاتی معاملے میں اس کی مداخلت کنزی کو بری لگی تھی۔ اس کا چہرہ تن گیا مگر صبوحی بدستور مسکراتی رہی۔ جب سے معیز کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی۔ اسے کوئی بات بری لگتی ہی نہیں تھی۔

"اس میں غلط کیا ہے رابعہ جی! اگر معیز کو لگتا ہے کہ اسے دو سال بڑھ کر موجودہ جاب سے اچھی جاب مل سکتی ہے۔ تو مجھے اس کا ساتھ دینا چاہیے آخر ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے سادگی سے کہا تھا۔ رابعہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"محبت" اس نے زیر لب عجیب سے انداز میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر صبوحی کے قریب آبیٹھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب محبت کا دعوا مرد اور عورت دونوں کرتے ہیں تو قربانی صرف عورت کے حصے میں کیوں آتی ہے۔ مرد کیوں عورت کی خاطر اپنی خواہش اپنے خواب قربان نہیں کرتا۔"

صبوحی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے دو ٹوک انداز سے کہا تھا۔

"ایسا نہیں ہے رابعہ جی! سب مرد ایسے نہیں ہوتے کہ صرف عورت سے قربانی طلب کریں کم از کم معیز ایسا نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے اگر آج میں اس کی خاطر کوئی تکلیف اٹھاؤں گی تو کل کو وہ بھی میری خواہشوں کو پورا کرنے میں کوئی کنجوسی نہیں دکھائے گا۔ میری محبت میری قربانی کی اسے ضرور قدر ہوگی۔"

صبوحی نے رابعہ کی بات کا اثر لیے بغیر پورے یقین سے کہا تھا "خوش فہمی ہے تمہاری مرد کبھی عورت کی قربانی کی قدر نہیں کر سکتا وہ ہمیشہ عورت کی محبت اس کی قربانی اور وفا کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ ایسا حق جس کے بدلے میں وہ کچھ بھی واپس لوٹانا ضروری نہیں سمجھتا۔

میرا تو یہی مشورہ ہے کہ تم ایسا کوئی قدم نہ اٹھاؤ جس کے لیے تمہیں کل کو پچھتانا پڑے۔" صبوحی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بہت ہمدردانہ انداز سے اسے سمجھایا تھا۔

"میں کبھی نہیں پچھتاؤں گی رابعہ جی!" اس نے نرمی سے رابعہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا تھا۔

"کیونکہ میرا ماننا ہے کہ محبت اور محنت کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے۔"

اس کے لہجے میں نرمی تھی مگر انداز دو ٹوک تھا۔ رابعہ سے مزید کچھ نہیں بولا گیا۔ اس نے خاموشی سے اپنی ڈائری کھول لی۔ کنزی کی چائے ختم ہو چکی تھی اور اگلی کلاس کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اور صبوحی اپنے اپنے رجسٹر اٹھا کر اسٹاف روم سے باہر نکل گئیں اور رابعہ اس وسیع و عریض اسٹاف روم میں تنہا بیٹھی رہ گئی۔ اگرچہ وقت تو اس کی کلاس کا بھی ہو چکا تھا مگر اس کے وجود پر ایک عجیب سا اضمحلال طاری ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کا کلاس میں جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔ اس کے ذہن میں صبوحی کے کہے ہوئے لفظ بار بار گونج رہے تھے۔

"محبت اور محنت کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے۔"

"مجھے تو محبت کا صلہ ملا اور نہ ہی محنت کا۔"

اس نے اپنے کھردرے ہاتھوں کو دیکھ کر سرد آہ بھری اور صوفے کی بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼
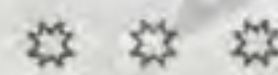
کمرے میں مکمل سکوت اور اندھیرے کا راج تھا۔ راشدہ بیگم دروازہ کھولنے کے بعد ایک پل کے لیے ٹھٹکیں پھر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ جلادی۔ اور کمرہ ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی سے بھر گیا۔ جس سے گھبرا کر کروٹ کے بل لیٹی رابعہ نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ سیاہ آستین سے جھانکتے اس کے گورے سنہری بازو کی دمک دیدنی تھی۔ اس نے آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا اور اس بازو کے نیچے سے

اس کا جتنا چہرہ نظر آرہا تھا۔ بلاشبہ خیرہ کن حسن کا شاہکار تھا۔ اس کا بے حد خوب صورت فیس کٹ ستواں ناک اور تراشیدہ ہونٹ' ہر چیز قدرت کی صناعی کا شاہکار تھی۔ راشدہ بیگم کو ہمیشہ کی طرح اس پر پیار آنے لگا۔ وہ اس کے قریب جا بیٹھیں۔

"رابعہ! اٹھو بیٹا آکر کھانا کھاؤ اس طرح ضد نہیں کرتے۔" اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے چمکارا تھا۔

"امی! پلیز" اپنی عادت کے خلاف اس نے خفگی سے ان کا ہاتھ اپنے بالوں سے ہٹایا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے جب کہہ دیا ہے کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گی تو آپ لوگ کیوں باری باری آکر مجھے تنگ کر رہے ہیں۔"

اس کے انداز میں جھنجلاہٹ اور بے زاری تھی۔ رو رو کر اس کی لمبی پلکوں والی غلافی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ راشدہ بیگم گم سم سی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ منتوں مرادوں اور دعاؤں سے مانگی ہوئی۔ شکل و صورت ایسی کہ اپنے تو اپنے غیروں کو بھی دیکھتے ہی پیار آجائے۔ پڑھائی میں ہمیشہ بہت اچھی رہی۔ طریقہ سلیقہ ایسا کہ سگھڑ سے سگھڑ لڑکیوں کو بھی مات کرتی تھی۔ تینوں بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ اکلوتی بہن اور گھر بھر کی لاڈلی تھی مگر مزاج میں نہ کسی طرح کی اکڑ تھی نہ خود پسندی۔ ہر کسی کے ساتھ بہت ادب نرمی اور محبت سے بات کیا کرتی تھی۔ مگر اب پچھلے کئی دنوں سے جیسے اس کے مزاج کا دھارا ہی بدل چکا تھا۔ خود سے تو کسی کو مخاطب ہی نہیں کرتی تھی کوئی دوسرا بلاتا تو آگے سے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اور گزشتہ رات سے تو اس نے بھوک ہڑتال ہی کر دی تھی۔ اس کے ان انداز و اطوار نے گھر بھر کو بری طرح سے پریشان کر رکھا تھا۔

"رابعہ! یہ بات منوانے کا کون سا طریقہ ہے۔ کل رات سے تم بھوکی پڑی ہو۔ سارا گھر تمہاری وجہ سے پریشان ہے۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھڑک ہی اٹھی۔

"کوئی ضرورت نہیں کسی کو بھی میرے لیے پریشان ہونے کی جب آپ لوگ میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے تو۔"

"اتنی سی خواہش؟" راشدہ بیگم نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا "یہ اتنی سی خواہش نہیں ہے بیٹا! زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ میں کس طرح اپنی نازوں پلی ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ بیٹی اس لاابالی شخص کے ہاتھوں میں تھمادوں جس سے بی ایس سی تک نہیں ہو سکا اور جو ہر چھٹے ماہ نوکری بدلنے کا عادی ہے۔ وہ تمہارے قابل نہیں ہے رابعہ! تم بہت غلط فیصلہ کر رہی ہو۔ مزمل میں سوائے اچھی شکل کے دوسری کوئی خوبی نہیں ہے۔"

"بس کریں امی! میں مزمل کی برائیاں نہیں سن سکتی۔ آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور ایسا آج سے نہیں ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ میرے ذہن میں صرف اسی کا خیال ہے۔ امی! میں اب چاہوں بھی تو اس کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتی۔ میں کسی اور سے شادی نہیں کر سکتی۔"

وہ بے چارگی سے کہتے کہتے رو پڑی۔ راشدہ بیگم کا دل پسیج گیا۔ وہ رابعہ کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے آنسو ان کی ہی نہیں ان کے تینوں بیٹوں کی بھی کمزوری تھے۔ اور اس کے ابا اگر زندہ ہوتے تو شاید اسے آنسو بہانے کی ضرورت پیش ہی نہ آتی وہ ان کی اتنی ہی لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ بلکہ لاڈلی تو وہ سارے گھر کی تھی۔ اسے کبھی کسی نے نہیں رلایا تھا۔ ہمیشہ اس کے منہ سے لفظ نکلتے ہی اس کی خواہش پوری کردی جاتی تھی۔ مگر اس بار اس نے خواہش ہی ایسی کی تھی کہ راشدہ بیگم چاہ کر بھی خود کو سمجھا نہیں پا رہی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہیں رابعہ کا یہ جذباتی فیصلہ اس کی آئندہ زندگی کو مشکلات سے نہ بھر دے اس لیے وہ اسے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی آئی تھیں مگر اب ان کی بس ہو چکی تھی۔ وہ رابعہ کو سمجھا نہیں پائی تھیں۔ اور وہ اسے مزید رلانا نہیں چاہتی تھیں۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔"

انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ روتی ہوئی رابعہ نے تیزی سے سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں دکھ مگر رابعہ نے صرف ان کی مسکراہٹ دیکھی اور ان کے گلے لگ گئی۔

"امی! آپ نہیں جانتیں آپ نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔"

ماں کا رخسار چوم کر وہ خوشی سے چہکی تھی۔ راشدہ بیگم بھیگی آنکھوں سے ایک بار پھر مسکرا دیں۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوما اور نرمی سے بولیں۔

"میں کھانا لگا رہی ہوں تم منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے آجاؤ۔ تمہارے بھائی بھی تمہارے انتظار میں بھوکے بیٹھے ہیں۔"

"امی! بھائی مان جائیں گے نا؟"

رابعہ نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا۔ اس کے تینوں بھائی اس سے بڑے تھے۔ اور بہت اچھی جاب کر رہے تھے اب اگر وہ مزمل کو اکلوتے بہنوئی کے طور پر قبول نہ کرتے تو رابعہ کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ اسے ابھی ابھی ان کا خیال آیا تھا۔

"وہ تینوں تو کبھی مان گئے تھے جب تم نے کل رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے ہی اصرار کر کے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔"

سرسری سے انداز سے بتا کر راشدہ بیگم باہر چلی گئیں۔ رابعہ نے بے اختیار ہی خوشی اور مسرت بھرا سانس اپنے اندر کھینچا۔ اور ہاتھوں سے بال سنوارتے ہوئے واش روم کی طرف چلی گئی۔ تاکہ فریش ہو کر باہر جا سکے۔

☼ ☼ ☼

دلہن بن کر وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ریڈ کلر کے لہنگے سنہری زیورات مہنگے ترین پارلر سے کروائے گئے میک اپ اور خاص طور پر اندرونی خوشی اور مسرت نے اسے جو روپ بخشا تھا۔ وہ اتنا دلکش تھا کہ ہر دیکھنے والی نظر ایک پل کے لیے تو اس کے وجود پر حیرت سے ضرور ہی ساکت ہوئی تھی۔ اور صرف وہی نہیں مزمل بھی گولڈن شیروانی میں اپنے شہد رنگ بالوں اور سنہری آنکھوں کے ساتھ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ ان دونوں کی جوڑی حقیقتاً" چاند اور سورج کی جوڑی تھی۔ ایسی جوڑی جس پر ہر دیکھنے والا رشک کرتا۔ اگر اس چاند میں مزمل کی کم تعلیم اور معمولی نوکری کا داغ نہ ہوتا۔ مگر یہ داغ اور کسی کو نظر آتا تو آتا۔ دلہن بنی رابعہ کو بالکل بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خوش تھی بے حد خوش اور اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنی اس خوشی کا اظہار کس طرح کرے۔ مزمل کا ساتھ پانا اس کے لیے زندگی کی ہر دوسری کامیابی سے بڑھ کر تھا۔

ان کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی رابعہ تو خیر تین کماؤ بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ پھر راشدہ بیگم نے اس کے لیے بہت کچھ جمع بھی کر رکھا تھا۔ اس لیے نا صرف اس کا جہیز بہت قیمتی اور اعلا درجے کا تھا بلکہ شادی کی تقریب بھی شہر کے مہنگے ترین شادی ہال میں منعقد کی گئی تھی۔ مزمل بھی دھوم دھام

میں ان سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ اگرچہ اس دھوم دھام کے لیے اسے اپنے آبائی مکان میں سے اپنا حصہ اپنے بڑے بھائی کے پاس فروخت کرنا پڑا تھا اس کے والدین کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ بڑا بھائی شادی شدہ اور پانچ بچوں کا باپ تھا۔ اس لیے اپنے اچھے کاروبار کے باوجود وہ مزمل کی شادی پر کچھ خرچ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے مزمل کو مجبوراً" گھر میں سے اپنا حصہ اپنے بھائی کے پاس فروخت کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ رابعہ کی خواہش تھی کہ اس کی شادی دھوم دھام سے ہو۔ اگرچہ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار صرف ایک بار کیا تھا اور وہ بھی بہت سرسری انداز میں مگر مزمل پھر بھی اس کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ اپنے تمام تر لاابالی پن کے باوجود وہ رابعہ سے واقعی محبت کرتا تھا۔

اس لیے مکان میں سے اپنا حصہ فروخت کر کے اس نے رابعہ کے لیے قیمتی زیورات اور ملبوسات بھی دل کھول کر خریدے تھے اور ولیمہ کا ریسپشن بھی بہت اعلا درجے کے ہوٹل میں دیا تھا۔ بلکہ شادی کے بعد وہ اسے ہنی مون پر لے کر گیا تو وہاں بھی اس نے دل کھول کر خرچہ کیا تھا۔ اس وقت تک رابعہ اس کی اس شاہ خرچی کا پس منظر نہیں جانتی تھی۔ اس لیے سارا وقت بے حد خوش رہی تھی۔ مگر شادی کے صرف چھ ماہ بعد جب مزمل کے بھائی نے گھر فروخت کر کے کسی دوسرے علاقے میں اپنے لیے گھر خریدنے کا اعلان کیا تو مزمل نے رابعہ کو ساری صورت حال بتائی۔ رابعہ یہ سب سن کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ صرف دھوم دھڑکے کی شادی اور چھ ماہ کے کھلے خرچ نے انہیں گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ مزمل اگر اپنا حصہ بیچنے سے پہلے اسے بتا دیتا تو وہ کبھی بھی اسے ایسا نہ کرنے دیتی۔ مگر اب ایسا ہو چکا تھا اور سوائے افسوس کرنے کے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ پہلا دھچکا تھا جو مزمل کے لاابالی پن سے لگا تھا۔ شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا اور اسے مزمل کے ساتھ کرائے کے ایک ایسے گھر میں شفٹ ہونا پڑا تھا جو اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے جہیز کا سارا

سامان بھی وہاں سیٹ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

کرائے کے گھر میں آکر ان کی زندگی ایک دم سے مشکل ہو گئی تھی۔ ایک تو گھر بہت چھوٹا اور غیر آرام دہ تھا۔ پھر ضروریات اور مسائل کا ایک انبار تھا جو ہر مہینے منہ پھاڑ کر سامنے آکھڑا ہوتا تھا۔ اس سے پہلے جوائنٹ فیملی سسٹم کی وجہ سے انہیں بہت سہولت رہی تھی کم سے کم مکان کا کرایہ بجلی اور گیس کے بل تو انہیں پریشان نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مزمل کی کم آمدنی کے باوجود کسی تنگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب انہیں صحیح معنوں میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا تھا۔ رابعہ کے پاس سلامیوں کے پیسے اور بھائیوں کا شادی پر دیا ہوا کیش بھی اب تیزی سے خرچ ہونے لگا تھا کیونکہ مزمل کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ گھر کا کرایہ بھی دیا جاسکے۔ اور باقی کے اخراجات بھی پورے ہوسکیں۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی رابعہ جمع شدہ رقم کو خرچ کرنے پر مجبور تھی۔ مگر اس رقم نے بھی کب تک ساتھ دینا تھا۔ جب وہ آنے والے دنوں کا سوچتی تو اس کا پریشانی سے برا حال ہو جاتا کیونکہ مزمل کی آمدنی بڑھنے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ بلکہ یہ بھی غنیمت ہی تھا کہ شادی کے بعد سے وہ اپنی جاب پر ٹکا ہوا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس نے چھ، آٹھ مہینے سے زیادہ کوئی جاب بھی نہیں کی تھی مگر اب شاید اسے اپنی ذمہ داریوں کا کچھ کچھ احساس ہو چلا تھا۔ بعض اوقات وہ اس چیز پر بھی افسوس کا اظہار کرنے لگتا تھا کہ اس نے اپنی تعلیم مکمل کیوں نہ کی۔

"اگر میں کوئی اچھی جاب کر رہا ہوتا تو تمہیں اتنی تکلیفیں نہ اٹھانا پڑتیں میرے ساتھ نے تمہیں کتنی مشکل میں ڈال دیا۔"

وہ کبھی کبھی آزردگی کے عالم میں رابعہ کا ہاتھ تھام کر کہتا تو اس کی بات سن کر رابعہ کا دل کٹ جاتا۔

"ایسی باتیں مت کیا کرو۔ میں تمہارے ساتھ بہت خوش ہوں۔" وہ اسے تسلی دیتی۔

"اتنی مشکلات اور تکلیفوں کے باوجود بھی حالانکہ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں تم کتنے نازوں میں پلی ہو۔" وہ مشکوک ہوتا رابعہ ہنس پڑتی اور محبت سے کہتی۔

"تمہارا ساتھ میرے لیے دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر ہے۔ ٹھیک ہے ہماری زندگی میں کچھ مشکلات ہیں۔ مگر مجھے پورا یقین ہے کہ یہ مشکل وقت بھی ٹل جائے گا۔ اور ان تمام مشکلات کے باوجود میں تمہارے ساتھ بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ اگر مجھے تمہارا ساتھ نہ ملتا تو دنیا بھر کی آسائشیں بھی مجھے مسکرانے پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔"

"تم سچ کہہ رہی ہو نا۔" وہ بچوں کی سی معصومیت سے پوچھتا تو رابعہ ہنس کر اثبات میں سر ہلا دیتی۔ کیونکہ سچائی یہی تھی کہ ہر مشکل اور ہر تکلیف سہہ کر بھی اس کے ذہن میں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ مزمل سے شادی نہ کرتی تو سکھی رہتی۔ اس کے لیے خوشی کا دوسرا نام ہی مزمل تھا اور وہ صرف اس کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی تھی۔ اسے مزمل سے اتنی ہی محبت تھی کہ اس کے ساتھ آنے والی پریشانیاں بھی وہ ہنس کر قبول کر سکتی تھی۔

رابعہ جیسی ناز و نعم میں پلی نازک مزاج لڑکی کا یہ رویہ پورے خاندان کے لیے غیر متوقع تھا۔ مزمل اس کا چچا زاد تھا اس لیے اس کی خوبیوں خامیوں اور کمزوریوں سے بھی خاندان والے اچھی طرح سے واقف تھے۔ اور کسی کو بھی یہ یقین نہیں تھا کہ رابعہ جیسی آسائشوں اور آسانیوں کی عادی لڑکی اس کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزارا کر پائے گی اور خاص طور پر ان کے کرائے کے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد تو سب ہی سوچ رہے تھے کہ آج نہیں تو کل ان کے بیچ جھگڑے شروع ہو جائیں گے اور رابعہ سب کچھ چھوڑ کر ماں کے گھر آبیٹھے گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ رابعہ نا صرف ہر طرح کی تنگی ترشی کے باوجود مزمل کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی تھی بلکہ وہ مزمل کے خلاف کہا ہوا کسی کا ایک لفظ بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔

چاہے کہنے والی اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے کرائے کے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد اس کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے ایک بار راشدہ بیگم نے باتوں ہی باتوں میں اسے جتا دیا کہ اسی وجہ سے وہ مزمل کے ساتھ اس کی شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

ان کی یہ بات سن کر رابعہ ان سے سخت ناراض ہو گئی تھی اور کئی ہفتوں تک ان کے گھر نہیں گئی تھی۔ بڑی مشکل سے راشدہ بیگم نے اسے منایا تھا اور آئندہ کے لیے مزمل کے خلاف کچھ بھی نہ کہنے کا دل ہی دل میں عہد بھی کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"رابعہ تم لوگ اپنا گھر کیوں نہیں بنوا لیتے؟"

اس روز وہ بڑے دنوں کے بعد امی کے گھر رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس کے سب سے بڑے اور منجھلے بھائی کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ اور ان دنوں شادی کے انتظامات کا سلسلہ زوروں پر تھا۔ اس مقصد کے لیے راشدہ بیگم نے اسے چند دنوں کے لیے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ تاکہ دونوں بھائیوں کی بری کی شاپنگ کی جاسکے۔ سارا دن وہ راشدہ بیگم کے ساتھ بازار پھرتی رہی تھی۔ اس لیے شام کو تھک کر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر ہی لیٹ گئی تھی۔ اے۔ سی کی خنکی ٹھنڈے مشروب اور ہر طرف پھیلے سکون کے باوجود اس کا دل اپنے مسائل کی وجہ سے پریشان ہی تھا۔ اور اسے رہ رہ کر مزمل کا خیال آرہا تھا جو تقریباً" اس وقت دفتر سے گھر آیا کرتا تھا اور آگے سے بجلی ہمیشہ غائب ہوتی تھی اور اکثر تو پانی بھی نہیں آرہا ہوتا تھا۔ پہلے تو رابعہ گھر پر ہوتی تھی تو کم از کم اس کے لیے ٹھنڈا شربت ہی بنا دیتی تھی۔ اس کے نہانے کے لیے پانی کا ایک ٹب سہ پہر میں ہی بھر دیا کرتی تھی مگر آج وہ بھی گھر پر نہیں تھی تو یقیناً" مزمل کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔ انہی ساری باتوں کو سوچ سوچ کر وہ آزردہ ہو رہی تھی۔ جب راشدہ بیگم نے اچانک ہی یہ بات کہی۔ وہ حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"اپنا گھر؟ امی یہ کس طرح ممکن ہے۔ ہمارے پاس اتنا سرمایہ کہاں ہے۔"

وہ بے حد حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"تم اپنا زیور کیوں نہیں بیچ دیتیں۔ اچھا خاصا زیور ہے تمہارے پاس اور یونہی بینک کے لاکر میں پڑا ہے۔ اچھا نہیں ہے کسی کام آجائے اور تمہاری جان کرائے کے گھر اور اس سے جڑے ڈھیروں مسائل سے بھی چھوٹ جائے گی۔"

انہوں نے اطمینان سے تجویز دی تھی۔ رابعہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ اپنا گھر خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو ان دنوں اس کا سب سے بڑا خواب بن چکا تھا۔ لیکن یہ خواب اس کے حساب سے اتنا بڑا تھا کہ وہ کھل کر اسے دیکھنے کی بھی جرات نہیں کرتی تھی کجا یہ کہ اس خواب کے بارے میں کسی سے بات کرتا۔

"امی کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔" وہ جوش کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "زیور تو میرے پاس کافی ہے اور مجھے پہننے کا اتنا شوق بھی نہیں ہے۔ مگر امی گھر بنانا آسان تھوڑی ہے۔ جگہ پہلے سے موجود ہو تو بھی لاکھوں روپے آرام سے لگ جاتے ہیں۔ اور میرے پاس جو زیور ہے۔ اس سے یا تو پلاٹ خریدا جاسکتا ہے یا پھر گھر بنایا جاسکتا ہے۔ دونوں کام ایک ساتھ تو نہیں ہوسکتے۔"

اس پر جوش سے بولتے بولتے مایوسی طاری ہو گئی تھی اور آنکھوں میں ابھرنے والی چمک بھی بجھنے لگی تھی۔

"تم اس بارے میں سوچو تو سہی۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ کچھ رقم میرے پاس جمع ہے۔ وہ میں تمہیں دے دوں گی اور تمہارے بھائی بھی اپنی شادیوں پر تمہیں کچھ نہ کچھ دیں گے ہی نا میں انہیں کہہ دوں گی کہ وہ تمہیں کیش دے دیں۔ تم ہمت پکڑو تو کچھ رقم کہیں سے قرض بھی مل جائے گی۔"

راشدہ بیگم سے اکلوتی بیٹی کے چہرے پر چھانے والی مایوسی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس لیے انہوں نے تجاویز کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ ان کی ہر تجویز پر رابعہ کا دل نئے

انداز سے دھڑک رہا تھا۔ اور چہرہ کئی کئی رنگ بدل رہا تھا۔

"مگر امی! اس طرح اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ سے رقم لوں یا بھائیوں سے کوئی تقاضا کروں۔" اس نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔ جسے راشدہ بیگم نے فوراً" رد کردیا "ایسی باتیں مت سوچو تمہاری شادی ہوجانے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ تم ہم سے الگ ہوگئی ہو۔ تم اب بھی اس گھر کا حصہ ہو بیٹا اور تمہارے مسائل صرف تمہارے نہیں ہیں۔ مجھ سے پوچھو تمہارے بارے میں سوچتی ہوں تو راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ کھانے پینے سے دل اچاٹ ہوجاتا ہے۔ کم از کم تمہارا اپنا گھر بن جائے گا تو مجھے تمہاری طرف سے تھوڑا سا سکون ہوجائے گا۔"

بات کرتے کرتے وہ جذباتی ہوگئیں اور ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"امی پلیز" رابعہ نے گھبرا کر انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔ "ایسا تو مت کریں۔"

وہ انہیں دلاسا دے رہی تھی۔ جب اس کا سب سے بڑا بھائی ماجد لاؤنج میں داخل ہوا۔

"ارے بھئی یہ ماں بیٹی میں کون سا سین چل رہا ہے۔"

رابعہ کو ماں کا رخسار چومتے دیکھ کر اس نے چھیڑا تھا۔ راشدہ بیگم نے فوراً" اپنی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں بھائی۔"

رابعہ نے اس سے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ ماجد اس کی چھوڑی ہوئی جگہ پر راشدہ بیگم کے پاس آبیٹھا۔

"ہاں جی اب بتائیں آپ کو کیا بات پریشان کررہی ہے؟"

ماں کے کندھوں پر بازو حمائل کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور ماں سے سب سے زیادہ قریب بھی وہی تھا۔ راشدہ بیگم کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اب وہ ان سے اصل بات اگلوا کر ہی دم لے گا۔ اس لیے وہ خود ہی اسے چپکے چپکے ساری بات بتانے لگیں۔ لاؤنج سے نکلتی رابعہ نے ان کی مدھم آواز سنی اور آنکھوں میں ہزاروں خوش رنگ خواب سجائے کچن کی طرف مڑ گئی۔

☼ ☼ ☼
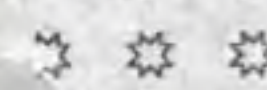
دونوں بھائیوں کی شادی کی تمام تقریبات خیر و خوبی سے نبٹ گئی تھیں۔ رابعہ نے تمام تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اپنے جہیز کے بے حد قیمتی ملبوسات اور زیورات پہنے وہ خوشی سے کھلکھلاتی سب کی ہی نظروں میں آتی رہی تھی۔ مزمل بھی شادی میں شریک تو ہوا تھا مگر وہ رابعہ جتنا خوش نظر نہیں آیا تھا۔ رابعہ نے ابھی تک اسے گھر کے حوالے سے ماں سے کی جانے والی گفتگو کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس لیے مزمل کے پاس رابعہ کی طرح خوش نظر آنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ تمام وقت سنجیدہ اور کچھ چپ چپ نظر آیا تھا مگر سنجیدگی اور کم گوئی کے باوجود اپنی وجاہت اور خوش لباسی کی وجہ سے وہ کوئی لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی رہا تھا۔

مزمل کو اچھی ڈریسنگ کرنے کا شوق تھا۔ اور رابعہ اس کا یہ شوق پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے اسے لڑکوں کی ڈریسنگ کی بہت اچھی سوجھ بوجھ تھی۔ اور وہ اس سوجھ بوجھ کو مزمل کے لیے خریداری کرتے یا اس کے روز مرہ کے کپڑے منتخب کرتے ہوئے پوری طرح سے استعمال کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کے بعد مزمل کی ظاہری شخصیت میں بہت مثبت تبدیلی آئی تھی۔

ولیمہ سے اگلے دن مزمل واپس گھر چلا گیا تھا۔ پانچ روز کے بعد رابعہ کو لینے آیا تھا۔ رابعہ پندرہ دن کے بعد گھر جارہی تھی۔ اور تھوڑی سی اداس تھی۔ مگر اس وقت اس کی اداسی ناقابل بیان خوشی میں بدل گئی۔ جب رخصت ہوتے وقت راشدہ بیگم نے اسے ساڑھے تین مرلے کے پلاٹ کے کاغذات دیے۔

پلاٹ اس کے اندازے اور توقع سے کہیں بڑا گفٹ تھا۔ وہ ہکابکا سی کاغذات دیکھے گئی۔

"امی! یہ۔۔۔ یہ کیسے؟"

بڑی دیر کے بعد اس کے منہ سے لفظ نکلے تھے۔ راشدہ بیگم مسکرا دیں۔

"میں نے ماجد اور طارق سے بات کی تھی۔ کہ انہوں نے تمہیں کچھ گفٹ تو دینا ہی ہے تو وہ تمہیں کیش دے دیں تاکہ تم اپنا گھر بنانے کا سوچ سکو کچھ رقم میں نے بھی تمہارے لیے رکھی تھی مگر پھر تمہارے تینوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ کچھ زیادہ رقم کا انتظام کر کے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا پلاٹ ہی خرید لیا جائے تاکہ تم اس پر اپنا مناسب سا گھر بنا کر کرائے کے گھر سے جان چھڑا سکو۔"

"امی! میں بتا نہیں سکتی کہ آپ نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔" رابعہ نم آنکھوں کے ساتھ ان کے گلے لگ گئی تھی۔

واپسی کے سفر میں وہ اور مزمل دونوں خوش تھے۔ اور مستقل اپنا چھوٹا سا گھر بنانے کے حوالے سے باتیں کررہے تھے۔ بلکہ گھر جاکر بھی اور اگلے کئی دنوں تک ان کے درمیان یہی موضوع گفتگو کا باعث رہا تھا۔ چند روز کے بعد رابعہ اپنی امی کے ساتھ جاکر اپنا سارا زیور سوائے اس لاکٹ کے جو مزمل نے اسے رونمائی میں دیا تھا فروخت کر آئی۔ گھر کا سادہ مگر خوب صورت سا نقشہ اس کے بڑے بھائی ناصر نے اپنے ایک دوست سے بنوادیا تھا۔ مزمل نے اپنے دفتر سے بغیر تنخواہ کے ایک ماہ کی چھٹی لی اور گھر کا کام شروع کروادیا۔

کام اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنی موجودہ ضرورت کے مطابق صرف دو کمرے کچن لاؤنج اور واش روم ہی تعمیر کروا رہے تھے اور رقم بھی ان کے حساب سے اچھی خاصی تھی مگر پھر بھی گھر کی فنشنگ، وائرنگ اور دیگر چھوٹے چھوٹے کاموں کی باری آنے تک تمام رقم ختم ہوچکی تھی رابعہ اب اپنے گھر والوں سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ پہلے ہی اس کے لیے بہت کچھ کرچکے تھے۔ مزمل کا کوئی ایسا دوست یار رشتے دار تھا نہیں جو انہیں بطور قرض ہی کچھ رقم دے دیتا اس لیے رابعہ نے بہت غور و فکر کرنے کے بعد مزمل سے مشورہ کر کے اپنے جہیز کی کچھ الیکٹرونک کی قیمتی چیزیں جو ابھی تک ڈبوں میں ہی پیک تھیں۔ تھوڑی سی کم قیمت لے کر مزمل کے ایک جاننے والے کے اسٹور پر فروخت کردیں۔ اور گھر کے باقی رہ جانے والے کام کروالیے۔

چار ماہ کے صبر آزما انتظار اور جدوجہد کے بعد وہ اپنے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ اس وقت تک ان کی شادی کو ڈیڑھ سال ہوچکا تھا۔ جس ہفتے وہ اپنے گھر میں شفٹ ہوئے اس ہفتے رابعہ کو دوسری بڑی خوشخبری اپنے پریگننٹ ہونے کی ملی اور صحیح معنوں میں اس نے خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼
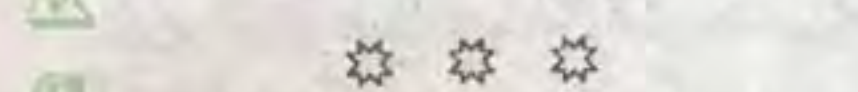
"مجھے پبلک سروس کمیشن سے ٹیسٹ کے لیے کال آئی ہے۔"

مزمل کھانا کھانے کے بعد ٹی وی کے آگے بیٹھا چینل پر چینل بدل رہا تھا جب رابعہ نے اسے اطلاع دی۔ اس نے کئی ماہ پہلے پبلک سروس کمیشن کی طرف سے اناؤنس کی گئی لیکچرر کی آسامی کے لیے فارم جمع کروایا تھا اور اپنے گھر کے بکھیڑوں میں اسے بھول بھی چکی تھی۔ ویسے بھی فارم جمع کروانے کے بعد اس نے سنا تھا کہ گورنمنٹ نے کسی وجہ سے ان آسامیوں پر بھرتی کو روک دیا ہے۔ اس لیے بھی اپنا جمع کروایا ہوا کام اسے بھول چکا تھا۔ مگر آج دوپہر کو جب وہ امی کی طرف گئی تو انہوں نے اسے ٹیسٹ کال والا لیٹر دیا۔ اس نے فارم پر پتا امی کے گھر کا ہی لکھا تھا۔ اس لیے لیٹر انہی کے گھر آیا تھا۔ لیٹر دیکھ کر اسے قدرتی طور پر بہت خوشی اور مسرت کا احساس ہوا تھا۔ اگر اسے یہ جاب مل جاتی تو یقینی طور پر ان کے بہت سارے مسائل ختم ہوسکتے تھے۔ اگرچہ اپنے گھر میں شفٹ ہونے اور مزمل کی تنخواہ تھوڑی سی بڑھ جانے سے ان

کے معاشی مسائل میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی تھی۔ مگر جب وہ مستقبل میں ہونے والے اخراجات کا سوچتی تو کوشش کے باوجود خود کو پریشان ہونے سے روک نہیں پاتی تھی۔

"اچھا کب ہے ٹیسٹ؟"

مزمل کا انداز سرسری سا تھا۔ بیشتر لوگوں کی طرح اس نے بھی اپنے ذہن میں یہ پختہ رائے قائم کر رکھی تھی کہ سرکاری ملازمت بغیر سفارش کے مل ہی نہیں سکتی۔ اس لیے جب رابعہ نے فارم جمع کروایا تھا۔ وہ تب بھی اسے ایسا کرنے سے منع ہی کرتا رہا تھا۔

"اگلے بدھ صبح آٹھ بجے ہے مگر جانا لاہور ہو گا۔" اس نے آہستگی سے بتایا۔ مزمل سوچ میں پڑ گیا۔

"میں تو کہتا ہوں رہنے ہی دو۔ یہ ٹیسٹ انٹرویو وغیرہ دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لوگ انہوں نے پہلے ہی سلیکٹ کر لیے ہوتے ہیں۔ اتنی گرمی ہے اور پھر تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔"

رابعہ کا ساتواں مہینہ چل رہا تھا اور اس کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ HB کم تھی اور بی پی اکثر ہی لو ہو جایا کرتا تھا مگر اس کے باوجود یہ چانس مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے مزمل کی بات سن کر اس کا پرامید چہرہ مرجھا سا گیا۔

"دیکھو نا یار! اتنی گرمی میں پبلک ٹرانسپورٹ کا سفر پھر بیٹھ کر اتنا لمبا ٹیسٹ دینا یہ سب بہت مشکل ہے۔"

مزمل کو اس کی اتری ہوئی صورت پر ترس بھی آ رہا تھا۔ اس لیے چاہنے کے باوجود وہ اسے صاف منع نہیں کر پا رہا تھا۔

"میں ناصر بھائی کے ساتھ ان کی کار میں چلی جاؤں گی۔ اور ایک دن پہلے ہم لوگ چلے جائیں گے وہاں خالہ بشریٰ کا گھر بھی تو ہے ہم وہاں رک جائیں گے۔ اور اگلے دن ٹیسٹ دے کر واپس آ جائیں گے۔ اس طرح سفر کی زیادہ تھکن بھی نہیں ہو گی۔"

اس نے اپنا منصوبہ ڈرتے ڈرتے پیش کیا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ مزمل اس کی پہلے سے کی گئی پلاننگ سن کر ناراض نہ ہو جائے مگر اس کے خدشے کے برعکس وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر نرمی سے بولا۔

"ٹھیک ہے چلی جانا مگر اپنا بہت خیال رکھنا۔ بلکہ ہو سکے تو اپنی امی کو بھی ساتھ لے جانا کیونکہ خود سے تم کہاں اپنا خیال رکھتی ہو۔"

یہ بات سچ تھی۔ وہ مزمل کا جتنا بھی خیال رکھ لیتی۔ گھر کے سارے کام بھی سلیقے سے کر لیتی مگر اس کا خیال مزمل کو ہی رکھنا پڑتا تھا اس لیے ان دنوں وہ دفتر سے آ کر سب سے پہلے اس سے دن بھر کی خوراک کے بارے میں پوچھتا تھا۔ اور خود جتنا وقت گھر پر رہتا۔ اسے وقفے وقفے سے پھل جوس یا دودھ خود کچن سے لا کر دیتا تھا۔ اور اپنے سامنے بٹھا کر اسے کھانا یا پھل کھلایا کرتا تھا۔ وہ اس کی اس محبت پر خوب اترایا کرتی تھی۔ اور اسے چھیڑنے کو بعض اوقات کہہ دیتی تھی۔

"مجھے پتا ہے تمہیں اپنے بچے کی فکر ہے۔ اس لیے میرا یوں خیال رکھتے ہو۔"

"جی نہیں" وہ فوراً" تردید کرتا "مجھے بچے سے زیادہ اپنی بیوی کی فکر ہے میرے لیے بچہ بہت اہم ہے۔ مگر تم اس سے زیادہ اہم ہو۔"

وہ پورے اعتماد اور یقین سے کہتا اور رابعہ کا دل اس کی بات سن کر خوشی سے جھوم اٹھتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹیسٹ اس کی توقع سے زیادہ اچھا ہوا تھا اور وہ بے حد خوش لاہور سے واپس آئی تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ اسے انٹرویو کے لیے کال کر لیا جائے گا۔ مگر مزمل اس کا ٹیسٹ اچھا ہونے کا سن کر بھی اپنی رائے پر قائم تھا۔ اسے یہی لگتا تھا کہ رابعہ لیکچرر شپ کے لیے کوشش کر کے اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ مگر رابعہ کی دل آزاری کے خیال سے وہ اس کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ اور اس کی خوش امیدی کی باتیں خاموش ہو کر سنے جاتا تھا۔ رابعہ کی پریگنینسی کا اب آٹھواں مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ راشدہ بیگم کئی بار اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کر چکی تھیں۔ مگر رابعہ ہر بار انکار کر دیتی تھی۔ وہ اتنے سارے دنوں کے لیے مزمل سے

دور ہونے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتی تھی۔ اس لیے ماں کو ہر بار ہی کہہ کر انکار کر دیتی تھی کہ وہ ڈلیوری کے بعد ان کے پاس کچھ ہفتے گزارے گی۔ مگر پہلے اپنے گھر پر ہی رہے گی۔ اس کی ضد دیکھ کر راشدہ بیگم نے چند بار اصرار کرنے کے بعد ہار مان لی تھی۔ اب وہ خود روز ہی اس کے پاس آ جایا کرتی تھیں۔ اور شام کو مزمل کے آنے کے بعد واپس جاتی تھیں۔ ویسے بھی ان کا گھر رابعہ کے گھر سے چند گلیاں ہی دور تھا اور وہ آرام سے پیدل ہی آ جایا کرتی تھیں۔

رابعہ کے گھر زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے ان کی رائے مزمل کے بارے میں بھی بہتر ہو گئی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ مزمل زیادہ نہیں کماتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے ان کی لاڈلی بیٹی کو بہت ساری ان آسائشات سے محروم ہونا پڑا تھا۔ جن کی وہ بچپن سے عادی رہی تھی۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ وہ رابعہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ ایک بار دفتر سے گھر آ جانے کے بعد اس کا سارے کا سارا وقت رابعہ کے لیے ہی مخصوص ہوا کرتا تھا۔ وہ نہ کہیں گھومنے پھرنے جاتا تھا اور نہ ہی دوستوں کی محفل میں جا جا کر بیٹھتا تھا۔ چھٹی والے دن وہ اس کے ساتھ گھر کے سارے کام کرواتا اور بعض اوقات کھانا بھی خود بنانے کھڑا ہو جاتا تھا۔ رابعہ اس کا بنایا ہوا کھانا دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی کیونکہ مزمل کو ٹھیک سے پکانا کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ اس لیے اس کی بنائی ہوئی ہر ڈش کی شکل نرالی ہی ہوا کرتی تھی۔

"کھانے کی شکل پر نہ جاؤ میری جان!" رابعہ کو ناک چڑھاتے دیکھ کر وہ ہنس کر کہتا۔

"میرا خلوص دیکھو میری محبت دیکھو۔ جو اس میں شامل ہے۔"

"دیکھو مزمل! میں تمہاری محبت اور تمہارے خلوص پر ویسے ہی یقین کرنے پر تیار ہوں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تم اپنا خلوص اور اپنی محبت یوں کھانے کے ساتھ جلا جلا کر میرے سامنے پیش کرو۔"

وہ مسکین سی شکل بنا کر سوال کرتی۔ ایسے میں اس کی جگر جگر کرتی آنکھوں میں جو شرارت ہوا کرتی وہ مزمل سے مخفی نہیں رہتی تھی اس لیے وہ اس کے دہائیاں دینے کے باوجود اپنا بنایا ہوا کھانا اسے کھلا کر ہی دم لیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

رابعہ کی طبیعت اچانک ہی خراب ہو گئی تھی۔ مزمل ایک دن کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے رات کو راشدہ بیگم ہی اس کے پاس تھیں۔ مزمل جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر کام چونکہ دفتر کا تھا اور تھا ضروری اس لیے مجبوراً" اسے جانا پڑا۔ ویسے بھی ابھی ایک روز پہلے ہی وہ رابعہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اور ڈاکٹر نے تین روز بعد رابعہ کو ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا کہا تھا۔ مگر جس شام کو مزمل لاہور جانے کے لیے نکلا اس رات کو رابعہ کی طبیعت ایک دم ہی خراب ہو گئی راشدہ بیگم کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ انہوں نے فوراً" گھر فون کیا۔ اور چند منٹ بعد ہی ماجد اور اس کی بیوی رابعہ کے گھر پہنچ گئے۔ راشدہ بیگم اور سائرہ نے سہارا دے کر رابعہ کو کار میں بٹھایا۔ اور فوراً" ہسپتال کے لیے نکل پڑے۔

اگلی صبح رابعہ نے ایک بے حد خوبصورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا۔ تب تک مزمل سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ رابعہ بیٹے کی ماں بن کر خوش تو تھی مگر جب تک مزمل اس کے پاس نہ ہوتا اس کی یہ خوشی ادھوری تھی۔ اس لیے اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ کمرے میں منتقل ہونے کے بعد تو اس کی آنکھیں مستقل دروازے کا ہی طواف کر رہی تھیں راشدہ بیگم کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے ایک سلائس اور دودھ پتی کے ایک کپ کے سوا کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ بار بار کل رات کا وقت یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ مزمل اس کے پاس نہیں تھا تو سب کی موجودگی کے باوجود خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت مزمل ہسپتال پہنچا تو اس کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھلی اور چہرے کی چمک لوٹی مزمل خود بھی بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ ابھی آدھا

گھنٹہ پہلے ہی گھر پہنچا تھا اور اس کے گھر آنے کے چند منٹ بعد ہی ناصر نے اسے فون کر کے صورت حال بتائی تھی۔ اس نے کپڑے بدلے نہ پانی پیا فوراً" ہی بائیک نکالی اور ہسپتال کے لیے روانہ ہوگیا۔

"رابی! میری جان تم ٹھیک تو ہو؟"

کمرے میں راشدہ بیگم اور ایک نرس کی موجودگی کے باوجود وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ رابعہ کا بے حد زرد اور مرجھایا ہوا چہرہ اسے بری طرح سے پریشان کر گیا تھا۔ اس لیے وہ فوراً" ہی والہانہ انداز سے اس کی طرف لپکا تھا۔ کچھ اس کی موجودگی کا احساس کچھ اس کا محبت بھرا انداز رابعہ کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر رخساروں پر پھسل گئے۔ مزمل نے اس کے قریب بیٹھ کر بے اختیار ہی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

"سوسوری جان! میں اتنے مشکل وقت پر تمہارے پاس نہیں تھا۔ کاش مجھے پتا ہوتا تو میں لاہور جاتا ہی نہیں۔" اسے نہ اپنے بیٹے کو دیکھنے کا خیال آیا تھا اور نہ ہی اس نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کمرے میں اور کون کون موجود ہے۔ اسے صرف رابعہ کا ہی خیال تھا اور اسے صرف وہی نظر آرہی تھی۔ اس لیے جب تک رابعہ کے آنسو تھم نہیں گئے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آگئی وہ کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوا۔

"اپنے بیٹے کو نہیں دیکھو گے؟"

رابعہ نے ہی اسے احساس دلایا تھا۔ اس نے گردن گھما کر کمرے کے دوسرے کونے میں موجود کاٹ کی طرف دیکھا اور وہاں راشدہ بیگم کو دیکھ کر بے اختیار ہی شرمندہ سا ہو کر ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بے شمار دعاؤں سے نواز کر کاٹ میں لیٹے ہوئے بچے کو احتیاط سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ مزمل نے بچے کو اپنی بانہوں میں بھر کر نرمی سے اپنے سینے سے لگایا اور اس کی ننھی سی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ رابعہ اور راشدہ بیگم دونوں ہی بہت توجہ سے اس کا اپنے بیٹے کے لیے محبت بھرا انداز دیکھ رہی تھیں۔

"رابعہ نے کچھ کھایا امی؟"

بچے کو واپس راشدہ بیگم کو دیتے ہوئے اسے ایک بار پھر اپنی بیوی کا خیال آیا تھا۔

"کہاں کچھ کھا رہی ہے بیٹا! اب تم آگئے ہو تو خود ہی اسے کھلاؤ اور میں ذرا گھر فون کر کے تمہارے لیے کھانا بھیجنے کا کہہ آؤں۔" بچے کو دوبارہ سے کاٹ میں لٹا کر راشدہ بیگم نے اسے جواب دیا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼
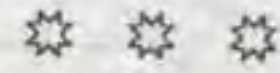
ہسپتال سے راشدہ بیگم رابعہ کو اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ ابھی اس کو بہت توجہ اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ اس لیے رابعہ نے بھی زیادہ آنا کانی نہیں کی۔ حالانکہ اسے مزمل کی فکر بھی ہو رہی تھی۔ کہ پیچھے اس کو مسئلہ ہوگا۔ مگر راشدہ بیگم نے مزمل کو بھی اپنے پیار بھرے انداز سے پابند کر دیا کہ جب تک رابعہ میکے میں ہے۔ وہ دفتر سے سیدھا ان کے گھر آیا کرے گا اور صبح کا ناشتا بھی وہیں کرے گا تھوڑی سی ردو کد کے بعد مزمل نے ان کی بات مان لی تھی۔ اس لیے رابعہ کو بھی اطمینان ہوگیا۔ میکے میں اسے ہر طرح کا آرام اور اچھی خوراک میسر تھی۔ دونوں بھابیوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ماں اور بھائی تو خیر شروع سے ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اس لیے وہ وہاں کافی خوش اور مطمئن تھی۔ اپنے بیٹے کا نام اس نے مزمل کی پسند سے عبدالہادی رکھا تھا۔ وہ زیادہ تر راشدہ بیگم کے پاس ہی رہتا تھا۔ اور وہی اس کے سارے کام بھی کرتی تھیں۔

عبدالہادی ابھی پورے ڈیڑھ ماہ کا بھی نہیں ہوا تھا جب پبلک سروس کمیشن سے اس کے لیے انٹرویو کی کال آگئی اس نے ٹیسٹ پاس کر لیا تھا۔ اگرچہ یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ یہ جاب اسے مل جائے مگر اب عبدالہادی کی وجہ سے وہ کچھ تذبذب کا شکار بھی ہو رہی

تھی۔

"تم بچے کی فکر کیوں کرتی ہو بیٹا! میں جو ہوں میں خود ہی اسے سنبھال لیا کروں گی۔"

راشدہ بیگم نے اس کا تذبذب دیکھ کر کہا تھا۔ وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی ہوگئی۔

انٹرویو دینے کے لیے وہ ماجد کے ساتھ گئی تھی۔ ٹیسٹ کی طرح اس کا انٹرویو بھی بہت اچھا ہوا۔ اور انٹرویو دینے کے چند مہینے بعد ہی اسے اپائنٹمنٹ لیٹر بھی مل گیا۔ اس کی تقرری اپنے شہر کے ایک گرلز کالج میں ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼
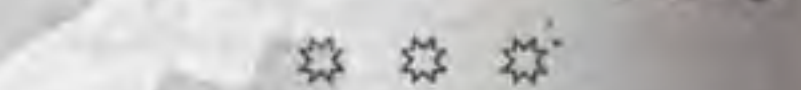
تین ماہ راشدہ بیگم کے پاس گزار کر وہ اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔ کالج میں اس کی جوائننگ بھی ہو چکی تھی۔ اور وہ بے حد خوش تھی۔ زندگی نے اسے بہت کچھ عطا کر دیا تھا۔ اپنا گھر' بیٹا! اچھی ملازمت اور سب سے بڑھ کر مزمل کا محبت بھرا ساتھ۔ ان دنوں وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتی تھی۔ کالج کی پرنسپل اور ساتھی لیکچرز بہت کوآپریٹو تھیں۔

اس کے تین ماہ کے بیٹے کے بارے میں جاننے کے بعد اس کے تمام پریڈ شروع کے ہی رکھے گئے تھے۔ اس طرح وہ صبح نو بجے کالج جاتی اور زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ یا ایک بجے تک گھر واپس پہنچ جاتی تھی۔ اس دوران عبدالہادی راشدہ بیگم کے پاس رہتا۔ اور رابعہ کے کالج سے آنے کے بعد اکثر ہی راشدہ بیگم عبدالہادی کو ساتھ لے کر خود بھی اس کے گھر آجایا کرتی تھیں۔ ان کے آجانے سے رابعہ کو بہت مدد مل جاتی کہ وہ عبدالہادی کو سنبھال لیتیں اور رابعہ جلدی جلدی گھر کے کام نبٹاتی گھر کے کاموں کے لیے راشدہ بیگم کے کہنے کے باوجود اس نے ابھی تک کوئی ملازمہ نہیں رکھی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کچھ عرصہ وہ پہلے کی طرح ذرا ہاتھ روک کر خرچہ کرے تاکہ ان کے پاس کچھ رقم جمع ہو جائے۔ اپنی اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی تھی۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کی ساری کی ساری تنخواہ بچ ہی جائے کیونکہ اب عبدالہادی بھی تھا۔ اور اس کے روزمرہ کے اخراجات کافی زیادہ تھے۔ پھر اب وہ اور مزمل پہلے کی طرح ہر چیز پر من بھی نہیں مار پاتے تھے۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ بچت ہر مہینے ضرور کر لیا کرتی تھی۔

زندگی ایک ڈگر پر رواں دواں ہو چکی تھی۔ رابعہ کو ایسا لگتا تھا کہ اب ان کے مشکلات کے دن گزر چکے ہیں مگر قسمت کو اس کا یہ اطمینان کچھ زیادہ نہیں بھایا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی جاب کے چار ماہ بعد مزمل نے اپنی جاب چھوڑ دی۔ اس کا اپنے ڈیپارٹمنٹ کے منیجر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور وہ نوکری پر لات مار کر گھر آگیا تھا۔ رابعہ کو پتا چلا تو وہ چند لمحوں کے لیے گنگ سی رہ گئی۔ ابھی تو اس نے اپنے گھر میں خوشحالی کی خوشی کو محسوس کرنا شروع ہی کیا تھا۔ اگلے ماہ سے وہ ایک بڑی کمیٹی ڈالنے کا سوچ رہی تھی کہ یہ افتاد پڑ گئی۔

"مزمل! اگر جھگڑا ہو بھی گیا تو جاب چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟" کئی لمحوں کے بعد وہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔

"بس یار! میں ایسے گھٹیا لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ کتنے عرصے سے اس منیجر کی بدتمیزیاں برداشت کیے جا رہا تھا مگر آج تو حد ہی ہو گئی۔ تم کہتی ہو مجھے نوکری نہیں چھوڑنا چاہیے تھی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اب اگر وہ مجھے دوبارہ بلائیں بھی تو میں یہ جاب نہیں کروں گا۔"

مزمل اس کی بات کے جواب میں پھٹ ہی پڑا تھا۔ رابعہ سے مزید کچھ نہیں کہا گیا۔ وہ جتنے غصے میں تھا۔ اس وقت اسے کوئی بات سمجھائی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ابھی اسے راشدہ بیگم کو فون کر کے یہ بھی بتانا تھا۔ کہ وہ ان کی دوست کے گھر ڈالی جانے والی کمیٹی میں حصہ نہیں لے سکے گی۔ اور اسے اندازا تھا کہ مزمل کے جاب چھوڑنے کا سن کر راشدہ بیگم اسے خوب باتیں بھی سنائیں گی۔

☼ ☼ ☼

مزمل نے اگرچہ اس سے کہا بھی تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر دوسری جاب تلاش کر لے گا۔ مگر تین ماہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک بے روزگار ہی پھر رہا تھا۔ دو تین جگہوں پر اسے جاب ملی بھی مگر وہ کسی نہ کسی وجہ سے اس نے خود ریجیکٹ کر دی۔ وہ اپنی پہلے والی جاب سے ایک ہزار روپیہ کم تنخواہ والی جاب کرنے پر بھی راضی نہیں تھا۔ رابعہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ مگر اسے قائل نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر رمضان کا مہینہ آگیا تو اس نے روزوں کو جواز بنا کر جاب کی تلاش کے لیے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ رابعہ کالج سے واپس آتی تو وہ یا تو ٹی وی دیکھ رہا ہوتا یا سویا ہوا ملتا۔ وہ اس کی اس لاپروائی پہ اندر ہی اندر کڑھتی تھی مگر اس کے سامنے کچھ نہیں کہتی تھی۔ مبادا وہ اس سے ہی بدظن ہو جائے لیکن اس روز وہ اپنی چپ قائم نہیں رکھ سکی۔

اس روز کالج میں ایڈمشنز کے سلسلے میں اسے کافی کام کرنا پڑا تھا۔ اور اس کی واپسی بھی کافی دیر سے ہوئی تھی۔ اس لیے اسے آرام کرنے کا بھی کچھ خاص موقع نہیں مل سکا تھا۔ تھکن بے خوابی اور ذہنی پریشانی نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ بہت بے دلی سے کچن میں کام کر رہی تھی۔ روزہ افطار ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں رہتا تھا۔ اس لیے ست ہونے کے باوجود وہ تیزی سے کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب اسے عبدالہادی کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر تو وہ یہی سوچ کر کچن میں رکی رہی کہ مزمل گھر پر ہی ہے اسے چپ کروا لے گا مگر جب عبدالہادی کی آواز مسلسل آتی رہی تو ناچار اسے چولہا ہلکا کر کے باہر جانا پڑا۔ اور یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا کر مزمل عبدالہادی کے رونے کی آواز سننے کے باوجود اندر جا کر اسے چپ کروانے کی بجائے آرام سے لاؤنج کے صوفے پر اوندھا لیٹا اخبار پڑھ رہا ہے۔ وہ عبدالہادی کو اٹھا کر باہر لائی اور نہ چاہتے ہوئے بھی مزمل پر برس پڑی۔

"تم کم سے کم عبدالہادی کو تو دیکھ لیا کرو۔ وہ کب سے اندر پڑا رو رہا ہے اور تمہیں پروا ہی نہیں۔ میں آخر کیا کیا دیکھوں کالج جاؤں گھر کے کام کروں یا بچے کی دیکھ بھال کروں۔"

غصے کے عالم میں اس کا لہجہ کچھ زیادہ ہی تیز ہو گیا تھا۔ جس نے مزمل کو بری طرح سے بھڑکا دیا۔ وہ اخبار پھینک کر سیدھا ہوا اور چبھتے ہوئے انداز سے بولا۔

"اگر تم کالج جاتی ہو تو کوئی احسان نہیں کرتی ہو جو یوں جتا رہی ہو۔ گھر اور بچے کی دیکھ بھال تمہاری ذمہ داری ہے میری نہیں۔ چار پیسے کیا کمانے لگی ہو تم نے تو میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ ایک وہ تمہاری والدہ محترمہ آجاتی ہیں مجھ پر طعنہ زنی کرنے کو اور رہی سہی کسر تم نکالنے بیٹھ جاتی ہو۔"

اس نے راشدہ بیگم کا ذکر جس بدتمیزی سے کیا تھا۔ رابعہ کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔ یہ ضرور تھا کہ راشدہ بیگم مزمل سے اکثر ہی نوکری ملنے کے بارے میں سوال کر لیا کرتی تھیں مگر انہوں نے اسے طعنہ تو کبھی نہیں دیا تھا۔ بلکہ وہ تو رابعہ کی ناراضی کے ڈر سے مزمل کی جاب کے بارے میں زیادہ بات بھی نہیں کرتی تھیں اور مزمل ان کے سارے احسانات بھلا کر ان کے بارے میں اس طرح سے بات کر رہا تھا۔ اس کے جسم میں خون کی جگہ گرم لاوا گردش کرنے لگا۔

"تمہیں شرم تو نہیں آتی امی کے بارے میں اس طرح بات کرتے ہوئے۔ بھول گئے کتنے احسان ہیں ان کے ہم پر۔"

اس نے بے حد غصے سے کہا تھا۔ مزمل کو اس کی بات تیر کی طرح لگی۔

"احسان کیے ہوں گے انہوں نے تم پر مجھ پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے جس کو وہ آکر جتائیں۔"

"تم" رابعہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔

"ہاں کیا میں" وہ لڑاکا عورتوں کی طرح دوبدو مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

"دے لو جو طعنے دینے ہیں۔ آخر سارا دن اپنی امی سے ہی کلاس تو لیتی ہو آج کل۔"

"تم انتہائی گھٹیا انسان ہو۔ میں تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی۔" رابعہ ماں کے متعلق اس کے مزید توہین آمیز الفاظ برداشت نہیں کر پائی تھی۔

"تو میں بھی کون سا تم سے بات کرنے کے لیے مرا جا رہا ہوں۔ دماغ خراب تھا میرا جو تم جیسی خود غرض عورت سے میں نے شادی کر لی۔"

پاؤں کی ٹھوکر سے تپائی کو الٹتا ہوا وہ گھر سے باہر چلا گیا۔ رابعہ سن سی کھڑی اس کے الفاظ پر غور کرتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

تین سالہ شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا جھگڑا تھا جو ان دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ اور دونوں ہی ایک دوسرے سے شدید ناراض ہو گئے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے بیچ کبھی کبھار کوئی چھوٹی موٹی جھڑپ ہو بھی جاتی تو ناراض ہونے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ عموماً رابعہ ہی لڑائی کو بھول کر اسے منانے میں پہل کر لیا کرتی تھی۔ مگر اس بار وہ مزمل سے بھی زیادہ ناراض ہو چکی تھی۔ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ مزمل ان دونوں کے آپس کے جھگڑے میں زبردستی اس کی ماں کو نا صرف گھسیٹ لایا بلکہ اس نے بلاوجہ ان کے بارے میں توہین آمیز کلمات ادا کر کے اس کا دل بھی دکھایا تھا۔ اس لیے چند روز گزر جانے کے بعد جب مزمل کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا اور باہمی ناراضی کا بوجھ اس کے لیے ناقابل برداشت بھی ہونے لگا تو اس نے بہانے بہانے سے رابعہ کو بلانے اور ناراضی کا یہ دور ختم کرنے کی کوشش بھی کی مگر رابعہ اس سے لاتعلق ہی رہی۔ اس کے لیے یہ بات اتنی معمولی سی نہیں تھی جس کو وہ اتنی آسانی سے بھول جاتی۔

وہ اپنے سارے معمولات پہلے کی طرح نبٹاتی تھی۔ مزمل کے سارے کام بھی اسی طرح سے کرتی تھی مگر اس نے مزمل کو بلانا قطعی چھوڑ رکھا تھا۔ بعض اوقات وہ سحری یا افطاری کے وقت جان بوجھ کر کمرے میں بیٹھا رہتا کہ رابعہ اسے بلانے آئے گی یا کم از کم آواز ہی دے گی مگر وہ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد اس کا کھانا خاموشی سے کمرے میں رکھ جایا کرتی تھی اور اگر مزمل اسے مخاطب کرتا تو یوں ہو جاتی جیسے اسے اس کی آواز سنائی ہی نہ دے رہی ہو۔ یہ ساری صورت حال مزمل کے لیے نئی بھی تھی اور تکلیف دہ بھی۔ اس نے اس سے پہلے رابعہ کو ہمیشہ اپنے آگے پیچھے پھرتے ہی دیکھا تھا۔ اس لیے اب اس کا یوں لاتعلق ہونا اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

اس روز انتیسواں روزہ تھا۔ اگلے روز عید ہونے کا بھی امکان تھا اور کالج سے چھٹی بھی تھی۔ اس لیے رابعہ نے خوب دل لگا کر سارے گھر کی صفائی کی۔ ایک روز پہلے جو مشین لگا کر اس نے کپڑے دھوئے تھے ان کو استری بھی کیا اور عید کے دن کے خیال سے کچھ چیزیں بنا کر فریج میں رکھ دیں۔ شام تک وہ تھکن سے چور ہو گئی تھی۔ مگر افطاری کا بندوبست تو کرنا ہی تھا۔ اس لیے حسب معمول عصر کی نماز کے بعد وہ اس کام میں مصروف ہو گئی۔ مزمل صبح سے گھر پر ہی تھا اور بہانے بہانے سے اسے مخاطب کرنے کی چند کوششیں بھی کر چکا تھا۔ رابعہ کے دل میں اگرچہ اب اس کے لیے پہلے جیسی ناراضی نہیں رہی تھی مگر وہ پھر بھی اس سے بات کرنے سے گریزاں تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ مزمل یونہی اس سے بات چیت شروع کرنے کی بجائے اس سے اپنے ان الفاظ کے لیے ضرور ایکسکیوز کرے جو اس نے اس کی ماں کے بارے میں کہے تھے۔ اس لیے آج بھی وہ اس کے بلانے پر خاموش ہی رہی تھی۔

"یار رابی! اب بس بھی کرو اور کتنے دن تم نے مجھ سے ناراض رہنا ہے میں تھک گیا ہوں یار! تمہارے بغیر رہتے رہتے۔"

پکوڑوں کے لیے آمیزہ بنا کر وہ فروٹ چاٹ بنا رہی تھی جب مزمل کچن میں چلا آیا۔ رابعہ نے ایک لاتعلق سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور رخ موڑ کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"مجھے بالکل اندازا نہیں تھا کہ تم اتنی ضدی بھی ہو سکتی ہو۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور چولہے پر رکھی

ہوئی کڑاہی کی طرف مڑ گیا جس میں پکوڑے تلنے کے لیے آئل ڈال کر رابعہ نے ہلکی آنچ پر رکھا ہوا تھا تاکہ اس کے چاٹ بنانے تک آئل گرم ہو جائے۔

"چلو آج پکوڑے میں تل لیتا ہوں۔ شاید میرے ہاتھ کے تلے ہوئے پکوڑے کھا کر ہی تم مجھ سے اپنی ناراضی ختم کر دو۔"

آنچ تیز کرتے ہوئے اس نے اعلان کیا تھا۔ رابعہ نے تیزی سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مزمل کچن کے کاموں میں بالکل بھی ماہر نہیں تھا۔ اور کم از کم تلنے جیسا کام اس کے لیے بالکل بھی آسان نہیں تھا۔ وہ جو چیز بھی بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا حشر کر کے رکھ دیا کرتا تھا۔ رابعہ نے اسے روکنے کے لیے ہی رخ موڑا تھا مگر ایک تو وہ اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اور دوسرے رابعہ کی اپنی ضد بھی آڑے آ گئی۔ اس لیے وہ کندھے اچکا کر دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اوہ شٹ"

مزمل نے پہلا چمچہ بھر کر آمیزہ کڑاہی میں ڈالا ہی تھا جب گرم گرم تیل اس کے ہاتھ پر پڑا۔ تیل زیادہ ہی گرم ہو چکا تھا اور اس نے چونکہ اناڑی پن سے کافی فاصلے سے آمیزہ کڑاہی میں ڈالا تھا اس لیے تیل اچھلا اور اس کے ہاتھ پر پڑ گیا تھا۔

"کیا ہوا" رابعہ اپنی ناراضی برقرار نہیں رکھ سکی تھی اور چھری پھینک کر تیزی سے اس کی جانب آئی تھی۔ جو تکلیف کی شدت سے ہونٹ بھینچے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑے کھڑا تھا۔ رابعہ نے جلدی سے فریج کھول کر گندھا ہوا آٹا نکالا۔ اور تھوڑا سا آٹا لے کر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر رکھ کر اپنے ہاتھ سے ہلکے ہلکے دبانے لگی۔ مزمل کے چہرے سے تکلیف کے آثار کم ہو گئے۔ فریج میں رکھے آٹے کی ٹھنڈک نے اسے کافی سکون پہنچایا تھا۔

"جب ایک کام نہیں آتا تو کیا ضرورت تھی اسے کرنے کی؟"

وہ خفگی سے بولی تھی اس کی آنکھیں پل بھر میں ہی مزمل کی تکلیف کے خیال سے نم ہو گئی تھیں۔

"میں تو تمہیں منانے کی کوشش کر رہا تھا۔" بچوں جیسی معصومیت چہرے پر سجا کر بولا۔ رابعہ کے دل کو کچھ ہونے لگا محض اس کو منانے کی کوشش میں مزمل نے اپنا ہاتھ جلا لیا تھا۔ کیا تھا اگر وہ اس کے بلانے سے بول پڑتی اور پھر اس کو ذرا طریقے سے سمجھا دیتی کہ وہ آئندہ آپس کی لڑائی میں کسی بھی تیسرے شخص کو نہ گھسیٹے وہ یقیناً" اس کی بات مان بھی لیتا۔

"چلو اب تم لاؤنج میں جا کر بیٹھو میں پکوڑے خود ہی تل لوں گی۔"

چولہا بند کر کے اس نے مزمل کے ہاتھ پر لگا آٹا اتارا اور جلے ہوئے ہاتھ پر برنال لگاتے ہوئے اسے ہدایت کی تھی۔

"میں نہیں جاؤں گا تم کون سا ابھی مانی ہو۔" وہ چھوٹے بچوں کی طرح ضد پر اڑا تھا۔ رابعہ بے اختیار ہی مسکرا دی۔

"میں مان گئی ہوں مزمل! بس دس منٹ میں پکوڑے تل کر آتی ہوں۔"

اس نے نرمی سے اس کا جلا ہوا ہاتھ سہلایا تھا۔ مزمل کی جلد ویسے ہی حساس تھی۔ اس لیے اس کے ہاتھ پر تیل پڑنے سے جلد سرخ ہونے کی بجائے آبلے سے پڑ گئے تھے۔ رابعہ کا افسوس دوچند ہو گیا۔

"واقعی مان گئی ہو۔"

مزمل نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا اور مشکوک سے انداز سے پوچھا اس نے ہنس کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"پھر وعدہ کرو کہ اگر آج چاند رات ہو گئی تو میرے ساتھ چوڑیاں پہننے چلو گی۔" اس نے فوراً" ہی فرمائش کی تھی۔

"ہاں ہاں چلوں گی" اس کی آنکھیں مزمل کے انداز پر پھر سے بھر آئیں اور وہ بے اختیار ہی اس کے سینے سے آ لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ عید کی صبح تھی۔ بے حد اجلی، نکھری اور خوبصورت سی اگرچہ عیدیں تو پہلے بھی آچکی تھیں مگر وہ دونوں اتنے دن تک ایک دوسرے سے ناراض رہنے کے بعد مانے تھے۔ تو دنیا کی ہر چیز ہی پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ گزشتہ رات مزمل اسے بازار لے کر گیا تھا۔ وہاں چوڑیاں پہننے اور مہندی لگوانے میں اتنا وقت نہیں لگا تھا۔ جتنا انہوں نے ایک دوسرے کی سنگت میں گھومتے پھرتے گزارا تھا۔ اور رات ایک بجے وہ واپس گھر آئے تھے تو دونوں ہی بے حد خوش تھے عبدالہادی کو وہ راشدہ بیگم کے پاس چھوڑ کر گئے تھے۔ ان کے واپس آنے تک نا صرف وہ سو چکا تھا بلکہ راشدہ بیگم بھی ان کے انتظار میں اونگھ رہی تھیں۔ انہیں یوں اتنی رات تک اپنے بچے کی دیکھ بھال کرتے دیکھ کر مزمل کو ان کے بارے میں کہے گئے اپنے الفاظ پر نئے سرے سے افسوس ہوا تھا۔ اور شاید اسی افسوس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اس کا رویہ راشدہ بیگم کے ساتھ ہمیشہ سے زیادہ احترام بھرا تھا۔

مزمل عید کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ عبدالہادی کا لباس تبدیل کرنے کے بعد خود بھی تیار ہو چکی تھی۔ آج بڑے دنوں کے بعد اس نے بہت دل سے سنگھار کیا تھا۔ اور اپنے پسندیدہ سیاہ رنگ کے بے حد خوبصورت انار کلی فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ مزمل نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس کے لیے موتیے کے گجرے لے کر آیا تھا۔

"یار! تم تو پریوں کو بھی حسن میں مات دے رہی ہو۔" اس کی کلائی میں گجرے پہناتے ہوئے وہ پرشوق نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ رابعہ شرما کر مسکرا دی۔

"اچھا تم نے کتنی پریاں دیکھ رکھی ہیں؟" اس نے شرارت سے مزمل کا چہرہ دیکھا تھا۔

"دیکھی تو صرف یہ ایک ہی ہے۔ باقیوں کا تو بس ذکر ہی سنا ہے۔" اس کے مہندی سے رچے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مزمل نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

"مجھ سے ناراض نہ ہوا کرو رابی! مجھ سے تمہاری ناراضی برداشت نہیں ہوتی۔ دنیا سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ ایسے لگنے لگتا ہے کہ جیسے میرا جینے کا مقصد ہی ختم ہو گیا ہو۔" اس کے بالوں سے اٹھتی خوشبو کو اپنے اندر اتارتے ہوئے مزمل نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"میں کون سا تم سے ناراض ہو کر خوش رہتی ہوں۔ مگر تم نے اس روز باتیں ہی ایسی کر دی تھیں۔ تمہیں ہماری آپس کی لڑائی میں امی کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہمارے لیے کتنا کچھ کرتی ہیں۔ پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ وہ تمہیں بے روزگاری کے طعنے دیتی ہیں۔ حالانکہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔"

مزمل کے سینے سے لگ کر اس نے اپنے شکوے کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو مگر پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے۔ کہ وہ مجھے تم سے کمتر سمجھتی ہیں۔ اور مجھ سے تمہاری شادی کر کے پچھتا رہی ہیں۔"

وہ کچھ بے چارگی سے بولا تھا۔ رابعہ نے اس کے سینے سے سر اٹھا کر حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا جس پر اب گہری سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔

"وہ ایسا کیوں سوچیں گی مزمل! ہماری شادی کو تین سال ہو چکے ہیں۔ انہیں اگر اس پر پچھتاوا ہوتا تو اس کا اظہار وہ اب کیوں کرتیں۔"

"مجھے نہیں پتا مجھے ایسا کیوں لگتا ہے" وہ آہستگی سے اسے خود سے الگ کر کے کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ "شاید تمہارے خود سے زیادہ کمانے کی وجہ سے میں احساس کمتری کا شکار ہونے لگا ہوں میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ میں خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کر لوں۔ تمہارے برابر یا تم سے زیادہ نہیں کما سکتا۔"

کھڑکی سے نظر آتی سنگلاخ دیوار کو دیکھتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں بھی دیوار جیسی سختی در آئی

تھی اور وہ چند منٹ پہلے والے مزمل سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔

"تم ایسا کیوں سوچنے لگے ہو مزمل! ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تو نہیں ہیں۔ تم زیادہ کماؤ یا میں ایک ہی بات ہے۔ مجھے کم یا زیادہ پیسوں سے فرق نہیں پڑتا مزمل! مجھے تمہاری محبت کے کم یا زیادہ ہونے سے فرق پڑتا ہے۔ کیونکہ مجھے تم سے صرف یہی ایک چیز چاہیے۔"

وہ اس کے قریب آکھڑی ہوئی تھی۔

"یہ سب کتابی باتیں ہیں رابی! تمہیں آج اس چیز سے فرق نہ بھی پڑتا ہو کہ میں تم سے کم کما رہا ہوں تو ضروری نہیں ہے کہ کل بھی تمہارے یہ ہی خیالات رہیں اور اگر میں فرض کر بھی لوں کہ تم ہمیشہ ایسی ہی رہو گی تب بھی میں اپنے دل کا کیا کروں جو اس صورت حال کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہے۔ کاش میں نے بھی ٹھیک سے پڑھائی کی ہوتی تو آج یہ احساس کمتری مجھے پریشان نہ کرتا۔"

"مزمل! ایسی باتیں نہ کرو میرا دل گھبرانے لگا ہے یہ سب سن کر۔ ایسی سوچوں سے تو اچھا ہے کہ تم اپنی پڑھائی کا سلسلہ پھر سے شروع کر لو۔ چند سال لگیں گے۔ ہمیں شاید تھوڑا سا Suffer بھی کرنا پڑے مگر پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے پاس ذہانت کی کمی نہیں ہے۔ تمہیں صرف محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ پھر تم زندگی میں وہ سب حاصل کر سکو گے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔"

اس کے شانے سے لگی وہ اسے بہت محبت سے سمجھا رہی تھی۔ اور یہ دیکھ کر اسے مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ اس کی بات سن کر مزمل کے چہرے پر چھائے مایوسی کے بادل پل بھر میں ہی چھٹ سے گئے تھے۔ اور اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے رابی" اس نے بہت شوق سے رابعہ کا چہرہ دیکھا تھا۔ "میرا مطلب ہے۔ پھر میں جاب میں کر سکوں گا اور..." اس نے کچھ سوچتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے مزمل! بس سچی لگن ہونی چاہیے۔ میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم پڑھائی مکمل کر کے اپنا کوئی کیریئر بنا لو تو مجھ سے زیادہ خوشی کس کو ہو گی۔"

"اور تھینک یو رابی! تم نے میرا ذہن ہلکا پھلکا کر دیا ہے۔ تمہیں پتا ہے میں اس نہج پر کئی دن سے سوچ رہا تھا مگر مجھ سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تم نے میری بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔ تم واقعی میرے لیے نعمت ہو۔"

رابعہ کو اپنے ساتھ لگائے وہ بہت خوشی اور جوش سے کہہ رہا تھا۔ رابعہ اس کی باتوں سے زیادہ اس کے لہجے پر دھیان دے رہی تھی جس میں خوشی اور مسرت کی کھنک تھی۔ اور اس کے لیے مزمل کی خوشی ہی سب سے قیمتی چیز تھی۔ اس نے پرسکون ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☼ ☼ ☼

راشدہ بیگم کو مزمل کے پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کرنے کی خبر ملی تو انہیں یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ ان کا خیال تھا کہ مزمل اپنی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے پڑھائی کا سہارا لے رہا ہے۔

"تم خود سوچو رابعہ! اگر اسے پڑھنا ہی ہوتا تو تب نہ پڑھتا جب بھائی جان اور بھابی نے ڈانٹ ڈپٹ سے لے کر منتوں ترلوں تک ہر حربہ اسے پڑھانے کے لیے آزمایا تھا۔ مگر اسے تو کتابوں سے جیسے نفرت تھی پھر اب بھلا وہ کیسے پڑھ سکتا ہے۔ میری مانو تو تم اس معاملے میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کرو۔ تھوڑا کما یا زیادہ مگر کچھ تو گھر لے کر آئے یوں تمہاری کمائی پر عیش نہ کرے۔"

انہوں نے رابعہ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ رابعہ ہی کیا جو مزمل کے معاملے میں کسی دوسرے کی بات سن لے اس کے لیے تو یہی خوشی کافی تھی کہ مزمل نے جب سے ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے کر پڑھنا شروع کیا تھا۔ وہ بہت خوش اور

مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ اگرچہ اب اس کے پاس رابعہ اور عبدالہادی کے لیے وقت کم ہوتا تھا۔ کیونکہ جتنی دیر وہ گھر پر ہوتا اپنی پڑھائی میں ہی مصروف نظر آتا تھا۔ اس نے ڈبل میتھ اور کمپیوٹر سائنس کے سبجیکٹ رکھے تھے۔ رابعہ کا سبجیکٹ بھی میتھ ہی تھا۔ اس لیے وہ روز رات کو اسے پڑھاتی بھی تھی۔ اور مزمل کا شوق دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا تھا کہ وہ واقعی اپنی پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔ اسی یقین کی وجہ سے وہ خود تکلیف اٹھا کر بھی اسے آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی مگر مزمل کی تعلیم کا خرچ اور عبدالہادی کے مہنگے اخراجات کی وجہ سے اس کا مہینہ بمشکل ہی سکون سے گزرتا تھا۔ مگر وہ پھر بھی مزمل کے لیے پھل دودھ اور صحت بخش غذاؤں کا بہت خیال رکھتی تھی۔

مزمل کو کمپیوٹر کا شوق ہوا تو اس نے راشدہ بیگم سے ادھار رقم لے کر اسے کمپیوٹر خریدنے کے لیے دے دی۔ کمپیوٹر ابھی اتنے عام نہیں ہوئے تھے اور اس لیے ان کی قیمت بھی زیادہ تھی۔ مگر وہ مزمل کی کسی خواہش کو ٹالنا نہیں چاہتی تھی۔ مبادا اس کے دل میں یہ خیال آجائے کہ وہ خود کما رہا ہوتا تو اسے اپنا دل مارنا نہ پڑتا۔ اسی خیال کی وجہ سے وہ مزمل کے کہے بغیر اس کے والٹ میں خود ہی معقول رقم بھی رکھ دیا کرتی تھی تاکہ مزمل کو اس سے روپے مانگنے نہ پڑیں۔ ناصر نے امریکہ سے اس کے لیے موبائل فون بھیجا تو مزمل کا شوق دیکھ کر اس نے وہ بھی اسے ہی دے دیا۔ ان دنوں میں موبائل بھی نئے نئے عام ہونے لگے تھے۔ اور لوگ ابھی موبائل کے بہت زیادہ عادی نہیں ہوئے تھے اس لیے اس نے اپنے لیے موبائل خریدنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

راشدہ بیگم اس کے یہ انداز واطوار دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں۔ مگر اسے کھل کر کچھ کہہ نہیں پاتی تھیں۔ کیونکہ انہیں اتنے سالوں میں اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مزمل سیاہ کرے یا سفید، رابعہ کو وہ کبھی غلط لگ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر کبھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ڈھکے چھپے انداز سے اس بارے میں کچھ کہہ بھی دیتیں تو رابعہ ان کی بات سنی ان سنی کر جایا کرتی تھی۔ راشدہ بیگم کو یہ سب پسند نہیں تھا۔ اپنی نازوں پلی بیٹی کے لیے وہ ہر ماں کی طرح عیش و آرام کی ہی خواہاں رہی تھیں۔ اس لیے اب اسے یوں دن رات کام کرتے دیکھنا ان کے لیے اچھا خاصا کڑا امتحان تھا۔ جاب سے واپس آنے کے بعد وہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھی۔ بچت کرنے کے خیال سے اس نے صفائی کرنے یا کپڑے دھونے کے لیے بھی کوئی ماسی نہیں رکھی تھی۔ اپنے لیے کوئی بھی چیز خریدنے سے پہلے وہ سو بار سوچتی تھی۔ مگر مزمل کی کسی بھی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ادھار تک لینے سے نہیں چوکتی تھی۔ یہ سب دیکھنا راشدہ بیگم کے لیے تکلیف دہ تھا۔ ایسے میں وہ صرف یہ سوچ کر خود کو دلاسا دے لیا کرتی تھیں کہ کچھ ہی عرصے کی بات ہے۔

مزمل کا بی ایس سی کا رزلٹ اگر ذرا بھی خراب آیا تو وہ کسی صورت رابعہ کو اسے مزید پڑھانے نہیں دیں گے مگر مزمل کا جو رزلٹ آیا تھا۔ اس نے جہاں رابعہ کو بے طرح خوشی دی تھی۔ وہیں اس کی ماں کے ارادوں کو بھی ڈگمگا دیا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس میں پاس ہوا تھا اور اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے بہت آرام سے یونیورسٹی کے کمپیوٹر سائنس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ مل گیا تھا۔ جس روز ایڈمشن لسٹ میں اس کا نام آیا۔ اس روز رابعہ کو دوہری خوشی ملی تھی۔ ایک مزمل کے داخلے کی اور دوسرے دوسری بار بیٹے کی ماں بننے کی۔ اس روز اس کا دوسرا بیٹا عبدالواحد پیدا ہوا تھا۔ وہ اتنی خوش تھی کہ راشدہ بیگم چاہ کر بھی اسے مزمل کو یونیورسٹی میں ایڈمشن دلانے سے روک نہیں پائی تھیں۔ بلکہ مزمل کی ایڈمیشن فیس کا خیال کرتے ہوئے عبدالواحد کی پیدائش پر ہونے والے تمام اخراجات انہوں نے ہی ادا کیے تھے۔ اور خاموشی سے عبدالہادی کے ساتھ عبدالواحد کی ذمہ داری بھی سنبھال لی تھی۔

☼ ☼ ☼

عبدالواحد کے آجانے اور مزمل کے یونیورسٹی میں ایڈمشن لینے کی وجہ سے ان کے اخراجات میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ جس کو پورا کرنے کے لیے رابعہ نے شام کے اوقات میں ایک اکیڈمی میں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ میتھس کی ٹیچر ہونے کی وجہ سے اسے وہاں اچھے خاصے اسٹوڈنٹس مل گئے تھے۔ اس لیے اکیڈمی والوں کو کمیشن ادا کرنے کے بعد بھی اسے کافی اچھی رقم مل جایا کرتی تھی ۔ اس طرح اخراجات کا مسئلہ تو حل ہو گیا بلکہ اس نے تھوڑی بہت بچت بھی شروع کردی تھی۔ مگر خود اس کی مصروفیات میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ سارا دن وہ کولہو کا بیل بنی رہتی۔ اور اتنی مصروفیت کے عالم میں اسے خود پر توجہ دینے کا بالکل بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ حتیٰ کہ کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو تب بھی وہ کوئی نہ کوئی اضافی کام نکال کر بیٹھ جاتی اسکول کی لڑکیوں کو گھر پر ٹیوشن دیتی یا اپنے اور بچوں کے کپڑے خود سلائی کرتی۔ سلائی بھی اس نے شادی کے بعد بچت کے خیال سے ہی سیکھی تھی۔ تاکہ کم از کم درزیوں کو جانے والی رقم ہی بچا سکے۔

اس دوپہر بھی وہ سلائی مشین کے آگے بیٹھے عبدالہادی کا کرتا شلوار سلائی کر رہی تھی۔ جب راشدہ بیگم کی آمد ہوئی۔ عبدالواحد ان کے ساتھ تھا۔ جبکہ عبدالہادی کو وہ ماجد اور طارق کے بچوں کے ساتھ کھیلتا چھوڑ آئی تھیں۔ رابعہ کی اگرچہ گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں مگر اس کی ٹف روٹین کی وجہ سے بچے ابھی بھی اپنی نانی کے پاس ہی دن بھر رہتے تھے۔ بلکہ عبدالہادی تو ان کے گھر سے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ بعض اوقات رات کو بھی گھر آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا اور نانی کے پاس ہی سو جایا کرتا تھا۔

"رابعہ! میں تو تمہاری ان مصروفیات سے عاجز آچکی ہوں ایک ہی بیٹی ہے میری اس سے بات کرنے کے لیے بھی میں ترس جاتی ہوں۔"

رابعہ کی مسلسل مصروفیات سے جھلا کر راشدہ بیگم نے گلہ کیا تھا۔ وہ مدھم سا مسکرا دی۔

"امی! بس یہ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے پورا کر کے ہی اٹھوں۔ کل سے میں صبح کے [illegible] گھنٹے بھی اکیڈمی جایا کروں گی۔ پھر اس کام کے [illegible] وقت نہیں ملے گا۔"

اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ سارا دن مصروفیات میں گھرے رہنے کے باوجود وہ کبھی چڑچڑی نہیں ہوئی تھی۔ مزمل کے ساتھ اور اس کی محبت کے احساس نے اسے کبھی ایک پل کے لیے بھی اکیلا[illegible] نہیں دیا تھا۔

"تم نے اپنے لان کے سوٹ خرید لیے؟"

راشدہ بیگم کو اچانک ہی اس کے سوٹوں کا خیال آیا تھا۔ جن کے لیے ماجد اور طارق نے ان ہی کے ذریعے رابعہ کو رقم بھجوائی تھی۔ رابعہ ان کے سوال پر ایک پل کے لیے خاموش رہی پھر نفی میں سر ہلا کر آہستگی سے بولی۔

"نہیں امی!"

"کیوں؟" راشدہ بیگم کو غصہ ہی تو آگیا گرمیاں آدھی گزر گئی تھیں اور اس نے لان کا ایک بھی نیا سوٹ نہیں بنایا تھا۔

"اس اتوار کو میرے ساتھ بازار چلنا۔ تمہارے کپڑے بھی خرید لیں گے اور میں نے گھر کی کچھ چیزیں لینی ہیں۔ وہ بھی لے آئیں گے۔ تمہیں تو اپنا ذرا سا بھی خیال نہیں رہا۔"

انہوں نے تاسف سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی اجلی سنہری رنگت اچھی خاصی ماند پڑ چکی تھی۔ اور آنکھوں کے گرد مسلسل کام کرنے اور آرام کی کمی کی وجہ سے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے وہ لمبے چمکدار بال جن کی خوب صورتی میں اضافے کے لیے وہ کوئی ٹوٹکا بھی آزمائے بغیر نہیں چھوڑتی تھی۔ اب وقت الجھے الجھے اور بے جان سے لگنے لگے تھے سستی سی لان کا جو بے حد عام سا سوٹ وہ اس وقت پہنے ہوئے تھی۔ ایسے سوٹوں کی طرف کبھی وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

"امی! دراصل مجھ سے وہ رقم خرچ ہو گئی ہے۔ جو آپ نے کپڑوں کی خریداری کے لیے مجھے دی تھی۔

اس نے پہلے سے بھی آہستہ آواز میں کہا تھا۔ اسے راشدہ بیگم کی طرف سے سخت سست سننے کی پوری امید تھی۔

"کہاں خرچ ہو گئی رقم؟"

راشدہ بیگم نے کھوجنے والے انداز سے پوچھا تھا۔ رابعہ نے بے اختیار ہی ان سے نظریں چرائیں۔

"وہ امی! مزمل کو رقم کی ضرورت تھی۔ اس کی کلاس کا ٹرپ مری اور کاغان کی طرف جا رہا ہے تو اس لیے۔"

اس نے ادھوری سی بات کر کے سر جھکا لیا۔ راشدہ بیگم صدمے کی سی کیفیت میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔

"رابعہ! مجھے سمجھ نہیں آتی میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کسی دوسرے کے ساتھ محبت کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انسان اپنی ذات کو ردی کر دے۔ ذرا آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھو۔ تم کیا تھیں اور کیا بن گئی ہو۔ کیا دیا ہے تمہیں اس نام نہاد محبت نے۔ ایک ڈھنگ کا جوڑا تک نہیں ہے تمہارے پاس نہ اچھا کھانا نہ اچھا پہننا نہ کوئی تفریح کا موقع۔ کیا تم انسان نہیں ہو یا تم نے صرف مزمل کو ہی انسان سمجھا ہوا ہے۔ اسے گھومنے پھرنے کا شوق پورا کرنے سے پہلے یہ تو دیکھنا چاہیے تھا نا کہ اس کی بیوی کس حال میں ہے۔"

"کچھ نہیں ہوا میرے حال کو امی! میں بہت خوش ہوں اور آپ بلاوجہ مزمل کو الزام نہ دیں۔ اس نے مجھ سے پیسے نہیں مانگے تھے وہ تو ٹرپ کے ساتھ جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو میں نے اصرار کیا تھا کہ اسے جانا چاہیے۔ اس کا پڑھائی کا آخری سال ہے پھر کہاں یہ موقع ملتے ہیں۔ اچھا ہے تھوڑا سا وقت وہ بھی انجوائے کرلے۔ آخر میں بھی تو اسٹوڈنٹ لائف میں ہر ٹرپ کے ساتھ جایا ہی کرتی تھی۔ آپ کو یاد نہیں ہے امی! مجھے تب گھومنے پھرنے کا کتنا شوق ہوا کرتا تھا۔" وہ بات کرتے کرتے کہیں ماضی میں کھو گئی تھی۔

"بات تو ایسے کر رہی ہو جیسے اب تم بوڑھی ہو چکی ہو اور تمہارے شوق ختم ہو چکے ہیں۔" راشدہ بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر گئی تھیں۔

"شوق ختم نہیں ہوئے امی! بس وقتی طور پر میں نے ان پر پہرہ بٹھا دیا ہے۔ اب تو بس تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے۔ مزمل کا ایم۔ ایس۔ سی مکمل ہونے والا ہے۔ پھر اسے کوئی اچھی سی جاب بھی مل جائے گی اور میرے یہ مشقت کے دن بھی ختم ہو جائیں گے۔"

وہ بہت پر امید تھی راشدہ بیگم بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوا کریں امی! میں جو بھی کرتی ہوں۔ اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے کرتی ہوں۔ مزمل نے مجھے کبھی بھی کسی کام کے لیے مجبور نہیں کیا۔ وہ میری قربانیوں کا معترف ہے اور آپ دیکھیے گا۔ جب اس کی کوئی اچھی جاب لگ جائے گی تو وہ میرے لیے کتنا کچھ کرے گا۔ آپ کو یاد نہیں ہے کہ شادی پر میرے لیے زیور اور کپڑے بنانے کے لیے اس نے اپنے گھر سے اپنا حصہ تک بیچ دیا تھا۔"

اس کی آنکھیں مزمل کی محبت کے احساس سے جگمگا اٹھی تھیں۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اور مزمل تمہاری ویسی ہی قدر کرے جیسی تمہارا حق ہے۔"

انہوں نے زیر لب دعا دی اور اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔ تاکہ رابعہ کے لیے کھانا بنا سکیں ورنہ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ اگر دیر ہو جاتی تو وہ بھوکی ہی اکیڈمی روانہ ہو جاتی۔ اور ویسے بھی جس موضوع پر وہ رابعہ سے بحث کر رہی تھیں۔ انہیں اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ پورا دن تو کیا ہفتہ بھر بھی لگی رہیں تو رابعہ کو قائل نہیں کر سکیں گی۔ اس لیے انہوں نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا تھا۔

اگلے ہفتے وہ اس کے گھر آئیں تو ان کے ساتھ لان کے تین نئے اور کافی قیمتی سوٹ بھی تھے۔ جو اپنے پاس موجود رقم سے خرید کر اور سلوا کر اس کے لیے لائی تھیں۔ وہ دوسری بار اسے اس کام کے لیے رقم دینے پر

تیار نہیں تھیں۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ اس بار رقم ملنے پر وہ مزمل کے لیے نئی شرٹس یا پرفیومز خرید لاتی۔ اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر مزمل کے لیے مہنگی سے مہنگی چیزیں خریدنے میں اسے ویسے بھی کمال حاصل تھا۔

✲ ✲ ✲

مزمل کے ڈیپارٹمنٹ میں اینول ڈنر تھا۔ اور اسے اس موقع پر کمپیئرنگ کرنا تھی۔ اس کی فرمائش پر رابعہ نے اپنی ایک کولیگ سے اسے کمپیئرنگ لکھوا کر دی تھی۔ جس کی اچھی طرح سے تیاری اور ریہرسل کرنے کے بعد وہ بہت مطمئن سا اپنی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ اور اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے رابعہ بھی گھر پر ہی تھی۔ اور پہلی مرتبہ مزمل کا یوں اہتمام سے تیار ہونا اسے تھوڑا سا بے آرام کر رہا تھا۔

بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس بلیک ہی شرٹ کے اوپر گرے ٹائی لگائے۔ اپنے سلیقے سے سنورے گھنے بالوں اور جگمگاتی ہوئی سنہری آنکھوں کے ساتھ وہ نظروں میں کھبا جا رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کی پرسنالٹی میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ وہ بہت پر اعتماد، پر جوش اور خوش مزاج ہو گیا تھا۔ اپنے آنے والے کل میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کا سوچ کر ہی وہ بہت مسرور رہنے لگا تھا۔ اور اس عرصے میں رابعہ جتنا خود سے لاپروا رہی تھی وہ اتنا ہی اپنا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ خوبصورت تو وہ ہمیشہ سے ہی تھا۔ اب باقاعدگی سے ایکسرسائز کرنے اور اپنا خیال رکھنے کی وجہ سے اس کی خوبصورتی کئی گنا بڑھ گئی تھی۔

وہ اپنے گھنے بالوں میں برش کرنے کے بعد پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ جب رابعہ وہاں آئی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں وہ دونوں ہی اب ایک ساتھ نظر آ رہے تھے۔ اور دونوں کی شخصیت میں واضح فرق تھا مزمل جتنا ترو تازہ اور نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ وہ اتنی ہی مرجھائی ہوئی اور تھکی تھکی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی رنگت جو پہلے مزمل سے زیادہ چمکا کرتی تھی۔ اس وقت اس کے چمکتے ہوئے رنگ کے آگے دبی دبی سی لگ رہی تھی۔ دو بچوں کی پیدائش اور بعد میں اپنا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اس کا جسم بھی فربہ ہو چکا تھا جبکہ مزمل ایکسرسائز کرنے کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ اسمارٹ ہو چکا تھا۔ وہ دونوں چند ماہ کے فرق سے ہم عمر تھے۔ بلکہ رابعہ مزمل سے چار ماہ چھوٹی تھی مگر اس وقت اس کے برابر کھڑی وہ اس سے دس برس بڑی لگ رہی تھی۔

اس نے بے اختیار ہی آئینے میں دکھائی دیتے اپنے اور مزمل کے عکس سے نظریں چرائی تھیں۔ مزمل اس کے تجزیے اور اس کی سوچوں سے بے خبر پرفیوم ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے کے بعد اب اپنی تیاری کا بہت توجہ سے جائزہ لے رہا تھا۔

"اچھا لگ رہا ہوں نا؟" اس نے بہت شوق سے رابعہ سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت اچھے لگ رہے ہو" اس نے گہری سانس لی۔ "اتنے اچھے لگ رہے ہو کہ پہلی بار مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں کوئی کم عمر خوبصورت دوشیزہ تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔"

دل میں آئے خیال کو اس نے مزمل کے سامنے فوراً ہی ظاہر کر دیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ پھر محبت سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"ایسے خوف مت پالا کرو میری جان! وہاں سب کو ہی پتا ہے کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ لڑکیاں تو میرے قریب بھی نہیں پھٹکتیں۔"

"ویسے ہی نہیں پھٹکتیں جتنے تم ہینڈسم اور خوبصورت ہو۔ لڑکیاں تو تم پر پروانہ وار فدا ہوتی ہوں گی۔"

اس نے منہ بنا کر مزمل کی بات کو جھٹلایا تھا۔

"لڑکیاں عام طور پر ایسے مردوں سے فاصلہ ہی رکھتی ہیں۔ جن کے بارے میں انہیں پتا ہو۔ کہ ان سے شادی ممکن نہیں ہے۔ اور میرے بارے میں سب کو ہی معلوم ہے کہ میری ایک عدد پیاری سی بیوی ہے۔ جس پر میں جان چھڑکتا ہوں۔ اس لیے کوئی لڑکی مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کرتی۔"

"مزمل! تم بدل تو نہیں جاؤ گے۔" بڑے معصومانہ انداز سے اس نے ایک نیا سوال جڑا تھا۔

"نہیں" اس کے بالوں کی الجھی ہوئی لٹوں کو ہاتھ سے سلجھاتے ہوئے مزمل نے بڑے اعتماد سے یک لفظی جواب دیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا۔" اگلا سوال فوراً آیا تھا۔ جو سراسر احمقانہ تھا۔

"کیونکہ میں بدلوں گا۔ اور اپنے بارے میں مجھے ہی پتا ہو گا نا۔" وہ بغیر اکتائے، بہت محبت سے اس کے بے سرے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

"تم نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے۔ میں کیسے تمہاری جگہ کسی اور کو دے سکتا ہوں۔ میری تو ہر سوچ تم سے شروع ہو کر تم ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ تم میری زندگی ہو یار! ایسی باتیں سوچ کر خود کو پریشان نہ کیا کرو۔"

اس کا سر اپنے سینے سے لگائے وہ اس محبت اور نرمی سے کہہ رہا تھا جو محبت اور نرمی شادی کے شروع والے دنوں میں رابعہ کے لیے اس کے انداز میں ہوا کرتی تھی۔ رابعہ اس کے لہجے اور اس کے الفاظ سے مطمئن بھی ہو گئی۔ مگر وہ خیال ابھی بھی اس کے ذہن سے پوری طرح مٹا نہیں تھا۔ جو مزمل کی دلکش پرسنالٹی کو دیکھ کر اسے پریشان کر گیا تھا "میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں مزمل! مگر ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے کبھی بھی اپنے دل میں میرے علاوہ کسی اور کو جگہ دی تو میں تمہیں اپنے دل سے ہمیشہ کے لیے نکال دوں گی۔ کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

مزمل کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے اس نے بہت ضدی انداز سے کہا تھا۔ اس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ ایک پل کے لیے مزمل کا دل بھی لرز گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر سر جھٹکا اور اس کے گرد اپنے دونوں بازو لپیٹ کر سرگوشی کے سے انداز سے بولا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا میری جان! میں تو تمہارے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم ہی تو میری طاقت ہو۔"

اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ رابعہ نے مطمئن ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

✲ ✲ ✲

مزمل کو ایم۔ ایس۔ سی کے فائنل ایگزامز کے فوراً بعد ہی ایک پرائیویٹ کالج میں کافی اچھے پیکج کے ساتھ جاب مل گئی تھی۔ چند ماہ تک اس نے وہ جاب کی اور شادی کے شروع دنوں کی طرح اس کو جتنی بھی تنخواہ ملتی وہ گھر آ کر رابعہ کے ہاتھ میں ہی دیا کرتا تھا۔ بعد میں اپنی ضرورت کے حساب سے وہ وقتاً فوقتاً اس سے رقم لے لیا کرتا تھا۔ رابعہ ان دنوں بہت خوش تھی۔ اس نے اکیڈمی والی جاب چھوڑ دی تھی اور اب کالج سے آنے کے بعد اس کا بیشتر وقت گھر اور بچوں کے کام کرنے میں ہی صرف ہوا کرتا تھا۔

پیپرز کے تین ماہ بعد مزمل کا رزلٹ آیا تھا۔ اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ٹاپ کیا تھا۔ اور رزلٹ کے فوراً بعد ہی اسے ایک گروپ آف انڈسٹریز کے ہیڈ آفس میں بہت اچھی سیلری کے ساتھ آئی ٹی کنسلٹنٹ کی جاب آفر ہو گئی تھی۔ یہاں اس کی سیلری اتنی تھی کہ چند ماہ کی بچت کے بعد انہوں نے ڈاؤن پے منٹ کر کے بینک کے ذریعے کار بھی لے لی تھی۔ اور گھر کے اوپر والے پورشن کی تعمیر کے لیے ابتدائی پلاننگ بھی کر لی تھی۔ اگلے چھ ماہ بہت سکون اور خوشگوار گزرے۔ مگر پھر اچانک ہی مزمل کے سر میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے برطانیہ جانے کا سودا سما گیا۔ G.R.E کی تیاری تو وہ فائنل پیپرز کے بعد سے ہی کر رہا تھا اب H.E.C کی طرف سے اسکالر شپ اناؤنس ہوئے تو اس نے بھی فوراً ہی G.R.E ٹیسٹ دے دیا۔ اور کافی اچھے نمبروں سے پاس بھی کر لیا۔ ساتھ ساتھ اس نے IELTS بھی کر لیا۔ اب وہ ہر طرح سے اس اسکالر شپ کو حاصل کرنے کا حقدار ہو چکا تھا۔ اور اسے یہ اسکالر شپ مل بھی گیا۔ خاندان میں جس نے بھی اس کی اس کامیابی کا سنا اش اش کر

اٹھا۔

ہر طرف اس کی ہی تعریفیں ہو رہی تھیں وہ خود بھی بے حد مسرور اور خوش تھا۔ بس ایک رابعہ تھی جو اپنے احساسات کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ایک طرف اسے مزمل کی کامیابی کی خوشی تھی۔ تو دوسری اس خیال نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں کہ وہ اتنے سال تک مزمل سے دور کیسے رہے گی۔ وہ تو دو دن کے لیے کہیں چلا جاتا تھا تو وہ بولائی بولائی سی پھرا کرتی تھی۔ اتنے عرصے کے لیے اسے خود سے دور کرنے کا وہ خود میں حوصلہ نہیں پاتی تھی۔ مگر دوسری طرف وہ مزمل کو یہ چانس چھوڑنے کے لیے مجبور بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ ایسے مواقع روز روز نہیں مل سکتے تھے۔ اور وہ مزمل کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی۔ ان دنوں وہ چھپ چھپ کر رویا کرتی تھی۔ کھانا پینا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ اور اپنی ذات سے اس کی لاپروائی پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ ان دنوں اسے اپنا زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت تھی وہ تیسری بار ماں بننے جا رہی تھی۔ اور اس بار ڈاکٹر نے اسے اچھی خوراک اور آرام کی زیادہ تلقین کی تھی۔ مگر وہ چاہ کر بھی خود کو کچھ کھانے پینے پر رضامند نہیں کر پا رہی تھی۔ مزمل بھی ان دنوں بہت مصروف تھا۔ اس نے جاب سے چھٹی لے رکھی تھی۔ اور اپنے ویزے اور ایڈمشن کے سلسلے میں اس کے آئے دن اسلام آباد کے چکر لگا کرتے تھے۔ کبھی گھر پر ہوتا بھی تو اس کا زیادہ وقت نیٹ پر ہی گزرتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ رابعہ کی حالت سے بے خبر نہیں تھا اور تقریباً روز ہی اسے سمجھانے اور حوصلہ دینے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

"رابی! جان یہ تو دیکھو کہ اگر میں باہر سے پی ایچ ڈی کر آیا تو ہمارے حالات کتنے اچھے ہو جائیں گے۔ ہم اپنے بچوں کو بہتر زندگی دے سکیں گے۔ اچھا سا گھر بنا سکیں گے اور زندگی کی ساری سہولیات سے فیضیاب ہو سکیں گے۔"

وہ اسے پیار سے سمجھاتا اور تب رابعہ سمجھ بھی جاتی۔ اور اپنی فیملی کے اچھے مستقبل کے لیے مزمل کی چند سال کی جدائی قبول کرنے کو راضی بھی ہو جاتی مگر کچھ ہی دیر کے بعد اس کے دل سے پھر ہوک سی اٹھتی اندر باہر سناٹا سا پھیل جاتا اور وہ ایک بار پھر اپنا ضبط کھو دیتی۔ اس کا مستقل یہی حال تھا حتیٰ کہ مزمل کے جانے کا دن آ پہنچا۔

جس صبح اس نے اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا۔ اس سے پچھلی رات اس کا سارا وقت رابعہ کو سمجھانے اور اسے تسلیاں دیتے ہی گزرا تھا۔ وہ کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی مسلسل روتی رہی تھی۔ اور مزمل اسے محبت اور نرمی سے سمجھاتا رہا تھا۔ رابعہ کے اتنے شدید اور مستقل رد عمل کے باوجود اس کے لہجے میں ایک بار پھر اس کے لیے سختی نہیں آئی تھی۔ وہ اس کے دل سے بہت قریب تھی اور مزمل اس کی کیفیت کو بہت اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ خود اس کا دل بھی اندر سے بہت اداس تھا مگر رابعہ کی حالت کے پیش نظر وہ اپنی اداسی اس پر ظاہر نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی اور مزمل کو پتا تھا کہ اگر اسے اس کی اندرونی کیفیت اور روح تک اتری اداسی کا پتا چل گیا تو وہ بالکل ہی ڈھے جائے گی۔ اس لیے وہ خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ اور اس پر یہی ظاہر کر رہا تھا۔ کہ وہ باہر جانے پر بہت خوش ہے۔

"یار! وہاں اتنی آزادی ہو گی رنگین نظارے ہوں گے۔ مجھے تو پاکستان کا خیال بھی نہیں آئے گا۔"

رابعہ کے پوچھنے پر وہ ہر بار ایسی ہی باتیں کرتا رہا تھا۔ مگر اگلی صبح روانہ ہونے سے پہلے جب رابعہ اس کے سینے سے آخری بار لگی تو اس کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

"میں تمہیں بہت مس کروں گا رابی! اتنا زیادہ کہ پتا نہیں میں تمہارے بغیر زندہ کیسے رہوں گا۔"

اس کا گلا رندھ گیا تھا اور شفاف آنکھوں سے ٹپکنے والے دو آنسو رابعہ کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے رابعہ کی پیشانی چومی اور تیزی سے پلٹ کر باہر چلا گیا۔ جہاں لاؤنج میں رابعہ کے سارے گھر والے اور ان کے دونوں بچے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر وہ رابعہ کے آگے چند لمحے بھی مزید رکا رہا تو شاید رابعہ ہی کی طرح رونا شروع کر دے گا۔

رابعہ اس کے باہر جانے کے بعد کئی لمحوں تک گم سم سی کھڑی اپنی پیشانی پر اس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتی رہی۔ پھر اس نے دوپٹے سے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ صاف کیا۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔ مزمل کے کہے ہوئے لفظوں نے اس پر جادو کا سا اثر کیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے تھے۔ اب اسے اپنے محبوب شوہر کی اداسی کا خیال تھا۔ اور وہ اسے مسکرا کر الوداع کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

مزمل کے باہر چلے جانے کے بعد گھر کا سارا بوجھ ایک بار پھر رابعہ کے کندھوں پر آ گیا تھا۔ پچھلے کچھ مہینوں سے انہوں نے اوپر کا پورشن بنوانے کے لیے جتنی بھی بچت کی تھی۔ وہ مزمل کی جانے کی تیاریوں کی نذر ہو چکی تھی۔ گاڑی کی ابھی ڈھائی سال کی قسطیں باقی تھیں۔ کئی بار تو رابعہ کے جی میں آیا کہ وہ گاڑی بیچ دے۔ مگر پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ وہ اکیلی جان اور بچوں کا ساتھ ہے۔ گاڑی کی ضرورت تو قدم قدم پر پڑتا تھی۔ اس لیے اس نے یہی سوچا کہ جو سہولت ملی ہوئی ہے اسے برقرار ہی رہنے دے۔

اس کی ڈلیوری میں ابھی چار ماہ باقی تھے۔ اس لیے راشدہ بیگم کچھ عرصے کے لیے اس کے ساتھ ہی شفٹ ہو گئی تھیں۔ ان دنوں اس کی طبیعت بھی اچھی نہیں تھی۔ مزمل کی جدائی نے اس پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کی وہ ایسی حالت میں پہلے بھی چور ہی ہوا کرتی تھی۔ مگر پچھلے دونوں بار مزمل اس کے پاس تھا۔ اور وہ اس کی خوراک اور آرام کا بہت دھیان رکھتا تھا۔ مگر اب وہ اس سے ہزاروں میل دور چلا گیا تھا اور یہ احساس ہی اسے مارے ڈالتا تھا۔ راشدہ بیگم کے ہزار کوشش کرنے کے باوجود وہ اتنی خوراک نہیں لے رہی تھی جتنی اس کے لیے ضروری تھی۔ مزمل ہر ہفتے اسے فون کرتا تھا مگر وہ فون پر بھی سوائے رونے کے کچھ نہیں کرتی تھی۔ اس کا یوں رونا مزمل کو بے چین کر دیا کرتا تھا۔ وہ خود ابھی تک نئے ماحول اور اتنی مشکل پڑھائی کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں رابعہ کا یوں رونا اس کی پریشانیوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا کرتا تھا۔

"رابی پلیز خود کو سنبھالو۔ اگر تم ایسا کرو گی تو میں کیسے اتنا عرصہ یہاں رہ پاؤں گا۔ میرا بھی تو سوچو یار! میں یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ تمہارے پاس تو پھر میرے علاوہ باقی سب ہیں۔"

وہ بے چارگی سے کہتا تو رابعہ ہونٹ کاٹ کر رہ جاتی۔ مزمل کی باتیں بالکل ٹھیک تھیں مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جسے صرف مزمل کا ہی خیال رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں مزمل کے سوا کسی کو دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ اس کے ذہن میں سوتے جاگتے بس مزمل کا ہی خیال رہتا تھا۔ اسے اس کی پریشانیوں کا بھی احساس تھا۔ اور وہ ہر بار اس سے خوش رہنے کا وعدہ بھی کر لیتی تھی۔ مگر اس کے ایسے تمام وعدے ریت کی دیوار ہی ثابت ہوتے تھے۔

مزمل کے جانے کے چار ماہ بعد اس کی بیٹی پیدا ہوئی جو ہو بہو مزمل جیسی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی تو اسے مزمل اور بھی شدت سے یاد آتا مگر ڈلیوری کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس کا رونا اور اداس ہونا کافی کم ہو گیا تھا۔ راشدہ بیگم ابھی تک اس کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔ اور ان کے ہر وقت پاس ہونے سے بھی اس کے دل کو کافی ڈھارس رہتی تھی۔

مزمل بھی اب کافی سیٹ ہو گیا تھا۔ اور اس نے پڑھائی کے ساتھ پارٹ ٹائم کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کی پڑھائی اور رہائش کا خرچ H.E.C کی طرف سے ملتا تھا۔ مگر اوپر کے کئی اخراجات ایسے تھے جن کے لیے اس کے پاس رقم کا ہونا ضروری تھا۔ پارٹ ٹائم کام کرنے کی وجہ سے اس کا اضافی اخراجات

کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ مگر اب اس کے پاس وقت کی کافی کمی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پاکستان کیے جانے والی اس کی فون کالز میں بھی وقفہ بڑھ گیا تھا۔ مگر رابعہ اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اس لیے اس نے اس وقفے کو بھی قبول کرلیا تھا۔ گھر کے بڑھتے ہوئے اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے زونیہ کی پیدائش کے چار ماہ بعد پھر سے اکیڈمی میں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ کیونکہ عبدالہادی کے ساتھ ساتھ اب عبدالواحد بھی اسکول جانے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

مزمل کی دوسرے سمسٹر کے ختم ہونے پر ایک ماہ کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ اور رابعہ نے چھٹیوں کا سنتے ہی اس سے اصرار شروع کردیا تھا کہ وہ یہ دن پاکستان میں ان کے ساتھ گزارے۔ مزمل کا اپنا بھی یہی دل چاہ رہا تھا مگر اسے یہ ڈر تھا کہ رابعہ جو پچھلا پورا سال لگا کر سنبھلی ہے۔ اس کے ایک ماہ پاکستان میں گزار کر جانے کے بعد پھر سے پہلے کی طرح ڈپریس نہ ہو جائے اس لیے وہ بہانے بہانے سے اسے ٹال رہا تھا۔

"یار! میں سوچ رہا تھا۔ اس ایک ماہ میں یہاں کچھ زیادہ کام کرلوں اور تمہارے اور بچوں کے لیے اس رقم سے کچھ تحائف خرید لوں پچھلے ایک سال سے میں یہاں ہوں اور تم لوگوں کے لیے کچھ بھی نہیں بھیج سکا۔"

اس نے اپنی طرف سے بہت سوچ کر بہانہ بنایا تھا۔ جسے رابعہ نے فوراً" ہی ریجیکٹ کردیا۔

"ہمارے لیے کچھ بھی خریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ بس تم آجاؤ۔"

"تمہیں پتا ہے آنے جانے کے ٹکٹ پر کتنی رقم خرچ ہو جائے گی۔ میرے پاس تو اتنے روپے ابھی نہیں ہیں۔"

رابعہ کے کہنے پر وہ بھی تھوڑا سا کمزور پڑا تو اسے رقم کی فکر ہوئی۔

"جتنے روپے کم ہیں مجھے بتادو میں بھجوادیتی ہوں مگر تم آجاؤ۔ تم کتنے سنگ دل ہو مزمل! تمہیں ہماری یاد نہیں آتی اور بے چاری زونیہ کو تو تم نے ابھی تک دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"پھر تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہو گا کہ تم میرے وہاں ہوتے یا واپس آنے کے بعد روؤ گی نہیں۔"

بیٹی کے ذکر پر اس نے بالکل ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مگر رابعہ کے دل دکھاتے آنسو اسے پھر بھی یاد رہے تھے۔

"کوشش کروں گی۔" رابعہ نے جزوی سا وعدہ کیا تھا۔

"نہیں رہنے دو پھر میں نہیں آتا میں تمہاری کوشش سے اچھی طرح واقف ہوں۔ پورے چھ ماہ یہاں آنے کے بعد میں تمہارے رونے سے پریشان رہا ہوں، تب بھی تم فون کال پر کوشش کرنے کا کہتی تھیں۔ مجھ سے نہ رونے کا پکا وعدہ کرو گی تو میں آؤں گا ورنہ نہیں۔" مزمل نے قطعیت سے کہا تھا۔

"اچھا بابا! پکا وعدہ ہے نہیں روؤں گی۔"

مزمل کو سامنے دیکھنے کا تصور اتنا خوش کن تھا کہ اس نے فوراً" وعدہ کرلیا۔ اور اس کے وعدے پر یقین کر کے مزمل چھٹیاں ہوتے ہی پاکستان آگیا۔ وہ رابعہ کے منع کرنے کے باوجود اس کے اور بچوں کے لیے تحائف خرید کر لایا تھا۔ مگر رابعہ کو کوئی بھی چیز وہ خوشی نہیں دے سکتی تھی جو مزمل کی موجودگی نے دی تھی۔ وہ پورا مہینہ جیسے تتلی بن کر ہواؤں میں اڑتی رہی تھی۔ مزمل کی پسند کے کھانے بنانا۔ اس کے لیے ہمہ وقت سجے سنورے رہنا اس کے ساتھ گھومنے پھرنے جانا وہ دن رات خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے مزمل کے واپس جانے کا خیال پریشان بھی کردیتا تھا۔ مگر وہ اپنی اداسی اس پر ظاہر نہیں کرتی تھی۔ اور اگر کبھی مزمل کو اندازا ہو جاتا کہ وہ اداس ہو رہی ہے تو وہ جھٹ اسے اس کا وعدہ یاد دلادیتا اور رابعہ کے لیے مسکرانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔

پلک جھپکنے میں ایک مہینہ گزر گیا اور مزمل واپس

بھی چلا گیا۔ اس بار اس کے جانے کے بعد رابعہ نے بہت جلدی خود کو سنبھال لیا تھا۔ مزمل کے ساتھ ایک ماہ گزار کر وہ خود کو بہت تروتازہ اور فریش بھی محسوس کر رہی تھی اس لیے اس کے جانے کے بعد وہ زیادہ تندہی سے اپنی ذمہ داریاں نبھانے لگی تھی۔ کالج اور اکیڈمی کی جاب بچوں کو خود پڑھانا گھر کے کام کاج کرتا وہ سارا دن مصروف رہتی۔

مزید ایک سال گزرا۔ تو مزمل پھر سے ایک ماہ کے لیے پاکستان آگیا اور اس کا یہ آنا آخری بار آنا ثابت ہوا تھا۔ اب وہ ریسرچ ورک میں اتنا مصروف ہو گیا تھا کہ اس کے لیے پاکستان آنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اب اس کو پارٹ ٹائم جاب بھی پہلے سے اچھی مل گئی تھی۔ اور وہ کچھ رقم پاکستان بھی بھیجنے لگا تھا۔ اس کی بھیجی ہوئی رقم اتنی ہوتی تھی کہ اب رابعہ کو اکیڈمی نہیں جانا پڑتا تھا۔ راشدہ بیگم اب بھی زیادہ تر اس کے پاس رہتی تھیں۔ اگرچہ ان کی بہوئیں اچھی تھیں۔ اور وہ اپنے گھر میں بہت سکون سے رہ سکتی تھیں۔ مگر رابعہ کی مشکلات اور اس کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے وہ زیادہ تر اس کے پاس رہنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ ان کی اس موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رابعہ نے اکیڈمی کی ملازمت چھوڑنے کے بعد شام کی کلاسز میں ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا۔ اسے شروع سے ہی پڑھنے کا شوق تھا۔ اور اگر اس کے حالات سازگار ہوتے تو شاید وہ اب تک پی ایچ ڈی کرچکی ہوتی۔ اس لیے اب موقع ملتے ہی اس نے اعلا تعلیم حاصل کرنے کا اپنا خواب پورا کرنے کی ٹھان لی تھی۔

جب تک مزمل پی ایچ ڈی مکمل کر کے واپس آیا تب تک اس کا ایم فل ہو چکا تھا اور اب وہ پی ایچ ڈی کرنے کا سوچ رہی تھی مزمل پاکستان آنے کے بعد کچھ ہفتے گھر پر ہی رہا پھر اس نے اسلام آباد میں جاب شروع کردی۔ اب وہ ویک اینڈ پر فیصل آباد آنے لگا تھا۔ اس کی جاب کافی اچھی تھی مگر اتنی اچھی نہیں تھی جتنی وہ چاہتا تھا۔ یا جتنی اچھی جاب کا وہ اتنی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد حق دار ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ اپنی جاب سے زیادہ خوش نہیں تھا۔ اور مزید اچھی جاب کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کی یہ کوشش یوں بار آور ہوئی کہ اپنے ایک یونیورسٹی فیلو کے توسط سے اسے امریکا کے ایک بہت اچھے سافٹ ویر ہاؤس سے جاب کی آفر آگئی۔

جاب اتنی اچھی تھی کہ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا پھر ابھی تک اسے پاکستان میں اس کی قابلیت کے مطابق جاب ملی بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ایچ ای سی سے پرمیشن حاصل کرنے کے لیے درخواست جمع کروادی اور HEC کی طرف سے اسے باہر جاکر جاب کرنے کی مشروط اجازت مل گئی کہ اگر کبھی بھی پاکستان کی طرف سے اس کی قابلیت کے مطابق جاب آفر کر کے اسے واپس بلایا گیا تو وہ واپس آنے اور کم از کم پانچ سال تک اپنے ملک میں جاب کرنے کا پابند ہو گا۔ مزمل کا اپنا ارادہ بھی مستقل امریکہ میں رہنے کا نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بخوشی یہ شرط مان لی۔

☼ ☼ ☼

"مزمل! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم ایسا کیسے کرسکتے ہو۔ مجھے اور بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم ہمیں چھوڑ کر پھر ملک سے باہر جانا چاہتے ہو؟"

رابعہ مزمل کے منہ سے امریکہ جانے کا سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی تھی۔ اس نے تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مزمل ایسا بھی سوچ سکتا ہے۔ وہ تو اس کے اسلام آباد جانے پر بھی دل سے راضی نہیں تھی اور ہفتے کے وہ پانچ دن جو مزمل اسلام آباد رہتا تھا۔ گن گن کر گزارا کرتی تھی۔ کجا یہ کہ اب وہ ملک سے ہی باہر جانے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

"رانی! مجھے تمہارا اور بچوں کا احساس ہے۔ اس لیے میں امریکہ جانا چاہتا ہوں۔ یہاں رہ کر میں دس سالوں میں جتنا کماؤں گا۔ اس سے دس گنا میں امریکہ میں رہ کر دو سالوں میں کما سکتا ہوں۔ مجھے ایک موقع مل رہا ہے۔ میں کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ جبکہ مجھے

HEC سے بھی اجازت مل چکی ہے۔" اس نے بہت رسان سے رابعہ کو سمجھایا تھا۔

"لیکن مزمل! ہمیں بہت زیادہ روپوں کا کیا کرنا ہے۔ تمہاری اچھی خاصی جاب ہے۔ میری سیلری ہے۔ ہمارا بہت اچھا گزارا ہو سکتا ہے۔ پھر ہم یہ بن باس کیوں کاٹیں۔"

وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ آخر کیا کہہ کر مزمل کو جانے سے روکے۔ ایسا کون سا اسم اعظم اس پر پڑھ کر پھونکے کہ وہ اس سے دور جانے کا خیال ہی بھول جائے۔

"اچھی خاصی جاب۔" وہ استہزائیہ انداز سے ہنسا۔ "رابی ڈارلنگ تمہیں کیا پتا" اچھی خاصی جاب کس کو کہتے ہیں۔ میں نے اتنی محنت اس لیے نہیں کی تھی کہ ساری زندگی حساب کتاب اور جوڑ توڑ میں ہی لگا رہوں۔ مجھے اپنی محنت کا صلہ چاہیے۔ میں بھی اب باقی کی زندگی چین اور سکون سے گزارنا چاہتا ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بچوں کے لیے مہنگی سے مہنگی برانڈڈ چیزیں خریدوں۔ انہیں بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم دلواؤں۔ تمہارے لیے وہ سب کچھ خریدوں جو خریدنے کی حسرت میں اب تک دل میں لیے پھرتا ہوں۔ شاپنگ کرنے جاؤں تو اپنی جیب کو ہی نہ دیکھتا رہوں۔ اپنی خواہشوں کو بھی مد نظر رکھوں۔ اپنی فیملی کو وہ ساری آسائشیں دوں جو ان کا حق ہے۔"

"ہمیں کچھ نہیں چاہیے مزمل! پلیز ہمیں صرف تمہاری ضرورت ہے۔ ہم تمہارے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

وہ رو دی تھی اور شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ مزمل اس کے رونے پر تڑپا نہیں تھا۔ بلکہ بے تاثر چہرہ لیے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"یہ سب جذباتی باتیں ہیں رابی! اور زندگی صرف جذبات سے نہیں گزرتی۔ تم لوگوں کو کیا چاہیے اور کیا نہیں چاہیے۔ یہ مجھے تم سے زیادہ اچھی طرح سے پتا ہے۔ اس لیے پلیز مجھے بلیک میل کر کے روکنے کی کوشش نہ کرو اور ویسے بھی میں کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ دو سال یا زیادہ سے زیادہ تین سال۔ اس کے بعد میں واپس یہاں ہی آؤں گا۔ آخر پہلے بھی تو میں اتنا عرصہ ملک سے باہر رہا ہی ہوں۔ جیسے وہ وقت گزر گیا۔ ویسے ہی یہ وقت بھی گزر جائے گا۔" وہ قطعیت سے کہتا ہوا اس کے سامنے سے اٹھا اور اندر بیڈ روم میں چلا گیا۔ رابعہ اپنے منجمد ہوتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسے پہلی بار مزمل کی شخصیت میں کسی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اسے پہلی بار لگا تھا کہ مزمل نے جو چار سال اس سے دور ہو کر گزارے ہیں۔ ان چار سالوں نے ان دونوں کے درمیان کسی نادیدہ دیوار کی بنیاد اٹھا دی ہے۔

اس بار مزمل کے جانے پر اس نے پہلے کی طرح رونا دھونا تو نہیں مچایا تھا۔ مگر ایک عجیب سی چپ اور بے حسی اس پر طاری ہو گئی تھی۔ جو کسی طرح بھی ٹوٹنے میں نہیں آرہی تھی۔ اس نے پی ایچ ڈی میں ایڈمشن لے لیا تھا۔ فی الحال اس کا کورس ورک چل رہا تھا۔ اس لیے اسے کالج سے آنے کے بعد روز ہی یونیورسٹی جانا پڑتا تھا۔ مزمل اسے کئی بار جاب چھوڑنے کا کہہ چکا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اب رابعہ کو جاب کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ ہر ماہ امریکہ سے اچھی خاصی رقم بھجوانے لگا تھا۔ مگر رابعہ اس کی یہ بات سنی ان سنی کر جاتی۔ اتنے سال تک کالج میں پڑھاتے پڑھاتے اسے اپنی جاب سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کا دل یہ جاب چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ گھر کے کاموں کے لیے البتہ اس نے ملازمہ رکھ لی تھی۔

بچے اب تینوں ہی اسکول جاتے تھے۔ ان کے لیے بھی ٹیوٹر رکھ دیا تھا۔ کبھی کبھار وہ خود بھی ان کا ہوم ورک چیک کر لیتی تھی۔ البتہ ان کے اسکول وہ مہینے میں دو بار ضرور جاتی تھی۔ اسے اپنے تینوں بچوں کے اچھے گریڈز اور اچھی شخصیت کی بہت فکر رہتی تھی۔ مزمل سے اب اس کی بات روزانہ بھی بہت آسانی سے ہو سکتی تھی۔ مگر اب وہ خود ہی اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ ان کے بیچ ایک عجیب سی سرد مہری حائل ہوتی تھی۔ جسے نہ وہ سمجھ پا رہی تھی اور نہ ہی مزمل۔ وہ دونوں فون پر بات کرتے بھی تو زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھی۔

بعض اوقات رابعہ پچھلے دور کو سوچتی مزمل کی محبت کو یاد کرتی تو اس کے دل سے ہوک سی اٹھتی اور اس کا دل چاہتا کہ ان کی زندگی کا وہی پرانا دور واپس آجائے جو خواہ کتنا ہی مشکل تھا۔ مگر اس دور میں محبت اور اپنائیت کا احساس تھا۔ اب روپے پیسے کی تنگی دور ہو چکی تھی۔ مگر دلوں کے درمیان ان دیکھے فاصلے حائل ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وہ خود کو امید دلاتی کہ ایک بار مزمل مستقل پاکستان لوٹ آیا اور وہ پھر سے ایک ساتھ رہنے لگے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اس کی یہ امید بھی اس وقت ٹوٹ گئی جب دو سال بعد مزمل نے مستقل امریکہ میں رہنے کا اپنا فیصلہ سنایا۔

اس نے جو پچاس لاکھ کا ضمانتی حلف نامہ HEC کے پاس جمع کروایا ہوا تھا کہ اگر پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اس نے پانچ سال تک اپنے ملک میں ملازمت نہ کی تو وہ یہ رقم H.E.C کو ادا کرے گا۔ اس نے اس رقم کی ادائیگی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ امریکہ میں اسے پہلے سے زیادہ اچھی جاب اور مراعات مل چکی تھیں اور اب وہ چاہتا تھا کہ رابعہ اور بچے بھی اس کے پاس امریکہ آجائیں۔

رابعہ نے اس کے منہ سے یہ باتیں سنیں تو اس کی سانس کچھ پل کے لیے ساکت سی ہو گئیں۔ کیونکہ ان ہی دنوں راشدہ بیگم کو فالج کا اٹیک ہوا تھا اور ان کے جسم کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا تھا۔ اگرچہ علاج سے بہتری تو آنے لگی تھی۔ مگر ابھی ان کو ٹھیک ہونے میں کافی عرصہ لگ جاتا تھا۔ وہ رابعہ کے پاس ہی رہ رہی تھیں اور رابعہ ان کو چھوڑ کر ملک سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی بھابھیاں لاکھ اچھی سہی مگر اتنی اچھی بہرحال نہیں تھیں کہ وقتی طور پر معذور ہو جانے والی ساس کو سنبھال سکیں۔

"مزمل! میں کیسے آسکتی ہوں۔ میری پی ایچ ڈی کی ریسرچ شروع ہو رہی ہے۔ میری جاب ہے اور سب سے بڑھ کر امی ہیں۔ اگر میں آگئی تو ان کا خیال کون رکھے گا۔"

اسکائپ پر مزمل سے بات کرتے ہوئے اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔ ان دنوں راشدہ بیگم کی وجہ سے وہ ویسے ہی بہت پریشان تھی۔ حالانکہ ڈاکٹرز نے یقین دلایا تھا کہ مستقل علاج اور اچھی دیکھ بھال سے وہ پھر پہلے کی طرح چل پھر سکیں گی۔ مگر رابعہ کا دل پھر بھی ڈرا ہوا تھا۔ وہ تو یہ امید لگائے بیٹھی تھی کہ مزمل اب پاکستان آجائے گا اور ان سب کو سنبھال لے گا۔ مگر مزمل نے ایک ہی فقرے میں اس کی ساری امیدوں کو چکنا چور کر ڈالا تھا۔

"جاب کرنے کی تمہیں اب ضرورت نہیں ہے اور پی ایچ ڈی کا ریسرچ ورک تم یہاں آکر زیادہ اچھے طریقے سے کر سکتی ہو اور رہی امی کی بات تو وہ وہاں اکیلی تو نہیں ہیں۔ ان کے بیٹے، بہوئیں، پوتے، پوتیاں سب ان کے پاس ہیں اور وہ ان کی بہت اچھی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔"

اس کے سارے اعتراضات کے سلسلہ وار جواب دیتے ہوئے اس نے راشدہ بیگم کی اپنی فیملی کے لیے دی ہوئی قربانیوں کو یکسر بھلا دیا تھا۔ رابعہ کا دل اس کے اس انداز پر دکھ سا گیا۔ اسے لگا کہ جیسے جس مزمل کو وہ جانتی تھی وہ کوئی اور تھا اور اس وقت کمپیوٹر کی اسکرین پر جس مزمل کا جذبات سے عاری چہرہ وہ دیکھ رہی ہے وہ کوئی دوسرا آدمی ہے۔ اس نے اپنے دل میں ناگواری کی لہر کو اٹھتے ہوئے محسوس کیا اور بڑی مشکل سے چہرے کے تاثرات کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے۔ مگر میں امی کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں آسکتی مزمل! انہوں نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اب میری باری ہے کہ میں ان کی ضرورت کے وقت ان کی خدمت کروں۔ ویسے بھی ان کا جیسا خیال میں رکھ سکتی ہوں کوئی دوسرا نہیں رکھ سکتا۔"

"یار! میں اپنے بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی تعلیم اور ان کے مستقبل کی فکر ہے۔ اب

اپنی اولاد کو ساتھ رکھنے کے لیے میں تمہاری ماں کے ٹھیک ہونے کا انتظار تو نہیں کر سکتا۔ تم ایسا کرو انہیں بھی ساتھ لے آؤ۔"

مزمل بری طرح سے زچ ہوا تھا۔ اس لیے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بگڑ گئے تھے۔ اس لمحے رابعہ کو اس کا خوب صورت چہرہ بہت عجیب لگا تھا اور اسے اس بات سے بھی دکھ پہنچا تھا کہ مزمل کو صرف اپنے بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کی فکر ہے۔ اس نے ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ اسے رابعہ کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس بار وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت خشک اور روکھا تھا۔

"امی ابھی بھی میرے ساتھ امریکہ آنے کے لیے راضی نہیں ہوں گی اور میں انہیں اکیلے چھوڑ کر نہیں آسکتی اور نہ ہی میرے بچے ایسا کر سکتے ہیں۔ تم سے اور مجھ سے زیادہ امی نے ان کا خیال رکھا ہے۔ بہت اٹیچڈ ہیں وہ تینوں اپنی نانی سے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم خود ہی پاکستان آجاؤ۔ ویسے بھی تم دو سال کا ہی کہہ کر گئے تھے۔"

"میں تمہارے یا کسی اور کے آگے جواب دہ نہیں ہوں کہ دو سال کا کہہ کر گیا تھا تو دو سال بعد واپس بھی آجاؤں۔ مجھے اپنے لیے جو بہتر لگے گا میں وہی کروں گا۔ تم بس صاف لفظوں میں یہ بتاؤ کہ تم امریکہ آرہی ہو یا نہیں۔"

مزمل کو اس کی باتوں نے زیادہ ہی غصہ دلا دیا تھا اور یہ غصہ اس کے چہرے اور اس کے لب و لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

"نہیں اور دوبارہ مجھے ایسا کہنا بھی نہیں۔" رابعہ کو بھی غصہ آگیا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔ مرتی رہو وہاں اکیلی، میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ تمہاری یہ روکھی، بے رونق شکل دیکھنے کے لیے۔"

غصے کی شدت میں وہ ہمیشہ کی طرح بے سوچے سمجھے بولا تھا اور غالباً" اس نے اپنا کمپیوٹر ہی بند کر دیا تھا۔ رابعہ بے حس و حرکت بیٹھی کمپیوٹر کی خالی اسکرین کو دیکھے گئی۔ اس کے کانوں میں مزمل کے کہے ہوئے الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترے تھے اس کا پورا وجود سن ہو گیا تھا اور آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی۔ اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے والا اس کی ایک ایک ادا پر نثار ہونے والا اسے اپنی زندگی کا مقصد کہنے والا مزمل اتنا بے حس ہو گیا تھا کہ اسے اس کے منہ پر بے رونق اور روکھی شکل والی کہہ گیا تھا۔ اس کا دل جیسے سیال بن کر آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔

یہ وہ شخص تھا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کے قیمتی سنہری سال محنت و مشقت کی چکی میں پستے ہوئے گزار دیے تھے۔ صرف یہ سوچ کر کہ وہ اپنا کیریئر بنا لے ترقی کر لے۔ وہ ٹیبل کا سہارا لے کر اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینہ اس کی وہی صورت دکھا رہا تھا جو مزمل کے لبوں نے دکھائی تھی اور آئینہ تو پچھلے کئی سالوں سے اسے یہ ہی بتاتا آرہا تھا کہ اس کا رنگ روپ کھو رہا ہے۔ مگر آج سے پہلے اس نے خود کو اپنی نظر سے دیکھا ہی کب تھا۔ وہ تو خود کو مزمل کی اس محبت کی آنکھوں سے دیکھتی آئی تھی۔ جو اس کے رنگ روپ کو ہمیشہ سنہری حصار میں لپٹا کر دکھاتی رہی تھی۔

آج اس محبت کا سنہری حصار جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ خود کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ بے رونق زرد چہرہ الجھے ہوئے بال اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود کو دیکھا۔ مگر اس کا عکس جوں کا توں رہا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر دفعتاً" اس نے آئینے کے دوسرے کونے سے ایک صورت ابھرتے دیکھی۔ ریشم کے لچھوں جیسے گھنے سیاہ چمک دار بال شانوں پر بکھرائے غلافی آنکھوں میں ساری دنیا کی چمک سمیٹے بے حد صاف چمکتی ہوئی جلد والا خوب صورت چہرہ نازک سا بے حد متناسب سراپا۔ اطمینان، سکون اور بے فکری کی دولت سے مالا مال وجود اس کا اپنا گیارہ سال پہلے کا وجود۔ گیارہ سال کی محنت نے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی خالی خالی آنکھوں سے اپنا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے کئی مہینوں تک اس کا اور مزمل کا رابطہ منقطع رہا۔ رابعہ اس کی کہی ہوئی باتوں کی وجہ سے صدمے کے زیر اثر تھی اور اس کا مزمل یا کسی سے بات کرنا تو درکنار سانس تک لینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ خاموش گم صم وہ کسی مشین کی طرح اپنے کام نمٹائے جاتی، پھر سر شام ہی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی۔ گھر بچوں حتیٰ کہ زندگی سے بھی اس کی دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی۔ راشدہ بیگم کا وہ خیال پورا رکھ رہی تھی۔ مگر کسی ایسی مشین کی طرح جس کے اپنے کوئی جذبات اور احساسات نہیں ہوتے۔ راشدہ بیگم کو اس کے اور مزمل کے جھگڑے کا سرسری سا پتا تھا۔ مگر معاملہ اتنا سنجیدہ نوعیت کا ہو گا۔ اس کی انہیں خبر نہیں تھی۔ مزمل اب شاذ و نادر ہی کبھی فون کرتا تھا اور کرتا بھی تو صرف بچوں سے بات کیا کرتا تھا۔ نہ اس نے کبھی رابی کا پوچھا، نہ کبھی رابی نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اس کے ڈرافٹ اب بھی باقاعدگی سے آیا کرتے تھے جنہیں رابعہ خاموشی سے بینک میں جمع کروا دیتی تھی۔ خود اس نے پی ایچ ڈی کا کورس ورک ہی مکمل کیا تھا۔ ابھی ریسرچ کرنا تھی جو اصل مرحلہ تھا۔ مگر اس کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔

راشدہ بیگم اکثر ہی اس سے اس کی اور مزمل کی ناراضی کا سبب پوچھتی تھیں۔ مگر وہ ہر بار ان کی بات ٹال جاتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنی ماں کو کیا بتائے کہ مزمل نے اس کا اپنی محبت پر سے مان توڑ دیا ہے یا یہ کہ اس نے رابعہ کی قربانیوں کو اس کی وفا کو یکسر بھلا دیا ہے۔ یا یہ کہ گیارہ سال تک اپنے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کروانے کے بعد اسے رابعہ کی بیمار ماں کا وجود اب ناگوار گزرنے لگا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی بات ایسی نہیں تھی جسے وہ آسانی سے زبان پر لا سکتی۔ اس لیے اس نے خاموشی کو ہی اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ اپنا خیال تو وہ پہلے بھی کچھ خاص نہیں رکھتی تھی۔ اب تو بالکل ہی خود سے لاپروا ہو گئی تھی۔ بس ایک عجیب سی بے حسی تھی۔ جس نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

آٹھ ماہ کے بعد اس حصار میں اس وقت دراڑ پڑی جب ناصر بھائی کے ایک دوست کے توسط سے پہلے انہیں اور ان سے رابعہ کو یہ خبر ملی کہ مزمل ان دنوں کسی دوسری عورت کے ساتھ گھومتا پھرتا نظر آتا ہے اور ان دونوں کا تعلق دوستی سے، بہت بڑھ کر دکھائی دیتا ہے۔ ناصر بھائی کے دوست نے مزمل اور سنہری بالوں والی اس بے حد خوب صورت عورت زرمین کی تصویریں بھی میل کی تھیں۔ وہ دونوں ایک ساتھ بہت خوش نظر آرہے تھے اور ان تصویروں میں ان دونوں کی ایک دوسرے سے بے تکلفی دیکھ کر کوئی بھی ان کے تعلق کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

رابعہ اس رات اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ حالات کی ہر طرح کی خرابی کے باوجود اس نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مزمل اس کی جگہ کسی اور کو بھی دے سکتا ہے۔ وہ بار بار مزمل اور زرمین کی تصویروں کو دیکھتی اور نئے سرے سے رونے لگتی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح مزمل کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر کھڑی اس خوب صورت عورت کو منظر سے غائب کر دے۔

بہت دیر تک روتے رہنے کے بعد اس رات اس نے آٹھ ماہ کے بعد مزمل کو فون کیا تھا۔ فون پر مزمل کی آواز سن کر اس کے ضبط کا بندھن ایک بار پھر ٹوٹ گیا اور وہ آنسو جو اس کو کال ملانے سے پہلے اس نے بہت مشکل سے روکے تھے۔ ایک بار پھر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

"کیا بات ہے، کیوں فون کیا ہے تم نے؟"

اس کے رونے کی آواز سننے کے باوجود وہ بے حد اجنبی اور روکھے انداز سے بول رہا تھا۔ لیکن آج رابعہ کو اس کے اجنبی انداز پر غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ اس سے دور رہ، رہ کر ہار گئی تھی۔ اسے ہر قیمت پر اپنا مزمل واپس چاہیے تھا۔ اس کی محبت واپس چاہیے تھی۔ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ ساری دنیا کو چھوڑ

سکتی تھی۔ مگر مزمل کو کھو دینا اس کے بس سے باہر تھا۔

"یہ زر... زرمین کون ہے۔ میں نے اس کے ساتھ تمہاری تصویریں دیکھی ہیں۔"

روتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ اس کے انداز میں نہ غصہ تھا۔ نہ شک، بس چھوٹے بچوں کا سا شکایتی انداز تھا۔ شاید اس کے اندر کہیں یہ خواہش پنپ رہی تھی کہ مزمل اس کے منہ سے زرمین کا ذکر سن کر ہنس دے گا اور کہے گا کون زرمین، وہ تو بس ایک دوست ہے، ایک کولیگ ہے۔ تم اس کے بارے میں سوچ کر خود کو کیوں ہلکان کر رہی ہو۔ تمہاری جگہ بھلا کوئی لے سکتا ہے۔

ایک پل میں اس نے ان گنت خوش رنگ خواب دیکھ لیے تھے۔ مگر مزمل بولا تو ان خوابوں کے سارے رنگ تتلی کے پروں پر سجے رنگوں کی طرح ایک لمحے میں اڑ گئے۔

"زرمین اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" مزمل نے اس کی سماعتوں پر بم پھوڑا تھا۔ وہ ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی۔

محبت بھلا ــــ کیسے وہ اس کے علاوہ کسی سے محبت کر سکتا تھا۔ وہ تو اس سے محبت کرتا تھا۔

"مزمل! تم یہ کیا کہہ رہے ہو، تم مجھے تنگ کرنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہو نا۔ دیکھو ایسا مت کرو، میں تمہارے پاس آنے کے لیے تیار ہوں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے خود کو بہت بے چارگی سے کہتے سنا تھا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جہاں ہو، وہیں رہو، میں بہت جلد زرمین سے شادی کر رہا ہوں۔" وہ کتنی بے رحمی سے کہہ رہا تھا۔ رابعہ کی زبان گنگ ہو گئی۔

"میں نے بہت انتظار کیا کہ تم اپنی بے جا ضد چھوڑ دو اور میری بات مان لو۔ مگر تمہیں تو اپنی انا زیادہ پیاری تھی نا۔ تم تو بس یہ چاہتی ہو کہ زندگی کا ہر فیصلہ تمہاری مرضی سے ہو۔ ہر چیز تم طے کرو۔ مگر میں ساری زندگی تمہارے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنا راستہ الگ کر لیا ہے۔"

بہت سکون سے کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ رابعہ حسرت و یاس کی تصویر بنی فون کو دیکھتی رہی۔ اس نے دوبارہ کال ملانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے اور مزمل کے بیچ ایسا کچھ نہیں بچا تھا کہ وہ دوبارہ اسے فون کر سکتی۔

دو ہفتے بعد ناصر بھائی کے دوست نے ہی بتایا تھا کہ مزمل اور زرمین دو دن بعد کورٹ میرج کرنے والے ہیں۔ اس دفعہ اس خبر کو سن کر رابعہ روئی نہیں تھی۔ پچھلے دو ہفتوں میں وہ اتنا رو چکی تھی کہ اسے لگتا تھا کہ اس کے آنسوؤں کا کوٹہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر اسے تکلیف پہنچی تھی۔ ناقابل بیان دکھ بھی ہوا تھا۔ مگر ساتھ ہی غصہ بھی عود کر آیا تھا۔ اس روز اس نے مزمل کو آخری بار فون کیا تھا۔ اس کے حساب سے یہ مزمل کے نکاح سے چند گھنٹے بعد کا وقت تھا اور اس وقت اسے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ اپنے فلیٹ پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کا یہ اندازا درست نکلا تھا۔ مزمل نہ صرف گھر پر تھا، بلکہ اس نے پہلی ہی بیل پر فون ریسیو بھی کر لیا تھا۔

"شادی مبارک ہو۔" اس کی آواز سنتے ہی رابعہ نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تھا۔

"آج تم نے ثابت کر دیا کہ تم ایک خود غرض اور مطلبی انسان تھے۔ جو اپنی غرض پوری کرنے کے بعد پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ کاش میں تمہاری اصلیت سے پہلے واقف ہو جاتی تو اپنی بے غرض محبت کے خزانے یوں تم پر نہ لٹاتی۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جس دن تم نے اپنے دل میں میرے علاوہ اور کسی کو جگہ دی۔ اس دن میں تمہیں اپنے دل سے نکال دوں گی۔ تو سنو آج میں تمہیں اپنے دل اپنی دنیا اور اپنی زندگی سے نکال رہی ہوں۔ میں اب تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ آج سے تم میرے لیے مر گئے اور میں تمہارے لیے۔ آج کے بعد تم نے مجھ سے یا بچوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام بہت برا ہو گا۔"

اپنی بات پوری کر کے اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اس نے مزمل کو ایک ہیلو کے سوا کچھ بھی بولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اب اسے کبھی بھی مزمل کی آواز نہیں سننا تھی۔ اس نے آج اپنے محبوب کو اپنے دل میں مار ڈالا تھا۔

اس روز وہ آخری بار مزمل کے لیے روئی تھی۔ اس کی شادی کے اولین سالوں کی محبت یاد کر کے اس کی تصویروں کو دیکھ کر اور اس لاکٹ کو اپنی آنکھوں سے لگا کر جو مزمل نے رونمائی کے طور پر اسے گلے میں پہنایا تھا اور رابعہ نے خراب سے خراب حالات میں بھی اس لاکٹ کو خود سے جدا نہیں کیا تھا۔ آج اس نے وہ لاکٹ بھی اتار دیا اور چند روز کے بعد ناصر بھائی کے پاکستان آئے ہوئے ایک جاننے والے کے ہاتھ پیک کر کے مزمل کو اس کے امریکہ والے ایڈریس پر بھجوا دیا۔

پندرہ روز کے بعد مزمل کا ڈرافٹ آیا تو اس نے وہ بھی جوں کا توں واپس کر دیا اور صرف وہی ڈرافٹ نہیں، مزمل نے بعد میں جتنی بار بھی رقم بھجوانے کی کوشش کی۔ اس نے ہر بار وہ رقم اسے جوں کی توں واپس بھجوا دی۔ آخر تنگ آ کر اس نے خود ہی پاکستان رقم بھجوانی ترک کر دی۔ فون تو وہ پہلے بھی نہیں کر رہا تھا۔ یوں رابعہ اور اس کے بچوں کی زندگی سے مزمل کا رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو گیا۔

رابعہ کے گرد بنا بے حسی کا حصار پہلے سے کہیں دبیز اور مضبوط ہو چکا تھا۔ مزمل کو اپنی زندگی سے مکمل طور پر نکال دینے اور اسے یکسر بھلا دینے کی کوشش کے باوجود وہ خود کو نارمل نہیں کر پائی تھی۔ ابتدا کے کئی ماہ تو اس نے مکمل خود فراموشی میں گزارے تھے۔ دنیا کی ہر چیز میں اس کی دلچسپی صفر ہو چکی تھی۔ مگر پھر راشدہ بیگم کے احساس دلانے پر اسے اپنے بچوں کی خاطر زندگی کی طرف لوٹنا پڑا۔

مزمل کے امریکہ سے رقم بھجوانے کے بعد سے اس کے بچے جن سہولیات اور لائف اسٹائل کے عادی ہو چکے تھے۔ اس کے لیے ہر ماہ اچھی خاصی رقم درکار ہوتی تھی اور مزمل سے رقم لینا وہ بند کر چکی تھی۔ اس کی تنخواہ بے شک کافی اچھی تھی۔ مگر مزمل کی بھجوائی ہوئی رقم کے آگے تو کچھ بھی نہیں تھی اور وہ اپنے بچوں کو ایک دم سے ان کا لائف اسٹائل تبدیل کرنے کا نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لیے زندگی جینے کی ہمت بہت کم ہو جانے کے باوجود اسے ایک بار پھر میدان عمل میں آنا پڑا۔ اس کا ایم فل ہو چکا تھا۔ اسی کی بنیاد پر اسے یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جاب بھی مل گئی اور ایم فل الاؤنس بھی ملنے لگا۔ اکیڈمی میں پڑھانے کا اس کا کافی زیادہ تجربہ تھا اور اس بار اس کے پاس بینک میں خاصی رقم بھی موجود تھی۔ اس لیے اس بار اس نے کسی اکیڈمی میں ملازمت کرنے کی بجائے اپنی اکیڈمی بنا لی اور وہاں چند اچھے ٹیچرز کو اپنی مدد کے لیے رکھ لیا۔

اچھے علاقے میں اکیڈمی ہونے اور ٹیچرز کی اچھی ساکھ کی وجہ سے اس کی اکیڈمی بہت جلد سائنس کے طلبا میں مقبول ہو گئی اور وہاں بڑی تعداد میں بچے آنے لگے۔ اب اس نے خود وہاں پڑھانا بہت کم کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا زیادہ وقت اپنی پی ایچ ڈی اور ریسرچ پیپرز کو دینے لگی تھی۔ اتنا کچھ کرنے سے اس کی بے حسی ختم تو نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس میں کمی ضرور ہو گئی تھی۔ البتہ جو برائی اس کی شخصیت میں اب اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی۔ وہ اس کا ہر چیز اور ہر صورت حال کا تاریک پہلو دیکھنا اور اسے ہی حقیقت سمجھنا تھا۔ راشدہ بیگم اپنی ہر طرح کی کوشش کر لینے کے باوجود اسے پھر سے نارمل نہیں کر سکی تھیں اور اس کی طرف سے مکمل مایوس ہو کر انہوں نے اسے اب اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس سے اب کچھ کہتی نہیں تھیں۔ مگر اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی ضرور تھیں۔ ایک مرد کی محبت نے ان کی ہیرے جیسی بیٹی کو سچ مچ رول دیا تھا اور وہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"محنت اور محنت کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے۔"

صبوحی کے کہے ہوئے یہ چند لفظ پچھلے دو دن سے بار بار اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور جتنی بار اسے یہ لفظ یاد آتے اتنی ہی بار وہ سوچ میں پڑ جاتی کہ کیا مزمل کے لیے اس کی محبت میں کوئی کھوٹ تھا یا اس کا کیریئر بنانے کے لیے کی گئی محنت میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ جو اسے دونوں میں سے کسی کا بھی صلہ نہیں ملا۔ اس وقت بھی لان میں جھولے پر بیٹھی وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے ان ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ جب وہاں راشدہ بیگم کی آمد ہوئی۔ اس کی حالت کے پیش نظر وہ اب ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس کے ساتھ رہ رہی تھیں اور آج بھی رابعہ سے زیادہ اس کے بچوں کا وہی خیال رکھتی تھیں۔

"رابی! کیا بات ہے بیٹا! میں کل سے دیکھ رہی ہوں تم کچھ کھوئی کھوئی سی ہو کوئی پریشانی ہے بیٹا!"

اس کے قریب بیٹھ کر راشدہ بیگم نے نرمی سے پوچھا تھا۔ وہ انہیں عزیز تو ہمیشہ سے ہی تھی۔ مگر جب سے مزمل کی بے وفائی کا دکھ اٹھا کر وہ ٹوٹ کر بکھری تھی۔ راشدہ بیگم کو وہ بالکل ہی کانچ سے بنی لگنے لگی تھی۔ وہ اسے کوئی بھی ایسی بات بتانے سے گریز کرنے لگی تھیں۔ جس سے اس کے پریشان ہونے کا ذرا سا بھی اندیشہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی اتنی احتیاط کے باوجود وہ انہیں ہمیشہ پریشان ہی نظر آتی تھی اور وہ اسے اس طرح دیکھنے کی عادی بھی ہو چکی تھیں۔ مگر کل سے وہ کچھ زیادہ ہی گم سم نظر آرہی تھی۔ اس لیے انہوں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"امی! کیا مزمل کے لیے میری محبت میں کوئی کھوٹ تھا۔" ان کا سوال ان سنا کرتے ہوئے وہ ان کی طرف دیکھے بغیر پوچھ رہی تھی۔ راشدہ بیگم کا دل کٹ سا گیا۔

"کتنی محنت کی تھی میں نے اس کا کیریئر بنانے کے لیے۔ سارا سارا دن پیسے کمانے کے لیے محنت، رات تک گھر کے کام کرنا پھر بھی ایک ایک روپیہ سوچ سوچ کر خرچ کرنا کہ کہیں اس کی کوئی ضرورت، کوئی خواہش ادھوری نہ رہ جائے۔ امی کیا میری محنت میں بھی کھوٹ تھا، خود نمائی تھی۔"

وہ بہت یاسیت سے پوچھ رہی تھی۔ راشدہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے بے اختیار ہی اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ "ایسی باتیں کیوں سوچنے لگی ہو بیٹا! تمہاری محنت میں کوئی کھوٹ تھا نہ محبت میں۔ بس وہ آدم ہی ناقدر نکلا۔ اس نے تمہاری قربانیوں کی قدر ہی نہیں کی۔ کاش میں نے تمہاری بات نہ مانی ہوتی اور زور زبردستی سے ہی سہی تمہاری شادی کہیں اور کروی ہوتی تو آج یوں تمہارے دکھ دیکھ دیکھ کر کڑھ نہ رہی ہوتی۔"

راشدہ بیگم کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔ رابعہ کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ وہ تڑپ کر ان سے الگ ہوئی تھی۔

"امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں مزمل کے سوا کسی سے شادی نہ کرتی۔"

اس نے ایک پل میں ہی سارے سود و زیاں کا حساب لگالیا تھا اور مزمل سے محبت اور شادی کے نتیجے میں ملنے والے تمام تر خساروں کے باوجود وہ آج بھی کسی دوسرے مرد کا تصور تک کرنے کو تیار نہیں تھی۔ راشدہ بیگم حیرت زدہ سی اس کا سرخ ہو جانے والا چہرہ دیکھتی رہ گئیں۔ پچھلے تین سال سے مزمل سے اس کا کوئی رابطہ نہیں تھا اور وہ اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی کسی بیوہ جیسی زندگی گزار رہی تھی۔ انہوں نے اس عرصے میں آج سے پہلے کبھی اس کے منہ سے مزمل کا نام تک نہیں سنا تھا۔ مگر وہ اندر سے آج بھی ویسی ہی تھی مزمل کے لیے مٹ جانے والی، اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سننے والی۔ وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔

"امی! آپ کو ایک بات بتاؤں؟"

کئی منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے بڑی رازداری سے سوال کیا تھا۔ راشدہ بیگم بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اپنے الجھے بکھرے حلیے اور چہرے کے ناقابل فہم تاثرات کی وجہ سے ان کی ذہین اور اعلا تعلیم یافتہ بیٹی اس وقت بالکل ایک نفسیاتی مریضہ لگ رہی تھی۔

"امی! اگر وقت پیچھے چلا جائے نا اور مجھے پتا بھی ہو کہ مزمل ایک دوسری عورت کی خاطر مجھے چھوڑ دے گا تو میں پھر بھی اس سے شادی کروں گی۔"

وہ بے حد کھوئے کھوئے اور خواب ناک انداز سے بغیر اپنی ماں کی طرف دیکھے بول رہی تھی۔

"اس نے شادی کے بعد کئی سالوں تک مجھے اتنی محبت دی ہے۔ میرا اتنا خیال رکھا ہے کہ صرف وہ چند سال اس کی محبت اور رفاقت کے احساس کے ساتھ گزارنے کے لیے اس کے بعد میں بدل جانے کا پتا ہونے کے باوجود اس سے شادی کروں گی۔"

"رابی تم!"

راشدہ بیگم کو اس پر بے طرح غصہ آیا تھا۔ انہوں نے اپنے غصے کا اظہار بھی کرنا چاہا اور وہ کر بھی دیتیں۔ اگر ان کی نظر رابی کی کھوئی کھوئی آنکھوں سے نہ ٹکرا جاتی۔ اس کی ہر وقت بجھی رہنے والی آنکھیں اس وقت گزرے ہوئے وقت کی کسی یاد سے جگر جگر کر رہی تھیں اور چہرے پر بہت مدھم اور بہت پیاری سی مسکان تھی۔ راشدہ بیگم کے الفاظ گم سے ہو گئے۔ ان کا غصہ اگلے ہی پل ترحم میں بدل گیا۔

"مزمل! تجھے اللہ ہی سمجھے۔" انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور وہاں سے اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں اگلے مہینے کے آخر میں امریکہ جارہی ہوں۔"

اس رات کھانا کھاتے ہوئے رابعہ نے اچانک ہی کہا تھا۔ سالن پلیٹ میں نکالتے ہوئے راشدہ بیگم کا ہاتھ اس کی بات سن کر ایک پل کے لیے لرز سا گیا۔ انہوں نے بے یقینی سے رابعہ کا چہرہ دیکھا۔ پچھلے کچھ ہفتوں سے وہ انہیں بہت سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ کھانا سب کے ساتھ بیٹھ کر رغبت سے کھانے لگی تھی۔ اپنی ڈریسنگ بھی اس نے اچھی کرلی تھی اور پار لر بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کے اسکول باقاعدگی سے چکر لگاتی، انہیں گھمانے پھرانے اور شاپنگ کے لیے لے کر جاتی اور خود ان کے پاس بیٹھ کر ڈھیروں ادھر ادھر کی باتیں بھی کرنے لگی تھی۔

"تو یہ ساری تبدیلی اس لیے تھی کہ رابعہ نے مزمل سے صلح کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" ان کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا۔ مگر رابعہ کی اگلی بات نے اس خیال کو پوری طرح ابھرنے سے پہلے ہی جھٹک دیا۔

"وہاں انٹر نیشنل میتھیمیٹکس کانفرنس ہو رہی ہے اور میرا ایک پیپر وہاں پڑھنے کے لیے سلیکٹ ہوا ہے۔"

"اوہ۔" ان کے لبوں سے بے اختیار ہی نکلا تھا۔ رابعہ کو ریسرچ کا کافی شوق تھا اور وہ اس سے پہلے بھی کئی بار نیشنل لیول کی کانفرنس میں پیپر پڑھنے جا چکی تھی۔ البتہ انٹر نیشنل لیول پر ہونے والی کسی کانفرنس میں وہ پہلی بار جارہی تھی۔

"لیکن بیٹا! تب تک تو رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا ہو گا تم رہنے دیتیں۔ اتنی دور جانا ضروری تھا کیا۔" کچھ سوچ کر انہوں نے ٹوکا تھا۔

"جانا بہت ضروری ہے امی۔"

کھانا کھاتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور بعد میں بھی انہوں نے جتنی بار اسے دیکھا، وہ گہری سوچ میں مستغرق ہی ملی۔

"امی! میں وہاں مزمل سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہوں۔ کانفرنس کا تو بس ایک بہانہ ہی بن گیا ہے۔"

بچے کھانا کھا کر جیسے ہی اٹھے اس نے ماں کے سامنے دھماکا کر دیا۔ "کیا" وہ ایک بار پھر حیران رہ گئی تھیں۔ "اور کیوں ملنا چاہتی ہو اب تم اس سے اگر تمہیں اس سے صلح ہی کرنا تھی تو پہلے تعلق توڑا ہی کیوں ناحق اتنے سال کی اذیت کاٹی اور اب تو اس کی کوئی خیر خبر بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں رہتا ہو گا پہلے تو ناصر کا دوست اسد ہوتا تھا نیویارک میں اب تو اسے بھی پاکستان آئے عرصہ ہو گیا ہے۔"

"امی! میں اس کا پتا معلوم کر چکی ہوں۔ وہ ابھی تک وہیں جاب کر رہا ہے اور گھر شاید اس نے بدل لیا ہو مگر مجھے اس کے گھر نہیں دفتر جانا ہے اور امی! میں اس سے

صلح کرنے نہیں جارہی۔ مجھے اس سے اپنے بچوں کا حق چاہیے بچے اب بڑے ہو رہے ہیں' ان کی ضروریات بھی بڑھ رہی ہیں پھر میرے پاس کوئی جائیداد نہیں ہے میں اپنے بچوں کو کل کیا دوں گی۔"

وہ بہت سکون سے بول رہی تھی۔

"لیکن رابی! تم نے خود ہی تو اس کی بھجوائی ہوئی رقم ہر بار واپس کی تھی۔ ورنہ اس نے تو بچوں کی کفالت سے ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔" راشدہ بیگم نے اسے یاد دلایا تھا۔

"تب میں نے بہت جذباتی فیصلہ کیا تھا امی! میں نے اپنے بچوں کی آسانی کا نہیں سوچا تھا مگر اب میں جذباتیت سے باہر نکل آئی ہوں۔ اس لیے تو خود جاکر اس سے بات کررہی ہوں ورنہ فون یا میل کا سہارا نہ لے لیتی۔ امی مجھے اپنے بچوں کا حق چاہیے بھیک نہیں کہ وہ جتنی مرضی دے دے اور چاہے تو نہ دے میں اسے پابند کرکے آؤں گی کہ وہ بچوں کے لیے کچھ جائیداد بھی خریدے اور انہیں سپورٹ بھی کرے۔ امی! میں نے اپنے جذبات کی وجہ سے اپنے بچوں کا خوامخواہ نقصان کیا۔"

ٹھہر ٹھہر کر بولتی ہوئی وہ واقعی بہت بدلی ہوئی لگ رہی تھی پہلی بار راشدہ بیگم کو لگا کہ رابعہ مزمل کی محبت کے طلسم سے باہر آچکی ہے اور اب صرف ایک ماں بن کر سوچ رہی ہے اور انہیں خود پر حیرت ہوئی کہ انہیں رابعہ کا محبت کے طلسم سے باہر آنا بھی اچھا نہیں لگا تھا انہیں وہ بہت ادھوری اور بہت اوپری سی لگی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکیں اور چپ چاپ اسے امریکا جانے کی تیاریاں کرتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

جہاز میں سارا وقت وہ اپنی پچھلی اور موجودہ زندگی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ مزمل کے لیے اپنی دیوانگی اس کے ساتھ گزرے ماہ و سال اور اس کے بعد گزرا سارا وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا تھا۔

مزمل سے آخری بار بات ہوئے چار سال سے زیادہ وقت گزر گیا تھا اور پچھلے دو ڈھائی مہینوں کے علاوہ باقی کا سارا وقت اس نے خود فراموشی کے عالم میں دنیا سے کٹ کر گزارا تھا اور شاید وہ باقی زندگی بھی ایسے ہی گزار دیتی اگر اس شام شاپنگ مال میں وہ اپنے بچوں کی گفتگو نہ سن لیتی۔ وہ راشدہ بیگم کے کہنے پر بچوں کو شاپنگ کے لیے لے کر آئی تھی۔ اور حسب عادت دنیا جہان سے لاتعلق ایک طرف کھڑی تھی اس کے تینوں بچے کچھ فاصلے پر موجود الیکٹرونک گیمز اور کھلونوں والے ریکس کی لین میں تھے جب بچوں کو وہاں خاصا وقت گزر گیا تو وہ ان کو دیکھنے کے لیے وہاں آئی تھی بچے اس کی طرف پشت کیے کھڑے تھے اور آپس میں باتیں کررہے تھے اس نے ذرا سا غور کیا تو پتا چلا کہ چھوٹی زونی ایک بے حد قیمتی باربی ڈول لینے کی ضد کررہی تھی اور اس کے دونوں بھائی اسے کوئی سستی گڑیا لینے پر مجبور کررہے تھے۔

"مجھے نہیں پتا بھائی! مجھے یہی باربی ڈول چاہیے۔" ننھی زونیہ کے انداز میں ہو بہو رابعہ والی ضد تھی۔ رابعہ ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔

"دیکھو زونی! اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ وہ والی ڈول بہت مہنگی ہے مما کے پاس اتنے روپے نہیں ہوں گے۔" عبدالواحد نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

"نہیں مجھے وہی ڈول لینی ہے۔ میری فرینڈ کے پاس بھی ایسی ہی ہے۔" زونیہ ٹھنکی تھی۔

"تمہاری فرینڈ کے تو پاپا نے اسے لاکر دی ہے۔ لیکن ہمارے پاپا تو ہمارے پاس نہیں ہیں اور مما کے پاس زیادہ روپے نہیں ہوتے اگر تم ضد کروگی تو مما پریشان ہو جائیں گی کیا تم مما کو پریشان کرنا چاہتی ہو۔"

ساڑھے تیرہ سالہ عبدالباری کا انداز عبدالواحد سے زیادہ مدبرانہ تھا۔

"نہیں میں مما کو پریشان نہیں کرنا چاہتی۔" ننھی زونیہ اس کی بلیک میلنگ میں فوراً" ہی آگئی تھی اور اس نے اپنے بھائیوں کی منتخب کردہ کم قیمت ڈول لینے پر آمادگی ظاہر کردی تھی۔ لیکن اس کے معصوم چہرے پر اپنی خواہش پوری نہ ہونے کی وجہ سے جو دھند اتری تھی وہ واپسی کا سارا راستہ رابعہ کا دل دکھاتی رہی اس روز اسے پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی جذباتیت کے ہاتھوں اپنے بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کردیا ہے۔ وہ مزمل کا روپیہ بے شک اپنی ذات پر نہ لگاتی مگر بچوں کو تو ان کے باپ کی کمائی استعمال کرنے دیتی۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب مزمل امریکا سے رقم بھیجا کرتا تھا تو وہ لوگ معاشی لحاظ سے اتنے آسودہ حال تھے کہ بچے جس چیز پر بھی ہاتھ رکھ دیتے وہ بغیر ایک لفظ کہے انہیں وہ چیز دلا دیا کرتی تھی۔

اس روز وہ پوری رات اپنے کمرے میں ٹہلتی اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور صبح تک اس نے اپنے دل میں پختہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے بچوں کی خاطر اسے مزمل سے ایک بار رابطہ کرنا ہی ہوگا۔ لیکن اس میں مشکل یہ تھی کہ مزمل سے بات کس طرح کی جائے وہ ایک طویل عرصے سے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ چار سال پہلے دوسری شادی کرچکا تھا اور کوئی بعید نہیں تھا کہ دوسری بیوی سے بھی اس کے بچے ہوچکے ہوں۔ اس لیے یہ بھی خطرہ تھا کہ اب وہ پاکستان میں موجود اپنے تینوں بچوں کو سپورٹ کرنے سے انکار کردے۔

ناصر بھائی کا قریبی دوست اسد پہلے امریکہ میں ہوا کرتا تھا۔ اب وہ بھی وہاں نہیں تھا اور خود ناصر بھائی تو مزمل کے امریکہ جانے سے پہلے ہی کینیڈا شفٹ ہوگئے تھے اس لیے مزمل سے روبرو بات کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے خود امریکہ جانے کا فیصلہ کیا اس نے کچھ دن پہلے ہی اس کے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ نے وہاں ہونے والی کانفرنس کا بتایا تھا پہلے تو اس کا وہاں جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر اب وہ جانا چاہتی تھی۔ یہ امریکہ جانے کا اچھا بہانہ تھا۔ کانفرنس میں شرکت کرکے وہ مزمل سے بھی مل لیتی۔ اس کا ارادہ مزمل کے آفس جاکر اس سے بات کرنے کا تھا اس کا خیال تھا کہ وہاں وہ زیادہ اچھی طرح سے اس پر دباؤ ڈال سکتی ہے۔

کانفرنس واشنگٹن میں تھی۔ اس لیے پہلے اسے وہاں جانا پڑا' مگر کانفرنس میں اپنا پیپر پڑھنے کے بعد اس نے فوراً" ہی نیویارک کے لیے فلائٹ لے لی تھی حتیٰ کہ اس نے ایمرجنسی کا بہانہ بناکر کانفرنس کی کلوزنگ سیرمنی میں بھی شرکت نہیں کی تھی۔

نیویارک پہنچ کر اس نے ایک ہوٹل میں کمرہ لیا اور فریش ہوکر مزمل کے آفس کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ اتنے عرصے کے بعد مزمل سے ملنے والی تھی مگر اسے نہ کوئی گھبراہٹ ہورہی تھی اور نہ ہی اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس وقت اسے صرف اپنے بچوں کا خیال تھا جن کو اپنی وجہ سے پہنچنے والے نقصان کی اسے تلافی کرنا تھی۔

مزمل اپنے آفس میں اسے نہیں ملا وہ کسی میٹنگ کے لیے گیا ہوا تھا مگر اس کی سیکریٹری نے اسے ویٹنگ روم میں بٹھا دیا۔ ویٹنگ روم مزمل کے آفس کے عین ساتھ تھا وہ باہر سے آتا تو یہیں سے گزر کر اسے اپنے آفس جانا تھا۔ اس نے ایک اخبار اٹھایا اور اسے پڑھتے ہوئے مزمل کا انتظار کرنے لگی۔ مزمل کی سیکریٹری نے اخلاقاً" اس سے کافی کا بھی پوچھا تھا مگر وہ روزے سے تھی اس لیے نرمی سے انکار کردیا اسے وہاں بیٹھے پون گھنٹہ ہوا تھا جب اس نے مزمل کو آتے دیکھا نیوی بلیو سوٹ میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح وجیہہ لگ رہا تھا۔ مگر رابعہ نے ایک نظر میں ہی اس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقے اور اس کے چہرے کی پژمردگی کو دیکھ لیا تھا۔

وہ بے اختیار ہی کھڑی ہوگئی اسے خود پر حیرت ہورہی تھی کہ اتنے دنوں سے اس میں جو تبدیلی آئی ہوئی تھی وہ مزمل کو سامنے پاتے ہی کہیں غائب ہوگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر وہی رابعہ بن گئی تھی اسے سامنے پاکر دل پر سے اپنا اختیار کھو دینے والی اپنی نظروں کو اس کے چہرے سے ہٹانے میں ناکام ہوجانے والی اپنی دھڑکنوں کی بے رابطگی کا سامنا کرنے والی۔

"رابی" مزمل بھی اسے اچانک سامنے پاکر ٹھٹک گیا

تھا۔ اور بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"تم یہاں؟"

رابعہ نے بمشکل اپنے بچوں کو تصور میں لا کر خود کو کمپوز کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

"ہاں مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

اس کے اندر اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا تھا کم از کم باہر سے وہ ایک مضبوط عورت ہی دکھائی دے رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اندر چلو میرے آفس میں۔" وہ کچھ بوکھلایا ہوا اسے اپنے شاندار آفس میں لے آیا۔

"بیٹھو۔" اندر آ کر اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے اسے بیٹھنے کا کہا تھا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی مجھے تم سے صرف چند لمحوں کی بات کرنا ہے۔ اور وہ کھڑے کھڑے بھی ہو سکتی ہے۔"

بے حد اجنبی اور سخت انداز میں بولتی وہ کوئی اور ہی رابی تھی۔ مزمل پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے گیا۔

"مجھے تمہاری جائیداد اور آمدنی میں سے اپنے بچوں کا حصہ چاہیے۔ وہ تمہاری بھی اولاد ہیں اور تمہارے روپے پر ان کا پورا حق ہے۔"

"تو میں نے کب انکار کیا ہے یار! تم نے خود ہی تو میری بھیجی ہوئی رقم واپس کی تھی۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ تھوڑا سا زچ ہوا تھا۔

"وہ میری غلطی تھی۔" رابعہ نے اطمینان سے کہا۔ "لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے کہ میں اپنے بچوں کو ان کے حق سے محروم نہیں کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں تک سوچتے رہنے کے بعد مزمل نے کہا تھا۔

"مگر ایسا ہے کہ یہ معاملہ تھوڑا تفصیل طلب ہے اور اس وقت مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے۔ تم ایسا کرو آج شام کو میرے فلیٹ پر آ جاؤ پھر ہم ساری تفصیلات طے کر لیتے ہیں۔"

اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ یوں دوستانہ انداز سے کہہ رہا تھا جیسے ان کے بڑے اچھے تعلقات ہوں۔ رابعہ کو اس پر غصہ تو بہت آیا مگر اپنے بچوں کی خاطر وہ ضبط کر گئی۔

"اور تمہاری بیوی وہ مجھے برداشت کرے گی وہاں۔" کارڈ پکڑتے ہوئے اس نے طنزیہ انداز سے پوچھا تھا۔

"میری بیوی۔" کچھ سوچ کر وہ پہلی بار مدھم سا مسکرایا تھا۔ "وہ بہت اچھی ہے وہ کچھ نہیں کہے گی۔"

رابعہ کے دل میں اس کی بات نیزے کی انی بن کر چبھی تھی۔ اس نے تلملا کر کارڈ بیگ میں رکھا اور اسے خدا حافظ کہے بغیر اس کے دفتر سے باہر نکل آئی۔ شام ہونے میں ابھی دیر تھی اس لیے وہ اپنے ہوٹل واپس آ گئی۔

وہ عصر کی نماز پڑھتے ہی مزمل کے گھر جانے کے خیال سے ہوٹل سے نکل آئی تھی اس کا ارادہ تھا کہ مزمل سے بات کر کے وہ افطاری کے وقت تک واپس اپنے ہوٹل آ جائے گی۔ مگر مزمل کا فلیٹ اس کے ہوٹل سے اتنی دور نکلا کہ وہ مغرب سے کچھ ہی وقت پہلے وہاں پہنچ سکی۔ کال بیل بجانے پر مزمل خود باہر آیا تھا۔ اس نے موتیا رنگ کا شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں کفگیر تھا۔ رابعہ نے طنزیہ انداز سے کفگیر کو دیکھا تو وہ مسکرا کر خجالت سے بولا۔

"دراصل میں، میں پکوڑے بنا رہا تھا افطاری کے لیے۔"

"کیوں تمہاری بیوی نہیں بنا کر دیتی۔" اس کا لہجہ بھی طنزیہ تھا۔

"کیوں نہیں بنا کر دیتی۔" مزمل نے فوراً احتجاج کیا۔ "گھر پر ہو تو ہمیشہ میری بیوی ہی پکوڑے بناتی ہے۔ مگر ابھی وہ گھر پر تھی نہیں۔"

اس کے لہجے میں اپنی بیوی کے لیے محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔ رابعہ کے دل کو کچھ ہونے لگا کچھ بھی بولے بغیر وہ اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔

"آؤ تم بیٹھو۔" اس کی حالت سے بے خبر وہ اسے کہہ رہا تھا۔ رابعہ بری طرح سے چڑ گئی۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی میرے ساتھ کام کی بات کرو تو میں جاؤں۔"

"اچھا ایک منٹ میں ذرا پکوڑے کڑاہی سے نکال کر چولہا بند کر آؤں۔" وہ اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر کچن کی طرف چلا گیا اور رابعہ بے مقصد ہی ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ اس کا چھوٹا سا فلیٹ بہت سادہ اور صاف ستھرا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ مزمل کی بیوی کو گھر سجانے کا بالکل بھی شوق نہیں لگ رہا تھا کیونکہ وہاں صرف ضرورت کی چیزیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

"ہاں اب بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟"

چند منٹ کے بعد وہ اس کے مقابل کھڑا تھا اور بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ پاکستان میں مقیم اپنے تینوں بچوں کے لیے ہر ماہ بھیجو اور ان کے لیے ان کے نام سے کوئی پراپرٹی بھی خرید کر دو۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ لفظ چبا چبا کر بولی تھی۔ مزمل کے چہرے کے تاثرات میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"ٹھیک ہے میں ایسا کر دوں گا اور کچھ۔"

"اور یہ کہ اس سارے معاملے کی کوئی قانونی حیثیت ہونی چاہیے۔"

"میں یہ بھی کر دوں گا مگر بدلے میں میری ایک شرط ہے۔"

وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اوہ۔" رابعہ من ہی من میں مسکرائی تھی۔

"اب یہ کہے گا کہ میں اس کی بیوی کے سامنے نہ آؤں۔ یا یہ کہ میں اس کے دفتر میں کسی کو پتا نہ لگنے دوں کہ میں اس کی پہلی بیوی ہوں اور ابھی تک اس کے نکاح میں ہوں۔"

دل میں اس نے کئی اندازے لگا لیے جو سب کے سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے دل کو ان اندازوں سے تکلیف بھی ہوئی مگر اس نے فوراً ہی خود کو سمجھا لیا وہ کون سا وہاں مزمل سے کوئی تعلق جوڑنے آئی تھی جو ایسے کسی مطالبے پر دکھی ہوتی۔ اس لیے اب کی بار وہ بولی تو اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ مضبوط تھا۔

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"پکی بات ہے۔ وعدہ کرتی ہو۔" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"ہاں وعدہ کرتی ہوں۔"

"مجھے تم چاہیے ہو رابی!" مزمل نے اس کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر اچانک ہی کہا تھا۔

"کیا؟" وہ سناٹے میں رہ گئی۔

"ہاں رابی! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تم سے الگ ہو کر میں نے اپنی زندگی کے جتنے بھی دن گزارے ہیں وہ میرے لیے قید میں گزرے ماہ و سال جیسے تھے۔ بے وقعت اور تکلیف دہ، جب سے تم مجھ سے جدا ہوئی ہو میں خوش رہنا بھول گیا ہوں اور اگر کچھ عرصہ میں اور تم سے دور رہا تو شاید سانس لینا بھی بھول جاؤں۔"

اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے وہ کسی ٹرانس میں بول رہا تھا۔ رابعہ اتنی حیرت زدہ تھی کہ اپنے کندھوں پر رکھے اس کے ہاتھ بھی نہیں ہٹا سکی تھی۔ بس ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ مزمل اس سے جھوٹ نہیں بول رہا تھا اتنا تو وہ اس کے چہرے سے سمجھ سکتی تھی مگر وہ اب اتنے سالوں کے بعد ایسی بات کیوں کر رہا تھا یہ اسے پتا نہیں چل رہا تھا۔

"تمہارا اپنی دوسری بیوی سے کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔"

بہت دیر کے بعد اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔

"میری کوئی بیوی نہیں ہے رابی! میں نے تمہارے بعد کسی سے شادی نہیں کی۔ میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

رندھے ہوئے گلے کے ساتھ وہ بمشکل بولا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ناصر بھائی کے دوست نے اچھی طرح سے پتا کرنے کے بعد ہی انہیں مستند خبر دی

تھی۔ جس روز انہوں نے بھائی کو بتایا اس سے دو روز بعد زرمین سے تمہاری شادی طے تھی۔ تم تو رجسٹرار سے وقت بھی لے چکے تھے۔"

رابعہ کے پاس پوری معلومات تھیں اور اسے جزئیات کے ساتھ یاد بھی تھیں۔

"کوشش کی تھی میں نے زرمین سے شادی کی، مگر تب تک مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میری رگوں میں خون نہیں تمہاری محبت بہتی ہے، میں تمہاری محبت کو دل سے نکال دوں گا تو زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"
اس نے جیسے ہار کر اپنا چہرہ رابعہ کے بالوں کے ساتھ ٹکا دیا تھا۔

زرمین انڈین نژاد مسلمان تھی اور مزمل کے ساتھ آفس میں کام کرتی تھی۔ خوب صورت ملنسار اور سادہ مزاج زرمین بلا کی باتونی اور حاضر جواب تھی۔ اپنی سادہ اور بے تکلف طبیعت کے باعث وہ بہت جلد مزمل کے ساتھ دوستی کے رشتے میں بندھ گئی تھی۔ مزمل نیا نیا وہاں آیا تھا اور اپنے بچوں اور رابعہ کو بہت مس کرتا تھا ایسے میں اسے زرمین کی دوستی بہت غنیمت لگی۔ وہ دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔

مزمل اسے صرف ایک اچھا دوست ہی سمجھتا تھا، مگر زرمین کی اس کے لیے پسند کا انداز کچھ عرصے بعد بدلنے لگا تھا۔ وہ اسے آئیڈیلائز کرنے لگی تھی اور اس کی یہ پسندیدگی رفتہ رفتہ محبت میں بدلتی جارہی تھی۔ مزمل اس کے جذبات سے انجان نہیں تھا۔ مگر اس کے سامنے خود کو انجان ہی ظاہر کرتا تھا۔ مگر بعد میں جب رابعہ کے ساتھ اس کا شدید جھگڑا ہوا اور ان کی کئی ماہ تک بول چال بند رہی تو اپنے ذہنی خلفشار اور تنہائی سے تنگ آکر اس نے زرمین کی محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

رابعہ کی طویل عرصے کی بے رخی اور بے اعتنائی سے وہ انتہائی حد تک دلبرداشتہ ہوچکا تھا اس لیے زرمین اور وہ پہلے سے بڑھ کر ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور مزمل نے اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔

تب تک اس کا خیال تھا کہ رابعہ اپنی ہٹ دھرمی اور بے وجہ کی ضد کی وجہ سے اس کے ساتھ جو بے رخی برتتی آئی ہے اس کی وجہ سے وہ اس کے دل سے نکل چکی ہے۔ اس لیے شادی سے چند ہفتے پہلے آنے والے رابعہ کے فون پر اسے روتا ہوا سن کر بھی اس کے دل میں رابعہ کے لیے کوئی جذبہ نہیں جاگا تھا اور وہ زرمین کے ساتھ شادی کے فیصلے پر قائم رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دن آپہنچا۔ جب اسے اور زرمین کو رجسٹرار کے پاس جاکر اپنی شادی رجسٹرڈ کروانا تھا۔ مزمل اس سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا اور پارکنگ میں کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا۔

جب زرمین وہاں آئی وہ عام دنوں سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ ریڈ کلر کا کامدار سوٹ جس کا دوپٹہ اس نے سلیقے سے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔ خوب صورتی سے کیا ہوا میک اپ اور میچنگ جیولری۔

مزمل اسے دیکھ کر وہیں ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ ریڈ کلر کا لہنگا ہی رابعہ نے بھی اپنی شادی والے دن پہنا تھا اور وہ کس قدر حسین اور معصوم لگ رہی تھی دلہن کے روپ میں، اسے رابعہ بہت غلط وقت پر یاد آئی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہوں نا؟"

زرمین اس کے سامنے کھڑی بہت لہک کر پوچھ رہی تھی۔ دوپٹے کے نیچے اس کے سنہری بالوں کا بہت خوب صورت سا اسٹائل بنا ہوا تھا اور بالوں کی لٹیں اس کی لمبی گردن کے گرد جھولتی بہت خوب صورت لگ رہی تھیں، مگر ان سنہری لٹوں کو دیکھ کر مزمل کو نہ جانے کیوں رابعہ کے گھنے سیاہ بال یاد آنے لگے تھے جب بھی اس کے بال کھلے ہوتے تو کیسے گھنگھور گھٹاؤں کے چھا جانے کا گمان ہوتا تھا۔

"مزمل! کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"
اسے مسلسل اپنی شکل کو گھورتا پاکر زرمین پریشان ہوگئی تھی۔ اس کی پریشانی دیکھ کر بھی مزمل کو رابعہ ہی کا خیال آیا تھا۔ جب بھی وہ دیر سے گھر آتا یا کہیں جانے کی بات کرتا تو کیسے اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگتی تھی۔ مزمل کے معاملے میں وہ بہت حساس تھی

ذرا سی کوئی بات ہوجاتی تو اس کی آنکھیں آنسوؤں کے دریا بہانے پر تیار ہوجایا کرتی تھیں۔ وہ اس کی شادی کا سن کر کیسے تڑپ تڑپ کر رورہی تھی۔ مزمل کے کانوں میں رابعہ کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ اس نے بے چینی سے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ رابعہ سے بہت دور تھا پتا نہیں اب تک وہ کتنا رو چکی ہوگی۔

"مزمل! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ چلو اندر چلیں ٹائم ہوگیا ہے۔"

اس کی چپ نہ ٹوٹی تو زرمین نے اس کا بازو پکڑ لیا کہ اسے اپنے ساتھ اندر لے جاسکے۔ مزمل جیسے کسی ٹرانس سے باہر آیا تھا کوئی طلسم تھا جس نے اسے آزاد کردیا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنا بازو زرمین کے ہاتھوں سے چھڑایا اور مدھم آواز میں بولا۔

"میں تم سے شادی نہیں کرسکتا زرمین! آئی ایم سوری۔"

"مگر کیوں مزمل! کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی۔" زرمین گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔

"نہیں! تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی مگر بس تم اتنا سمجھ لو کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے پاؤں گا۔ میری محبت میری وفا میری چاہتیں سب کسی اور کے پاس گروی پڑی ہیں اور اتنی بڑی قیمت کے عوض گروی پڑی ہیں کہ میں چاہوں بھی تو انہیں وہاں سے چھڑا نہیں سکتا۔ ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔ لیکن میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔" اس کا انداز ابھی بھی کھویا کھویا تھا۔ زرمین صدمے سے گنگ ہوگئی۔ چند لمحوں تک تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ اس صورت حال پر کیا رد عمل دکھائے۔ وہ شادی کرنے کے لیے وہاں آئی تھی اور جس شخص کو اس کی زندگی کا ساتھی بننا تھا۔ وہ عین آخری لمحوں میں اسے اپنانے سے انکاری ہوگیا تھا۔

"یہ سب کچھ تمہیں پہلے سے معلوم نہیں تھا۔ اگر تم اتنے ہی مجبور تھے تو تم نے مجھ سے شادی کی بات ہی کیوں کی؟"
کئی لمحوں کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تھی اور ملامتی انداز سے کہہ رہی تھی۔

"زرمین!" مزمل نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو کہ مجھے تم سے یا کسی بھی دوسری عورت سے شادی کی بات کرنا ہی نہیں چاہیے تھی۔ اگر تم مجھے اس غلطی کے لیے معاف نہیں کرسکتیں تو میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر اتنا سوچ لینا کہ ہماری شادی کے کامیاب ہونے کا امکان بہت کم ہوگا۔"

خود کو بہت سنبھال کر وہ اتنی بات کرنے کے قابل ہوا تھا اور یہ سوچ کر ہی اس کا سانس رکا جارہا تھا کہ اگر زرمین نے شادی کے لیے اصرار جاری رکھا تو وہ کیسے اس کو بیوی کے طور پر قبول کرپائے گا لیکن اس کی سوچ کے برعکس زرمین نے ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑائے اور غصیلے لہجے میں بولی۔

"جہنم میں جاؤ تم۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے جو میں ایک ایسے آدمی سے شادی کرکے بیٹھ جاؤں جسے یہی نہیں پتا کہ وہ دراصل چاہتا کیا ہے۔ تمہارا کیا بھروسہ تم شادی کرکے اگلے ہی دن اپنے پاگل پن میں مجھے طلاق دے دو۔ میں تو پھر کہیں کی نہیں رہوں گی نا۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں ابھی یہ کڑوا گھونٹ پی لوں۔" اپنی بات کہہ کر اس نے ایک نفرت بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور پلٹ کر اپنی کار میں جا بیٹھی۔
مزمل اس کے روانہ ہونے کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا۔ اسے ایک عجیب سی آزادی اور آسودگی کا احساس ہورہا تھا۔ مگر آسودگی کا یہ احساس اس وقت ہوا ہوگیا جب اسی شام جس وقت وہ رابعہ کو فون کرنے کا سوچ رہا تھا رابعہ کا اپنا فون آگیا اور اس کے فون اٹھاتے ہی رابعہ نے اسے جو کچھ کہا اسے سن کر وہ گنگ سا ہوگیا۔

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ زرمین سے شادی کرنے سے انکار کردینے کے باوجود وہ رابعہ کو کھو ہی چکا ہے اسے رابعہ کی کئی سال پہلے کی ہوئی بات اچھی

طرح سے یاد تھی کہ اگر اس نے کبھی بھی اپنے دل میں کسی دوسری عورت کو جگہ دی تو وہ اسے اپنے دل سے نکال دے گی۔ وہ آج بھی یہی سب کہہ رہی تھی اور مزمل اپنے احساس جرم کے ہاتھوں خود کو اتنا مجبور پا رہا تھا کہ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ زرمین سے بے شک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ مگر اسے اپنے دل میں جگہ تو دی تھی نا۔ رابعہ کے فون بند کر دینے کے بعد وہ ساکت وصامت وہیں بیٹھا رہا اور اپنی زندگی کے سود و زیاں کا حساب لگاتا رہا۔ اپنے لیے ہر چیز کو اپنی خواہش کے مطابق حاصل کر لینے کے لالچ میں وہ اپنی سب سے قیمتی متاع اپنی عزیز از جان بیوی کی محبت گنوا بیٹھا تھا۔

"مگر ایسی بات تھی تو تم پاکستان واپس کیوں نہ آ گئے۔ تمہیں آنا چاہیے تھا۔"

مزمل کی روداد سن کر وہ بس اسی قدر ہی کہہ سکی تھی۔

"میں تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نہیں دیکھ سکتا تھا رابی! میں نے ان آنکھوں میں اپنے لیے ہمیشہ محبت دیکھی تھی۔ تمہاری نفرت سہنے کا حوصلہ نہیں کر پایا میں اور ویسے بھی میں نے جرم کیا تھا اس کی سزا تو مجھے کاٹنا چاہیے تھی اس لیے میں نے اپنے آپ کو تم سے اور بچوں سے دوری کی سزا دے دی۔"

اس کے چہرے اس کی آواز اور اس کی آنکھیں ہر چیز سے گہرے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ رابی کا دل ہمیشہ کی طرح فوراً ہی اس کے لیے پگھل گیا وہ جھٹ اس کے سینے سے آ لگی۔

"اور ہم؟ ہمیں کس بات کی سزا دی تم نے۔ کبھی تم نے یہ سوچا کہ میں تمہارے بغیر کیسے رہتی ہوں گی۔" وہ شکایتی انداز میں کہہ رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دو رابی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی باقی کی زندگی ویسے ہی گزاروں گا جیسے تم چاہو گی۔ میں کبھی ایک دن کے لیے بھی تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے بغیر رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔"

اس کے بالوں کو چومتے ہوئے وہ بہت محبت سے کہہ رہا تھا۔ جب اس کے موبائل پر لگا الارم بجا افطاری کا وقت ہو چکا تھا۔

"تم منہ ہاتھ دھو لو بلکہ وضو کر لو میں تب تک کھانا لگاتا ہوں۔" اپنی نم آنکھوں کو آستین سے رگڑتے ہوئے اس نے رابی سے کہا تھا۔

"میں تمہارے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاؤں گی۔ تم بہت برے باورچی ہو۔" وہ روتے روتے مسکرا دی تھی۔

"میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا تو تمہیں اچھا لگے گا اور ویسے بھی اب میرا کھانا پکانے کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔"

کچن کی طرف جاتے ہوئے وہ کئی سال پہلے والا مزمل لگ رہا تھا اس کے وجود سے ماہ و سال کی گرد اور تھکن جیسے جھڑ چکی تھی۔ رابعہ نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور وضو کرنے کے لیے واش روم کی طرف چلی گئی۔

افطاری اور نماز کے بعد وہ مزمل کے ساتھ جا کر ہوٹل سے اپنا سامان بھی لے آئی تھی اور اس نے پاکستان فون کر کے راشدہ بیگم کو ساری بات بھی بتا دی تھی۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگ پاکستان کب آ رہے ہو۔" راشدہ بیگم کی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی۔

"بہت جلد امی! بس مزمل کو آفس سے چھٹی مل جائے پھر ہم پاکستان آ جائیں گے اور عید ہم ان شاء اللہ اکٹھے منائیں گے۔"

اس کی خوشی اس کے لہجے اور آواز سے صاف ظاہر تھی۔ تھوڑے سے فاصلے پر بیٹھا مزمل بہت دلچسپی سے اس کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔"

فون بند کر کے وہ پلٹی تو مزمل کو اپنی طرف از خود دیکھتا پا کر جھینپ گئی۔

"دیکھ رہا ہوں کہ میری جدائی سے نقصان تو جو بھی ہوئے ہوں مگر یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ میری بیوی دوبارہ

سے اسمارٹ ہو گئی ہے۔" وہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہوا اور اپنی جیب سے رابعہ کی رونمائی والا لاکٹ نکال کر اس کے گلے میں پہنا دیا۔

"بہت ادھوری لگ رہی تھیں اس کے بغیر، تمہیں ہمیشہ سے اس لاکٹ کے ساتھ دیکھنے کی عادت جو ہے۔"

لاکٹ پہنا کر اسے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے وہ سرگوشی کے انداز سے بولا تھا۔ رابعہ کھوئی کھوئی سی لاکٹ کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ وہ مزمل کو بتا نہیں پائی کہ اس لاکٹ کے بغیر خود کو دیکھنے کی وہ آج تک عادی نہیں ہو پائی تھی۔

☼ ☼ ☼
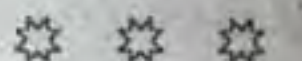
وہ عید کا دن تھا۔ بہت عرصے کے بعد رابعہ کے آنگن میں ایسی عید اتری تھی جو اپنے ساتھ ڈھیروں رنگ اور مسرتیں سمیت کر لائی تھی وہ اور مزمل تین روز پہلے ہی پاکستان پہنچے تھے۔ مزمل نے فی الحال ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ مگر اس نے اسلام آباد میں واقع اپنے سافٹ ویئر ہاؤس کی برانچ میں ٹرانسفر کے لیے درخواست بھی دے دی تھی۔ بچے اس کے آنے سے بہت خوش تھے۔ تین دن ہو گئے تھے اسے آئے ہوئے مگر ان کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ رابعہ کو اپنے بچے بھی مزمل کے آنے کے بعد بدلے بدلے سے اور بہت پر اعتماد نظر آ رہے تھے۔ گزشتہ رات وہ پانچوں رات دو بجے تک شاپنگ مالز میں پھرتے رہے تھے اور اس سارے وقت میں رابعہ کو تینوں بچوں کے چہروں پر جو مسرت نظر آئی تھی وہ اپنے ساتھ شاپنگ کرتے یا گھومتے پھرتے کبھی دکھائی نہیں دی تھی بلکہ اسے تو اپنا آپ بھی بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔

کل رات بڑے سالوں کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر مہندی لگوائی تھی اور کلائیاں بھر بھر کر چوڑیاں پہنی تھیں۔ اس وقت بھی گہرے سرخ رنگ کے خوب صورت کپڑوں میں وہ کسی گڑیا کی طرح سجی سنوری مزمل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب سے وہ مزمل کو دوبارہ ملی تھی وہ چند منٹ کے لیے بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہا تھا۔

"بابا! آپ تو ہماری بات ہی نہیں سنتے سارا وقت بس ممی کو ہی دیکھے جاتے ہیں۔"

مزمل رابعہ کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا جب عبدالواحد نے کچھ چڑ کر کہا وہ مزمل کو اپنا کوئی قصہ سنا رہا تھا اور مزمل اسے ہوں ہاں میں جواب دیتے ہوئے رابعہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے اس انداز نے عبدالواحد کو چڑا دیا تھا۔ مزمل اس کے انداز پر ہنس پڑا۔

"یہ تو بیٹا! جب تمہاری بیوی آئے گی تب تم سے پوچھوں گا۔"

"میں کبھی اپنی بیوی کو سارے کام چھوڑ کر یوں نہیں دیکھا کروں گا۔"

عبدالواحد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ مزمل نے اٹھ کر ہنستے ہوئے بے اختیار ہی اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ رابعہ مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر اپنا موبائل اٹھا کر وہاں سے جانے لگی تو مزمل نے جاتے جاتے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بس ابھی آئی ایک دوست کو فون کر آؤں"

"تو ہمارے سامنے ہی کر لو ایسی کون سی خاص دوست ہے تمہاری۔"

"دوست تو اتنی خاص نہیں ہے، مگر اس سے جو بات کرنی ہے وہ بہت خاص ہے، میں بس پانچ منٹ میں آئی۔"

مسکراتے ہوئے مزمل سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ لاؤنج سے باہر نکل آئی اور اپنے موبائل پر صبوحی کا نمبر ملانے لگی اسے صبوحی کے سامنے اعتراف جو کرنا تھا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے۔

"محبت اور محنت کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے۔" کبھی کبھار یہ صلہ ملنے میں دیر ضرور ہو جاتی ہے۔ مگر ملتا ضرور ہے۔

☼ ☼

اُمِ ایمان

بارش کا پہلا قطرہ
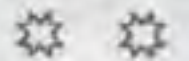
وہ خوفزدہ نظروں سے کبھی خوفناک اور گہری کھائیوں کی سمت دیکھتی کبھی مشاقی سے ڈرائیونگ کرتے اس کے مضبوط ہاتھوں کو کبھی فراخ پیشانی پر پڑی بے شمار شکنوں کو جو کسی گہری سوچ کا پتا دیتی تھیں۔

انہیں سفر کرتے ہوئے بلا مبالغہ تقریباً" آٹھواں گھنٹہ تھا۔ راستے میں دو جگہ رک کر انہیں نے گاڑی کو چیک کروا کے اس کی ٹنکی فل کرائی تھی۔ کچھ خشک خوراک کے ڈبے 'مشروبات کے ٹن خریدے اور ! نیز کچھ کھے لاکر اسے ——— دے دیے اور پھر سے وہ طویل اور تھکا دینے والا سفر شروع ہو گیا۔ عام حالات ہوتے تو وہ یقیناً" اس سفر کو انجوائے کرتی بل کھاتے ٹیڑھے میڑھے راستے جو سخت ترین پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے انتہائی دشوار گزار تھے کہیں دور برف پوش پہاڑ اپنی طرف متوجہ کرتے تو کہیں نیچے بہت دور بہنے والا دریا کا پانی اس کے اندر سراسیمگی کی گہری لہر دوڑا دیتا لیکن کچھ گھنٹے قبل گزرے انتہائی حیرت انگیز حالات و واقعات نے اسے حقیقتاً" چکرا ڈالا تھا۔ زندگی میں سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جو ہم اپنے لیے متعین کرتے ہیں بلکہ حالات اور واقعات کا اسی طرح ہونا ازل سے طے شدہ ہے حتیٰ کہ ایک پتے کا درخت سے ٹوٹ کر نیچے گرنا بھی' لیکن ہم نادان انسان اپنی زندگی کی تربیت کو کبھی اپنی کبھی دوسرے کی بھول بھلیاں سمجھتے ہیں اوپر بیٹھے کاتب تقدیر کو بھول کر۔

رضا حیات خان مقامی کالج میں ریاضی کے ایک قابل پروفیسر تھے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بڑا حلقہ ان کی قابلیت کا مداح تھا تو نوجوان نسل ان کے پر شفقت انداز کی گرویدہ تھی۔ علم کے خزانوں کی تقسیم کے لیے ان کے دروازے ہر وقت طالبعلموں کے لیے کھلے رہتے تھے۔ ان کی شریک حیات چار سال پہلے انہیں چھوڑ کر اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئی تھیں۔ پروفیسر صاحب کے دو ہی بچے تھے۔ بڑا بیٹا اسفر یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا جبکہ بیٹی ماہین رضا حیات بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھی جہاں پروفیسر صاحب پڑھاتے تھے۔

حیدر علی کا تعلق یہاں سے بہت دور دراز پہاڑی سلسلے کے علاقے سکردو سے تھا۔ پاکستان کے بلند ترین سرحدی مقام سے تعلق رکھنے والے حیدر علی کو تعلیم کی کشش شہر کھینچ لائی تھی۔ وہ یہاں ہوسٹل میں رہائش پذیر رہا تھا۔ پروفیسر رضا حیات کا بہت فرماں بردار اور چہیتا اسٹوڈنٹ ہونے کے ناتے وہ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ گزشتہ چار سال سے استوار رکھا گیا یہ تعلق اب استادی شاگردی کی حد سے نکل کر دوستانہ بے تکلفی کی حد میں شامل ہو گیا تھا کہ حیدر علی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب بھی شہر چکر لگاتا پروفیسر صاحب کے پاس ضرور آتا وہ بھی اس کی تعلیمی قابلیت اچھے کردار و گفتار کی وجہ سے اسے بہت توجہ دیتے اور اسفر کی ہی طرح سمجھنے لگے تھے۔ اب تو اگر اسے شہر میں رکنا بھی پڑ جاتا تو پروفیسر صاحب اسے اپنے گھر ہی ٹھہراتے تھے۔

زندگی اسی پر سکون نہج پر گزرتی رہتی اگر جو وہ واقعہ نہ ہو جاتا۔ اسفر کو اپنی یونیورسٹی کی کلاس فیلو سے محبت ہو گئی تھی وہ پروفیسر صاحب سے بات کرنا ہی چاہتا تھا کہ اس لڑکی نے فی الحال اسے منع کر دیا تھا کہ پہلے وہ خود اپنے ماں باپ کو اعتماد میں لے گی پھر وہ پروفیسر صاحب کو بھیجے لیکن فرح جو کہ ایک جاگیردار فیملی سے تعلق رکھتی تھی ان کی ——— شادیاں اپنے خاندان میں ہی ہوتی تھیں اور وہ بھی اپنے چچا زاد کی منگ تھی جسے وہ پسند نہیں تھا اور یونیورسٹی میں اسفر کو دیکھتے ہی دل ہار گئی تھی۔

فائنل کے امتحان ہو رہے تھے سو اس کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی کیونکہ اس کے ماں باپ ایک تو اسے مزید پڑھانے کے حق میں نہ تھے وہ بے حد ضد کر کے یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ چچا کے گھر والوں کی طرف سے بھی شادی کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور مالی' سماجی کسی قسم کی رکاوٹ بھی در پیش نہ تھی سو دونوں طرف سے زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ فرح کے تو ہوش ہی اڑ گئے جب اسے ساری صورت حال معلوم ہوئی۔ باپ کے سامنے تو وہ بول ہی نہ سکتی تھی

کہ وہ اپنی جاگیر کے سردار اور بہت رعب و دبدبہ رکھنے والی شخصیت تھے ہاں ماں کے سامنے خوب واویلا کیا کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں کر سکتی۔ اس کی ماں نے تو کیا ہی اس کی بات ماننی تھی الٹا دو تھپڑ لگا کر اس کی تعلیم اور یونیورسٹی کو ہی مورد الزام ٹھہرایا اور کہہ دیا کہ وہ آئندہ سے یونیورسٹی نہ جائے بھلے ہی پیپر کیوں نہ ہوں انہوں نے کون سا دلہن سے نوکری کرانی تھی۔

فرح کی ماں کو بیٹی کے تیور پریشان کر گئے تھے انہوں نے اسے تو ڈانٹ دیا تھا لیکن ڈر رہی تھیں کہ فرح کے والد تک یہ بات نہ ہی پہنچے تو اچھی بات ہے ورنہ وہ اس کے نتیجے میں اٹھنے والے بھیانک طوفان سے واقف تھیں۔ برادری میں دوسروں کے متعلق فیصلہ صادر کرنے والے سردار کیسے برداشت کرتے کہ ان کی بیٹی ان کے فیصلے سے روگردانی کی مرتکب ہو رہی ہو۔ فرح کی والدہ اپنے تئیں ہی معاملے کو سلجھا دینا چاہتی تھیں سو ڈانٹ، مار، پیار ہر انداز میں فرح کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اسی ہٹ دھرمی پر اڑی رہی کہ بے شک جان کیوں نہ چلی جائے وہ شادی کرے گی تو صرف اسفر سے۔ آخر کار اس نازک صورت حال کو فرح کی ماں اس کے باپ کے علم میں لے آئیں یہ سن کر وہ تو غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے شام کو ہی نکاح کی تقریب رکھ دی۔ فرح نے ساری صورت حال جب رو رو کر فون پر اسفر کو سنائی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ تب ان دونوں کو یہی مناسب لگا کہ سوچنے کا وقت نکل چکا ہے اب عمل کرنے کا وقت ہے۔ اس وقت ان دونوں وہی مناسب لگا جو انہوں نے کیا۔ فرح کے والدین کو اس سے کسی انتہائی قدم کی توقع نہ تھی سو اس پر کسی خاص نگرانی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ اپنی حویلی سے سڑک پار کر کے اپنی ملازمہ کے ساتھ وہ خود آئی تھی۔ آگے پکی سڑک پر کسی دوست سے مستعار لی گئی گاڑی لیے اسفر اس کا منتظر تھا۔ ملازمہ کو واپس بھیج کر اس نے ایک الوداعی نظر اپنے پیچھے ڈالی اور جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت دونوں نے جا کر کورٹ میں نکاح کیا اور اسفر اسے اپنے اس دوست کی طرف لے گیا جس کو یہ سارا قصہ پتا تھا اسے پروفیسر صاحب سے سخت رد عمل کی توقع تھی سو گھر لے کر نہ گیا تھا۔

کسی ایک فرد کی لمحاتی لغزش کی سزا اس کی آنے والی کئی نسلیں بھگتتی ہیں محبت کے نشے میں وہ دونوں اس بات سے غافل ہو گئے تھے۔ ماں باپ کی عزت کو اپنے قدموں تلے روند کر فرح اگر اسفر کے سنگ چلی آئی تھی تو آزمائش میں اسفر نے بھی اپنے والد کی تربیت کو ڈالا تھا۔ فرح کے والد کو جونہی اس کے جانے کی اطلاع ملی اس ملازمہ کا تو جو حشر ہوا سو ہوا انہوں نے اپنے سارے ذرائع استعمال کروا کے یونیورسٹی سے اس لڑکے کا پورا بائیوڈیٹا ہی منگوا لیا تھا۔ پروفیسر صاحب معمول کے مطابق یونیورسٹی میں تھے جب فرح کے والد ملک جہانداد خان کا فون انہیں موصول ہوا جس میں انہوں نے فوراً" سے بیشتر لڑکی کی بازیابی کے متعلق تقاضا کر کے انہیں دھمکی دی کہ نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

پروفیسر صاحب طبعاً" شریف النفس آدمی تھے۔ ان کی ساری زندگی علم و ادب کے حوالے اور دلچسپیوں کے ساتھ گزری تھی۔ اس قدر سنگین صورت حال اور انتہائی شرمناک جرم جس کا ارتکاب ان کے بیٹے سے ہوا تھا۔ پہلی فرصت میں اس سے رابطہ ہونے پر جو کچھ اس نے بتایا۔ وہ ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

اصل پریشانی کا آغاز تو تب ہوا جب رات کو فائرنگ کر کے ان کے گھر کی بیرونی دیوار و گیٹ کو نقصان پہنچا کر ان کو ہراساں کرنے کی کوشش کی گئی پروفیسر صاحب کو آنے والے اگلے فون میں کہا گیا کہ اگر ان کی بیٹی شام تک نہیں ملی تو ان کی بھی ایک عدد بیٹی ہے وہ اس کی خیر منائیں۔

اپنی جان کی بات ہوتی تو انہیں کوئی پروا نہیں تھی بات اب ان کی بیٹی کی عزت کی تھی وہ تو رو ہی پڑے تھے ایسے میں حیدر نام کا جگنو ان کے ذہن میں روشن ہوا تو فوراً" ہی فون کر کے اسے پہنچنے کی استدعا کی۔ حیدر علی جو آج ہی اپنے ذاتی کام کے لیے شہر پہنچا تھا

اپنے کام کو پس پشت رکھ کر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچا تھا۔

"میری بیٹی کی عزت شدید خطرے میں ہے حیدر۔ اس سے نکاح کر کے فوراً" اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔" شدید رنج و صدمے سے نڈھال بھرائی ہوئی آواز میں حیدر سے جیسے استدعا کی اور پروفیسر صاحب کی یہ حالت اسے شدید رنج میں مبتلا کر گئی۔ اسفر پر غصہ الگ آیا تھا جس نے نادانی میں ایک اندھا قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن اب وہ کتنے لوگوں کی زندگی سے روشنی لینے والا تھا کچھ معلوم نہ تھا۔ حیدر کئی بار اسفر سے مل چکا تھا۔ وہ قدرے لاپروا اور من موجی سا بندہ لگا تھا اسے اپنے والد کی شخصیت سے یکسر مختلف، لیکن وہ اتنا بڑا سنگین فیصلہ کر لے گا۔ ایسے لوگوں سے ٹکر لے گا جو غیرت کے نام پر کھڑے کھڑے بندوں کو ختم کرا دیا کرتے ہیں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

"بیٹا میں جانتا ہوں! میں نے تمہیں بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ اگر شادی نہیں ہوئی تو ہر ماں باپ کی طرح تمہارے ماں باپ نے بھی کچھ سوچا ہو گا لیکن میری بیٹی کی عزت اور جان دونوں خطرے میں ہیں اور میں اس وقت صرف ایک بے بس بیٹی کا باپ بن کر خود غرض ہو گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا اس کے بھائی کی خود غرضی کی سزا اسے ملے بیٹا میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" رندھے ہوئے لہجے میں جو بے بسی اور عاجزی پروفیسر صاحب کے لہجے میں تھی اس نے حیدر علی کو گنگ کر دیا پھر اتنی تیزی سے بعد کے معاملات طے ہوئے کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا ماہین جو بھائی کے اس ایک غیر ذمہ دارانہ اور خود غرض قدم پر انگشت بدنداں تھی۔ رات کو ہونے والی فائرنگ نے الگ خوفزدہ کیا ہوا تھا۔ اب جب پروفیسر صاحب نے بلا کر مختصراً صورت حال بتائی تو حالات و واقعات کی اس ترتیب نے اس کا دماغ جیسے ماؤف کر دیا نکاح نامے پر سائن بھی اس نے کسی مشینی انداز میں کیے۔ بابا انہیں جلد از جلد روانہ کرنا چاہ رہے تھے۔ نم آنکھوں کے ساتھ جب انہوں نے ماہین کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے گلے سے لگایا تو گویا اس کے حواس بھی جاگ اٹھے۔ ان کے گلے لگ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ حیدر نے فون کر کے سکردو جانے والی فلائٹ کا پتا کیا لیکن موسم ابر آلود ہونے کے باعث فلائٹ نہیں جا رہی تھی سو فون پر کسی دوست سے گاڑی منگوا کر جلد از جلد وہاں سے نکل آیا تھا۔ بائے روڈ سفر سے انہیں کم از کم تیس سے پینتیس گھنٹے درکار تھے وہ اتنا لمبا سفر ماہین کی وجہ سے کرنے سے کترا رہا تھا لیکن مجبوری تھی کہ بعض اوقات فلائٹس موسم کے باعث ہفتہ ہفتہ بھر نہ جا پاتی تھیں سو اس نے بائے روڈ ہی سفر شروع کر دیا تھا۔

آج سفر کرتے ہوئے انہیں تیسرا روز تھا فضا میں اچانک خنکی بڑھ گئی تھی جس نے سردی کی شدت کو بڑھا دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے حیدر ایک ہوٹل سے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس بار اس نے گاڑی روک کر اس سے نرمی سے کھانا کھانے کو کہا وہ دو دن سے پانی اور چائے پہ گزارا کر رہی تھی۔ پیٹ کو غم، خوشی، دکھ کسی قسم کی کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے وقت آنے پر اپنا ایندھن مانگتا ہے اور اس شدت سے اس تقاضے کو دہراتا ہے کہ وقتی طور پر انسان اپنی ساری پریشانیاں بھول کر صرف اسی کی ضرورت پوری کرنے کی طرف دھیان دیتا ہے۔

"باہر آ جائیے چل کر چائے پی لیں اور تھوڑا فریش ہو جائیں۔" اتنے طویل سفر کا پہلا طویل جملہ تھا جو حیدر کے منہ سے ادا ہوا تھا وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی جو شاید اس کے کھانا ختم کرنے کے انتظار میں تھا اب گاڑی کا دروازہ کھولے اسے باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ اپنی چادر کو سنبھال کر اس نے جونہی قدم نیچے رکھا قدموں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اتنا لمبا سفر کرنے سے ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی درمیانے درجے کے اس ہوٹل میں اس وقت لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک کمرے میں جا کر حیدر نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"جب تک میں چائے کا کہہ کر آتا ہوں آپ فریش ہو جائیں۔" اس نے کہا تو ماہین نے بھی فریش ہونے میں دیر نہ لگائی۔ دھلے منہ کو چادر سے ہی پونچھ لیا جس وقت وہ چادر ٹھیک کرکے دوبارہ پہن رہی تھی وہ دستک دے کر اندر چلا آیا ساتھ ہی چائے کی ٹرے اور ساتھ کچھ اسنیکس بھی تھے۔ حیدر نے ویٹر کے ہاتھ سے ٹرے لے کر تپائی پر رکھی اور اسے جانے کو کہا۔

"پلیز لیجیے۔ پھر ہمیں جلدی نکلنا ہے۔" کہتے ہی اس نے ایک کپ خود اٹھا کر پینا شروع کر دیا۔ اسی دوران حیدر کے موبائل کی بیل بجنے پر اس نے کال ریسیو کی۔ پروفیسر صاحب کی کال تھی انہوں نے بتایا کہ فرح نے جا کر عدالت میں بیان دے دیا تھا کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی اور اسفر کے خلاف یہ الزام غلط تھا کہ اس نے اسے حبس بے جا میں رکھا ہوا تھا۔ سو اس کے باپ کی طرف سے گزشتہ دن سے دھمکیوں کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ وہ اگر ماہین کی طرف سے تھوڑے مطمئن تھے تو اسفر کی طرف سے پریشانی ہنوز برقرار تھی کیونکہ بے شک وہ غلطی کا مرتکب ہوا تھا لیکن تھا تو ان کی اولاد ہی نا اور بہت با اثر لوگوں سے انجانے میں ٹکر لے بیٹھا تھا اور ابھی تک اپنے کسی دوست کے ہاں مقیم تھا۔

حیدر نے ماہین کی طرف فون بڑھایا تو اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر تیزی سے کان سے لگا لیا آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر نکل آئے تھے۔ بابا کی آواز سن کر کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ بابا نے بھی غالباً" اس کی کیفیت محسوس کر لی تھی جبھی اسے چند نصیحتیں کرنے کے بعد فون دوبارہ حیدر کو دینے کو کہا وہ چادر کے پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے سر جھکائے اس کی جی سر، جی سر فکر مت کریں کی تکرار سنتی رہی۔

آخر اس نے خدا حافظ کہہ کر موبائل جیب میں رکھا اور بولا۔

"ماہین جو بھی حالات اب تک رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ کچھ دیر میں ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ آپ کو بہت سے نئے رویوں نئے ماحول ہو سکتا ہے کچھ نامناسب حالات کا بھی سامنا کرنا پڑ جائے تو پلیز یہ سوچ کر برداشت کر لیجیے گا کہ کیسے بھی حالات ہوں میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔ پروفیسر صاحب مجھے اپنے آغا جان کی طرح عزیز ہیں ان سے میں نے آپ کو خوش رکھنے کا وعدہ کیا ہے اور ہم لوگ اپنے وعدوں پر جان دینے والے لوگ ہیں۔ میرے آغا جی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ مورے (ماں) بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے وہ کبھی بھی آپ کے لیے روایتی ساس ثابت نہیں ہوں گی۔" ماں کے ذکر پر اس کے وجیہہ اور مغرور چہرے پر نرمی کا تاثر پھیل گیا تھا۔ "ایک چھوٹی بہن ہے پلوشہ شادی شدہ ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا پتا وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی چل جائے گا۔ آپ یہ جیکٹ اور گرم چادر لے لیں کیونکہ آگے پڑنے والی سردی آپ میدانی علاقے کے لوگوں کے لیے بعض اوقات خاصی خوفناک ثابت ہو سکتی ہے۔" اس نے اپنی جیکٹ اور گرم شال اس کی جانب بڑھائی۔ خود وہ اب ایک سویٹر میں ملبوس تھا۔ ماہین نے شکریہ کے ساتھ دونوں چیزیں تھام لیں کیونکہ گاڑی میں ہیٹر ہونے کے باوجود وہ مسلسل کئی گھنٹے سے سردی محسوس کر رہی تھی اور گاڑی سے باہر آنے پر تو اسے کپکپی سی محسوس ہوئی تھی جو یقیناً" اس علاقے کی مخصوص آب و ہوا اور ماحول کا اثر تھا۔ اس نے جیکٹ پہنی چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی سفر دوبارہ شروع ہوا لیکن اب کی بار اندر کے خوف اور خدشات کا وہ عالم نہ تھا جس نے دو دن سے اسے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اپنے درمیان اس نازک رشتے کی موجودگی کا احساس اب اسے ہوا تھا جو وہ اسے دیکھتے ہی نظر چرا لیتی تھی۔ اسے کئی بار بابا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا لیکن کبھی یہ خیال دامن گیر نہ ہوا تھا کہ ایک دن یہی شخص اس کی قسمت میں لکھ دیا جائے گا۔ کچھ وہ خود بھی اپنے آپ میں مگن سی پڑھائی کی دلدادہ لڑکی تھی جو تعلیمی سفر میں کچھ کر کے دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن اسفر بھائی کے ایک خود غرضانہ فیصلے کے بعد کیسی تعلیم کہاں کی تعلیم۔ ہاں اس کی زندگی کے نئے راستے اسے کون سے سبق پڑھانا چاہتے تھے یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے اس کا تھکا ذہن اور بوجھل آنکھیں کب نیند کی آغوش میں چلی گئیں پتا ہی نہ چلا۔

اپنا علاقہ شروع ہوتے ہوئے بے ساختہ حیدر کی نگاہ بیک مرر میں سے اس پر گئی۔ سرخ و سفید چہرہ بالوں کی چند لٹیں ماتھے پر، ستواں ناک میں چمکتی نوز پن نیم وا گلابی ہونٹ اس کی گہری نیند کی خبر دے رہے تھے۔ پروفیسر صاحب سے کیے وعدے کا پاس تھا یا اپنے درمیان موجود نازک رشتے کا احساس اس نے اپنے آپ کو عجیب سی ڈور میں بندھے محسوس کیا جو اسے اس معصوم سی لڑکی تک لے جاتی محسوس ہو رہی تھی جسے تقدیر نے اچانک اس کی راہ میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ خود جو پہلے ہی رسم و رواج کے آہنی فیصلوں کے بھاری طوق کو گلے میں لٹکائے پھر رہا تھا اس صورت حال پر ٹھٹکا گیا تھا لیکن پروفیسر صاحب سے کیے گئے وعدے کا پاس اسے عہد نبھانے پر مجبور کر رہا تھا اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے حالات کو قسمت کے دھارے پر چھوڑا اور گاڑی کو آہستہ کرتے ہوئے اسے آوازیں دینا شروع کیں۔

"ماہین' ماہین..... اٹھ جائیے ماہین۔" تیسری یا چوتھی دفعہ بلانے پر وہ ایک دفعہ کسمسائی اور آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔

"بس پندرہ منٹ تک ہم گھر میں ہوں گے۔" شدید سردی کی ایک لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ بل کھاتی پہاڑی راستوں پر سڑک تاحد نگاہ پھیلے ہوئے برف پوش پہاڑ اسے مبہوت کیے دے رہے تھے۔ درختوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

"یہ خوبانی' سیب اور بادام اخروٹ کے باغات ہیں۔ ابھی تو سردی کی وجہ سے پھل نہیں لگے ہوئے لیکن ان کی اصل خوب صورتی آپ کو گرمیوں میں نظر آئے گی۔" اس کی محویت محسوس کر کے حیدر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"قدرت کی صناعی میں اگر انسانی ہاتھ کی کاریگری بھی شامل ہو جائے تو ایسے ہی نظر کو ٹھہرا دینے والا حسن وجود میں آتا ہے۔ ہمارے علاقے پر اب کچھ حکومت نے توجہ دینا شروع کی ہے ورنہ تو دشوار گزار راستوں کی صعوبتیں' موسم کی سختی اور بہت سارے عوامل تھے جو حکومت کو اس طرف کوئی تعمیری کام کرنے سے باز رکھتے تھے لیکن اب کچھ پکی سڑکوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ فوج کے یونٹ یہاں قائم ہو جانے کے بعد کچھ یہاں کی تعمیری صورت حال میں بہتری آئی ہے۔" اپنے علاقے کی تفصیلی صورت حال اسے بتاتے ہوئے وہ گویا ہوا۔ اس علاقے کا نام گمبہ ہے یہاں زیادہ تر بارانی زمینیں ہیں لیکن صرف وہی پھل کاشت ہوتے ہیں جو موسم کی سختی برداشت کر سکیں۔ اس لیے چھ ماہ تو بہت اچھے گزرتے ہیں۔ لیکن سردی کے چھ ماہ بہت دشوار ہوتی ہے یہاں کی زندگی۔ خیر اب آپ رہیں گی تو اندازہ ہو ہی جائے گا آپ کو۔" اس نے گاڑی درختوں سے گھرے پتھروں کے بنے قدیم اور جدید امتزاج سے بنے گھر کے سامنے روکی۔ ماہین پر اس جگہ کا گویا سحر طاری تھا وہ مسمرائز انداز میں اتری اور حیدر علی کی معیت میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے احاطے میں پہنچی۔

☼ ☼ ☼

"میں فریدہ گل ہوں۔ اپنے باپ سارنگ خان کی اکلوتی بیٹی شادی کے دس سال بعد پیدا ہونے اور مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھنے کے باوجود میرا باپ چاہ کر بھی میری پیدائش کی خوشیاں نہ منا سکا کیونکہ اپنے رسم و رواج کے مطابق بیٹی کی نصیب سے تو واقف تھا ہی وہی تاریک نصیب جو ازل سے اس قبیلے کی بیٹیوں کا نصیب چلا آیا تھا۔ جس میں بیٹی اگر بیاہنی ہوتی تھی تو خاندان میں چاہے اس کا جوڑ اپنے سے بیس سال بڑے مرد کے ساتھ بنتا۔ پندرہ سال چھوٹے مرد کے ساتھ یا تیسری چوتھی بیوی بھگتائے عمر رسیدہ

شخص کے ساتھ۔

میری ماں، جو چپکے سے آنکھوں میں بیٹے کے خواب سجائے کئی رنگین سپنے بن کر اپنی آنکھیں روشن کر چکی تھی۔ میری پیدائش پر اس کی آنکھوں کے وہ سارے جگنو بجھ گئے۔ بیٹی کے نصیب کی سیاہی اس کے ہونٹ جامد کر گئی۔ میں نے اپنے شعور میں اپنی ماں کو کبھی مسکراتے ہوئے نہ دیکھا جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی میرے والدین کی نگاہوں کا ہراس بڑھتا گیا ارد گرد جہاں بھی نظر دوڑاتے قبیلے کے وہی عمر رسیدہ مرد نظر آتے جو کوئی تین بیویاں رکھتا تھا تو کوئی چار اور انہی میں سے کسی ایک کے ساتھ انہیں میرا نصیب جڑا نظر آرہا تھا۔ نگاہوں کو مبہوت کردینے والا میرا حسن دیکھ کر ماں سرد آہ بھر کر نظر دوسری جانب کرلیتی تو باپ نگاہیں چرا لیتا۔ میری فکر نے ان دونوں کو وقت سے پہلے بڑھاپے کی سرحد پر لا کھڑا کیا۔ ابھی چودھواں ہی لگا تھا اور میں ان دنوں اپنی عمر کے حساب سے ــــ ہم جولیوں کے ہمراہ ساری وادی میں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی جب میرے داجی (والد) کے بھائی کے گھر نرینہ اولاد کی آمد ہوئی ساتھ ہی میرے نصیب کی ڈوری کو اس نومولود کے ساتھ جوڑ دیا گیا جس کا نام بعد میں رکھا گیا ہمارے رشتے کی جوڑ پہلے ہوئی۔ بی بی (ماں) اور داجی اب کچھ مطمئن نظر آنے لگے تھے میں اپنے الھڑپن میں ننھے حیدر کو اٹھائے اٹھائے پھرتی اس کے کتنے ہی کام خود بخود اپنے ذمہ لے لیے۔ وہ تھا ہی اتنا پیارا گول مٹول سا کہ خود ہی پیار آجاتا۔ شادی کے لیے لڑکا لڑکی سے چھوٹا ہونے کی صورت میں لڑکے کا پندرہ سال کا ہونا ضروری تھا۔ شعور کی بہت سی منازل طے کرنے کے بعد جب حیدر سے اپنے رشتے کی بابت معلوم ہوا تب تک ننھا حیدر مجھ سے کون سے رشتے کا تعین کرچکا تھا ــــ مجھے نہیں پتا تھا ایک صدمے کی کیفیت نے گھیر لیا۔ وہ بھاگ بھاگ کر جب میرے پاس اپنی کسی ضرورت کے لیے آتا مجھے اپنے آپ پر اور اس معصوم پر ترس آتا۔ خود ترسی کی وہ کیفیت کب ایک مضبوط محبت کی شکل اختیار کر گئی مجھے پتا ہی نہ چلا۔

میری آنکھیں مستقبل کے سنہرے سپنے بننے لگیں۔ جب سے دل کی نظر نے اسے الگ ہی انداز سے دیکھنا شروع کیا تھا اس کے سامنے پلکیں ہی نہ اٹھائی جاتیں حالانکہ اس کا وہ شروع کا سا انداز بدستور تھا۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا آغا جی (حیدر کے والد) اسے اسکول چھوڑ آتے واپس لے آتے ہمارے اپنے گاؤں میں اسکول کی سہولت موجود نہ تھی، میرے عین شباب اور اس کے لڑکپن کے درمیان جو کھٹا میٹھا سا ربط تھا وہ اس دن ٹوٹا جب اسے کلاس کے کسی رشتے دار لڑکے نے میرے حوالے سے چھیڑا۔ لڑکپن کے جوشیلے جذبات بھڑک اٹھے اس نے اس لڑکے کی زبردست پٹائی کی کہ اس کی جرات کیسے ہوئی وہ اسے اس کی بہن کے حوالے سے چھیڑے۔ آگ سا تپتا چہرہ لے کر وہ گھر آیا تھا۔

اور جس وقت مورے (حیدر کی ماں) نے اسے اس صورت حال سے آگاہ کیا کہ دو سال بعد اس کی مجھ سے شادی متوقع ہے کیونکہ وہ پندرہ کے سن میں پہنچنے والا ہے اس نے گھر میں طوفان کھڑا کردیا کہ وہ مجھے صرف اپنی بڑی بہن مانتا ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کے ذمہ دار وہ سب خود ہوں گے۔ مجھ تک یہ خبر میری سہیلی نے پہنچائی جس کی ماں حیدر کے گھر ملازم تھی تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔

دیہی علاقوں میں تعلیم کا گراف بھلے کچھ بھی ہو ذہنی پختگی کا عمل عمر سے کئی سال آگے چلتا ہے۔ میں نے بھی کچے ذہن سے اسے اپنا شوہر تسلیم کرلیا تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد میں نے سنا کہ وہ شہر مزید پڑھنے کے لیے چلا گیا۔ آغا جی نے اس شرط پر جانے کی اجازت دی تھی کہ دو سال بعد اسے مجھ سے ہر صورت شادی کرنا ہوگی۔

پندرہ سال کا بھرپور نوجوان جب شہر سے واپس آیا تھا تو میری خواہش، خواب ادھورے پن کا درد لیے اس کے منتظر تھے۔ کالے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار جگمگا اٹھے تھے۔ مورے اور آغا جی نے اسے کن شرائط پر یا واسطوں پر راضی کیا مجھے نہیں معلوم

لیکن جس دن مجھے بیاہ کر اپنے گھر لے آیا میرا مقام اس نے مجھے اسی دن بتا دیا تھا میں جو دیوی بن کر اس کے قدموں کی بھینٹ چڑھنے کو تیار تھی۔ سوئے ہوئے جذبے خوشی سے بیدار ہو لگے تھے انہیں اس ظالم نے یہ کہہ کر دوبارہ سلا دیا کہ اس نے مجھے کبھی بھی اس نظر سے نہ دیکھا تھا نہ قبول کیا تھا۔ مورے اور آغا جی کی قسمیں مجھے اس گھر میں تو لے آئیں لیکن اس کے دل تک لے جانا ان کے بس کی بات نہیں تھی نہ ہی میرا حق دلوانا۔

کتنے طویل شب و روز تھے جو گزرتے چلے گئے۔ داجی جوان مردوں سے گھبرا گئے تھے جن کی میں تیسری یا چوتھی بیوی بن کر جاتی۔ حیدر کی پہلی بن کر بھی میری محرومی اور ناخوشی ان کو میرے چہرے پر نظر آتی۔ میرے دکھ کی دیمک آہستہ آہستہ ان کو چاٹ گئی کہ ایک دن مٹی کی بے جان مورت کی مانند ڈھے گئے اور کئی ماہ بعد ان کے پیچھے بی بی نے بھی آن واحد میں رخت سفر باندھ لیا تھا۔ اس ستمگر نے تو مجھے ماں باپ کا پرسہ دینا تک گوارا نہیں کیا۔ بیوی نہ سہی بچپن کی دوست تو تھی نا، تیرہ سال اس کے لاڈ اٹھائے تھے تین حرف تسلی کے بھی اس کی زبان سے نہ نکلے۔ خاموشی کی ایک دبیز تہہ اندر اترتی چلی گئی تھی۔ باہر موسم کی برف تھی تو اندر جذبے بھی برف بن گئے تھے۔ جذبوں کی اس پامالی پر اب دکھ غم جیسے لفظ بے معنی ہو گئے تھے۔

حیدر اب شہر میں ہوتا تھا مہینوں بعد چکر لگتا تھا اس کا، کبھی آغا جی بصد اصرار بلا بھیجتے میں نے مورے اور آغا جی کی حالت دیکھ کر ان سے کہا تھا کہ حیدر کی جہاں وہ چاہتا ہے شادی کردیں تاکہ میرے سر پر دو بزرگوں کی سیلی زندگی کا بوجھ نہ رہے میری تجویز پر آغا جی تو مجھے گلے سے لگا کر رو ہی پڑے تھے لیکن میرے جذبوں کے گلیشیر نے ایک بھی آنسو کا قطرہ میری آنکھوں کو دینے سے انکار کردیا سو آنکھوں کے سوتے خشک ہی رہے۔ تعلیم کے محاذوں میں سے پتا نہیں کون سے محاذ پر تھا وہ جب آغا جی بھی برف کا تودہ کرنے سے ہمیں

چھوڑ کر چلے گئے تو میں نے اس اونچے لمبے حیدر کو آغا جی کی چارپائی سے سر ٹکرا کر روتے دیکھا تھا۔ مورے اس سے سخت خفا تھیں اور وہ پیاری سی لڑکی پلوشہ جو کہنے کو تو حیدر کی بہن تھی لیکن اس جیسی کوئی خصوصیت اس کے اندر نہ تھی، بہت ہمدرد، ڈرپوک اور قدرے کھلنڈری پلوشہ کو قبیلے نے جب سردار شیر خان کے ساتھ رخصت کرنے کا فیصلہ کیا تو جہاں میرا دل خون کے آنسو رویا تھا ایک اور فریدہ گل کی بربادی پر وہاں بڑی بڑی کتابی باتیں کرنے والا حیدر بھی چپ کر کے رسموں کی اونچی اور آہنی دیوار سے ٹکرا نہ سکا اور اس کی رخصتی والے دن چپ چاپ شہر چلا گیا۔

اس دن، بہت دنوں بعد میں نے اسے چلاتے سنا تھا۔

"کیا مل جاتا ہے آپ لوگوں کو زندگیاں تباہ کر کے پہلے مجھے زندہ درگور کردیا اب اس معصوم کو اس ساٹھ سالہ بڈھے سے منسوب کر کے کون سا والدین ہونے کا حق ادا کر رہے ہیں آپ۔"

"یہی ہمارے بنائے ہوئے اصول ہیں اور ان ہی کے ساتھ ہمیں زندگی گزارنی ہے۔" آغا جی کی آہستہ آواز اس کی تیز آواز میں دب گئی تھی۔

"تو انسانوں کے ہی بنائے گئے اصول ہیں نا خدا اور اس کے نبیؐ نے تو نہیں بنائیں یہ ظالمانہ رسمیں جو توڑی نہ جاسکیں۔ اللہ ظلم نہیں کرتا ظالم تو ہم انسان ہوتے ہیں جو اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔"

پتا نہیں کون کون سے دکھ اس کے اندر رو رہے تھے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی وہ برداشت کر گیا تھا لیکن پلوشہ سے بہت پیار تھا اسے جو اس کے ساتھ ایسا کچھ برداشت نہیں کرپا رہا تھا۔

"چھوڑ دیں ایسی رسمیں جو آپ کو زندہ درگور کر دیں۔ شہر چلیں میرے ساتھ آغا جی۔ وہاں جا کر ایک نیا جہان بنائیں گے جہاں یہ مجبوریوں کے طوق نہ ہوں۔ ذات برادری کے اندھے گورکھ دھندے نہ ہوں۔" سرخ آنکھیں لیے وہ التجائیہ انداز میں آغا جی کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

"بڑھاپے میں اپنی مٹی چھوڑ جاؤں حیدر؟ اپنے باپ دادا کی قبروں کو لاوارث چھوڑ جاؤں؟ تو تو یہ بھی نہیں جانتا کہ بے جڑ پودا تو زمین بھی قبول نہیں کرتی۔ اچھے برے جیسے بھی ہوں انسان اپنے رشتوں کے ساتھ کھڑا توانا دکھتا ہے۔ تجھے برادری کی یہ رسمیں زنجیریں دکھتی ہیں تو توڑ ڈال یہ زنجیریں اور چلا جا لیکن ہمیں مجبور نہ کر۔" نم آنکھوں کے ساتھ کہتے آغاجی یہ کہہ کر وہاں رکے نہیں تھے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ حیدر بھی اسی دن اپنا بیگ اٹھا کر شہر چلا آیا اور کتنے ہی دن واپس مڑ کر نہیں دیکھا۔

پلوشہ بیاہ کر شیر خان کے سنگ چلی گئی تو گھر کے سونے آنگن میں مورے اور میں ملازماؤں کے ہمراہ اکیلے رہ گئے تھے۔ وہ تو کرم ہوا کہ شیر خان عام مردوں جیسا نہ نکلا اس نے پلوشہ کو حقیقی خوشیاں دینے کا وعدہ کیا اور نبھایا بھی دو بیویاں مر چکی تھیں۔ بچے جوان اور شادی شدہ تھے۔ پلوشہ خوش تھی یا نظر آنے کی کوشش کرتی تھی یہ میں کبھی نہ جان سکی۔ آغاجی کے جانے کے بعد اب وہ جلدی جلدی آنے لگا تھا۔ زمینوں کی موسمی کاشت اور ذات برادری کے فیصلوں کو بھی نہ چاہتے ہوئے نبھاتا کہ آغاجی کے بعد ان کی نسل اسی سے چلنی تھی۔ ان ہی دنوں جب میری زندگی کے سونے پن کے سوا سب کچھ بظاہر سیٹ ہی نظر آتا تھا کہ حیدر اب مستقل گھر آ گیا تھا کبھی کبھار شہر چکر لگاتا مجھ سے روایتی میاں بیوی کا تعلق تو اس نے کبھی رکھنا گوارا کیا ہی نہ تھا ہاں کوئی ایک آدھ جملہ مورے کی صحت کے حوالے سے ضرور سماعت میں انڈیل دیتا دل کی بنجر زمین ان لفظوں سے ہی سیراب ہو جاتی تھی۔

پلوشہ کے خاوند کی اچانک موت ہم سب کو ہلا کر رکھ گئی۔ پندرہ سال کی پلوشہ بیاہی گئی تھی اور سترہ سال کی بیوہ ہو کر واپس ہمارے پاس آ گئی تھی۔ مورے اب پلوشہ کو دیکھ کر زیادہ باہمت ہو گئی تھیں۔ جو پتھر کی بے جان مورت کی مانند جہاں بیٹھتی بیٹھی رہ جاتی پتا نہیں کیوں کائنات کے اس خوب صورت قطعے کی ہر عورت اپنے ساتھ ایک ہی دکھ کی صلیب لیے جیسے چلی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن جب حیدر شہر گیا ہوا تھا اپنے معمول کا کوئی کام نبٹانے تو مورے کے سر کی مالش کرتے میرے ہاتھ رک گئے۔ پلوشہ کی زمین پر تنکے سے لکیریں لگاتی انگلیاں ساکت ہو گئیں وجہ حیدر نہیں تھا اس کے ساتھ داخل ہونے والا وہ وجود تھا جس نے ہم تینوں کے ذہنوں کو الگ الگ خیال بخشے تھے۔ حیدر کی گرم جیکٹ اور گرم شال اس کی حیثیت کا تعین خود ہی کر رہے تھے اور میری حیثیت؟ میرا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر دوبارہ ابھرا تھا۔

☼ ☼ ☼
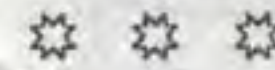
دریچے میں کھڑے ہو کر اس نے چاروں اور نگاہ دوڑائی۔ گلیاں راستے، درخت، چھتیں ہر چیز نے گویا برف کی چادر اوڑھ لی تھی۔ برف باری کا یہ سلسلہ یونہی وقفے وقفے سے جاری تھا۔ اوپر سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہیں بلندی کا سفر طے کر کے نیچے آئیں تو قدرت کی کاریگری پر ذہن اش اش کر اٹھا۔ نیچے ان کے گھر کی پچھلی سائیڈ پر شفاف پانیوں کا ایک جھرنا گزر رہا تھا جس کا منبع دور کہیں بنے ہوئے اونچے برف پوش پہاڑ تھے۔ گاؤں کی کافی عورتیں اس وقت وہاں بیٹھی کپڑے دھوتی نظر آ رہی تھیں۔ ابھی کل ہی بابا سے اس کی بات ہوئی تھی وہ اس کے متعلق بہت فکر مند تھے اسفر اور فرح دبئی جا چکے تھے۔ اس نے بابا کی اپنی طرف سے بہت تسلی کرائی تھی اور کہا تھا کہ وہ جلد ہی ان سے ملنے آئے گی۔ کھٹکے پر اس کا ارتکاز ٹوٹا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر فریدہ گل چائے کا کپ تپائی پر رکھتی نظر آئیں۔

"چائے پی لو ٹھنڈی ہو جائے گی۔" اس کی اپنے پر مرکوز نظروں سے گھبرا کر وہ جلدی سے بولیں سرخ و سفید چہرہ مزید سرخ پڑ گیا تھا۔

"رکھ دیں پی لوں گی۔" نرم سی مسکراہٹ نے ان کا حوصلہ بحال کیا تو وہ بھی جواباً" زبردستی مسکرائیں اور باہر چلی گئیں۔ اتنے حسین چہرے بہت کم ماہین کی نظر سے گزرے تھے۔ حسن کے ساتھ سوز و گداز بھی ہو تو ایسا ہی حسین امتزاج ہوتا ہو گا جیسا فریدہ گل کے چہرے پر تھا۔

"میں عورت ہو کر کچھ پل ان کے چہرے پر نظر نہیں ٹکا پاتی تو حیدر..." آگے کے سوال نے اس کے اندر کے خالی پن کو مزید بڑھا دیا۔ اندر کی وحشت سے گھبرا کر وہ باہر چلی آئی جہاں بڑے کمرے میں وسط میں انگیٹھی ٹائپ کا چولہا تھا جس میں ہمہ وقت لکڑیاں جلتی رہتیں اور اس کے دھوئیں کے اخراج کا سسٹم درمیان میں ایک پائپ گزار کر کیا گیا تھا جس کا منہ یقیناً" اوپر چھت پر تھا کیونکہ مسلسل آگ جلتی رہنے کے باوجود وہاں دھوئیں کا نام و نشان نہ تھا۔ مورے تخت پر تکیہ لگائے نیم دراز تھیں کونے میں باداموں کا ایک بڑا ڈھیر لگا تھا۔ چار ملازمائیں جن میں سے دو ان کو چھوٹے پتھروں سے توڑتی اور دو ان میں سے بادام نکال کر چھلکے الگ کرتی جا رہی تھیں۔ فریدہ گل اور پلوشہ پتا نہیں کہاں تھیں۔ مورے نے اس کی جگہ اپنے پاس بنائی اور اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگیں جن میں زیادہ حیدر کے بچپن کی تھیں کہ وہ کتنا شرارتی تھا۔ انہیں کیسا دوڑائے رکھتا تھا۔ اسی دوران ملازمہ ایک پلیٹ میں خشک خوبانیاں اور دوسرے میں توڑے ہوئے بادام رکھ گئی۔

"اتنے سارے بادام کیا کریں گی؟" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا اپنے بے تکے سوال پر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔

"تیل نکالتے ہیں گھر کے استعمال کا چھوڑ کے باقی مارکیٹ میں بھیج دیتے ہیں۔ یہاں تمہیں کھانے کی ہر ڈش میں بادام ضرور نظر آئے گا۔ حیدر کو باداموں والی طاہری اور ساتھ بادام کی چٹنی بڑی پسند ہے۔ فریدہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ اس کے ہاتھ کے کھانے کھا کے دیکھنا۔" پتا نہیں حیدر نے گھر کے لوگوں سے اس کے متعلق کیسے بات کی تھی کہ سب ہی افراد نے کھلی بانہوں سے اس کا استقبال کیا تھا۔ مورے میں تو اس کو کو ماں ہی مل گئی تھیں۔ پلوشہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں وہ خود ہی پوچھتی تو جواب مل جاتا زیادہ تر چپ ہی رہتی اس کے اکیلے کا حیدر کی زبانی سن کر اس چھوٹی سی لڑکی کا دکھ اسے رلا گیا تھا۔ باقی رہی فریدہ تو ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتیں کبھی ملازماؤں کے سر پر کھڑی باڑے سے زو (مقامی جانور) کا دودھ نکلواتی۔ کبھی کچن میں کوئی کام کرتی۔ کبھی مورے کو دوائیاں کھلاتی۔ اسے وہ قدیم کہانیوں کا کوئی پراسرار کردار لگتی جن کی ذات کے ساتھ پتا نہیں کتنے اسرار بندھے تھے۔

چوتھا دن تھا اسے یہاں آئے حیدر تو اسی دن اسے چھوڑ کر کسی پنچایت میں شرکت کی غرض سے گیا تھا۔ واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی اس کی۔

دوپہر کو رک جانے والی برف باری کا سلسلہ دوبارہ سے شروع ہو گیا تھا۔ انسان، جانور سب ہی اپنی اپنی کمین گاہوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں کے یہ تین چار ماہ ایسے ہی گزرتے تھے۔ رات کو پلوشہ اچانک ہی اس کمرے میں آ گئی جس میں وہ رہائش پذیر تھی اس نے اس کے لیے اپنے پاس جگہ بنائی اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی۔ پہلے دو تین دن تو وہ جھجکتی رہی تھی لیکن آج ماہین کے ساتھ اس نے کئی باتیں کیں۔

"سنو پلوشہ جب پندرہ سال کی عمر میں تم لوگ شادیاں کر دیتے ہو تو فریدہ گل کی شادی کیوں نہ ہو سکی؟" بہت دنوں سے ذہن میں کلبلاتا سوال زبان کی نوک پر آیا تو وہ خود کو روک نہ پائی۔

"فریدہ گل کی شادی؟" پلوشہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں مزید پھیلا کر اسے دیکھا۔

"فریدہ گل کی شادی تو ہو چکی ہے حیدر لالا کے ساتھ۔ اس نے نہیں بتایا آپ کو؟" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔

"خیر تم کو آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ہمارا بڑا بھابھی ہے وہ پر حیدر لالا مانتا ہی نہیں اس رشتے کو۔ اس کا دل نے کبھی بھابھی کو بیوی سمجھا ہی نہیں اور برادری کے رواج نے اس کو یہ رشتہ توڑنے ہی نہیں دیا۔ داجی، بی بی یہ غم لیے قبر میں اتر گئے۔ آغاجی کو فریدہ

گل کا دکھ دیمک کی طرح چاٹ گیا۔ اب تو فریدہ بھابھی نے خود ہی بھائی کو اجازت دیا کہ وہ اپنی مرضی سے دوسری شادی کرلے اور وہ شہر سے تم کو بیاہ لے آیا۔"

انکشافات کے بم تھے جو اس کے وجود اور دل دماغ سے آکر ٹکرائے تھے۔ حیدر جیسا پڑھا لکھا انٹلکچوئل بندہ ایسا سنگین جرم کرسکتا تھا کہ کسی جیتی جاگتی زندگی کو زندہ درگور کردے۔ کتنے سال ہوگئے ان کی شادی کو اور اس نے اس عورت کو اس کے شرعی حق سے محروم رکھا جو اس کا فطری حق تھا جس کو قسمت کے پھیرے نے اس کے ساتھ لا کھڑا کیا تھا۔ پلوشہ نے یہ کیسے گھاؤ ڈالے تھے اس کے دل پر۔ وہ تو مرد تھا نا ٹکرا جاتا ان فیصلوں کے خلاف جن کو نبھانے کی طاقت اس کے اندر نہ تھی۔ اسے فریدہ گل کا حزن و ملال سے مزین چہرہ نظر آیا تو اس کے دکھ پر دل رو اٹھا۔

پلوشہ تو باتیں کرتے کرتے کب کی سوگئی۔ اس نے وہ تمام رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ صبح کے قریب جا کر اس کی آنکھ لگی۔ دوبارہ آنکھ کھلنے پر اس نے چمکتی دھوپ کی روشن کرنوں کو چھن چھن کر کمرے کی کھڑکی میں آتے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ درد سے سر پھٹا جارہا تھا اور صاف دن نکلا ہونے کی وجہ سے سردی بھی حد سے سوا تھی۔ ابھی اٹھنے کا ارادہ کرہی رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر حیدر اندر چلا آیا۔ سلام کرنے کے بعد وہ بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ تھکن اس کے پورے وجود سے جھلک رہی تھی۔

"ہاں بھئی سنائیں کیسے گزرے یہ دن؟ کیسے لگے ہم لوگ اور ہمارا علاقہ؟" قصداً" اپنے لہجے کو بشاش ظاہر کرتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں اور تکیہ کمر کے پیچھے رکھ کر ٹیک لگائی۔ اس کے جواب دینے سے قبل ہی فریدہ گل ٹرے میں ماہین کا ناشتا اور چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئیں ٹیبل پر برتن سیٹ کیے چائے کا کپ حیدر کو دیا اور ماہین کی طرف مختصر نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"آپ ناشتا کریں آپ کی چائے بھجواتی ہوں۔" انہیں دیکھتے ہی ماہین کو ساری گزری باتیں سرعت سے یاد آئیں جو پلوشہ نے بتائی تھیں۔ اس نے ایک دزدیدہ نظر حیدر پر ڈالی جو گرد و پیش سے بے خبر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ فریدہ گل اس دوران کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

"پروفیسر صاحب کا فون آیا تھا آپ کی خیریت دریافت کررہے تھے۔" دفعتاً" وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"ہوں..... مجھے بھی کال کی تھی انہوں نے۔" اس نے ناشتے کے لوازمات نظر انداز کرکے صرف چائے لیتے ہوئے کہا۔

"میں اگر یہاں ایک اسکول کھولنا چاہوں تو....؟" اس نے ڈرتے ڈرتے اس سے سوال کیا۔

"اچھی سوچ ہے لیکن یہاں کے لوگ جس قدیم سوچ میں صدیوں سے جکڑے ہوئے ہیں اس فرسودہ سوچ سے جان چھڑانا نہیں چاہتے نہ ہی لڑکیوں کی تعلیم کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لیے ایسا قدم اٹھانے کی کسی نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی پلوشہ کو بھی میں نے گھر پر ہی ابتدائی بکس پڑھادی تھیں حالانکہ بہت خواہش تھی میری کہ وہ کچھ پڑھ لکھ جائے لیکن....." ایک طویل سانس لینے کے بعد خاموش ہوگیا۔ "خیر آپ مایوس نہ ہوں پہلا قطرہ کسی نے تو بننا ہے تو آپ کیوں نہیں میں جلد ہی اس سلسلے میں کچھ کرکے آپ کو بتاتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ تھوڑی دیر سوتا ہوں شام کو خشک فروٹس کی ڈلیوری بھجوانی ہے۔" کہتے ہی اس نے کمبل منہ تک ڈال لیا۔ کچھ ہی دیر میں اس کے خراٹے کمرے کی فضائیں گونجنے لگے۔ اپنے دکھتے سر کو تھام کر وہ باہر چلی آئی۔ سورج کی گرم شعاعیں جو میدانی علاقوں میں اپنی تپش جسم و روح میں منتقل کر دیتی ہیں یہاں کی سردی کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھیں۔ سردی کی شدت کئی گنا زیادہ تھی اس نے اپنے گرد جیکٹ کو مزید کسا

یہاں کے لوگ عام

لباس اور ایک آدھ گرم چیز میں دکھائی دیتے تو وہ حیران رہ جاتی کہ اتنے کم کپڑوں میں وہ اتنے سخت ماحول میں کیسے آرام سے روزمرہ کے کام انجام دیتے نظر آتے، حتیٰ کہ بچے بھی شاید موسم کی سختی ان کے وجود میں رچ بس چکی تھی۔ کچن میں آتے ہی اسے فریدہ گل ملازموں کے سر پر کھڑی کچھ ہدایات دیتی نظر آئیں۔ اسے دیکھ کر چونکیں۔

"کچھ چاہیے کیا؟"

"نہیں آپ سے باتیں کرنے کو دل کررہا تھا۔"

حیرت سے فریدہ گل کی خوب صورت آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھل گئیں۔ شاید وہ اس سے اس بات کی توقع نہیں کررہی تھیں۔ اس لیے کچھ توقف کے بعد ملازماؤں کو ہدایات کا سلسلہ دوبارہ سے جوڑا اور ان سے فارغ ہوکر اسے اشارہ کرتی باہر آگئیں۔ موسم چونکہ صاف تھا اس لیے اسے ساتھ لیے پچھلے باغ کی طرف آگئیں۔ درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے ٹنڈ منڈ درختوں پر جمی برف اور زمین پر پڑی برف عجیب ہی تاثر پیش کررہی تھی۔ سائیڈ پر بنے پتھروں کے حوض کی منڈیر پر دونوں آبیٹھیں۔

کافی دیر ایک معنی خیز خاموشی ان کے درمیان رہی آخر ماہین نے ہی سکوت کی اس جھیل میں آواز کا پہلا کنکر پھینکا۔

"مجھے جب آپ کے بارے میں پتا چلا فریدہ گل تو پہلے تو بہت دکھ ہوا بعد میں غصہ بھی بہت آیا آپ پر کہ اتنا عرصہ برداشت کرتی رہیں بغیر وجہ کے ایک مرد کی بے رخی۔ اس سے اپنا حق کیوں نہیں مانگا آپ نے جب کہ آپ کے ساتھ آغاجی مورے پلوشہ جیسے مخلص لوگوں کی محبتیں بھی تھیں مضبوط ساتھ بھی تھا۔"

"اس نے مجھے حق مانگنے کا حق کبھی دیا ہی نہیں تھا میں نے سمجھا تھا محبت سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے کسی بھی فرد کو زیر کرنے کے لیے خصوصاً" مرد کو اور حیدر تو ویسے ہی مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا کیا تھا جو سوچنے کا انداز الگ تھا۔ نکاح کے بول اس کے دل کی حالت بھی بدل دیں گے جب وہ اس رشتے کے بارے میں آغاجی' مورے کی خوشی کے بارے میں سوچے گا تو اس نے ہر رشتہ پوری ایمانداری سے نبھایا سوائے اس رشتے کے ہر محبت کو دل میں جگہ دی بس فریدہ گل کی محبت کو دل سے نکال دیا۔"

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بغور دیکھتے ایک عورت اپنا دکھ دوسری عورت کے سینے میں منتقل کرنے لگی عورت بھی کون اس کے مرد کی دوسری بیوی پر یہاں احساسات و جذبات ویسے نہیں تھے جیسے دو سوتنوں کے آپس میں رقابت کے حوالے سے ہوتے ہیں۔

"اب تو بہت زمانے بیتے" دل نے اس راہ پر چلنا ہی چھوڑ دیا دل بہت جلتا تھا حیدر کی سونی زندگی کو دیکھ کر۔ بہت بار آغاجی سے کہا جہاں وہ کہے اس کی شادی کر دیں۔ یقین کریں میں بہت خوش رہوں گی اسے خوش اور اپنی زندگی میں بستا دیکھ کے۔ ایسے میں خوش نہیں تھی اس کی سونی زندگی کو دیکھ کر۔ اس گھر کی ویرانی مجھے اپنی نظروں میں مجرم بنادیتی تھی پھر جب وہ تمہیں لے آیا مجھے لگا اللہ نے میری دعائیں سن لیں۔ حیدر کا بہت خیال رکھنا ماہین۔ حالات نے اسے بہت کٹھور اور بظاہر سخت بنادیا ہے لیکن میں جانتی ہوں ان سنگلاخ پتھروں میں رہنے والے حیدر کا دل موم جیسا ہے اسے بہت پیار دینا ماہین۔ بہت پیار اور بھول جانا کہ اس کی زندگی میں کوئی اور عورت تھی یا ہے۔ وہ تو زندگی کی کتاب کا ایک ورق تھا۔ جواب پلٹا جاچکا ہے۔ میری زندگی کا مقصد اب مورے کی خدمت ہے اور بس۔"

ماہین تشکر کے احساسات کے زیر اثر اس عورت کو دیکھے گئی جس نے اپنی زندگی کی تلخیوں کو ایک بھی شکوے سے عبارت نہیں کیا نہ انسانوں سے نہ پیدا کرنے والے سے اس شخص سے بھی نہیں جو حقیقت میں اس کا سزاوار تھا۔

"اٹھو یہاں بہت سردی ہے۔ تم عادی ہی کہاں ہو ان موسموں کی۔" ابھی وہ جواب میں کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ فریدہ گل نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لیے بڑے کمرے میں چلی آئیں یہ جانے بغیر کہ ماہین نے بھی اپنے اندر اسی وقت ایک عہد کیا تھا

جس میں اس محبتوں سے بھری لڑکی کی وہ خوشیاں لوٹائی تھیں جو اس کے خیال میں وہ کھو چکی تھی اب ان خوشیوں پر ماہین کا حق تھا لیکن ماہین کا خیال اس سے مختلف تھا۔

☼ ☼ ☼

اس خوب صورت علاقے پر بہار کا جوبن عروج پر تھا شدید سردی کی جگہ ہلکی خنکی نے لے لی تھی۔ ہریالی اور شادابی لوٹ آئی تھی۔ خوبانی، سیب، آڑو اور بادام کے درخت پھلوں سے لدے تھے۔ جنگلی پھولوں کی مہک سانسوں سے اتر کر روح میں نئی ترنگ جگا ڈالتی تھی۔ ایک اچھے کام کا بیڑہ اٹھانے کی انسان اگر ٹھان لے تو خدا اس کام میں غیبی مدد شامل حال کرتا ہے۔ ماہین نے بھی کسی کی روٹھی خوشیاں لوٹانے کا عہد کیا تھا اور اس کے رب نے اسے مایوس نہیں کیا تھا فریدہ گل کے حقوق کی جنگ حیدر سے اس نے لڑی تھی اور اس وقت تک یہ اعلان جنگ جاری رکھا تھا جب تک فریدہ گل کو اس کا جائز اور شرعی حق دلوانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ کچھ حیدر خود بھی دل ہی دل میں اپنے اس جرم پر شرمندہ تھا۔ اس نے اگر شروع سے فریدہ کو بہن سمجھا تھا تو اس میں فریدہ گل کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ ضمیر کی چبھن اسے ہمیشہ بے چین رکھتی تھی اور اب جب فریدہ گل کے چمکتے چہرے کی جانب نگاہ کرتا تو اسے لگتا کہ وہ خود مطمئن ہو گیا ہے۔

فریدہ گل ماہین کا جتنا شکریہ ادا کرتی کم تھا، اب جبکہ ماہین ماں بننے والی تھی اس سے زیادہ فریدہ گل خوش تھیں۔ حیدر نے ماہین کو اسکول کھول کے دیا تھا جہاں پہلا ہفتہ تو ماہین اکیلی بیٹھی رہی تھی کسی نے اپنے بچے نہیں بھیجے تھے لیکن اس کے مایوس ہونے سے پہلے چار سال کی سرخ و سفید بچی کو بستہ کندھے سے لٹکائے اندر آتے دیکھ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ وہ بچی بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اس کے بعد بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور اب سو کے قریب بچے اس کے اسکول میں موجود تھے حیدر اسکول کو سرکاری منظوری دلوانے کی تگ و دو میں تھا۔ ماہین ایک دفعہ حیدر کے ساتھ جا کر بابا سے مل آئی تھی۔ انہی کی زبانی پتا چلا تھا کہ آرام و آسائش کے جھولے لینے والی فرح نے اسفر کے ہمراہ جب عملی زندگی میں قدم رکھا۔ زندگی کے مصائب اور مشکلات کی کڑی دھوپ کا سامنا کرنے کے باعث محض چند ماہ میں ہی پریشان ہو کر اس نے اپنے والدین سے رابطہ کر کے معافی طلب کی اور ان کی معافی ملتے ہی اس نے اسفر سے جان چھڑانے میں زیادہ ٹائم نہیں لگایا تھا ماں باپ کی دعاؤں کے بغیر بسائے جانے والے گھر شاید ایسے ہی ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔ اس پل ماہین نے سوچا تھا۔

اسفر اب بھی دوبئی میں تھا کسی کمپنی میں ملازمت کر رہا تھا اس نے بابا سے روتے ہوئے اپنی غلطی کی معافی مانگی تھی اور بھلا والدین بھی بچوں سے ناراض رہ سکتے ہیں۔ انہوں نے بھی سب کچھ بھول کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ بابا ماہین کی جانب سے مطمئن تھے۔ ان کا جلدی میں کیا گیا فیصلہ اس کے لیے دانشمندانہ ثابت ہوا تھا۔ بابا کو ان کی صحت کے حوالے سے کئی ہدایتیں دیتی وہ واپس اپنے گھر چلی آئی تھی۔ پلوشہ میں کئی مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ابتدائی کچھ کلاسز تو حیدر اسے گھر پر کرا ہی چکا تھا۔ ماہین اب اسے اسکول لے کر جاتی تھی مصروفیت نے اس کے غم کو ختم تو نہیں کیا تھا لیکن زندگی میں جو ایک جمود کی فضا طاری تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔ مورے ماہین کو دعائیں دیتی نہ تھکتیں جس نے ان کے گھر کو صحیح معنوں میں گھر کیا تھا اور فریدہ گل کو اس کا جائز مقام دلایا تھا اور حیدر کی زندگی میں اس کی شرعی حیثیت کا تعین کیا تھا۔

اوائل جون جب وادی میں نہایت ہی خوب صورت موسم تھا۔ چاروں جانب پھولوں اور پھلوں کی اجارہ داری تھی اور زندگی کی ساری گہما گہمی گویا اس موسم میں سمٹ آئی تھی ماہین نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ جس وقت فریدہ گل بچے کو پیار کرنے کے بعد واپس ماہین کی گود میں دینے لگیں اس کے منہ سے نکلے الفاظ نے وہاں موجود سب لوگوں کو ساکت کر دیا۔

"یہ مجھے آپ کی دعاؤں کے توسط سے ملا ہے فریدہ گل اور یہ آپ کے حصے کا ہے، آپ کا بیٹا ہے یہ۔" فریدہ گل گرنٹ کھا کر بچے کو اس کی گود میں رکھ کر دور ہٹیں۔

"نہیں نہیں ماہین تمہارے پہلے بہت احسان ہیں مجھ پر ایسا مت کرو۔ یہ صرف میرا نہیں ہم سب کا ہے۔ ہماری خوشیوں کا پیامبر بن کر آیا ہے۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا تو ماہین مسکرا دی۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے لیکن حیدر کا اور میرا فیصلہ ہے کہ یہ بچہ آپ کا ہے یہ آپ کی گود میں پرورش پائے گا کیوں حیدر۔" اپنے انتہائی فیصلے میں اس نے ایک جانب خاموش بیٹھے حیدر کو مخاطب کیا تو وہ جیسے چونک ہی گیا۔

"ہاں فریدہ گل، ماہین ٹھیک کہہ رہی ہے۔" باپ بننے کی خوشی اس کے انگ انگ سے ہویدا تھی تو دل انگ شکر کے گیت الاپ رہا تھا کہ اس کے حصے میں جو دو عورتیں آئی تھیں دونوں ہی انمول جذبوں کی دولت سے مالامال تھیں۔ اس نے آنکھوں کے اشارے سے فریدہ گل کو ماہین کے ہاتھوں سے بچے کو تھام لینے کا اشارہ کیا اور فریدہ گل ہو اور حیدر علی کا حکم نہ مانے انہوں نے آگے بڑھ کر جلدی سے ننھے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اندر تک ممتا سیراب ہوتی چلی گئی۔ فریدہ گل کی آنکھوں میں اس وقت ماہین کے لیے محبت، احترام، تشکر کے سارے رنگ تھے جنہیں وہ زبان نہ دے سکیں اور بچے کو سینے سے لگائے باہر چلی گئیں۔ اس کے تنہا ہوتے ہی حیدر اس کے قریب چلا آیا۔ نم آنکھوں سے اس کے دونوں ہاتھوں کو چھوا۔ آہستگی سے لبوں کے قریب لے جا کر چھوا اور نرمی سے چھوڑ دیا۔

"شکریہ کہہ کر تمہارے کسی جذبے کو بے مول نہیں کروں گا۔ ہاں میرے ذمہ جو قرض تھے انہیں چکانے کی جو کوششیں تم نے کیں ان کے لیے تا زندگی تمہارا مشکور رہوں گا۔ آج میں بہت خوش ہوں ماہین

بہت خوش، پتا نہیں اللہ نے میری کس نیکی کے عوض مجھ پر تمہاری صورت میں انعام اتارا۔" ماہین ان جذبوں سے گندھے الفاظ کی پھوار میں بھیگتی چلی گئی۔

"ایک بات کہوں حیدر۔" کچھ توقف کے بعد وہ گویا ہوئی۔

"حالانکہ تمہیں مجھ سے کچھ کہنے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، کہو۔" نرمی سے اس کے ہاتھ کو دبا کر گویا اسے اپنی بات کہنے کا حوصلہ دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوئی خاص بات ہوگی جو ہچکچاہٹ اس کے لہجے سے عیاں تھی ورنہ تو اپنے دل کی ہر بات وہ بڑے آرام سے کہہ لیا کرتی تھی۔

"پلوشہ کا کیا سوچا آپ نے؟ پہاڑ سی زندگی ہے اس کے آگے۔ کیسے گزارے گی؟"

عزیز از جان بہن کا دکھ اسے بھی پہروں رلاتا پر وہ کیا کر سکتا تھا ان کے قبیلے میں بیوہ عورت کا نکاح دوبارہ نہیں کیا جاتا تھا۔ جب یہی بات اس نے ماہین کو بتائی تو وہ تو صدمے سے گنگ ہی رہ گئی۔

"کیوں حیدر جب ہمارے اللہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کوئی قانون بیوہ کے لیے تفویض نہیں کیا تو کیوں؟ ہم کیوں اس آگ سے اپنے دامن راکھ کر رہے ہیں۔ دو تین دن پہلے بابا نے اسفر بھائی کے لیے پلوشہ کی مجھ سے بات کی تو ان دو دنوں میں میں نے ان دونوں کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے خواب دیکھ ڈالے اور اب آپ کہتے ہیں کہ وہ ساری عمر ایسے ہی رہے گی۔" تیز تیز بولتے وہ ہانپ گئی۔

"آپ کے قبیلے والے تو بچیوں کی پڑھائی کے بھی خلاف تھے آپ نے اسٹینڈ لیا نا۔ آج دیکھیں کتنی شمعیں جلیں آپ کہتے ہیں کہ کوئی تو ہو جو بارش کا پہلا قطرہ بنے تو وہ قطرہ آپ کیوں نہیں بنتے۔" اس نے حیدر کو خاموش دیکھ کر لوہا گرم جان کر چوٹ لگائی۔

"بزرگوں کی روایات کو سینے سے لگائے رکھنا اچھی بات ہے لیکن جو رسمیں زندہ انسانوں کو در گور کر دیں ان کو چھوڑ دینا ٹھیک ہے حیدر۔" آج وہ اسے قائل کر کے ہی چھوڑنا چاہتی تھی۔

"اچھا اچھا۔۔۔ تم آرام کرو، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" گہری طویل سانس لیتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

"یہ۔۔۔ یہ میری بات کا جواب نہیں ہے حیدر مجھے وہ بات بتائیں جو میں سننا چاہتی ہوں۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ حیدر نے غور سے اس کی سمت دیکھا۔

"میں بہت پہلے سے ان فضول رسومات کے خلاف ہوں بہت دفعہ ان کے خلاف کھڑے ہونے کا عزم ایسا بودا ثابت ہوا کہ میں اپنی نظر میں شرمندہ ہو کر رہ گیا اس لیے محض بلند و بانگ دعوے کر کے جھوٹی تسلی نہیں دلانا چاہتا۔ میری بہن کا گھر بس جائے اس کی روٹھی خوشیاں دوبارہ اسے مل جائیں اس سے بڑھ کر کوئی بڑی بات اہم نہیں میرے لیے لیکن صدیوں سے رائج ان رسوم سے ٹکرانے کے لیے کوئی مناسب لائحہ عمل بنانا ہوگا۔ اپنی فریدہ گل سے شادی کے وقت اور پلوشہ کی شیر خان سے شادی کے وقت میں نے صرف زبانی دعوے کیے تھے۔ اب کی بار کوئی ٹھوس عمل کر کے یہ بازی میں نہیں ہاروں گا اور یہ میرا خود سے اور تم سے وعدہ ہے کہ بھلے کچھ دیر کیوں نہ ہو جائے میں اپنی بہن کی خوشیاں ضرور لوٹاؤں گا اپنی برادری کو قبیلے کو قائل کر کے۔ ان کی مرضی سے کہ خود فیصلہ کر کے میں اپنے بزرگوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا کیونکہ بے جڑ پودے کو زمین بھی قبول نہیں کرتی۔" مضبوط لہجے میں اس کے سر کو تھپتھپاتا وہ باہر نکل گیا۔ ماہین نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ کوشش شرط ہے پھر کچھ فیصلے وقت کرتا ہے ان دونوں نے کوشش کا آغاز کر دیا تھا اسے یقین تھا کہ وقت ان کے حق میں فیصلہ کر کے پلوشہ کی زندگی میں نئی بہاریں لے آئے گا۔

☼ ☼

رنگِ زیست

ام حسن

الارم کی تیز آواز نے اسے نیند کی گہری وادیوں سے بے دار کردیا تھا آنکھیں موندے اس نے ہاتھوں سے گھڑی کو ٹٹولا اور آف کا بٹن دبادیا۔

آج اس کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا بی ایس انگریزی میں ایڈمیشن کے لیے اس نے بڑی تگ و دو کی تھی پھر کہیں جاکر اس کا داخلہ ہوا تھا۔ شروع ہی سے اس نے کبھی کسی سے دوستی نہیں کی تھی وہ بہت ہی ریزرو رہنے والی اور تنہائی پسند لڑکی تھی مگر اپنے نام کی طرح قابل اور باعتماد۔۔۔

"عاتکہ! عاتی بیٹا اٹھ جاؤ دیکھو یونیورسٹی کا پہلا دن ہے اور آج ہی دیر کروگی تو آگے کیا ہوگا۔۔۔ پہلا دن بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر سورج کی طرح چمکنا ہے تو اس کے ساتھ چلنا سیکھو!"

کچن سے مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی امی اٹھ گئی تھیں اور اب اسے پکار رہی تھیں۔ وہ بغیر کچھ کہے باتھ روم میں گھس گئی۔

عاتکہ نہایت ہی پروقار شخصیت کی حامل تھی۔ ڈارک براؤن لانگ شرٹ پر سفید ٹراؤزر اور دوپٹہ اس کی شخصیت کو اور پروقار بنا رہا تھا اس کی ماں ہمیشہ اسے آگے بڑھنے اور خود اعتمادی کا درس دیتی رہتی تھیں۔ حالانکہ وہ خود اپنے شوہر کی لاپرواہی اور بے زاری سے اکتا چکی تھیں۔

عاتکہ کا بچپن اس کی ماں کے ساتھ ہی گزرا۔۔۔ اس کے پاپا نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی باوجود اس کے کہ وہ اکلوتی تھی۔ وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے اور دوسری شادی کرچکے تھے۔ تمام تر پریشانیوں کے باوجود فاطمہ خاتون نے عاتکہ پر کبھی کسی قسم کا دباؤ نہ پڑنے دیا۔ اسے اچھے اسکول، اچھے کالج اور اب اچھی نیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی رہیں وہ خود بھی 14 گریڈ کی گورنمنٹ ٹیچر تھیں اور انہیں کی وجہ سے یہ گھر چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ نئی جگہ، نیا ماحول اور نئے لوگوں کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور عاتکہ تو ویسے ہی بہت محتاط رہتی تھی۔

یونیورسٹی میں داخل ہو کر اس نے کلاس کے بارے میں معلومات حاصل کیں جگہ جگہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ بیٹھے باتیں کرتے دیکھ کر اسے عجیب لگا۔

"کیا یہ لوگ یونیورسٹی پڑھنے نہیں آتے۔" اس نے خود کلامی کی اور کلاس کی طرف بڑھ گئی۔

عاتکہ نے کبھی کسی سے دوستی نہیں کی اس لیے وہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ کلاس میں سب کا ہی پہلا دن تھا سب ایک دوسرے سے تعارف حاصل کررہے تھے پھر اسے ماں کی بات یاد آئی۔

"تنہا زندگی نہیں گزرتی انسان اکیلے نہ روتا اچھا لگتا ہے نہ ہنستا اور یہ تو دستور ہے کہ انسان اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا اسے ہر دور ہر عمر میں دوست، رفیق، ہمدرد، ہم سفر کی تلاش و ضرورت رہتی ہے۔"

اس بات سے متاثر ہو کر عاتکہ نے بھی چند لڑکیوں سے بات چیت کی اس طرح اس کو دوستی ثمرین سے ہو گئی۔ ثمرین بڑے گھر سے تعلق رکھتی تھی۔ ثمرین کی فیملی بھی مختصر سی ہی تھی۔ ماں بچپن میں ہی گزر گئی تھیں جبکہ ایک بھائی جو انگلینڈ میں بینک میں جاب کرتا تھا اور باپ سرکاری عہدے پر فائز تھا۔

عاتکہ کو اسے دیکھ کر احساس کمتری تو ہوا مگر اسے اپنی امی کی بات یاد آگئی کہ انسان اپنی شخصیت سے بڑا بنتا ہے۔ پیسہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اگر پیسہ اور شخصیت کا موازنہ کیا جائے تو پیسہ تو آنے جانے والی چیز ہے جبکہ شخصیت تو انسان کے گزر جانے کے بعد بھی لوگوں کو یاد رہتی ہے اور ہمیشہ اپنے مقصد کو ترجیح دو۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح شام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

بہرحال یونیورسٹی کا پہلا دن اس کے لیے بہتر گزرا۔ دوپہر کے کھانے میں وہ ماں سے یونیورسٹی کی ہی باتیں کرتی رہی۔

"ماں یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں ایسے بیٹھے تھے جیسے پڑھنے نہیں بلکہ کسی تفریح گاہ میں آئے ہوئے ہیں اور کینٹین تو ایسے بھری ہوئی تھی جیسے ہر کوئی وہاں صرف کھانے آتا ہو۔" اس نے طنزیہ لہجہ میں کہا تھا۔

"بیٹا تعلیم کا مقصد شعور کی بے داری ہے۔ اب جو اس بات کو سمجھے گا وہ ہمیشہ اپنی حد میں رہتے ہوئے قدم اٹھائے گا لیکن بعض لوگوں کے لیے تعلیم یا تو محض ذریعہ معاش ہے یا پھر وہ اپنے والدین کے دباؤ میں مجبوری میں تعلیم حاصل کررہے ہیں تعلیم کا ذریعہ معاش ہونا بھی تعلیم کے مقاصد میں ایک مقصد ہے مگر صرف اسی پر اکتفا کرنا صحیح نہیں یہ تو قابلیت پر منحصر ہے۔ تم بس اپنی پڑھائی پر توجہ دو تم نے وہ شعر سنا ہے؟

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

تو بس ڈھونڈنے والا ہونا چاہیے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کسی سے دوستی کی یا پھر یہاں بھی چپ رہ کر سال گزارنے ہیں؟" فاطمہ خاتون نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی ماں آج تو پہلا دن تھا پھر بھی ایک لڑکی سے بات چیت ہوئی ہے۔ ثمرین نام ہے اس کا دیکھنے میں تو اچھی لگتی ہے اور وہ بہت امیر اور بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔"

"گڈ" فاطمہ نے سراہا۔ وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

اسٹڈی ٹیبل پر نیم دراز کتاب کھول کر سینے سے لگائے وہ گہری سوچوں میں گم تھی اچانک فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے ریسیور کان سے لگا کر بات شروع کی۔

"ہیلو عاتکہ میں اشعر بات کررہا ہوں۔"

"خیریت اتنی رات گئے فون کیا؟"

"ہاں وہ عمران انکل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ تم جلدی سے جمشید ہسپتال آجاؤ۔" اشعر کی بات نے اسے حواس باختہ کردیا۔

بظاہر عاتکہ کا اس کے والد سے کوئی رشتہ نہ سہی چاہے اس کے والد نے کبھی اسے اپنی اولاد نہ سمجھا کبھی اس کی طرف مشفقانہ نظروں سے نہیں دیکھا تھا مگر پھر بھی وہ حواس باختہ ریسیور چھوڑ کر ماں کی طرف دوڑی۔

"امی۔۔۔ وہ، وہ ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے آپ انھیں نا چلیں میرے ساتھ۔" عاتکہ اضطرابی کیفیت سے دوچار تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" فاطمہ خاتون کا حلق خشک ہوگیا ایک ہی لمحہ میں ساری نفرتوں نے فکر کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

ہسپتال میں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا جس وارڈ میں ابا تھے وہاں پہلے ہی لوگوں کا ہجوم تھا اسی ہجوم سے اشعر نکل کر آیا۔ اشعر عاتکہ کی خالہ کا بیٹا تھا۔

"فاطمہ آنٹی اچھا ہوا آپ آگئیں۔" اشعر کا لہجہ حواس باختہ تھا۔

عاتکہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے وارڈ کی طرف جانے لگی تو ایک لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کہاں جارہی ہو یہ میرے پاپا ہیں تمہارا اور تمہاری ماں کا ان سے کوئی رشتہ نہیں اور جو بھی رشتہ تھا وہ عرصہ پہلے ختم ہوچکا ہے۔" فاطمہ خاتون کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" عاتکہ ابھی آگے کچھ کہتی مگر دو لڑکوں نے اپنی بھاری آواز سے اس کی آواز کو دبادیا۔

"یہ بکواس نہیں حقیقت ہے ہمارے پاپا سے کوئی نہیں مل سکتا جاؤ یہاں سے۔"

"تین بچے؟ عمران کے تین بچے ہوگئے اتنا بے زار ہے وہ ہم سے کہ کبھی بتانا گوارا نہ سمجھا کبھی اپنی اکلوتی اولاد سے پیار جتانا ضروری نہیں سمجھا۔"

عاتکہ نے پہلی بار اپنی مضبوط پرعزم اور باوقار ماں کو اتنا کمزور اور بے بس دیکھا تھا اسے کیا خبر تھی کہ ان کے دل میں کیا طوفان ہے۔

فاطمہ خاتون حیرت زدہ لہجہ میں الفاظ چبا رہی

تھیں۔ اتنا بے حس انسان ان کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے۔

فاطمہ خاتون نے جب عمران سے شادی کی تھی اس وقت اس کے پاس رہنے کو گھر بھی نہیں تھا امیر خاندان سے تعلق رکھنے والی فاطمہ خاتون نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور عمران کے ساتھ زندگی تباہ کرنے کے لیے راضی تھیں۔ انہوں نے کبھی عاتکہ کو زندگی کی تلخی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ اس کا خمیازہ ہی بھر رہی ہیں۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ حادثات اور تجربات انسان کو عملی زندگی کی پریشانیاں اور مصیبتوں کو جھیلنا اور برداشت کرنا سکھا دیتے ہیں اور فاطمہ خاتون بھی اچھی طرح ان تمام مراحل کو سمجھ چکی تھیں اور ان سے بہ احسن طریق گزر بھی چکی تھیں اور اپنی بیٹی کی پرورش بھی اسی طور پر کرنا چاہتی تھیں۔

رات کے سناٹے میں چاند کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ تاریک رات میں کمرے میں بھی مکمل تاریکی تھی فاطمہ خاتون کھڑکی کے سامنے بیٹھی سوچوں میں گم تھیں۔ دروازہ کھولنے کی آواز نے انہیں جگا دیا۔

"اماں..." عاتکہ کی آواز تھی۔ "آجاؤ بیٹا تم اب تک سوئی نہیں صبح یونیورسٹی نہیں جانا۔"

"اور کتنا صبر کریں گی آپ؟ آپ ان سے طلاق کیوں نہیں لے لیتیں؟" عاتکہ کا لہجہ تلخ تھا۔

"تم ان الجھنوں میں نہ الجھو عاتی... اپنی پڑھائی پر توجہ دو اور اپنے مستقبل کی فکر کرو۔ میں تمہارے لیے اچھے مستقبل اور بہترین زندگی کی خواہش مند ہوں۔ میری زندگی تو گزر گئی بیٹا تجربات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ مگر ہمیشہ یاد رکھنا کہ تعلیم ہی انسان کا اصل زیور ہے اگر وہ کبھی زندگی کی راہوں میں بالکل ہی تنہا ہو جائے اس وقت بھی تعلیم ہی اس کی زندگی کا سہارا ہوتی ہے۔ طلاق کی بات تم کر رہی ہو جو کہ جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ قرار دی گئی ہے اور عورت کو تو ہر موڑ پر صبر اور برداشت کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی مرد کی سرپرستی کی محتاج ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم میری طرح بے بس و لاچار نہ ہو۔"

دنیا میں ہر طرح کے انسان ہیں کچھ لوگ وفا اور محبت کو ترستے ہیں اور کچھ لوگ وفا اور محبت ملنے پر بھی اس کی قدر نہیں کرتے اور کچھ لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں وفا اور محبت دی جائے فاطمہ خاتون کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

عاتکہ بھی اپنی ماں کے گلے لگ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

زندگی کے ساحل پر پہنچو تو
بہت سے لوگ ملتے ہیں
حسین سنگ ریزوں جیسے لوگ
قیمتی موتی جیسے لوگ
نوکیلی کنکریوں جیسے لوگ
ان میں سے کچھ لوگ ہاتھوں میں جمی ریت کی مانند
ہاتھوں سے ہی نہیں دل سے بھی اتر جاتے ہیں
لیکن کچھ خوشبو صفت لوگ اور ان کے ہاتھوں
کے لمس ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔

"کیسی ہو عاتکہ!" ثمرین نے اس کی سوچوں کے بھنور کو توڑا تھا۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں تم سناؤ!" کلاس میں بیٹھی عاتکہ نے کہا۔

"کیا ہوا اپ سیٹ لگ رہی ہو..." ثمرین نے اس کی آنکھوں کو پڑھ لیا تھا۔

"نہیں بس یونہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور کیا چل رہا ہے!" عاتکہ نے بات کا رخ بدل دیا تھا۔

"ہیلو ایوری ون..." منہاج جو کہ بہت ہی پرکشش شخصیت رکھتا تھا۔ کلاس میں داخل ہوا تھا اس کی زیادہ تر توجہ ثمرین پر ہی تھی۔ بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں اس سے بات کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر اتفاق کہ وہ عاتکہ کی دوست بن گئی تھی۔

"کیا حال ہیں جناب..." ثمرین نے منہاج کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

"جی بالکل ٹھیک۔" منہاج نے زور دے کر کہا۔

"اور آپ کیسی ہیں عاتکہ؟" اب اس کی توجہ عاتکہ کی جانب مبذول ہو گئی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" عاتکہ نے مختصر جواب دیا تھا۔

یونیورسٹی میں اسے پڑھتے کافی عرصہ ہو گیا تھا اور اسی دوران وہ ثمرین کی وجہ سے منہاج کے بہت قریب آچکی تھی چونکہ وہ اس کی ایک ہی دوست تھی اور ثمرین بھی منہاج میں دلچسپی رکھتی تھی۔ تو ہر روز تینوں ساتھ ہی ہوتے تھے مگر نہ جانے کیوں عاتکہ کو منہاج کا ثمرین سے ہنسی مذاق کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

اسٹڈی ٹیبل پر نیم دراز وہ اسی کی سوچوں میں گم تھی۔ کہیں مجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی؟ اس نے ایک لمحہ کو سوچا اور دوسرے ہی لمحے اس سوچ کو جھٹک دیا۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی منگنی بچپن سے ہی اشعر کے ساتھ ہو چکی ہے اب کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی اس کو غلط محسوس ہو رہا تھا۔

مگر وہ اپنے دل کا حال کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کو اپنے دل پر یقین نہیں تھا۔

اس نے بچپن ہی سے اپنی اماں کو محنت کرتے دیکھا تھا انہوں نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی زندگی کی تلخیاں برداشت کرنے کے بعد بھی وہ اس پر کچھ عیاں نہیں ہونے دیتی تھیں عاتکہ بھی سب سمجھتی تھی مگر کچھ کہہ نہ پاتی تھی۔

اشعر نے اس سے کبھی کسی قسم کی بات ہی نہیں کی تھی اس کے دل میں کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی اسے وہ دن یاد تھا جب اس نے اشعر سے پوچھا تھا کہ۔

"کیا تم اس منگنی سے خوش ہو کیا تم میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو؟" اسے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ اشعر کو اس منگنی سے اعتراض ہے مگر وہ اس کے دل کا حال واقعی نہیں جانتی تھی ضروری تو نہیں کہ محبت جتا کر کی

جائے لیکن کبھی کبھی محبت کا اظہار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

لیکن اشعر نے کبھی اس بات کا اظہار کیا اور نہ ہی اس کے کسی انداز سے لگتا تھا کہ وہ عاتکہ کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے راضی ہی نہیں بلکہ خواہش مند ہے وہ ہمیشہ اسے یہی کہتا کہ تم نہیں جان سکتیں وہ اپنے خاموش لمحوں میں صرف اسی کو سوچتا تھا اس کے جذبوں کی شدت عروج پر تھی مگر وہ ان جذبوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

یہ ممکن کس طرح ہے کہ تم جو کچھ چاہو
اس کو پاؤ بھی
تم اپنی گفتگو سے شوخ نظروں سے
جو بھی دل کا راز ہو پالو
دبے پاؤں میرے جذبوں کی شدت کو
فقط تم چھو تو سکتی ہو
مگر تم کو اجازت ہی نہیں
میرے خاموش لمحوں کو
چرانے کی
وہی خاموش لمحے میں جن میں جیتا ہوں
نہیں تم کو اجازت ہی نہیں ان کو جگانے کی
بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟
تم جو چاہو تو
اس احساس کو پالو
میری دھڑکنوں کے ربط کو
تم سن تو سکتی ہو
مگر کیا دل میں ہے
نہ جان پاؤ گی
میرے خاموش لمحے صرف میرے ہیں
اجازت ہی نہیں تم کو
میرے خاموش لمحوں کو
چرانے کی

"اماں..." عاتکہ نے ناشتے کی میز پر فاطمہ خاتون کو مخاطب کیا تھا۔

"ہاں بولو عاتکہ؟"

اس نے کبھی کوئی بات اپنی اماں سے چھپائی نہیں تھی اور اگر وہ کچھ چھپانا بھی چاہتی تو بھی نہ چھپا سکتی تھی جس نے زندگی کا مرکز اپنی بیٹی کو سمجھا تھا وہ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے فوراً" واقف ہو جاتی تھیں۔

"اماں مجھے محبت ہو گئی ہے، مجھے کچھ نہیں معلوم کہ یہ کیسے اور کیوں ہوا میں کافی عرصے سے اپنے آپ کو سنبھال رہی ہوں مگر سنبھال نہیں پا رہی ہوں آپ کہتی ہیں نا کہ تعلیم شعور کا حصول ہے۔ تو مجھے اس چیز کا شعور ہونے کے باوجود بھی نہیں ہے کہ میری منگنی ہو گئی ہے اور اس بات سے بھی انجان ہوں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اماں..." وہ بے بسی سے کہتی جا رہی تھی۔

اور فاطمہ خاتون اس کے مجبور چہرے کو تک رہی تھیں۔

"کون ہے؟" ساری باتوں کو سننے کے بعد اس کی اماں نے سرد لہجے میں پوچھا تھا۔

"منہاج... یونیورسٹی میں میری کلاس میں..."

ابھی وہ بتا رہی تھی کہ فاطمہ خاتون نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم وہی ہو نا جس نے یونیورسٹی کے پہلے دن ان باتوں پر اعتراض کیا تھا؟"

"اماں آپ ناراض مت ہوں پلیز... مجھے معلوم ہے کہ میری منگنی ہو گئی ہے میں بھی آپ کو شرمندہ نہیں کروں گی میں بے کار کی باتیں سوچ رہی ہوں مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔"

عاتکہ اپنی جھوٹی صفائی پیش کر رہی تھی۔

"تمہیں شاید اندازا نہیں ہے کہ اشعر تم سے کتنی محبت کرتا ہے لیکن اگر اس کی محبت پر تم اپنی محبت کو ترجیح دینا چاہتی ہو دو ترجیح مگر اشعر کی محبت کو ٹھکرانے سے پہلے تم اپنی محبت کے بارے میں یقین کر لو کہ یک طرفہ تو نہیں ہے؟ کیونکہ ایک طرفہ محبت ہمیشہ نقصان اور گھاٹے کا سودا ہوا کرتی ہے۔" فاطمہ خاتون اٹھ کر جا چکی تھیں اور عاتکہ سب سمجھتے ہوئے بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

چاہتوں کے سلسلے اور بے خودی ذرا ذرا
مختصر سی خواہش اور عاشقی ذرا ذرا
کس ادا سے مانگ لوں کہ مل جائے تو مجھے
ایک دعا مختصر سب اور عاجزی ذرا ذرا
کبھی ہجر میں بھی قرار ہے کبھی دھڑکنوں سے بھی الجھنیں
نہ ہوش ہے کہ خود کی خبر اور دیوانگی ذرا ذرا
کانچ کے یہ خواب ہیں اور پلکیں کھلی تو کچھ نہیں
بڑی حسرتیں ہیں جینے کی اور زندگی ذرا ذرا

"وہ منہاج آج آیا نہیں کیا؟" عاتکہ انجان لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں یار وہ آج نہیں آئے گا اس نے مجھے فون کیا تھا تو بتا رہا تھا۔" ثمرین لاپروائی سے بتا رہی تھی۔

"وہ تمہیں فون کرتا ہے؟ عاتکہ نے چھپے لفظوں میں پوچھا تھا۔

"ہاں تو وہ تو مجھے روز فون کرتا ہے اور ہاں اس نے مجھے پرپوز بھی کیا ہے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" ثمرین نے اس سے سوال کیا تھا۔

"ایک طرف محبت گھاٹے اور نقصان کا سودا ہے۔ ہمیشہ اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرے۔" اماں کے الفاظ ہر موڑ پر اس کا ساتھ دیتے تھے عاتکہ بغیر کچھ کہے اٹھ گئی اور پھر نہ جانے ثمرین نے اسے کتنی آوازیں دیں اس کے کانوں میں ہی نہیں پڑیں۔

"کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہو۔" عاتکہ سخت لہجہ میں اشعر سے فون پر بات کر رہی تھی۔

"اف بار بار یہ سوال کیوں کرتی ہو عاتکہ؟" "تمہیں میری آنکھوں سے میری محبت ظاہر نہیں ہوتی؟" اشعر نے اضطرابی کیفیت میں اس کے سوال پر سوال کیا تھا۔

"نہیں ہوتی ظاہر... میں جو تم سے پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو اشعر؟" عاتکہ کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

کاش تم سمجھ پاتیں
کتنا چاہا ہے تم کو
کتنا مانگا ہے تم کو
کس قدر محبت ہے
کس قدر ضرورت ہے
کاش تم سمجھ پاتیں
جان یہ تمہاری ہے
ہر خوشی تمہاری ہے
دل لگی تم ہی سے ہے
زندگی تم ہی سے ہے
کاش تم سمجھ پاتیں
روح کی ضرورت ہو تم
دل کی دھڑکن ہو تم
میری محبت ہو تم
کاش تم سمجھ پاتیں
صرف تم سے محبت ہے
صرف تم کو چاہا ہے

اشعر کا ایک ایک لفظ اس کے دل و دماغ میں بستا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم اور دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی اس نے فون رکھ دیا۔

"اماں میں نے ترجیح دے دی اپنی محبت پر اشعر کی محبت کو اور میں یہ سب کسی کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کر رہی ہوں آج سے وہ میری زندگی کی اولین ترجیح ہے۔"

عاتکہ اماں کو پر عزم لہجہ میں بتا رہی تھی۔

فاطمہ خاتون نے اس کو گلے سے لگایا اور دونوں مسکراتے ہوئے اپنی زندگی کے مقصد کو سمجھ چکی تھیں۔

☼ ☼

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی.... مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے.... رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے.... اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے.... اور ایسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے.... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، وکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کرلیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے.... رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے.... وہ دونوں واپس جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے.... اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کردیتا ہے.... اب آگے پڑھیں۔

— ۳۹ —

انتالیسویں قسط

نمل! تم ٹھیک تو ہو نا۔" خرم نے اسے چونکاتے ہوئے کہا تو نمل آنکھوں میں آئی نمی کو تیزی سے پلکیں جھپک کر پینے کی کوشش کرنے لگی۔

خرم کچھ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ اسے امید نہیں تھی کہ سمیر کو اس سارے کھیل کا ذمہ دار دیکھ کر نمل کو اتنا صدمہ ہوگا۔ وہ جانتا تھا وہ سمیر کو صرف اسے جلانے کے لیے اہمیت دیتی ہے۔ پھر اسے ایسی تکلیف کیوں ہو رہی ہے اس کی اصلیت کھلنے پر۔

"کیا تمہیں سمیر کی فطرت کا ذرا بھی اندازا نہیں تھا جو تم اتنی حیران ہو رہی ہو وہ تو ایسا ہی ہے گھٹیا اور کم ظرف اور یہ بات ساری یونیورسٹی جانتی ہے۔" خرم کچھ حیران حیران سا گویا ہوا۔
تو نمل جو ایک ٹرانس کے عالم میں ساکت کھڑی تھی ایک دم چونک اٹھی اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے خرم کو دیکھا تو اس کے چہرے پر تعجب پھیلا دیکھ کر وہ زچ ہو کر بولی۔
"یہ بات میں بھی بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور مجھے اس کی اصلیت جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو پھر اس کی حقیقت کھلنے پر میرے دکھی یا حیران ہونے کا کوئی جواز ہی نہیں بنتا۔" نمل کو یہ سوچ کر ہی کوفت ہو رہی تھی کہ خرم یہ سمجھ رہا ہے کہ اسے سمیر کے متعلق یہ انکشاف ہونے پر دکھ ہو رہا ہے وہ کیا اتنی ہی فالتو ہے۔ جو ایسے لوگوں کے لیے اپنا دل دکھانے لگے۔ ہاں البتہ اسے خرم کے ساتھ کی گئی زیادتی پر شرمندگی ضرور محسوس ہو رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے معذرت کس طرح کرے۔
"اچھا یونیورسٹی میں تو اس کی بڑی تعریفیں کر رہی تھیں۔" نمل کا رکھائی سے بولنا خرم کو تپا گیا تھا وہ بھی قدرے تلخی سے بولا تو نمل کو اپنے الفاظ ایک دم یاد آ گئے۔
وہ ایک بار پھر جیسے شرمندگی کی گہری کھائی میں گر گئی جو کچھ اس نے آج صبح کہا تھا اس کے غلط ہونے کا احساس اسے اس وقت بھی تھا بلکہ ایک طرح سے آج کا سارا دن وہ اپنی کہی بات پر ماتم کرتے ہی گزارتی رہی تھی۔
لیکن اب سمیر کی ایک اور خامی جاننے کے بعد اس کی خجالت سو گنا بڑھ گئی تھی۔ کتنا گھٹیا انسان تھا وہ جو نمل کو تماشا بناتا رہا اپنے دشمن کو ذلیل کرنے کے لیے۔
پہلے اس نے نمل کے پاس اپنے اس خبیث کزن کو بھیج دیا کہ وہ جا کر اس کے ساتھ نازیبا حرکت کرے پھر خود ہی اس کی مووی بنائی تاکہ تمام لوگ اس بے ہودگی کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں۔
اور آج نمل کی منگنی ٹوٹنے کی خوشی میں اتنا پیسہ خرچ کر سب کو پیزا کھلانے بیٹھ گیا تاکہ یونیورسٹی میں پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کا نام سمیر کے ساتھ لیا جانے لگے۔
واقعی کسی بھی دشمن کے لیے اس سے بڑی شکست اور کیا ہوگی کہ اس کی منگیتر منگنی ٹوٹتے ہی اس کے حریف کے ساتھ مل کر خوشی کے طور پر پارٹی منا رہی ہے۔
اس نے خرم کو تو ذلیل کر دیا تھا مگر اس نے نمل کو بھی بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی آج کی اس کی اس حرکت کے بعد تو یونیورسٹی میں سمیر اور نمل کے متعلق جو نہ کہا جائے وہ کم تھا۔
ایک بار پھر نمل کا خون کھولنے لگا اس کا دل چاہا وہ ابھی جا کر ایسا ہی ایک کرارا سا تھپڑ سمیر کے منہ پر مار دے جیسا اس نے خرم کو مارا تھا اور واقعی انجام کی پروا کیے بغیر اس نے قدم آگے بڑھا دیے کہ بروقت خرم نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے ڈپٹ کر کہا۔
"کہاں جا رہی ہو؟" وہ اس کے ارادے بھانپ گیا تھا۔
"چھوڑو مجھے میں......"
"ان لوگوں کو سبق سکھاؤ گی جیسا مجھے سکھایا تھا۔" خرم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے درشتگی سے جملہ مکمل کیا تو نمل جو شاید یہ بات کبھی نہ کہہ پاتی ایک دم روانی میں بول گئی۔
"میں نے بہت بڑی غلطی کی جو میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا اور تمہیں اس شخص کو مارنے سے روک لیا تم جو اس کے ساتھ کر رہے تھے بالکل ٹھیک کر رہے تھے کاش کہ میں تمہیں نہ روکتی۔" نمل کے منہ سے الفاظ نہیں نکلے تھے بلکہ چاروں اور ٹھنڈی پھوار برسنے لگی تھی۔
خرم کو لگا جیسے اس کے اندر ایک آگ دہک رہی تھی جانے کب سے وہ انجانے میں اس آگ میں جلے جا رہا

تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس میں جلنے کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں رہا تھا اور وہ جلن اس کے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔ مگر ایک طویل عرصے بعد اس کھولن پر کسی نے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار برسا دی کہ نا صرف وہ جلن ختم ہو گئی بلکہ ایک تپتے صحرا میں اچانک موسم بہار آ گئی۔ وہ بے خود سا اسے دیکھے گیا تھا کیا تھی یہ لڑکی جس کے منہ سے نکلی ایک بات نے اس کے اندر کا سارا ماحول تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔
اسی لیے جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بالکل دھیما اور پر سکون تھا۔
"نہیں تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ تم نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا اگر تم اس وقت مجھے نہ روکتیں تو میں اس وقت اتنے غصے میں تھا کہ میں اسے قتل کر دیتا۔"
"اچھا ہی ہوتا کہ وہ قتل ہو جاتا ایسے لوگوں کے پاس جینے کا کوئی حق نہیں۔" نمل بدستور سمیر اور اس کے کزن کو دیکھتے ہوئے پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔
"کسے جینے کا حق ہے اور کسے نہیں، یہ طے کرنے کا حق کسی انسان کے پاس نہیں ہے۔ جب تم مجھے اس سارے عمل کا ذمہ دار سمجھ رہی تھیں تب تمہارا میرے بارے میں بھی یہی خیال ہوگا کہ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن سچ سامنے آنے کی صورت میں تم مجھے زندہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں تو پھر کسی کے مر جانے کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمہارے پاس کیسے ہو سکتا ہے۔" خرم بڑے پر سکون انداز میں بول رہا تھا نمل اپنا سارا غصہ بھول کر ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر خرم سے اختلاف کرنے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔
ویسے بھی وہ سمیر یا اس کے اس کزن کو جا کر کچھ برا بھلا کہہ بھی دیتی تو انہیں کون سا شرمندہ ہو جانا تھا۔ ایسے معاملوں میں خاموشی ہی بہتر تھی دوستی ہو یا دشمنی دونوں صورتوں میں سمیر جیسے لڑکوں سے تعلق بن سکتا ہے لہٰذا ان لوگوں سے بچ کر رہنے کا سب سے آسان حربہ یہی تھا کہ ان سے لاتعلقی اختیار کر لی جائے۔
وہ سوچ ہی رہی تھی کہ خرم اسے خاموش دیکھ کر کہنے لگا۔
"اس لڑکے کی اس وقت اچھی خاصی پٹائی ہو گئی تھی جو کہ اس کی سزا کے لیے بہت ہے اب فار گاڈ سیک تم بدلہ لینے کا کوئی پلان مت بنانے لگنا۔"
"نہیں میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی۔" نمل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"تو پھر اتنے سکون سے کیوں کھڑی ہو یہ کوئی یونیورسٹی کا کیمپس نہیں ہے آدھی رات کو اس ساحل سمندر پر کسی نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا یا سمیر نے ہی ہماری کوئی پکچر لے کر فیس بک میں ڈال دی تو تم ایک بار پھر مجھ سے خائف ہو جاؤ گی کہ میں نے خود ہم دونوں کا اسکینڈل مشہور کرنے کے لیے یہ ساری حرکت کی ہے۔" بہت کوشش کے باوجود نمل اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو روک نہ سکی۔
"ایک بار پھر' سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں تو ابھی بھی تم سے خائف ہوں۔ چلو مان لیا تم نے اس لڑکے کو نہیں بھیجا تھا اور یہ تو میں جانتی تھی کہ وہ ویڈیو تم نے نہیں بنوائی کیونکہ اگر تم نے بنوائی ہوتی تو تم اپنے تھپڑ کا سین فیس بک میں نہیں شو کرتے۔ لیکن پیلس ہوٹل میں میرے پیسے تو تم نے ہی چرائے تھے نا۔" نمل نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے خاصے خوشگوار لہجے میں کہا۔
"تو تمہیں کون سا ہوٹل کے برتن دھونے پڑ گئے جو آج تک اس بات کو دل سے لگائے بیٹھی ہو میں نے اسی وقت تمہاری مدد کر دی تھی اور بعد میں تمہارے سارے پیسے بھی لوٹا دیے تھے۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر خرم کو بہت اچھا لگا تھا تبھی اسے یاد دلانے کے لیے نہیں بلکہ اس گفتگو کو تھوڑا طول دینے کے لیے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہنے لگا۔
"اگر سنبل اور رومیلہ ساتھ نہ ہوتیں تو میں برتن دھو لیتی مگر تمہاری مدد نہ لیتی۔" کتنی بھلی لگ رہی تھی نمل

کے چہرے پر وہ مسکراہٹ مگر کتنی جلدی غائب ہو گئی تھی وہ ابھی تو خرم نے یقین بھی نہیں کیا تھا کہ نمل اس سے مسکرا کر مخاطب ہے کہ وہ منظر واقعی کسی حسین خواب کی طرح دھندلا گیا۔

اس کے سنجیدہ ہو جانے پر خرم کچھ تپ گیا تبھی چبا کر بولا۔

"بس ایک یہی عادت ہے تمہاری جو مجھے غصہ دلاتی ہے کیا ضرورت ہے اتنی ضد اور انا دکھانے کی۔" پھر اس کی نقل اتارتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر سنبل اور رومیلہ ساتھ نہ ہوتیں تو میں برتن دھو لیتی..... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سنبل اور رومیلہ موجود تھیں ورنہ تم تو واقعی برتن دھونے کھڑی ہو جاتیں۔" خرم کے تپے ہوئے انداز پر نمل کو بڑا مزا آیا تھا تبھی ایک بار پھر مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا اور وہ قدرے چڑانے والے انداز میں کہنے لگی۔ "تو تمہیں کیا فرق پڑتا میں ہی دھوتی نا تمہیں تو نہیں دھونے پڑتے۔"

"اگر مجھے دھونے پڑتے تو واقعی مجھے کوئی فرق نہ پڑتا لیکن اگر تم دھوتیں تو میں پورے ہوٹل کو آگ لگا دیتا۔" خرم برجستہ بولا۔

نمل اس سے ایسے کسی جملے کی توقع نہیں کر رہی تھی اسی لیے اتنے اچانک اس کے اتنے ٹھوس لہجے میں کہنے پر نمل کے دل کی کوئی دھڑکن جیسے کہیں مس ہو گئی۔

وہ غیر ارادی طور پر خرم پر سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی مگر ایسی کوئی مصروفیت سمجھ میں نہیں آئی جس میں لگ کر وہ کچھ دیر کے لیے خرم کو نظر انداز کر سکتی آخر بروقت اسے خیال آگیا۔

"اف..... تم ٹھیک کہہ رہے تھے رات بہت ہو رہی ہے یہ کوئی یونیورسٹی کا کیمپس نہیں ہے یہاں سے فوراً چلنا چاہیے۔" نمل کو بہانہ تو سوجھ گیا تھا مگر آواز کی لڑکھڑاہٹ پر وہ اتنی جلدی قابو نہیں پا سکی تھی۔

خرم کے لیے اس کا یہ انداز بہت..... اچنبھے کا باعث تھا۔ نمل کا کترانا اتنا واضح تھا کہ وہ اسے اپنی خوش فہمی نہیں کہہ سکتا تھا۔

حالانکہ وہ خود بھی ایسا کچھ کہنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر نمل کے رد عمل نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ جو کچھ اس کے لیے محسوس کرتا ہے اگر اسے ہی نہیں بتا سکا تو یہ سارے جذبے بے مول ہو جائیں گے تبھی نمل کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بھی اس نے نظر انداز کر دیا۔

"چلتے ہیں چلتے ہیں پہلے تمہارے سوال کا جواب تو دے دوں جو تمہارے اندر جانے کب سے مچل رہا ہے۔"

"کون سا سوال؟" نمل واقعی نہیں سمجھی۔

"یہی کہ میں نے منگنی کیوں توڑ دی۔" خرم نے اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا تو نمل ایک بار پھر کتراتے ہوئے تیز تیز بولنے لگی۔

"نہیں میرے اندر ایسا کوئی سوال نہیں مچل رہا مجھے تو اس وقت صرف گھر جانے کی جلدی ہے اگر امی کو پتا چل گیا کہ میں گھر پر نہیں ہوں تو وہ قیامت مچا دیں گی۔"

"اول تو امی کو پتا نہیں چلے گا اور دوم اگر آج کا وقت گزر گیا تو شاید میں یہ سب کبھی کہہ نہ سکوں۔ کیونکہ مجھے تم سے یہ سب کبھی کہنا ہی نہیں تھا' جانے میں کیوں نہیں چاہتا تھا شاید اس لیے کہ میں بھی تمہاری طرح ضدی ہوں۔ میرے لاشعور میں یہ ڈر تھا کہ اگر میں نے تمہیں بتا دیا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں تو تمہیں مجھ پر ہنسنے کا موقع مل جائے گا تم میرا مذاق اڑاؤ گی میرے جذبوں کی تذلیل کرو گی۔

لیکن آج پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ اگر ہم دونوں اپنی اپنی انا کو ایک طرف رکھ دیں تو ہمارے بیچ بہت اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو سکتی ہے۔" نمل سانس روکے خرم کو سن رہی تھی جو ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ خرم کبھی اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے اظہار محبت کرے گا لہٰذا اس کے احساسات بہت ہی عجیب ہو گئے تھے وہ شرما تو نہیں رہی تھی لیکن پزل ضرور ہو گئی تھی۔

ایک بار بہت پہلے خرم نے اس کے سامنے جھوٹا اظہار محبت کیا تھا نمل تب خاصے غصے میں تھی اس کے باوجود وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔

پھر آج تو جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تو بھلا وہ کس طرح خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتی لہٰذا وہ بس پتھرائے ہوئے انداز میں کھڑی تھی جبکہ خرم کے لیے یہ موقع بہت غنیمت تھا کہ نمل بغیر مداخلت کے اسے بولنے دے رہی ہے تبھی وہ کہتا چلا گیا۔

"سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں پتا کہ میں تمہیں کب سے چاہتا ہوں تب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا مجھے تب ہی تم بہت اچھی لگی تھیں۔

اگر پہلی ملاقات میں تمہارا رویہ ذرا بھی نرم ہوتا یا یوں سمجھ لو کہ تمہیں اندازہ نہ ہوا ہوتا کہ تمہارے پیسے میں نے چرائے ہیں اور تم میرے مدد کرنے پر انکساری سے میرا شکریہ ادا کر دیتیں تو یونیورسٹی میں میں اپنی فطرت کے برعکس ایک لڑکی ہوتے ہوئے بھی تمہیں اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل کر لیتا۔ لیکن تمہارے رویے نے مجھے خاصا تپا دیا تھا اور پھر یونیورسٹی میں پہلے ہی دن تم نے سمیر کے کیے مذاق کو میرے کھاتے میں ڈال کر میری کمپلین کر دی۔ اس پر تو مجھے تم سے شاید چڑ ہو گئی تھی پھر جب جب ہمارا سامنا ہوا تم نے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کی جس پر میرا غصہ بڑھتا رہا اور تمہارے لیے پسندیدگی کا احساس کہیں دبتا چلا گیا مگر یہ احساس میرے اندر ہمیشہ موجود رہا یہی وجہ ہے جب تم سمیر کو میرے مقابل لے کر آئیں تو میرا ایک ایک پل انگاروں پر گزرنے لگا۔

میں نے کبھی کسی مقام پر بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش یا خواہش نہیں کی میں صرف تمہیں زیر کرنا چاہتا تھا بس کچھ ایسا ہو کہ تم ہار مان کر میرے مقابلے سے ہٹ جاؤ اور شاید اسی دھن میں میں تم سے شادی بھی کر لیتا کہ اچانک وہ ہو گیا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جب میں تمہارے گھر آیا تھا تب....." خرم بڑے ٹھہراؤ کے ساتھ بڑے گمبھیر لہجے میں بول رہا تھا۔ نمل غیر ارادی طور پر اسے بڑی توجہ سے سن رہی تھی کہ تبھی وہ اچانک خاموش ہو گیا تو نمل کچھ چونک کر اسے دیکھنے لگی جو نمل پر سے نظریں ہٹائے اندھیرے میں ڈوبے سمندر کو دیکھنے لگا تھا وہ اس کے آگے کی بات سننا چاہتی تھی مگر اس طرح اپنی بے قراری ظاہر کرنا اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا کچھ دیر تو وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھتی رہی مگر خرم تو خاموش ہی ہو گیا تھا تب نمل سرسراتے لہجے میں بڑی آہستگی سے پوچھنے لگی۔

"ایسا کیا ہو گیا تھا؟" خرم کچھ چونک سا گیا وہ سمجھا نہیں وہ کیا پوچھ رہی ہے۔

"کیا؟"

"ابھی ابھی تم نے کہا نا پھر وہ ہو گیا جو تم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" نمل نے آہستگی سے دہرایا خرم کو اس کا اس طرح پوچھنا خاصا حیران کر گیا تھا اسے امید نہیں تھی کہ نمل کو یہ سب سننے میں دلچسپی ہو گی۔

لیکن وہ تو جاننا چاہتی تھی بلکہ ایک ایک لفظ اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ مگر خرم جو روانی میں بولنے جا رہا تھا عین وقت اس نے خود کو وہ کہنے سے روک لیا اگر وہ نمل کو بتا دیتا کہ اس کے گھر پر ڈائننگ ٹیبل پر اسے روتا دیکھ کر خرم کے اندر کی دنیا بدل گئی تو نمل اس کی محبت کو ہمدردی اور ترس کا جامہ پہنا دیتی جبکہ اس نے نمل پر کوئی ترس نہیں کھایا تھا بلکہ اس پر اپنے اندر چھپی محبت کا انکشاف ہوا تھا۔ لیکن یہ بات نمل کو سمجھانا مشکل تھا۔ پھر نمل فطرتاً بہت انا پرست تھی اسے یہ احساس سخت شرمندہ کرتا کہ خرم نے اسے روتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

وہ نمل کو شرمندہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور وہ بھی اس وقت جب نمل ہمیشہ سے بالکل مختلف انداز میں

اس سے ہم کلام تھی عجیب چھوئی موئی سے انداز میں وہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی تھی چہرے پر پھیلی ہلکی ہلکی سی گھبراہٹ اور آنکھوں میں استفہامیہ تاثر لیے وہ منتظر کھڑی تھی کہ خرم اپنی بات پوری کرے۔
وہ اس کے اس انداز کو دل میں اتارتے ہوئے قدرے شوخی سے بولا۔
"کیا بات ہے، بہت دل چاہ رہا ہے اپنی تعریفیں سننے کا۔" نمل ایک دم خجل ہوگئی اسے تو لگا تھا خرم کوئی اہم بات بتانے جارہا ہے اور واقعی اس کی شدید خواہش تھی کہ خرم اپنی بات پوری کرے۔ مگر اس کے اچانک پینترا بدلنے پر نمل جھینپ ہی تو گئی اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تو خرم مزید کہنے لگا۔
"بھئی جب تمہارے گھر آیا تو تم اچانک اتنی اچھی لگنے لگیں کہ دل ہی نہیں مانا اس کومل سی لڑکی کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچائی جائے۔ بس پھر میں نے دل پر پتھر رکھ کر منگنی توڑ دی لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ منگنی توڑ کر میں تمہارے دل میں جگہ بنالوں گا۔"
"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" نمل ایک دم تنک کر بولی وہ جو خرم کے انداز پر بالکل سمٹ گئی تھی ایک دم اپنی جون میں واپس آگئی۔
"ایسی ہی بات ہے تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے۔" خرم پورے وثوق سے بولا نمل کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ وہ اتنی آسانی سے آشکار کیوں ہوگئی۔ ابھی تو اس بات کا ادراک اسے خود بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہوا تھا کہ اس نے خرم کو بھی ہم راز بنالیا۔ اپنی کھسیاہٹ چھپانے کے لیے وہ برہم سے انداز میں کہتی ہوئی جانے کے لیے پلٹ گئی۔
"خوامخواہ کی خوش فہمی ہے تمہاری ورنہ میرا دماغ خراب نہیں ہوا......" نمل تیزی سے بول رہی تھی کہ خرم اچانک اس کے عین سامنے آگیا۔
"یار پلیز اب بس کرو کم از کم اس وقت مجھے مت جھٹلاؤ اگر یہ واقعی خوش فہمی ہے تو تھوڑی دیر مجھے خوش فہم رہنے دو۔" خرم کے لہجے میں اتنی انکساری تھی کہ نمل ایک دم خاموش ہوگئی اس پل وہ اسے واقعی نہیں جھٹلا سکی تو ایک بار پھر دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔
"تو پھر اپنی بات پوری کرو تم اس وقت کیا کہہ رہے تھے 'جب تم میرے گھر آئے...... پھر اس کے بعد تم نے ایک دم بات بدل دی۔"
"اس لڑکی کو ٹالنا اتنا آسان نہیں ہے۔" خرم نے دل ہی دل میں سوچا مگر اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔
"بتا تو دیا ہے اور کیا سننا چاہ رہی ہو کیا کسی فلمی ہیرو کی طرح اظہار کروں۔"
"چلو خیر تمہاری خاطر یہ بھی کرلیتا ہوں آئی لو یو نمل" نمل بری طرح بلش ہوگئی وہ اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔
"تم اگر مجھے گھر ڈراپ نہیں کررہے تو میں خود ہی پیدل جارہی ہوں۔" خرم اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا اب وہ دوبارہ یہ سوال نہیں پوچھنے والی تھی لہٰذا وہ خود بھی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔
رات واقعی بہت بیت گئی تھی عظمت خلیل اگر ان کی غیر موجودگی میں گھر لوٹ آئے تو نمل کے ساتھ ساتھ رشیدہ کو بھی بڑی مشکل صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔
"چلو بیٹھو گاڑی میں دس منٹ میں تم ان شاء اللہ اپنے گھر میں ہوگی" خرم نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے شان بے نیازی سے کہا۔
"مجھے اپنے گھر جانا ہے اپنی آخری آرام گاہ میں نہیں 'اتنی رش ڈرائیونگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'" نمل نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اطلاع دی۔

"تم نے میری ڈرائیونگ دیکھی نہیں ہے اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔"
"ابھی جو تم گاڑی چلا کر لائے تھے کیا وہ تمہاری ڈرائیونگ نہیں تھی۔" نمل نے طنزیہ کہا۔
"میں اس سے بھی تیز کر سکتا ہوں۔"
"بہت بہت شکریہ آپ اس سے کم رفتار میں ہی چلالیں تو بہتر ہوگا۔" نمل نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کو چیک کرنے لگی۔ رشیدہ یا عظمت خلیل کی کوئی مسڈ کال نہیں تھی گویا ابھی تک وہ گھر میں اس کی غیر موجودگی سے بے خبر تھے۔
نمل دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ عظمت خلیل کے گھر پہنچنے سے پہلے وہ پہنچ جائے اس لیے خرم نے جیسے ہی گھر کے گیٹ کے قریب گاڑی روکی نمل نے اشارے سے چوکیدار سے عظمت خلیل کے متعلق پوچھا تو اس نے سر نفی میں ہلا کر گویا نمل کو زندگی کی نوید دے دی۔
"نمل" نمل کو گاڑی کا دروازہ کھولتا دیکھ کر خرم بے اختیار اسے پکار بیٹھا تو وہ بھی رک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"تمہارے بابا منگنی توڑنے کی وجہ سے مجھ سے بہت ناراض ہیں اب اگر میں دوبارہ اپنے پیرنٹس کو بھیجوں گا تو کیا وہ مان جائیں گے؟" خرم بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔
نمل کچھ خاموش سی ہوگئی عظمت خلیل کو منانے کا بہترین حل اس کے پاس تھا مگر وہ اتنی جلدی اسے بتا کر اپنی رضامندی نہیں دینا چاہتی تھی۔
ابھی تو اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ خرم کے لیے اس کے دل کی دھڑکنیں کب بدل گئیں پھر اتنی جلدی وہ اس کے سامنے یہ اقرار کیسے کرلیتی۔
لیکن شاید اقرار یا انکار کا وقت اب گزر گیا تھا سب کچھ جیسے خود بخود ظاہر ہوگیا تھا تبھی خرم اتنے یقین سے پوچھ رہا تھا اور اس کے اس یقین کو توڑنے کے لیے خود نمل کا دل بھی نہیں مانا تب ہی اسے مایوس نہ کرسکی مگر اپنی فطرت سے مجبور بھی۔ لہٰذا اسے پوری طرح بتایا بھی نہیں اور آس و نراش کے بیچ میں لٹکا دیا۔
"ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ' سب ٹھیک ہوجائے گا۔" خرم کے لیے شاید یہ سوال معنی نہیں رکھتا تھا کہ سب کچھ کیسے ٹھیک ہوگا۔ وہ تو نمل کے منہ سے یہ سن کر ہی سرشار ہوگیا تھا۔ ایک دلفریب مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھر آئی تو نمل جلدی سے دروازہ کھول کر اتر گئی۔

☼ ☼ ☼
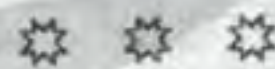
شگفتہ غفار نے کھانے کی میز پر جو کچھ کہا تھا بعد میں ریاض غفار نے اس کا سختی سے نوٹس لیا تھا۔ جس پر شگفتہ غفار "حقیقتاً" اپنے کیے پر شرمندہ ہوگئی تھیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ رومیلہ کے ساتھ سختی سے پیش آئیں۔ بلکہ اس لیے کہ حامد کا رد عمل بڑا شدید تھا۔ وہ نا صرف کھانے کی میز پر سے اٹھ کر چلا گیا تھا بلکہ بریرہ سے بھی ناراض ہوگیا تھا۔
بریرہ کے کافی اصرار اور منت سماجت پر اس نے اتنا ہی کہا تھا اسے پھپھو کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔ گھر کی بہو کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کرنا وہ بھی گھر کے مردوں کے سامنے نہایت گھٹیا حرکت ہے۔
بریرہ بھلا اس پر کیا بولتی۔ وہ اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ ممی کا یہ مطلب نہیں تھا وہ تو عام عورتوں کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔
گر حامد کوئی بے وقوف تو تھا نہیں۔ اس نے اس موضوع پر بحث نہیں کی مگر اس کے انداز میں سرد مہری آگئی

تھی۔ جس پر بریرہ بھی زچ ہو کر شگفتہ غفار پر چڑھ دوڑی۔
"آپ کو ضرورت کیا تھی حامد کے سامنے اس طرح کی گفتگو کرنے کی۔ آپ کو ذرا بھی احساس نہیں ہے حامد کو آپ کا انداز کتنا برا لگا ہے۔" داماد کی نظروں میں برا بننے کے ساتھ ساتھ زندگی میں پہلی بار بریرہ کا اس لب ولہجے میں ان سے کلام کرنا انہیں بہت دکھی کر گیا تھا۔
وہ واقعی اپنے کیے پر شرمندہ ہو گئیں۔ جس کا اظہار انہوں نے شوہر اور بچوں کے سامنے بھی کر دیا تو ریاض غفار انہیں مزید شرمندہ کرنے کی بجائے معاملہ رفع دفع کرتے ہوئے بولے۔
"حامد کے سامنے جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ کوشش کرو کہ اب امی کے سامنے کوئی تماشا نہ ہو۔" شگفتہ غفار نے فورا" سر اثبات میں ہلا دیا تو الیان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ جس پر اور کسی نے تو دھیان نہیں دیا۔ مگر وہ ریاض غفار سے مخفی نہ رہ سکی۔
انہوں نے بھنویں اچکا کر گویا اس کی مسکراہٹ کی وجہ پوچھی تو الیان نے ایک نظر شگفتہ غفار پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے سر ہلکے سے نفی میں ہلا دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔
"ممی یہ کر نہیں سکتیں۔" ریاض غفار اس سے متفق تھے۔ تب ہی متفکر بھی ہو گئے۔ واقعی شگفتہ غفار کے لیے رومیلہ کے لیے اپنی نفرت چھپانا بڑا مشکل امر تھا اور جب جب ان کی نفرت دوسروں کے سامنے ظاہر ہوتی تھی۔ تب تب تماشا ہونا تو لازمی تھا اور واقعی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔
ہوا بس اتنا تھا کہ شگفتہ غفار کی کچھ دوستیں ان کی والدہ سے ملنے گھر آ گئیں۔ ایک دوست نے باتوں باتوں میں یہ کہا کہ اس نے کافی دن پہلے انہیں فون کیا تھا۔ ان کا موبائل نہیں مل رہا تھا تو ان خاتون نے شگفتہ غفار کے گھر پر کر لیا اور ملازمین کو خاص تاکید کر دی کہ جیسے ہی شگفتہ گھر آئے انہیں فون کر لے مگر ان کی ملازمہ تو بڑی نکمی نکلی۔
اتفاق سے سرداراں وہیں چائے دے رہی تھی۔ شگفتہ غفار نے اسی وقت اس سے بھی پوچھ لیا۔
"کیوں بھئی حسنہ کا فون آیا تھا۔ تم نے بتایا نہیں۔ اگر میں گھر پر نہیں تھی تو الیان یا ریاض کو بتا دیتیں' اپنی یادداشت پر بھروسا کر کے کیوں بیٹھ گئیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اسے ڈانٹا تو وہ فورا" صفائی دیتے ہوئے بولی۔
"جی میں تو کبھی اپنی یادداشت پر بھروسا نہیں کرتی۔ میں نے ہمیشہ الیان صاحب یا بڑے صاحب کو اسی لیے بتا دیا کہ کہیں میں بھول نہ جاؤں۔ مگر اس وقت وہ دونوں بھی گھر پر نہیں تھے۔"
"ارے تو شگفتہ کی بہو تو ہو گی' اسے بتا دیتیں۔" ان کی دوست حسنہ نے بھی سرداراں کی معصومیت پر ہنس کر کہا۔
"وہ بھی گھر پر نہیں تھیں بلکہ الیان صاحب کے ساتھ ہی شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔ اگر اس وقت تک آپ کا فون یاد رہتا تو میں الیان صاحب کو ہی بتا دیتی۔" سرداراں اپنے طور پر تو صفائی ہی دے رہی تھی۔ مگر شگفتہ غفار کا رنگ فق ہو گیا۔
"الیان کے ساتھ شاپنگ؟ کب کی بات ہے یہ؟"
"جی۔۔۔ آپ کی والدہ کے آنے سے ایک یا دو دن پہلے کی ہی بات ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
"تمہیں یقین ہے رومیلہ' الیان کے ساتھ شاپنگ پر گئی تھی۔" ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ جسے ماسی تو محسوس نہ کر سکی۔ البتہ نانی اماں نے بڑی باریک بینی سے اس کا مشاہدہ کیا۔
"ہاں' بہت سارے تھیلے لے کر گاڑی سے اترے تھے۔ پھر دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔" ماسی نے کہا تو ایک خاتون جھٹ بولیں۔

"اپنے اپنے کمروں؟ شگفتہ' کیا الیان اور رومیلہ الگ الگ کمرے میں رہتے ہیں۔" یہ سوال تو نانی اماں کے ذہن میں بھی ابھرا تھا۔ مگر ظاہری بات ہے۔ وہ بھری محفل میں باز پرس نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن شگفتہ غفار کی دوستوں کو تو محفل میں ہی ایسا سوال کرنا تھا۔ آخر کو وہ سب الیان اور رومیلہ کی اچانک شادی پر ابھی تک حیران تھیں اور پھر جب بھی انہوں نے رومیلہ کے بارے میں شگفتہ سے کچھ بھی دریافت کیا۔ انہوں نے بڑی بے زاری سے نہایت نپا تلا جواب دے کر ان پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ انہیں رومیلہ کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایسے میں ان ساری خواتین کا متجسس ہونا تو فطری تھا۔
"بہت سارے تھیلے لے کر آئے تھے۔" شگفتہ غفار کے سینے پر گویا سانپ لوٹنے لگے۔ انہیں اپنی دوست کا پوچھا سوال سنائی ہی نہیں دیا۔
مگر ان خواتین کو بھی صبر کہاں تھا۔ وہ بھی کریدے بغیر جان چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ تب ہی ایک اور دوست نے اپنے شولڈر کٹ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی ادا سے پوچھا۔ "کیا الیان اور رومیلہ کے بیچ کوئی ناراضی چل رہی ہے۔ جو ان کے کمرے الگ الگ ہیں یا رومیلہ اپنی پڑھائی ختم ہونے سے پہلے بچوں کا کوئی جھنجھٹ نہیں پالنا چاہتی۔ اس لیے اس نے خود ہی الیان کو کمرے سے باہر کر دیا ہے۔" ان کی بات ساری خواتین کو بڑی مزے دار لگی۔ سب ہی زوردار قہقہہ مار کر ہنس دیں۔
نانی اماں کو ان کا انداز ذرا نہیں بھایا۔ انہیں تو شگفتہ پر غصہ آنے لگا۔ کیسی واہیات دوستیں بنا رکھی تھیں ان کی بیٹی نے۔
شگفتہ غفار کو بھی اپنی دوست کا مذاق ذرا اچھا نہ لگا۔ اس دو کوڑی کی لڑکی کی بھلا کیا مجال کہ ان کے بیٹے کو کمرے سے باہر کر دے۔ ان کے بیٹے نے ہی کبھی اسے اس قابل نہیں سمجھا۔ تب ہی وہ بڑے تنک کر بولیں۔
"وہ کوئی ایسی پڑھاکو نہیں ہے۔ جو پڑھائی کی خاطر اتنی قربانیاں دے۔ الیان کو خود ہی اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" ان کے جواب نے تمام عورتوں میں کھلبلی مچا دی۔ حسنہ نے بظاہر بڑی ہمدردی سے' لیکن حقیقتاً" بڑی بے قراری سے پوچھا۔
"کیوں بھئی خیریت۔۔۔ بہو تو تمہاری اچھی شکل وصورت کی ہے۔ پھر۔۔۔"
"تمہاری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں کیا۔ کون سی اچھی شکل ہے۔ میرے الیان کے سامنے پانی بھرتی ہے۔" شگفتہ غفار سے رومیلہ کی تعریف ذرا برداشت نہیں ہوئی۔ انہوں نے تلملا کر حسنہ کی بات کاٹ دی۔
نانی اماں لب بھینچے بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر شگفتہ غفار اتنے غصے میں تھیں کہ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔
اس وقت بھی انہوں نے رومیلہ کی برائی کرنے کے چکر میں جھوٹ کی حد کر دی تھی۔ ورنہ رومیلہ کا شمار بہت حسین نہ سہی مگر دلکش اور پیاری لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ لیکن یہاں کچھ خواتین ایسی تھیں جو الیان کے لیے خود اپنی بیٹیوں کی امید لگائے بیٹھی تھیں۔ لہٰذا انہیں شگفتہ کی بات سے بھرپور اتفاق تھا۔ بلکہ ان میں سے ایک جلتی پر تیل کا کام کرتے ہوئے کہا۔
"خیر یہ تو ہے۔ تم نے الیان کی شادی اس کے ساتھ کر کے الیان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"
"مجھے تو لگتا ہے الیان نے خود ہی اس سے شادی کر لی ہے' شگفتہ کی مرضی کے بغیر۔" حسنہ نے ہنس کر کہا تو شگفتہ غفار بری طرح تپ گئیں۔
"میرا بیٹا ان لڑکوں میں سے نہیں ہے۔ جو کسی لڑکی کو دیکھ کر اس پر مر مٹتے ہیں۔ الیان میری مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا' شادی کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"شگفتہ بس کرو' اتنا غصہ بھی اچھا نہیں کہ انسان کفر بکنے لگے۔" نانی اماں سے رہا نہ گیا تو وہ سختی سے بول پڑیں۔ مگر شگفتہ غفار کا اس وقت خود پر سے کنٹرول ختم ہو گیا تھا۔ ان کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ سب کے سامنے ماں سے ترخ کر بولیں۔

"غصہ نہ کروں تو کیا کروں۔ پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جو یہ لڑکی میرے بیٹے کی زندگی میں آگئی۔"

"کیوں کیا برائی ہے رومیلہ میں۔" نانی اماں کو بھی غصہ آگیا۔

"کوئی تو برائی ہوگی جو بارات گھر تک آکر لوٹ گئی۔" شگفتہ غفار چیخیں۔

"کیا...؟" حسنہ نے تعجب سے کہا۔

"رومیلہ کی بارات لوٹ گئی تھی۔"

"تو تم نے وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی۔"

"ایسے آنکھ بند کر کے اپنے ایک ہی بیٹے کی شادی کیوں کر دی۔"

ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔ نانی اماں بڑھتے تنفس کے ساتھ بیٹی کو دیکھے گئیں۔ جس نے خود ہی اپنے گھر کا تماشا بنا لیا تھا۔

"بس یہی تو غلطی ہوگئی۔ ریاض کی پہچان کے لوگ تھے۔ میں نے بیٹے کو مجبور کر کے نیکی کرنی چاہی مگر وہ اس قابل ہی نہیں تھی۔ ورنہ میرا بیٹا ایسی لڑکی سے شادی کرتا وہ بھی میرے خلاف جا کر۔" شگفتہ غفار نے ایک دم بات بنالی۔ ان سے برداشت نہیں ہوا تھا کہ کوئی یہ سوچ بھی لے کہ ان کے بیٹے نے انہیں اہمیت نہ دی اور اپنی مرضی سے شادی رچالی۔ لہٰذا اس بات کی صفائی دینا تو سخت ضروری تھا۔ بھلے ہی اس کے لیے رومیلہ کو ذلیل کرنا پڑے اور یہ بتانا پڑے کہ وہ ٹھکرائی ہوئی لڑکی ہے۔ جس کی بارات لوٹ چکی ہے۔

"مگر تم نے یہ پتا کرنے کی کوشش نہیں کی' اس کی شادی کیوں ٹوٹ گئی۔" ایک خاتون نے آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا تو نانی اماں خود کو روک نہ سکیں اور بڑی سختی سے بولیں۔

"شرم کرو' بیٹی تم بھی کسی کی بیٹی ہو' تمہاری بھی کوئی بیٹی ہوگی' کسی لڑکی کے ساتھ ہوئی انہونی کو یوں چٹخارے لے کر سننا' تمہیں بالکل زیب نہیں دیتا۔" نانی اماں کی بات انہیں طمانچہ کی طرح لگی۔ وہ پھر کر کچھ کہنا چاہتی تھیں کہ حسنہ نے ان کی طرف داری کرتے ہوئے خود کو بہت نیک پروین ظاہر کرنا چاہا۔

"ہاں' ہاں خالہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ کریدنے کی بجائے ہمیں شگفتہ کو سمجھانا چاہیے کہ جو ہو گیا ہے اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کرلے۔

اب وہ اس کی بہو ہے لہٰذا اسے وہی درجہ دے بلکہ الیان کو سمجھائے کہ اسے اپنے کمرے میں رکھے۔" ان کا پینترا بدلا دوسری خواتین بھی سمجھ گئیں۔ وہ بھی حسنہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔

نانی اماں کو کون سا یہاں مستقل رہنا تھا۔ ان کے سامنے اچھا بننے کے لیے ابھی یہ باتیں کر لو بعد میں شگفتہ کو اکسا کر ساری تفصیل پتا چل ہی جائے گی۔

شگفتہ غفار کو ان سب کا اماں کی حمایت کرنا کھلا تو بہت' مگر وہ ضبط کر گئیں۔ کیونکہ نانی اماں کے چہرے پر بھی واضح طور پر ناگواری پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول میں تناؤ دیکھ کر ان کی دوستیں بھی جلدی اٹھ گئیں اور ان سب کے جاتے ہی جب اماں نے شگفتہ غفار سے بات کرنی چاہی تو وہ ان ہی پر چڑھ دوڑیں۔

"کوئی ضرورت نہیں مجھے لیکچر دینے کی۔ میں نے جو کیا' ٹھیک کیا۔"

"تمہیں پتا بھی ہے' تم نے کیا کیا ہے۔ اپنی بہو کی سب کے سامنے برائی کر کے تم نے خود ان لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے اور تمہارے متعلق باتیں بنانے کا موقع دیا ہے۔"

"ہاں تو بناتے رہیں باتیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔" شگفتہ غفار جلے پیر کی بلی کی طرح ڈرائنگ روم میں پھر رہی تھیں۔

"کیوں آگ لگی ہے میری سمجھ میں تو یہی نہیں آرہا۔" نانی اماں زچ ہو گئیں مگر شگفتہ غفار نے دھیان ہی نہیں دیا۔ ان کا ذہن تو مشین کی طرح چل رہا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے سرداراں کو آوازیں دیں۔

ان کا جلال دیکھ کر سرداراں بھی خوف زدہ سی دوڑی چلی آئی۔

"اس دن بازار کے علاوہ بھی کیا وہ دونوں کبھی ساتھ گئے ہیں۔"

"ج... جی پتا نہیں۔" اب اسے احساس ہو رہا تھا۔ اس نے یہ بات کہہ کر شاید بہت بڑی غلطی کر دی۔

"شگفتہ بند کرو یہ بکواس... سرداراں تم جاؤ یہاں سے۔" نانی اماں نے دانت پیس کر کہا۔ سرداراں فوراً" پلٹنے لگی تو شگفتہ غفار دھاڑ کر بولیں۔

"کہاں جا رہی ہو تمہیں اماں تنخواہ دیتی ہیں یا میں... جب تک میں اجازت نہ دوں تم یہاں سے ہلو گی بھی نہیں۔ اب بتاؤ اگر تم نے انہیں کبھی ساتھ جاتے ہوئے نہیں تو کبھی ساتھ ساتھ بیٹھ کر باتیں وغیرہ کرتے ہوئے تو دیکھا ہوگا۔"

"بیگم صاحبہ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔" وہ ہراساں ہوئی۔ "یاد نہیں آرہا تو یاد کرنے کی کوشش کرو۔" شگفتہ غفار چلائیں۔ وہ اس وقت بالکل بھی اپنے آپے میں نہیں تھیں اور یہ رومیلہ کی سراسر بدقسمتی تھی کہ اس نے اسی وقت گھر میں قدم رکھ دیا۔

عام دنوں میں تو وہ خاصی تاخیر سے آتی تھی۔ مگر آج نمل یونیورسٹی آئی تھی۔ بہت دنوں کے بعد' جس پر سمیر نے نمل کی منگنی ٹوٹنے کی خوشی میں سب کو ٹریٹ دے ڈالی۔ لہٰذا نمل' سنبل اور رومیلہ سب ہی خجالت محسوس کرتیں وقت سے پہلے وہاں سے نکل گئیں۔

رومیلہ نے گھر میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی محسوس کر لیا کہ کوئی ہنگامہ چل رہا ہے۔ شگفتہ غفار' نانی اماں اور سرداراں سب ڈرائنگ روم میں تھیں مگر ان کے چیخنے کی آوازیں باہر ٹی وی لاؤنج تک آرہی تھیں۔

رومیلہ الفاظ سنائی نہ دینے کی وجہ سے یہ تو نہ جان سکی کہ بات کیا ہو رہی ہے۔ البتہ شگفتہ کا شدید غصہ محسوس کرتی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ مگر تب ہی زینے کی طرف جاتی رومیلہ پر شگفتہ غفار کی نظر پڑ گئی اور انہوں نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا۔

"رومیلہ!" ان کی آواز اور لہجہ میں کچھ ایسا تھا کہ رومیلہ کا دل ہی بند ہونے لگا۔ اس نے بڑی ہمت کر کے پلٹ کر دیکھا تو وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکل کر اب لاؤنج میں آکھڑی ہوئی تھیں۔

"جی..." رومیلہ کی آواز ہی نہ نکل سکی۔

"اتنی جلدی واپس آگئیں۔ تمہارے نہ آنے کا کوئی ٹائم ہے' نہ جانے کا کوئی ٹائم ہے' یونیورسٹی ہی جاتی ہو نا۔" شگفتہ غفار کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ رومیلہ کا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔

"کچھ پوچھ رہی ہوں میں۔" وہ ایک دم چلائیں تو رومیلہ خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلدی سے کہنے لگی۔

"یونیورسٹی سے ہی آرہی ہوں۔ آ... آں... آج کوئی خاص کلاس نہیں تھی... اور... ایک اسائنمنٹ جمع کرانی تھی لہٰذا میں... جلدی گھر آگئی۔" رومیلہ نے اپنے طور پر بڑے اعتماد سے کہنے کی کوشش کی۔ اتنے میں نانی اماں بھی ڈرائنگ روم سے اٹھ کر یہیں آگئی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی بلا کی سنجیدگی پھیلی تھیں۔ وہ اسی گمبھیر لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

"یہ کہیں نہیں جا رہی ہے۔" شگفتہ غفار ترخ کر ماں سے بولیں۔

"رومیلہ سے بعد میں بات کر لینا' پہلے تم ذرا میرے ساتھ کمرے میں آؤ۔" نانی اماں انہیں رومیلہ کے ساتھ خاموش رہنے کی تنبیہہ کرتے ہوئے بردباری سے بولیں مگر شگفتہ غفار بالکل جنونی بنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بدتمیزی سے گویا ہوئیں۔

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ مجھے رومیلہ سے بات کرنے دیں۔ اسے یونیورسٹی جانے کی اجازت دے کر مجھے لگتا ہے میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یونیورسٹی کے بہانے یہ تو گلچھرے اڑاتی پھر رہی ہے۔" رومیلہ کو اپنے پیروں سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ جبکہ نانی اماں کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ خاصی تیز آواز میں بولیں۔

"زبان سنبھال کر بات کرو شگفتہ' تمہیں ہوش بھی ہے تم کیا بول رہی ہو۔"

"نہیں مجھے بالکل ہوش نہیں رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے یہ میرے بیٹے پر ڈورے ڈالتی رہے اور میں ہوش میں رہوں' کیا یہ ممکن ہے۔"

"شگفتہ... بس کرو وہ اس کا شوہر ہے۔ تمہیں شرم نہیں آ رہی اپنی بہو کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے۔" نانی اماں کا شرمندگی سے برا حال ہونا شروع ہو گیا تھا۔

اپنی بیٹی پر انہیں آج شدید تعجب ہو رہا تھا۔ مگر شگفتہ غفار کو نانی اماں کے احساسات کی پرواہی کہاں تھی ان پر تو جیسے خون سوار تھا۔ وہ رومیلہ کے عین سامنے آ کھڑی ہوئیں اور نہایت کرختگی سے بولیں۔

"کتنی بار شاپنگ پر جا چکی ہو تم الیان کے ساتھ۔" رومیلہ تو پہلے ہی اس ساری صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ تو اب ایک دم سکتے میں چلی گئی۔

"بت بنی کیا کھڑی ہو' جواب دو مجھے۔ کتنا لوٹا ہے میرے بیٹے کو بولو... جواب دو۔" شگفتہ غفار دھاڑیں۔

رومیلہ کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اتنا تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ شگفتہ غفار کو پتا چل گیا ہے کہ وہ الیان کے ساتھ شاپنگ پر گئی تھی۔ لیکن اس صورت حال کو کیسے سنبھالنا ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو خود کو نہیں سنبھال پا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جسے چھلکنے کے لیے بے تاب دیکھ کر شگفتہ غفار خونخوار انداز میں بولیں۔

"خبردار جو میرے سامنے آنسو بہائے' جو میں نے پوچھا ہے شرافت سے اس کا جواب دو۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی الیان کے ساتھ شاپنگ پر جانے کی۔"

"کیا ہوا امی۔" بریرہ کی صبح ماں کے گھر میں خاصی دیر سے ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھ چیخ و پکار سے ہی کھلی تھی' تو وہ اٹھ کر فوراً" اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ ریلنگ سے نیچے جھانکنے پر اسے زینے کے پاس ہی سب کھڑے نظر آئے تو اس نے وہیں سے آواز لگا کر پوچھ لیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی نانی اماں کے سوالوں کو جیسے سمت مل گئی۔

"بریرہ! نیچے آؤ' فوراً" نیچے آؤ۔" بریرہ نے نانی اماں کو اتنے غصے میں پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی ان کے پاس آ گئی اور گھبرا کر پوچھنے لگی۔

"کیا ہوا نانی اماں... سب خیریت تو ہے نا۔"

"مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے ذرا بھی عزت ہے تو تم مجھ سے ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولو گی۔" نانی اماں کے لہجے میں غم و غصے دونوں کی آمیزش تھی۔ بریرہ تڑپ اٹھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں نانی اماں۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

"یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا کہ ہوا کیا ہے۔ تم صرف مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگوں نے رومیلہ کے ساتھ الیان کی شادی کیوں کی؟" لاؤنج میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

بریرہ تو کچھ جانتی نہیں تھی وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نانی اماں یہ سوال کر ڈالیں گی۔ رومیلہ اور شگفتہ غفار تک اس سوال پر ہکا بکا رہ گئے۔

"ج... جی... نانی اماں میں سمجھی نہیں۔"

"مجھے سچ بتاؤ... رومیلہ کے ساتھ الیان کی شادی کیوں کی تھی؟

جو رومیلہ نے کہا تھا کہ اس کی بارات لوٹ گئی اور الیان اس کے بھائی کا دوست تھا۔ اس کہانی پر تو کوئی بچہ بھی یقین نہیں کر سکتا۔ الیان اتنا خودسر نہیں ہے کہ دوست کی خاطر ماں کے خلاف جائے اور تمہاری ماں کو مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ یہ وہ عورت ہی نہیں جسے نیکیاں کمانے کا شوق ہوتا ہے۔ پھر آخر یہ شادی کیسے ہو گئی۔ شگفتہ کی نفرت اور اس کی جلن دیکھ کر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ تم لوگوں نے کسی مجبوری کے تحت یہ فیصلہ لیا ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا' تم لوگوں کی ایسی کیا مجبوری تھی جو تم لوگوں نے اتنا بڑا فیصلہ لیا۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ یہ سب مجبوری کا سودا ہے۔ بس مجھے وہ مجبوری جاننی ہے۔" نانی اماں کا لہجہ گلوگیر ہو گیا تھا۔

بریرہ اور رومیلہ تو کیا خود شگفتہ غفار سانس روکے کھڑی تھیں۔

اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے کیا کر دیا ہے۔ نانی اماں کو ایک بار اگر شک ہو گیا تھا تو اب اس شک کو دور کرنا آسان نہیں تھا۔

شگفتہ غفار نے ان کے سامنے اتنا ہنگامہ کر کے انہیں مشکوک کر دیا تھا اور وہ برہمی سے بریرہ سے مخاطب تھیں جو خود روہانسی ہونے لگی تھی۔ اس کے اوپر تو اس راز کے فاش ہونے کا خطرہ کسی تلوار کی طرح لٹکتا رہتا تھا۔ اس کی بھنک پڑتا دیکھ کر ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔ وہ تو جیسے بالکل ہی ہمت ہار گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

☆ ☆

فاخرہ گل

میرے ہمنوا کو خبر کرو

چوتھی قسط

"میں کل سے یونیورسٹی جوائن کر رہی ہوں۔"
لہجے کی مضبوطی پر کنٹرول قائم رکھتے ہوئے ندی نے شاید اُن کے سروں پر انتہائی غیر متوقع طور پر گویا بم پھوڑا تھا۔

استفہامیہ نظریں عصر کے ڈھلتے سائے بنی پھیل گئی تھیں اور امی کے علاوہ کمرے میں موجود باقی تینوں نفوس چونک گئے۔

البتہ یہ سچ تھا کہ چہرے پر سکوت طاری کیے امی اُن سب کے تاثرات کا بغور مشاہدہ کر رہی تھیں مگر تسبیح کو حرکت دیتی اُن کی اپنی انگلیاں تھم گئی تھیں۔

اوجھل ہی سہی آنکھ سے ڈوبا نہیں ہوں میں
اے رات خبردار کہ ہارا نہیں ہوں میں
مجھ کو فرشتہ ہونے کا دعوا نہیں مگر
جتنا برا سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں میں

"کیوں؟ کوئی نیا گل کھلانا باقی رہ گیا ہے کیا جس کے لیے یہ دوبارہ جانا چاہتی ہے یا پھر ابھی بدنامی میں کوئی کسر باقی ہے۔"
اسے مخاطب کیے بغیر ناصر بھائی نے فوری ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔

"میں کہتا ہوں کہ مجھے جینے کے قابل چھوڑے گی یا منہ چھپا کر بیٹھ جاؤں۔"
اب اُن کی مخاطب امی تھیں جو ان سب کے درمیان بیٹھی بھی تنہا معلوم ہو رہی تھیں۔

"ندی! اب تم ایک بار پھر وہی کچھ کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو جس کی وجہ سے تم نے بابا کی جان لے لی۔۔۔ مجھے سسرال میں سر جھکا کر اُن کے طعنے سننے پر مجبور کیا اور اب۔۔۔"

ثروت آپا کی بات پر ندی کے دل میں موسم سرما راج کرنے لگا تھا۔ ہاتھوں پیروں میں بھی اسی موسم نے اثر دکھایا تو ان کا درجہ حرارت بھی گرنے لگا۔

اس کے برعکس شاید امی نے خود کو یا تو بہت جلدی کمپوز کر لیا تھا یا پھر انہیں اسی طرح کی باتوں کی توقع تھی۔ جبھی تسبیح کے دانے ریت بنے سرکنے لگے۔

"اب کیا یونیورسٹی جا کر امی کی جان لو گی؟"
سانس لینے کے لیے لحہ بھر رکنے کے فوراً بعد انہوں نے جملہ مکمل کیا۔

ان کے زہرخند لہجے میں بے تلخ ترین الفاظ استعمال کرنے پر ندی ششدر رہ گئی تھی۔ اُسی لمحے امی نے اس کے گرد موجود اپنے بازو کا حلقہ مزید تنگ کرتے ہوئے اسے سیکورٹی کا احساس دلایا۔ وہ بھی اس لمحے جب وہ خود اپنے آپ کو اولاد کے سامنے غیر محفوظ تصور کر رہی تھیں۔

"ثروت! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"
"غلط تو کچھ بھی نہیں کہا گیا امی!" ثروت کے بجائے ناصر بھائی نے جواب میں بلا کا سرد لہجہ استعمال کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"تم لوگ ندی کے ساتھ۔۔۔ اپنی چھوٹی اور لاڈلی بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرو گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

امی کی ذات کی بے قدری کا دکھ ندی کے تن بدن کو سرد آندھیوں کی زد میں لیے ہوئے تھا۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے اور ابھی مزید کتنا کچھ ہو..."

باقی ہے۔

پھٹی آنکھوں اور سائیں سائیں کرتے کانوں کے ساتھ سردپڑتے جسم کو لیے ان سب کے درمیان بیٹھنا بہت مشکل ہورہا تھا۔ کتنی ہی دفعہ اس نے خود کو کسی کی بھی باتوں پر پریشان نہ ہونے کے بارے میں تاکید کی تھی مگر اس تاکید کو یاد رکھ کر اس پر عمل کرنا ہمیشہ ہی بھول جاتی۔ وہ اتنی کمزور تو کبھی بھی نہیں تھی مگر اب یقینی طور پر اس کا دل بہت کمزور پڑ چکا تھا۔ اپنی وجہ سے عزیز از جان ماں کی توہین اور کم مائیگی کا احساس اس کے دل کو مزید کچوکے لگا رہا تھا۔

"کچھ بھی غلط نہیں کر رہے ہم لوگ، یہ سب خود ندی کا کیا دھرا ہے، ہم تو بس بھگت رہے ہیں، شرم آتی ہے اب تو اس کی باتیں لوگوں کے منہ سے سنتے ہوئے بھی۔" عائشہ بھابھی خاموش رہ کر ناصر بھائی اور ثروت آپا کو بولنے کا بھرپور موقع فراہم کیے ہوئے تھیں۔ امی جو کچھ دیر پہلے تک خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے ندی کو اپنے بازو سے احساس تحفظ فراہم کر رہی تھیں اب اپنے ہی بازو پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

"ان حالات میں جب ساری دنیا اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہے اس کے کردار کے کیچڑ کو اپنی باتوں اور قہقہوں سے مزید نمایاں کر رہی ہے تو آپ خود سوچیں، ایسے حالات میں اسے یونیورسٹی جانا چاہیے یا نہیں؟ کم از کم میں نہیں سمجھتی کہ یہ جائے۔"

لفظوں کی تیر اندازی میں عائشہ بھابھی اب تک خاموش تھیں مگر اس ہنر سے ناواقف ہرگز بھی نہیں تھیں سو اپنا فن دکھانے کے لیے آخرکار زہر میں بجھے لفظوں کے تیر زبان کی کسی کمان کے ساتھ لیے اب ان کے لیے پیچھے رہنا ناممکن تھا۔

لہٰذا پورے جوش سے اپنا جوہر دکھانے میدان میں آن موجود ہوئیں۔

اماں کے بے جان اور زرد چہرے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ثروت آپا نے بھی تائید کرتے ہوئے گردن ہلا کر ان کی بات کے حق میں ووٹ دیا۔

مگر ندی اپنی قسمت کا فیصلہ اُن لوگوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہتی تھی جواب اس کے ساتھ بال برابر بھی مخلص معلوم نہ ہوتے۔

جن کی انا کا پودا کچھ ہی عرصے میں تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

"میں کل ہر قیمت پر یونیورسٹی جاؤں گی اور بس۔"

آخرکار جب ضبط کے غبارے میں حجم کم پڑنے لگا تو وہ پھٹ ہی تو پڑی، مگر اس کی بات پر لحہ بھر رکے بغیر ناصر بھائی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"امی یہ یونیورسٹی جانا چاہتی ہے نا تو ضرور جائے، شوق سے جائے۔"

امی نے گردن اوپر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"لیکن یہ بھی سوچ لے کہ پھر اپنی آئندہ زندگی کہاں گزارے گی، کیونکہ واپسی کے سب دروازے اس کے گھر سے نکلتے ہی بند کر دیے جائیں گے۔"

اتنی سنگ دلی، اس قدر کٹھور پن۔۔۔

کوئی اپنی ماں جائی کے ساتھ اس طرح بھی کرتا ہے بھلا!

ناصر بھائی کی آواز میں اس قدر سختی تھی گویا شیشہ کٹ رہا ہو، پتے کے آخری سرے پر ٹکی بوند کی مانند انہیں اپنا آپ اب گرا کہ تب کے مصداق بے اماں محسوس ہوا تھا۔

ایسے میں چق کے پیچھے ایک مضطرب سی ہلچل محسوس ہوئی اور آن کی آن میں بابا دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر مگر بے نور آنکھوں سے خالی پن لیے اُن کے پاس آ بیٹھے۔

"آزمائش۔۔۔!! آزمائش ہے تمہاری، حوصلہ مت ہار دینا، جانتی ہو نا جو خدا کا زیادہ محبوب ہوتا ہے آزمائش بھی اسی کی ہوتی ہے۔ ہر ایک کی قسمت میں رب کی یہ اپنائیت کہاں۔"

"رب کی اپنائیت؟ آزمائش؟ آپ کو کیسے پتا کہ یہ آزمائش ہی ہے؟"

گرمیوں کی سنسان دوپہر میں کوئی کوئل کی کوک سے الفاظ امی کے خالی دل میں بازگشت پیدا کرنے لگے تھے۔

"ہر وہ دکھ، تکلیف یا پریشانی جو خدا سے نزدیک کر دے ہمارے لیے آزمائش، اور اگر اسی دکھ تکلیف یا پریشانی کے نتیجے میں مایوس ہو کر ہم خدا سے دور ہونے لگیں تو وہ ہمارے لیے سزا کی صورت نازل ہوتی ہے۔"

بابا نے چند لمحے امی کا چہرہ بغور دیکھا جہاں کی ویرانی پتھریلے پہاڑوں کو مات دیے ہوئی تھی۔

"یہ سارے حالات جس نے پیدا کیے ہیں اُس کے حوالے سب کچھ کر کے بے فکر ہو جاؤ، سب بہتر ہو جائے گا۔"

چق کے اوپر خزاں رسیدہ پتے ہوا کی مدھم رفتار سے گرنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ بابا سے امی اپنی الجھن بانٹتیں، جیسے کچھ یاد آنے پر ایک دم بولے۔

"جانتا ہوں کہ ناصر کی وجہ سے تمہارا دل بہت دکھا ہوا ہے مگر دیکھو اُسے بددعا نہ دینا، لفظوں کی ایسی گھڑی اس کے نصیب کے حوالے نہ کرنا جس کا بار اٹھانے کی طاقت اس میں نہ ہو۔"

امی نے ایک دم سر جھکا لیا تھا۔

چق کے اُس پار ایک دفعہ پھر شہر خموشاں سا سکون تھا۔

"امی!"

ثروت آپا نے اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے پکارا اور ان کے کندھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو امی نے رزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

کمرے میں اس وقت ندی، ثروت آپا اور ان کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

ناصر بھائی بات کرنے کے بعید رکے نہیں تھے اور عائشہ بھابھی نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔

☆☆☆

شاہ سائیں جان بوجھ کر ان دنوں حویلی میں اپنا قیام طویل کرنا چاہتے تھے۔ شہر میں جس طرح آج کل الیکشن کا میلہ سجائے جانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور ہر ممبر اپنی مارکیٹ ویلیو چیک کرنے کی غرض سے مختلف سیاسی جماعتوں سے اپنی قیمتیں لگوا رہے تھے۔ ایسے میں شاہ سائیں کا منظر سے غائب ہو جانا یقینی طور پر ایک حیران کن امر تھا۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ بلاشبہ وہ ایک زیرک سیاست دان ہیں اور وقت کی چلتی نبض پر ہاتھ رکھ کر سیاست کی بچھی بساط پر مہرے تبدیل کیا کرتے ہیں۔

ان دنوں جب سیاست دانوں کی گاڑیوں کے پہیے اور فون کے کنکشن ہمہ وقت مصروف رہتے وہ بڑے آرام سے ہاتھ میں سگار لیے، کلف لگے شلوار قمیص میں اپنے جدید ٹی وی کی اسکرین پر نیوز چینلز کو آئینے کی طرح دیکھا کرتے۔ سیاسی جماعتوں کی بنتی بگڑتی صورت حال، کل کے وزیر آج کے اسیر اور اس پر خود کو پائے کا دانشور خیال کرتے مائیک کے سامنے بیٹھے صحافی۔

جو کسی بھی ڈگری کو کہیں بھی چیک کروانے کے نہ تو عادی تھے نہ پابند۔

مائیک ہاتھ میں آتے ہی جو کسی کو بھی فرش سے عرش تک بھی لے جا سکتے تھے اور عرش سے فرش تک پہنچنے میں بھی انہیں محض ایک ہی گھنٹہ درکار ہوتا۔

ایسے میں آج انہوں نے اپنے حلقے کے ہونے والے آئندہ الیکشنز سے پہلے اخباروں کے ذریعے عوام تک اپنا اچھا تاثر پہنچانے ہی کی غرض سے چند چیدہ چیدہ صحافیوں اور اعلیٰ عہدیداران کا ڈنر حویلی میں ارینج کیا تھا۔

بہترین و لذیذ کھانے بھی کھائے گئے، "باہمی تعاون" پر بھی اشاروں کنایوں میں غور کیا گیا۔ جس پر کبھی نے شاہ سائیں کو اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے انہیں بے فکر ہو کر الیکشن مہم کا آغاز کرنے کا مشورہ دیا اور محفل کی "برکات" سمیٹتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

برآمدے میں کھڑے شاہ سائیں اور میران چونکے تو تب جاتے ہوئے اللہ حافظ کہتے کہتے ایک صحافی نے اپنی طرف سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے خود کو میران کا مخلص دکھانا چاہا۔

"اُس لڑکی کی طرف سے پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا نا۔"

شاہ سائیں نے چونک کر پہلے صحافی کو اور پھر

میران کو دیکھا جو اس کی بات پر گڑبڑا سا گیا تھا۔
"نہیں نہیں، اب تو سب کچھ سیٹ ہو گیا ہے۔"
"سیٹ تو سائیں ہونا ہی تھا نا، خبر ہی ایسی لگائی تھی۔"

میران نے تو اپنے تئیں بات ختم کر کے جان چھڑانا چاہی تھی مگر ایسا ہو نہ سکا کیونکہ وہ یقیناً تفصیلی بات کرنے کے موڈ میں تھا جبھی شاہ سائیں کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور صرف میں نے ہی نہیں، اپنے دوسرے صحافی دوستوں کو بھی میں نے بتایا کہ یہ خبر ضرور لگنی چاہیے اور لگے بھی ایسی جگہ پر کہ ہر ایک کی نظر سے ایک دفعہ تو ضرور ہی گزرے۔۔۔ اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔"

"ہاں بالکل، مگر اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"
"بس سائیں! اگر کبھی کوئی مسئلہ ہو بھی تو صرف ایک فون کال آپ کی، اور باقی سارا کام میرا۔"
"بہت مہربانی، شکریہ۔"
نا چاہتے ہوئے میران نے خوش اخلاقی نبھائی۔
"شرمندہ نہ کریں جی، ہمارا اخبار سمجھیں آپ کا ہی اخبار ہے، چاہیں تو روز لکھی جانے والی ڈائری کی طرح استعمال کریں۔"
"بہت شکریہ۔"
میران کو منظر سے جلد از جلد ہٹنے کی جلدی تھی مگر وہ تھا کہ جیسے رات کے اس پہر فراغت کے لمحات گزار رہا تھا۔ اس پر شاہ سائیں کے چہرے پر بنتے بگڑتے ناگواری کے تاثرات۔

"میں ان شاءاللہ پھر ملتا ہوں آپ سے۔"
شاہ سائیں نے خود ہی اشارتاً اب اُسے چلے جانے کا کہتے ہوئے مصافحہ کی غرض سے ہاتھ بڑھایا تو اسے جاتے ہی بنی مگر اس کے جاتے ہی میران بھی شاہ سائیں کی باتیں سننے کے لیے رکا نہیں اور فوراً حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

مصروفیت کے موڑ پر یادوں کی شاہراہ
لمحوں سے پوچھتی ہے مسافر کدھر گئے

نہ چاہتے ہوئے بھی شاہ زین کو آج یونیورسٹی آنا ہی پڑا تھا مگر بڑے سے آہنی گیٹ کے اُس پار یونیورسٹی کے اندر ندی کی یادیں جو درزی کی کترنوں کی طرح جا بجا بکھری ہوئی تھیں اُن سے وہ کیسے اور کیونکر مل پائے گا، اس معاملے میں وہ خود کو تمام رستہ سمجھاتا آیا تھا کہ ندی سے اس کا پیار صرف یک طرفہ تھا۔ اس کے جذبات سے محض وقتی طور پر اپنی انا کی تسکین کے لیے کھیلا گیا اور بس۔

لیکن یہ الگ بات تھی کہ اس نے اپنے دل و ذہن میں محبت اور تجارت میں بہت فرق رکھا تھا۔ اگر وہ محبت میں تجارت کے اصول و ضوابط کی آمیزش کرتا تو یقیناً اب تک ندی کو اپنے دل سے نکال چکا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں تھا، بلکہ اسے اب بھی ندی سے محبت تھی، فرق جو تھا سو دل کے کسی ایک کونے میں جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا ضرور تھا۔

اور اتنا سوشل تو وہ کبھی بھی نہیں رہا تھا کہ اسے دیکھتے ہی اسٹوڈنٹس کی ٹولیاں اس کی طرف لپکی آتیں جبھی بڑے سنجیدہ اور پروقار انداز میں چلتا ہوا ڈیپارٹمنٹ کی راہداری تک پہنچا کہ اسی راہداری کے آخر میں بائیں طرف موجود آفس میں وقار صاحب سے اُسے اپنے کچھ کاغذات کے سلسلے میں ملنا تھا۔

"شاہو!" اسے لگا جیسے ہمیشہ کی طرح اس کے دائیں سمت چلتی ندی نے اسے پکارا ہو۔ ڈارک بلیو جینز پر وائٹ بے داغ کاٹن کا ٹاپ اور گلے میں چھوٹے سے پنک مفلر کی گرہ لگائے اس کی طرف چہرا کر کے چلتی ندی نے اسے پکارا تھا مگر شاہو نے اس کی بات سننے کے بجائے خود ہی اسے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"ویسے، میرے ساتھ تمہیں ایک فائدہ تو ہے۔"
"وہ کون سا؟" وہ وہیں پر رک جاتی۔
"تم ہمیشہ میرے سامنے سر اٹھا کر بات کیا کرو گی۔" وہ زیر لب مسکراتا تو ندی ہنس دیتی۔
"پتا ہے میں ہمیشہ تمہاری رائٹ سائیڈ پر چلتی ہوں، تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ میں تمہارا رائٹ ہینڈ ہوں اور اگر کبھی تم نے مجھے چھوڑ دیا نا تو نکمے ہو جاؤ گے ایک نمبر کے۔" بات میں جب تک شوخی کی جھلک نہ آتی اسے اپنی بات نامکمل سی لگا کرتی تھی، جبھی مسکراتے ہوئے اسے دھمکی دے ڈالی۔

"ہاں بالکل کیونکہ دو نمبری تو ویسے بھی تمہارے پاس ہے۔"
وہ محض بات برائے بات کرتا مگر نتیجتاً ندی کا دھموکا سہنا پڑتا۔

یہاں اسی راہداری کے ایک ایک ستون کے پاس بعض اوقات وہ چاروں صرف بات کرتے کرتے رکتے اور کبھی کبھار اتنی دیر تک کھڑے رہتے کہ اگلے پیریڈ کا ٹائم بھی اسٹارٹ ہو جاتا۔ مگر اب ان سب یادوں پر وقت کی تیز ہوا دھول اڑا رہی تھی۔

کچھ کلاس فیلوز نے دیکھا تو ہیلو ہائے کرنے کی غرض سے آگے بھی بڑھے۔ انہی سے پتا چلا کہ آج زبیر اور صبا کی منگنی کی تقریب ہے اس لیے وہ دونوں یونیورسٹی نہیں آئے۔ حیرت انگیز طور پر کسی نے بھی ندی کے متعلق کوئی بات کی نہ پوچھی۔ حالانکہ لاشعوری طور پر شاہ زین کی سماعتیں منتظر ہی رہیں مگر چونکہ وہ کسی کے پاس بھی زیادہ دیر نہیں رکا تھا اور باوجود ان کے کینٹین چل کر چائے پینے کی آفر پر اس نے معذرت کرتے ہوئے اُن سے اجازت چاہی۔ اس لیے ندی کے بارے میں کوئی بات ڈسکس نہیں ہوئی تھی۔

ہوا میں موجود نرم اور پرکیف احساس کی طرح یادوں کو ساتھ لیے نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتا اس سے پہلے کہ وہ مطلوبہ آفس تک پہنچتا، سامنے سے میران اپنے چیلوں کے ساتھ حسب معمول بازو دو فٹ دور کر کے اکڑتے ہوئے چلتا نظر آیا، شاہ زین کو دیکھا تو نہ صرف چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی بلکہ دایاں ہاتھ مونچھوں کو تاؤ بھی دینے لگا۔
بغیر بات کے چیلوں نے قہقہہ لگایا تو میران نے شاہ زین کی طرف رخ کر کے انہیں مخاطب کیا۔
"یار! شہر میں جتنی بھی کوشش کر لو پر یہ آوارہ، دم ہلاتے کتے ختم نہیں ہوتے۔"
"سائیں ندرت بھابھی کو تو کتے ویسے بھی بہت پسند ہیں۔"
ایک دوست نے کچھ زیادہ ہی نمبر بنانے کے لیے ندی کو بھابھی تک کہہ ڈالا جس پر پہلے تو میران چونکا پھر اسے تھپکی دیتے ہوئے بولا۔
"ہاں ہاں تیری ندرت بھابھی کو منہ دکھائی میں بھی کوئی کتا ہی نہ دے دوں۔"

اور بس یہی وہ لمحہ تھا جب میران کی بات پر امڈ آنے والے قہقہوں کی مکروہ آواز سے وہ اپنی برداشت کھو بیٹھا اور پاس سے گزرتے میران کو پیچھے سے کالر پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ لمبے چوڑے شاہ زین کے سامنے میران جیسے بالکل ہی بچہ معلوم ہو رہا تھا۔ ساتھ موجود اس کے دوستوں نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات بھی پیش کرنی چاہیں مگر میران نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

راہداری میں موجود نوٹس بورڈ کے پاس کھڑے اسٹوڈنٹس ایک لمحہ میں وہاں سے غائب ہو گئے تھے اور اب وہاں ان کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

یوں بھی ہر نرم دل انسان کی بھی برداشت کی آخر کو ایک حد ہوتی ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک خالی گلاس میں پانی ہم اس وقت تک ہی ڈال سکتے ہیں جب تک اس میں گنجائش ہو، دوسری صورت میں ڈالا گیا پانی ہر حال میں باہر گرے گا۔

سو اب بھی وہی ہوا تھا۔ شاہ زین کی سرخ ہوتی آنکھیں میران کے چہرے پر تھیں۔
"آج کے بعد اگر اُس کا نام بھی تمہاری زبان پر اس انداز میں آیا تو دوسرا لفظ کہنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

ایک جھٹکے سے شاہان نے اُس کا گریبان چھوڑا تو وہ ایک بار پھر مسکرانے لگا۔ وہی جلانے والی طنزیہ مسکراہٹ۔
"کیوں تمہارے نام لکھی گئی ہے کیا؟"
"میں کہتا ہوں بکواس بند کروانی ورنہ۔۔۔"
شاہ زین ایک بار پھر اس کی طرف لپکا مگر اس دفعہ میران کے دوستوں نے اسے آگے بڑھنے سے

روک دیا، یوں بھی وہ لوگ پانچ چھ تھے اور شاہ زین تن تنہا اور پھر یہ حقیقی زندگی تھی فلم ہوتی تو یقیناً پانچ چھ کے بجائے درجن بھر غنڈوں سے نبٹا جا سکتا تھا مگر حقیقت میں اب میران کے دوستوں نے اس کے گرد حصار بن کر شاہ زین کو میران تک پہنچنے سے روک تو دیا تھا مگر میران کے اشارے پر اس پر جھپٹنے سے گریز کیا تھا۔

"ورنہ کیا؟ کیا کرلو گے تم؟"

میران نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے مونچھوں کو "سنوارتے" ہوئے اسے چیلنج دیا تھا مگر اس سے پہلے کہ شاہ زین بھی جواب میں کچھ کہتا اتفاقاً سامنے اپنے آفس سے نکل کر آتے پروفیسر وقار کو دیکھ کر جہاں میران اور اس کے دوستوں کو وہاں سے کھسکنا پڑا وہیں شاہ زین بھی غصے میں محض پیچ و تاب کھاتا رہ گیا، باوجود اس کے کہ وہ ایک نہایت مضبوط اعصاب اور تحمل مزاج کا انسان تھا مگر پھر بھی میران کے ندی کے بارے کہے گئے الفاظ اور اس کے دوستوں کے گھٹیا ریمارکس نے اسے اس طرح کا ردِعمل دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے لیے جس کے لیے شاہ زین کی محبت کا وجود شاید روزانہ کے اخبار سے بڑھ کر کبھی بھی نہیں رہا تھا اور حالات و واقعات یہی بتا رہے تھے کہ وہ اس کے جذبات کی سچائی سے سدا لاعلم ہی رہی تھی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جس کو ہم سفر جانیں
جسے پانے کی خواہش میں
ہزاروں درد انجانے
یونہی ہم گود لیتے ہیں
زمانے کے گلے شکوے
کبھی اغیار کی باتیں
کبھی جاگتی ہوئی راتیں
ہمیں تحفے میں ملتی ہیں
تمنا جس کو پانے کی
زبان پر ورد کی صورت
ہمیشہ جاری رہتی ہے
وہ جس کا نام سن کر
دل دھڑکنا بھول جاتا ہے
ہم اس خوش بخت کی خاطر
جاں پر کھیل جاتے ہیں
مگر ایسا بھی ہوتا ہے
کہ جس کو ہم سفر جانیں
ہمارے دل کی باتوں سے
وہی لاعلم رہتا ہے۔۔۔!!

☆☆☆

زندہ دلوں کا شہر لاہور اکمل کے لیے پہلی پوسٹنگ کے حوالے سے اب ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا تھا کہ اس شہر کی رونقوں پر وہ شروع سے فدا تھا، کراچی میں پلے بڑھے لوگ عموماً کراچی پر کسی بھی شہر کو ترجیح دینے سے گریز کرتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ شروع ہی سے لاہور کی فضا میں رچی بسی اپنائیت کا دلدادہ تھا۔ اسی لیے اب وہ لاہور آ کر خوش بھی تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ گھر سے آنے سے اب تک وہ اُن حالات و واقعات کو ہرگز نہیں بھولا تھا جن میں آج کل ندی زندگی گزار رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ چاہنے کے باوجود آتے ہوئے اُس سے مل نہیں پایا تھا، یہ احساس یقیناً اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ تھا جتنا خود ندی کے لیے۔ یوں بھی یہ اچھے دوستوں کی ایک نشانی ہے کہ وہ دوست پر بیتی تکلیف کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ مگر دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اپنے دل میں موجود ندی کے لیے اس احساس کو اس کے سامنے بیان نہیں کر پایا تھا۔ دنیا والے، شاہ زین، عائشہ سب اپنی جگہ مگر وہ اسے ایک مضبوط تحفظ کا احساس دلا کر خود کو اکیلا نہ سمجھنے کا کہنا چاہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کی ڈھارس بندھاتا اور اس کے دل میں موجود تمام طوفان کو اپنے سامنے بہہ نکلنے کا موقع دیتا مگر۔۔۔

وقت کا پہیہ شاید اسے یہ مہلت دینے پر راضی معلوم نہ ہوتا تھا۔

جبھی طے شدہ وقت پر عین اس وقت ناصر بھائی نے اسے ندی سے ملنا تو دور بات تک کرنے کی اجازت نہ دی جب اس کے پاس مزید کوئی دن نہ تھا اور اگلے ہی دن اسے لاہور میں اپنی تعیناتی رپورٹ کر کے حاضری دینا تھی۔

"یار! ریس کورس جا رہا ہوں۔۔۔ موڈ ہے تو چلو۔"

اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر موجود خوب صورت ہریالی اور رنگ برنگے ترتیب وار لگے پھولوں کو دیکھتے اکمل کی محویت دروازہ کھول کر محض سر اندر داخل کرتے نبیل کی آواز سے ٹوٹی۔

"او بندے نے بات کرنی ہو تو انسانوں کی طرح اندر آ کر کرنی چاہیے۔ تمہیں دیکھ کر تو لگ رہا ہے گھوڑے نے اصطبل سے منہ نکالا ہوا ہے۔"

نبیل کی آمد اکمل کے ذہن پر خوش گوار تاثر بن کر یوں ابھری کہ چند لمحوں پہلے ندی کے لیے سوچ کر پریشان ہوتے اکمل نے جان بوجھ کر مذاق کرتے ہوئے دل کو ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔

"واقعی؟" نبیل کی طرف سے مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا گیا۔

"میں تو سمجھا تھا صرف تم پر ہی کھڑکی سے چمٹے بندر کا گمان ہو رہا ہے۔"

اندر داخل ہوتے نبیل کی بات پر اکمل نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"ادھار نہ رکھنا کبھی تم۔۔۔"

"نا جی نا، کیونکہ ادھار محبت کی قینچی ہے یارا! اویں خوامخواہ گٹ گٹ گئی تو کیا کریں گے دونوں۔"

"ویسے باتیں تو شام کے اخبار کی طرح بڑی کراری ہوتی ہیں تمہاری۔" اکمل نے مسکراتے ہوئے جاگرز کے تسمے باندھے، ٹراؤزر کی جیب میں والٹ اور چابی ڈال کر ہاتھ میں موبائل لیا اور اس کے کندھے پر تھپکی مارتے ہوئے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

وہی آہٹیں در و بام پر وہی رتجگوں کے عذاب ہیں
وہی ادھ بجھی مری نیند ہے وہی ادھ جلے میرے خواب ہیں
یہ نہ پوچھ کیسے بسر کیے، شب و روز کتنے پہر جیے
گئے رات دن کی تمیز تھی، کسے یاد اتنے حساب ہیں

پچھلی دفعہ کی طرح اس بار بھی مہربانو وہی امید وہی خواہش اور وہی ادھوری تمنا دل ہی میں لیے اپنے ہاسٹل آن پہنچی تھی۔ وہ دعا جو وہ رستہ بھر مانگتی رہی تھی اس بار بھی قبولیت کے درجے کو چھوتے چھوتے رہ گئی تھی۔

ملکانی سائیں کے ساتھ میری اور کنول کی طرح دوستانہ انداز میں بات چیت، میران کے ساتھ چھوٹی موٹی شرارتیں اور چھیڑ چھاڑ اور شاہ سائیں کے ساتھ لاڈ بھرا انداز۔۔۔ بس یہی کچھ تو وہ مانگتی آ رہی تھی تب سے جب سے وہ حویلی کے بلند و بالا آہنی گیٹ سے نکل کر پہلی دفعہ اس ہاسٹل میں آئی تھی۔

زندگی کا اصل رنگ و روپ تو اب تک خود کو مہربانو کی نظر سے کسی دیہاتی دوشیزہ کی طرح چھپائے ہوئے تھا اور حقیقی معنوں میں یہ حسن اس پر کنول اور میری کے ساتھ ہاسٹل میں روم شیئر کرنے کے پہلے روز ہی آشکار ہو گیا تھا۔ جب اس کی توقع کے برعکس نہ تو اسے اُن دونوں سے کوئی خاص قسم کا پروٹوکول ملا اور نہ ہی ایف ایس سی کی کلاس فیلوز کی طرح اسے کوئی بہت توپ چیز خیال کیا گیا۔

پہلے دن اُن دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو کر لگایا گیا قہقہہ خود اسے اجنبی لگا تھا مگر یوں کھلکھلا کر ہنسنے کے بعد اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ جوان دونوں اور اپنے ذہن کے درمیان کافی فاصلہ محسوس کر رہی تھی تو اس کا یہ احساس قطعاً غلط تھا اور یوں ہنسی مذاق میں وہ تینوں شروع کے چند ہی روز میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ پہلے اُس کا خیال تھا کہ اُسے ایسا کمرہ مل جائے جس میں اکیلی رہ سکے۔ مگر اب وہ اپنی ہی سوچ کے پورا نہ ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرتی۔

تینوں مختلف بیک گراؤنڈ ہونے کے باوجود ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئیں — اور

اب اتنے دن ایک دوسرے سے دور رہنے کی وجہ سے باتوں کے ڈھیر تھے جو تینوں میں برابر تقسیم ہوتا تھے۔

"مہرو، یار، بہت مس کیا تمہیں چھٹیوں میں۔"

اٹیچی سے کپڑے نکال کر کپ بورڈ میں رکھتی کنول نے کتابیں سیٹ کرتی مہربانو کو مخاطب کیا تو ساتھ ہی بیگ میں منہ گھسا کر کچھ ڈھونڈتی میری بھی اپنا منہ "برآمد" کرنے پر مجبور ہوگئی۔

"اور کیا، میں اور کنول تو دور ہو کر بھی موبائل پر بات تو کم از کم کر لیتے تھے مگر تمہارا نمبر تو ہم سمجھے چھٹیوں میں کسی سرکاری دفتر نے ادھار ــــ لے لیا ہے۔"

"سرکاری دفتر؟"

مہربانو اس کی بات میں چھپے مقصد کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ تبھی ہمیشہ کی طرح نئی خریدی گئی کتاب کے پہلے صفحے کے کونے پر نام لکھتے لکھتے اُس کا پین رک گیا تھا۔

"تو اور کیا یار، موبائل پکڑے پکڑے ہاتھ میں پسینہ آجاتا تھا، کان سے لگائے لگائے اتنی بیلز کانوں میں جاتیں کہ بعد میں بھی کانوں میں گونجتی رہتیں لیکن مجال ہے جو کبھی فون اٹھالو یا خود کرلو۔۔۔"

میری نے ہلکے پھلکے انداز میں شکوہ کیا، پین کے تسلسل میں آئے گئے توقف کے بعد اپنا ادھورا نام مکمل کیا اور پین بند کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں جتنے دن بھی حویلی میں رہی ہوں میں نے تو ایک بار بھی کبھی بیل کی آواز نہیں سنی۔"

"نہیں سنی؟" دونوں نے یک زبان ہو کر چیختے ہوئے کہا۔ حیرت کا اظہار کرنے میں آواز کے ساتھ ساتھ ان کی پھیلتی آنکھوں نے بھی کافی مدد کی تھی۔

"ہاں۔۔۔ قسم لے لو، میں نے تو ایک دفعہ بھی اپنے موبائل کی بیل نہیں سنی۔"

"کہو تو موبائل کا call log دکھادوں؟" میری نے بڑے پرسکون انداز میں مسکراتی مہربانو کو یقین دلانا چاہا تھا۔

"مگر میں نے کب کہا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو، مجھے پتا ہے تم دونوں نے کال کی تھی۔"

"کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ صحیح طرح بتاؤ۔"

کنول اس کی بات سے الجھ گئی تھی۔

"بیل کی آواز بھی نہیں سنی اور پتا بھی ہے کہ کال کی تھی؟" میری نے پولیس والوں کا انداز اپناتے ہوئے تفتیشی رخ سے اس کے جملے پر غور کرنا چاہا مگر وہ خود ہی بول پڑی۔

"اس لیے کہ میرا موبائل وائبریشن پر تھا۔"

مہربانو نے یونہی خوامخواہ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"وائبریشن پر تھا؟" کنول اور میری نے الجھ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"پوری چھٹیوں میں وائبریشن پر ہی رہا؟ لیکن کیوں یار؟"

قمیص ہینگر میں ڈالتے ڈالتے وہیں رکھ کر کنول اس کے پاس ہی آبیٹھی۔

میری بھی اس کی بات پر مکمل توجہ دینے کی غرض سے بیگ پر سے دھیان ہٹا بیٹھی تھی۔

مہربانو نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا جن کے چہرے پر اس کے لیے پریشانی تھی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"دراصل موبائل ان تمام دنوں میں میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہی پڑا رہا۔ یہاں سے جاتے ہی میں نے اس کی ساؤنڈ آف کر کے وائبریشن پر جو لگایا تو اب آتے ہوئے ساؤنڈز آن کی ہیں۔"

"لیکن کیوں؟ یہی تو بات مجھے سمجھ نہیں آرہی۔"

"دراصل مجھے معلوم ہے کہ اماں سائیں یوں میرے موبائل پر بات کرنے سے شاید کچھ اور سوچنے لگیں۔ بس اسی لیے میں نے خود بھی کال نہیں کی کہ کہیں کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے کوئی سن نہ لے۔"

مہربانو بہت کم اُن کے سامنے اپنا آپ، حویلی!

اس کے مکینوں کو ڈسکس کرتی تھی مگر آج اُن کے چہرے پر اپنے لیے اتنی پریشانی اور محبت دیکھ کر وہ بول ہی پڑی تھی۔ اپنی فیملی کے بارے میں بات چیت سے گریز کو خود کنول اور میری نے بھی محسوس کیا تھا اسی لیے کبھی اس سے اس بارے میں زیادہ پوچھ گچھ نہ کی جاتی۔

"ہاؤ فنی، گھر والوں نے انٹرنیٹ کے کنکشن سمیت جدید موبائل تو تم کو لے دیا۔ پڑھنے کے لیے گاؤں سے اتنی دور لاہور میں اور وہ بھی ایک ہاسٹل میں رہنے کے لیے تو بھیج دیا پھر بھی موبائل پر بات کرنے میں اتنی پرابلم۔۔۔؟" حیرت کا اظہار اس تمام صورت حال میں بجا تھا۔

"تمہاری حیرت بالکل ٹھیک ہے مگر ایسا ہی ہے۔ مجھے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اتنی دور بھیجنا واقعی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب میرا اپنا بھائی میران علی شاہ مخالفت میں سب سے آگے ہو۔"

"ہوں۔" دونوں نے گہری سانس لی تھی۔

"بھائی کیا کرتا ہے تمہارا؟"

"پتا نہیں آج کل کیا کر رہا ہے۔ میری زیادہ بات نہیں ہو پائی اُس سے۔"

مہربانو کے چہرے پر اداسی لحہ بہ لحہ بڑھنے لگی تھی۔ جسے ان دونوں نے بھی بخوبی محسوس کیا۔

"اچھا سنو، سارے کام چھوڑو میرا خیال ہے پہلے میس سے کھانا لے آتے ہیں۔"

کنول نے بات بدل کر اٹھتے ہوئے اُن دونوں کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے، ویسے بھی میس والے انکل کو بھی ذرا سمجھانا پڑے گا، مستقبل کی ڈاکٹرز کو پلیٹ میں مریضوں جتنا سالن ڈال دیتے ہیں۔ اب بندہ اگر بار بار مانگے بھی تو کس منہ سے۔"

میری نے پاؤں میں جوتے پہن کر ہاتھ میں پکڑی بیگ کی چابی بیگ ہی کی جیب میں ڈالی۔

"کس منہ سے؟ ارے اسی فِٹے منہ سے ہی مانگو گی اور کیا۔۔۔"

کنول نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس کے گھورنے پر مسکرا کر دیکھا تو مزید کسی بھی حملے سے بچ گئی۔ مہربانو نے بھی کتابیں سائیڈ پر کرنے کے بعد موبائل ہاتھ میں لے لیا کہ گاؤں سے آئی کسی بھی کال کو فوراً اٹینڈ کرنا نہ صرف اس کی اولین ترجیح تھی بلکہ یہاں آنے کے بعد سے بنیادی فرض بھی۔

☆☆☆

مکمل دو ہی دانوں پر یہ تسبیح محبت ہے
جو آئے تیسرا دانہ یہ ڈوری ٹوٹ جاتی ہے
متعین وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے، قضا بھی چھوٹ جاتی ہے

نئے تیار شدہ ملبوسات کی کوڈنگ چیک کرتے ہوئے پنک کلر کے ٹراؤزر شرٹ پر یک دم شاہ زین کی نظر رُک سی گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کی آنکھوں کے سامنے ندی کا گلابی چہرہ آرکا تھا۔ یہ رنگ اس کے اپنے رنگ کے سامنے ہمیشہ سے سبقت لے جانے کی کوشش میں نظر آتا اور پھر وہی رنگ اکثر اوقات چلتے ہوئے سرخ کے قریب ترین جا پہنچتا اور وہ بھی اس لیے کہ ندی کی چال میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ہمیشہ تیز رفتاری سے چلا کرتی مگر ہاں ہوا کو مات دیتی ہرگز معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"ابھی تو پیریڈ شروع ہونے میں بہت ٹائم ہے پھر اتنا تیز کیوں چل رہی ہو؟"

گلابی رنگ پر نظریں ٹکائیں وہ اپنی محبت کے گلابی دنوں میں جا پہنچا تھا جہاں ابھی ان چاروں کی دوستی کے اوائل روز چل رہے تھے۔

شاہ زین کی بات ختم ہونے تک وہ ان تینوں کے نزدیک پہنچ کر رک چکی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتی زبیر نے اس کی طرف سے شاہ زین کو مخاطب کیا۔

"بس دیکھ لو، خوامخواہ ہی لوگ یورپ کی لڑکیوں کو تیز رفتار قرار دیتے ہیں، میں تو کہتا ہوں کوئی اپنی ندی کو دیکھ لے نا تو۔۔۔"

''یا تو یورپ کی لڑکیوں کو بھول جائیں گے یا اسے بھی وہیں لے جائیں گے۔''
صبا نے زبیر کے منہ سے بات اچکی تھی۔
''جناب۔۔۔!''
ندی نے بیگ سے چیونگم نکال کر تینوں کی طرف بڑھائی اور پھر اپنے منہ میں ڈال کر چباتے ہوئے بولی۔
''نہ تو مجھے یورپ جانا ہے اور نہ ہی مجھے لڑکیوں کی اکثریت کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلنا پسند ہے۔''
''ٹھمک ٹھمک کر۔۔۔؟'' صبا اور زبیر نے مشترکہ قہقہہ لگایا البتہ شاہ زین نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔
''تو اور کیا۔'' ندی نے بے نیازی سے گلے میں جھولتے اسکارف کو ٹائی کی شکل میں گرہ لگائی۔
''دور کیوں جائیں، اپنی یونیورسٹی میں ہی دیکھ لینا، سلائی مشین جسم کے اوپر رکھ کر کپڑے سلوانے کے بعد ایسے ایسے جان لیوا ٹھمکے مارتی ہیں چلتے ہوئے کہ دیکھنے والوں کو شرم آجائے۔''
''ویسے ندی کی بات تو سچ ہے۔''
شاہ زین نے بھی اس دفعہ ندی کی تائید کی تھی جبکہ لفظ ''جان لیوا'' پر ہنسے بنا وہ بھی نہیں رہ پایا تھا۔
''بلکہ خاص طور پر لڑکیوں کو تو چلتے ہوئے اپنا انداز اتنا باوقار اور پراعتماد رکھنا چاہیے کہ لڑکوں کے ہجوم میں سے بھی گزر کر آنا پڑے تو کسی کو جملہ کسنے کی بھی ہمت نہ ہو۔'' شاہ زین نے دل ہی دل میں اسے سراہا تھا۔
اور وہ خود بھی تو ایسی ہی تھی، پراعتمادسی۔
''تم پر جملہ کس کر کسی نے اپنے دانت تڑوانے ہیں۔''
''صرف دانت؟ ارے کسی کی ایسی حرکت پر میں پورا منہ بونس میں توڑ دوں گی یار۔'' زبیر کی بات کے جواب میں ندی کی بات پر وہ تینوں مل کر ہنسنے لگے تھے۔ خود شاہ زین کے ہونٹوں پر اب تک مسکراہٹ تیر رہی تھی اور شاید پنک لباس پر نظریں جمائے وہ یونہی دیر تک خیالوں میں ہی مسکراتا رہتا اگر اسی وقت باؤ کمرے میں داخل نہ ہوتا۔
''السلام علیکم شاہ زین صاحب!''
''وعلیکم السلام۔''
باؤ کی آواز پر شاہ زین نے چونکتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر ان تمام باتوں کے محض خیال ہونے پر ایک بار پھر افسردہ سا ہونے لگا۔
باؤ نہ صرف اس دفتر میں چپڑاسی کا کام کرتا تھا بلکہ رہتا بھی نزدیکی گاؤں میں تھا۔ شادی کو آٹھ سال گزر جانے کے باوجود چونکہ ابھی تک اولاد سے محروم تھا سو اس کی بیوی اکثر اوقات فیکٹری کے نزدیک تعمیر کیے گئے رہائشی علاقے میں مختلف گھروں میں بوقتِ ضرورت بلانے پر اُن کے کام کرنے چلی آتی۔
شاہ زین کے گھر منعقدہ میلاد میں اتفاقیہ آمد کے بعد تو ثمینہ اور اماں کے اخلاق نے اس کے دل میں ایسا گھر کیا کہ اُس دن بھی تمام کام ختم کروا کر گئی اور اس کے بعد بھی اکثر اوقات بن بلائے ان کے گھر آنے لگی۔
اسی وجہ سے باؤ بھی دوسروں کی نسبت شاہ زین کے ساتھ اس کی پوسٹ ذہن میں رکھتے ہوئے تھوڑا بہت ایزی ہو کر بات کیا کرتا۔
''شاہ زین صاحب! خیر تو ہے؟ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں؟''
''ارے نہیں نہیں، بتاؤ کیا بات ہے؟''
''وہ دراصل یہ پیپر پر سائن کروانا ہے۔''
باؤ نے آگے بڑھ کر ایک پیپر ٹیبل پر اس کے سامنے رکھا جس میں فیکٹری کے ایم ڈی کے ساتھ کل ہونے والی پہلی میٹنگ کا ٹائم وغیرہ درج تھا۔
شاہ زین نے کل کا ٹائم سامنے رکھی اپنی ڈائری میں نوٹ کرنے کے بعد اُس پر سائن کیا اور باؤ کی طرف واپس بڑھا دیا۔
''سر آپ پہلے بھی ملے ہیں اُن سے؟ یا آپ کی پہلی میٹنگ ہو گی؟''

''نہیں پہلے تو آج تک ایسا اتفاق نہیں ہوا، کل فرسٹ ہی ملاقات ہو گی۔''
شاہ زین نے پین بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
''لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''
''کوئی خاص بات نہیں، میں تو بس ویسے ہی۔۔۔''
شاہ زین نے خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مزید کوئی بھی سوال کرنے سے گریز کیا۔
وہ ضرور کچھ کہنا چاہتا ہے، اتنا تو شاہ زین کو اندازا ہو گیا تھا لیکن وہ کسی بھی قسم کا اصرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔
باؤ نے شاہ زین سے پیپر لے کر اسے درمیان سے تہہ کیا اور لے کر مڑتے ہوئے پہلے تو دروازے تک گیا مگر کچھ سوچ کر پھر لوٹ آیا۔
''ہمارے گاؤں کے وڈیرے ہیں، اور یوں سمجھیں کہ ہم سب اُن کی رعایا۔''
شاہ زین نے مکمل توجہ اُس پر مرکوز کرتے ہوئے اسے بولنے کا موقع دیا۔
''ہیں تو بہت اچھے اور خدا ترس۔۔۔ فیکٹری میں بھی دیکھیں سارے ورکرز انہی کے گاؤں کے ہیں مگر۔۔۔''
باؤ کے چند لمحے رکنے پر اُس نے استفہامیہ انداز میں دیکھا۔
''کیا اخبار میں آج کل شاہ سائیں کے متعلق کچھ خبریں آرہی ہیں؟''
''میری نظر سے تو کوئی ایسی خبر نہیں گزری، کیوں خبر آنا تھی کیا؟''
باؤ کے سوال پر آخر شاہ زین نے پوچھ لیا۔
''الیکشن ہونے والے ہیں نا سر! تو آج کل تو شاہ سائیں گاؤں میں ہیں، لیکن سنا ہے کہ شہر میں اُن کی زندگی کا انداز کچھ اور ہی ہے۔ میرا مطلب آپ سمجھ رہے ہیں نا۔''
''باؤ۔۔۔!''
شاہ زین کے انداز میں واضح تنبیہی اشارہ تھا۔
''آج کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ تم میرے سامنے اس قسم کی کوئی بھی بات کسی کے لیے بھی نہیں کرو گے، سمجھے نا۔''
''جی سر!'' متوقع پذیرائی نہ ملنے پر باؤ جز بز سا نظر آنے لگا تھا۔
''اُن کی یا کسی کی بھی ذاتی زندگی میں گھسنے یا ٹوہ لگانے سے پہلے ہمیں اتنا ضرور سوچ لینا چاہیے کہ دوسروں کے گناہ گنتے رہنے سے کسی کو فرق پڑے نہ پڑے ہمارا دل ضرور مُردہ ہو جاتا ہے۔''
''معافی چاہتا ہوں سر! میں تو بس ویسے ہی۔''
''اٹس او کے، جاؤ اب مجھے بھی کام کرنے دو۔''
''جی سر!''
شاہ زین باؤ کے خیال کے بالکل برعکس طبیعت کا مالک نکلا تھا اور یہ بات باؤ کو خوش کر گئی تھی۔ ورنہ باقی سارے لوگ اس کی ایک ایک بات کو دھیان سے سنتے اور خود اس سے اکثر معلومات لیتے بھی۔
شاہ زین کے اس ردِعمل نے نہ صرف باؤ کے دل میں بہت سی جگہ بنالی تھی بلکہ باؤ نے اسے حقیقتاً اپنا باس بھی مان لیا تھا۔
اچھا اور سچا والا۔۔۔!

☆☆☆

بھنور کے ساتھ الجھتی ہوئی صدا کو سنا
پھر اس کے بعد سماعت ہی ساتھ چھوڑ گئی
تم ایک شخص کے جانے کے غم میں بیٹھے ہو
یہاں تو پوری جماعت ہی ساتھ چھوڑ گئی

ناصر بھائی کے اس قدر سخت اور دوٹوک رویہ اپنانے پر ندی نے وقتی طور پر یونیورسٹی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان کے غصے یا گھر واپس نہ آنے دینے کی دھمکی سے ڈر گئی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ اس کے ساتھ اس کی ماں کی زندگی بھی مزید مشکلات میں گھر سکتی تھی اور یہ اسے کسی بھی طور گوارا نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر وہ انہیں اپنی ذات سے کوئی خوشی نہیں دے سکتی تو مزید کوئی دُکھ

دینے کا باعث بنے۔
ورنہ ناصر بھائی کی نیچر سے تو وہ بخوبی واقف تھی ہی۔ جانتی تھی کہ کسی شخص کے لیے اگر ان کے دل میں ایک بار غلط فہمی جگہ لے لے تو وہ دور ہونا پھر مشکل ہی نہیں بعض اوقات ناممکن بھی ہوتا ہے۔
لیکن زندگی اس طرح دو رویہ ٹریفک کی طرح گزارنا بھی تو بھلا کب ممکن تھا۔
دن رات عجیب جھنجھلاہٹ میں گزر رہے تھے۔
شاہ زین تو ایک طرف صبا اور زبیر تک کے نمبرز اسے زبانی یاد نہیں تھے ورنہ اب تک وہ ان سے تو ہر حال میں رابطہ کر چکی ہوتی۔
عائشہ دوپہر کا کھانا اب اپنے کمرے میں کھانے لگی تھی اور اگر باہر کھاتی بھی تو کیا فرق پڑتا کہ امی نے تو خود کو محض بیڈ روم تک ہی محدود کر لیا تھا۔
کچھ دنوں سے ندی چونکہ امی کے لیے خود روٹی بنانے لگی تھی سو آج بھی فریج سے آٹا نکال کر ماربل کی سلیب پر رکھتے ہی پرانے مگر سنہری دن چق کی اوٹ سے جھانکنے لگے۔
"ارے امی، اب روٹی کی سائیڈ چینج کر بھی لیں نا، ورنہ جل جائے گی۔"
عائشہ کے میکے جانے پر امی آج اس کے اور بابا کے لیے روٹی پکا رہی تھیں جبکہ وہ ان کے ساتھ ہی دھنیا کاٹ رہی تھی۔
امی اس کی بات پر مسکرائیں ضرور مگر روٹی کی سائیڈ تبدیل کرنے کے بجائے دوسری روٹی کے لیے پیڑا بنانے لگیں۔
"امی جل جائے گی۔۔۔ اسے دیکھیں نا۔"
ایک بار پھر اس کے توجہ دلانے پر انہوں نے ایک نظر توے پر موجود روٹی کو دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا کہہ کر روٹی بیلی اور چند لمحوں بعد توے پر سے روٹی کی سائیڈ بدل کر ہلکا سا صافی کی مدد سے دبایا اور نرم گرم روٹی توے سے اتار کر ہاٹ پاٹ میں منتقل کر دی۔
ندی خاموشی سے اُن کا یہ عمل دیکھے جا رہی تھی۔
اس امر سے وہ بخوبی آگاہ تھیں۔ تبھی پہلے سے بیلی گئی روٹی توے پر ڈالتے ہوئے بولیں۔
"اگر تمہارے کہنے پر میں روٹی کی سائیڈ پلٹتی تو اسے پکانے کے لیے مجھے صافی سے زیادہ دبانا پڑتا نتیجتاً روٹی سخت ہو جاتی اور اگر نہ دباتی تو جل جاتی جگہ جگہ سے کچی رہتی۔۔۔" انہوں نے ایک نظر توے پر پڑی روٹی کو دیکھتے ہوئے مزید آٹا ہتھیلی پر لیا اور مسکرائیں۔
"میری جان! مجھ پر بھروسہ رکھو، میں تمہیں کبھی کچی، سخت یا جلی ہوئی روٹی نہیں کھلاؤں گی۔"
ان کی بات سمجھ کر اس نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور تازہ دھنیا ہنڈیا میں ڈالنے کے بعد چولہا بند کر دیا۔
شاید وہ یونہی سلیب پر ہاتھ رکھے جانے کب تک ماضی کے خوش گوار مناظر میں جھانکتی رہتی کہ لاؤنج میں رکھے فون کی بیل سے حال میں لوٹ آئی۔
آٹا وہیں رکھ کر سب سے پہلے گلاس میں پانی ڈالا اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئی۔ بجائے اس کے کہ پانی پیتی لاشعوری طور پر اس روٹی سے اپنی ذات کا موازنہ کرنے لگی۔
یقیناً کچھ بعید نہ تھا کہ وہ بھی دل ہی دل میں بعض اوقات اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتی کہ اس کی قسمت کی سائیڈ بھی اب چینج ہونی چاہیے کہ حالات کی تپش کے باعث اس کے دل و دماغ پر بھی کرب و اذیت کے کئی پھول نما نشان بن چکے ہیں اور اگر اب بھی اس کی قسمت کی سائیڈ تبدیل نہ کی گئی تو اس کی روح بھی جل جائے گی۔ جھلس جائے گی اور شاید کسی کو خبر تک نہیں ہو گی۔۔۔
لیکن اس دن کی طرح آج بھی وہ شاید اپنی قسمت کی ظاہری سائیڈ ہی دیکھ رہی تھی توے کے ساتھ لگی روٹی کی پوشیدہ حالت سے نہ وہ تب واقف تھی نہ اپنی قسمت کے پوشیدہ اسرار سے آج!
جانتا ہے تو صرف اللہ، کہ وہ ہی عقلِ کُل اور بہترین جاننے والا ہے۔

کیونکہ یہ سب تو محض ندی کا انداز تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ ایسا ہے جب کہ اوپر والے کے پاس لامحدود علم ہے اور مکمل اختیار بھی۔ اگر وہ ہمارے کہنے پر ہماری قسمتوں کی سائیڈز بدلتا رہے تو کون جانتا ہے وہی بات بعد میں ہمارے لیے تکلیف کا باعث بن جائے اس لیے ہمیں ہمیشہ اس ذاتِ احد پر مکمل بھروسہ کرنا اور توکل رکھنا چاہیے کہ وہ نرم گرم روئی کی طرح ہمارے لیے سدا بہترین ہی منتخب کرے گا۔

اپنی ذات کی بھول بھلیوں سے وہ جلد از جلد باہر نکلنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے سب سے پہلے اسے امی کو اعتماد میں لینا تھا۔ تبھی اس نے آج رات امی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

مجھے تم سے ہے نفرت اس وجہ سے
اسے تم سے محبت کیوں ہوئی ہے
نظر انداز کرتا پھر بھلاتا
قیامت پر قیامت کیوں ہوئی ہے

اس دن ندی کی بات پر شاہ زین کا ردِ عمل میران کو بھلائے نہیں بھول رہا تھا اور بھلا بھولتا بھی کیسے جب ذہن بھلانے پر آمادہ ہی نہ ہو۔

دن رات اس کے ذہن میں اگر کوئی بات تھی تو وہ یہ کہ شاہ زین کو کسی طرح نیچا دکھایا جائے جو ہمیشہ اس کی ذات پر نئے زخم لگانے کا موجب بنتا ہے ایسے زخم جو آنکھوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے نہ تو دھیان کسی اور طرف ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی رسنا چھوڑتے ہیں۔

یوں بھی جو بھی شخص انتقام لینے کے طریقوں یا بدلا لینے پر غور کرتا ہے اس کے زخم کبھی نہیں بھرتے اور حقیقتاً میران کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں موجود شاہ زین ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اور کچھ نہ سوجھا تو گہرے میرون رنگ کی چھت کو چھوتی الماری سے اپنی کلاشنکوف نکال کر اسے مختلف زاویوں سے جانچنے اور پرکھنے لگا۔ انداز بالکل وہی تھا جو کسی نئے جانور کو خریدتے ہوئے ہوتا ہے۔

ہر جگہ، ہر رستے، ہر موڑ پر شاہ زین کا یوں اس کا راستہ کاٹنا میران کے ذہن میں جیسے کوئی الارم سا بجا رہا تھا۔

حالانکہ اتنا تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کسی امیر کبیر گھرانے کا چشم و چراغ نہیں ہے اور شاید زیادہ غصہ بھی اسی بات پر تھا اسے کہ وہ میران جیسے دیکھ کر گاؤں میں لوگوں کی گردنیں جھک جایا کرتی ہیں، کھیتوں اور فصلوں میں کام کرنے والے لوگ اسے دیکھتے ہی اپنا کام چھوڑ کر "سلام سائیں" کہنے کو دوڑے چلے آتے ہیں اور پھر ایسا صرف گاؤں میں ہی نہیں تھا۔ شاہ سائیں کے سیاسی و سماجی اثر و رسوخ کے باعث گاؤں کے باہر بھی اُسے اسی انداز میں پروٹوکول ملتا۔

یوں بھی جب دائیں بائیں اسلحہ بردار باڈی گارڈز صرف حفاظت اور اپنا Status ظاہر کرنے کی غرض سے تعینات کیے گئے ہوں تو پروٹوکول خود بہ خود ملنے لگتا ہے سو اس تمام پسِ منظر میں شاہ زین کا اس کے سامنے گردن اٹھا کر بات کرنا تو ظاہر ہے میران کے لیے کسی بھی طور قابلِ قبول نہ تھا اور نہ صرف یہ بلکہ ندی کا بھی اس کو لفٹ نہ کرواتے ہوئے شاہ زین کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی خاطر میران کی بے عزتی کرنا، یہ سب میران کے اندر ایک ناسور کی صورت پل رہا تھا۔

اخبارات میں اچھلنے والا سارا قصہ اُس دن شاہ زین کو یونیورسٹی میں دوبارہ دیکھ کر اسے بے حد بے معنی اور معمولی محسوس ہونے لگا تھا کہ رسی جلنے کے باوجود بل کا ابھی تک اسی طرح برقرار رہنا اب اس کے لیے برداشت سے باہر تھا۔

"میران پُتر!"

ملکانی سائیں نے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے اس کے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف دیکھ کر حیرت سے بلایا۔

"جی اماں سائیں! آپ یہاں؟"

پیشانی پر ابھرتی ناگواری کی سلوٹیں تو نظر آ ہی رہی تھیں مگر میران نے لہجے میں موجود روکھے پن کو بھی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"ہاں پُتر! شام کا وقت ہو گیا ہے پر تو باہر ہی نہیں نکلا، میکوں فکر ہو گئی تھی فر۔"

اس کے لہجے کی تلخی محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے وہ آگے بڑھیں۔ اسی لمحے معمولی سے کھلے دروازے سے خراماں خراماں چلتی سونی بھی اندر داخل ہوئی اور عین ملکانی سائیں کے قدموں کے ساتھ کھڑی ہو کر گہری سبز آنکھوں کو مکمل طور پر کھولنے کے ساتھ پوری توجہ میران کی انگلیوں کی جنبش پر مرکوز کر دی جو کلاشنکوف کے مختلف حصوں کو کھولنے اور بند کرنے میں مصروف تھا۔

"بس میرا دل نہیں کر رہا تھا اماں سائیں!"

اکتاہٹ جون کے سورج کی طرح عروج پر تھی مگر اس اکتاہٹ بھرے انداز پر بجائے اس کے کہ ملکانی سائیں کسی طرح کی خفگی کا اظہار کرتیں، بے چینی سے وہ تو تڑپ ہی اٹھیں۔

"ہائے او میریا ربا، کی ہویا، میکوں تے گش بتانا۔"

ملکانی سائیں نے دہل کر انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سینے پر رکھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

سونی کا ارتکاز البتہ ابھی تک قائم و دائم تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں اماں سائیں! کوئی خاص بات نہیں۔"

"خاص ہے یا نئیں، جو گش وی ہے تُو مجھے بتا۔"

میران کے معاملے میں وہ ایسی ہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ اپنی پریشانی انہیں بتا نہیں دے گا وہ نہ صرف اسی طرح پریشان رہیں گی بلکہ بار بار اس سے پوچھتی بھی رہیں گی کہ آخر مسئلہ کیا ہے۔

کچھ دیر یونہی ظاہری طور پر کلاشنکوف میں مصروف رہنے مگر حقیقتاً لفظوں کو مناسب لبادہ پہناتے ہوئے آخر وہ بولا۔

"اماں سائیں! سادہ لفظوں میں سمجھاؤں تو یہ کہ ایرانی نسل کا ایک انتہائی خوب صورت گھوڑا خریدنا چاہتا ہوں مگر وہ اتنا اڑیل ہے کہ خریدنا تو دور اپنے جسم پر ہاتھ تک پھیرنے نہیں دیتا۔"

صاف اور سچ بات کرنے سے ملکانی سائیں شاید اسے زین کی خوانخواہ مخالفت پر روکنے کی کوشش کرتیں، اسی خیال کے تحت اس نے لفظوں کو مثال کا پیرہن بنا کر ان کے گوش گزار کیا تھا۔

اور اس کی توقع کے عین مطابق اس کی بات سنتے ہی وہ ایک دم ریلیکس محسوس کرنے لگی تھیں۔

"او پتر وہ نہیں تے کوئی اور سہی، گھوڑا تے فیر گھوڑا ہوتا ہے نا۔"

"نہیں اماں سائیں! ہر گھوڑا اُس جیسا نہیں ہو سکتا۔" ازراہ تفنن اس نے کلاشنکوف سے سونی کا نشانہ لیا۔

جس پر کتنی ہی دیر سے ایک انداز میں میران کو دیکھتی سونی کمزور سی آواز میں میاؤں کرتے ہوئے ملکانی سائیں کے دونوں پیروں کے درمیان جا بیٹھی۔

"اور اُسے تو میں خرید کر ہی رہوں گا۔"

ملکانی سائیں نے کلاشنکوف پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا اور اس کے لہجے کی مضبوطی دیکھ کر بولیں۔

"اگر پتر ایسا ہے تو فیر اس کا اک طریقہ ہے۔"

"کون سا طریقہ اماں سائیں؟"

"پُتر یہ جو جانور ہوتے ہیں نا، دیکھنے اِچ سب اِک جیسے لگتے ہیں پر ان کے وی خاندان ہوتے ہیں، جیسے میں تیرے بغیر نئیں ناں رہ سکدی، ایسی طرح ایہہ جانور وی اپنی ماں یا ماں اپنے بچے سے دور نئیں رہتی وپار (بیوپار) کرنے والے وکھرا وکھرا (الگ الگ) بیچ تو دیتے ہیں پر جو جانور ذرا اڑی (ضد) کرتا ہے نا۔۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی بچہ ہے فیر اسے ماں کے ساتھ خریدنا پڑتا ہے۔"

ملکانی سائیں نے اسے جو مشورہ دیا تھا وہ تو یقینی طور پر جانوروں کی نفسیات کے حوالے سے تھا مگر میران کے دل کو لگا تھا۔

خود ہم انسان بھی تو خاندان کی اکائی کی خاطر کتنے ہی ایسے کام کر جاتے ہیں جو اگر تنہا ہوتے تو شاید کبھی نہ کرتے۔

واقعی شاید ان رشتوں میں اتنی کشش ہوتی ہے جو انسان کو کچھ بھی کروا سکتی ہیں۔ خود سے جڑے ان رشتوں کے چہرے پر ایک آسودہ اور بھرپور مسکراہٹ کی خاطر جب انسان انتہائی قدم بھی اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے تو پھر ایسے میں یقیناً یہ گرکاری گر ہو سکتا تھا۔

"بالکل اماں سائیں! آپ نے سچ کہا کہ جو جانور اڑیل ہو، اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی بچہ ہے۔۔۔ اور پھر اسے ماں کے ساتھ خریدنا پڑتا ہے۔"

ملکانی کے قدموں میں بیٹھی سونی کو میران نے جھک کر اٹھایا، کلاشنکوف بیڈ پر رکھی اور اس کے نرم بالوں بھرے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میں بھی اس گھوڑے کو اب ماں کے ساتھ ہی خریدوں گا۔"

سگریٹ سے سیاہ پڑتے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ رینگی تھی۔

ملکانی سائیں نے بھی سکھ کا سانس لیتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو سونی جس کے لیے میران کالمس کوئی بہت زیادہ مانوس نہ تھا، امداد طلب نظروں سے ملکانی سائیں کی طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

یہ بار فلک ہم نے زمیں پر نہیں رکھا
تھک کر کسی کاندھے پہ بھی سر نہیں رکھا
کیوں ٹھوکریں لگتی ہیں کہ جب ہم نے کبھی بھی
رستے میں کسی کے کوئی پتھر نہیں رکھا

دن بھر کی تھکا دینے والی روٹین کے بعد نبیل کے ساتھ چہل قدمی کے دوران گپ شپ کرنے کے بعد اب وہ اپنے کمرے میں تھا اور ایک دوست کا نمبر ڈھونڈنے کے لیے بیڈ سے ٹیک لگا کر اپنا سیل فون ہاتھ میں لیے کونٹیکٹ لسٹ کھنگال رہا تھا جب اچانک ندی کا نمبر سامنے آنے پر موبائل کی اسکرین کو اوپر کی طرف پر مس کرتی انگلی وہیں تھم کے رہ گئی۔

ندی کا یہ نمبر اس دفعہ ہی لے کر اس نے save کیا تھا ورنہ اس سے پہلے اس کے پاس نہ تو اس کا کوئی نمبر تھا اور نہ ہی کبھی خیال آیا تھا۔

اب جو اس کا نام اور نمبر سامنے دیکھا تو بے اختیار اس کا تروتازہ سرخ و سفید چہرہ ذہن میں ابھرا تو ضرور۔۔۔ مگر صرف لمحہ بھر کے لیے، کیونکہ فوراً ہی ذہن کے پردے پر اس کا وہ روپ اتر آیا جو یقیناً کسی طور پر اس سے متضاد تھا۔ کانچ سی شفاف آنکھوں میں ڈیرے ڈال کر بیٹھی ویرانی، آنکھوں تلے سیاہ رنگ کے حلقے جو چہرے کی رنگت سے سرخی غائب ہو جانے کے باعث محض بے رونق سفیدی پر مزید نمایاں لگتے اور سفیدی بھی ایسی جس میں ندی کے بات کرنے کے دوران اکثر زردی کی آمیزش کا بھی شک گزرنے لگتا۔

وہ ندی جس کی خوش لباسی پر لڑکیاں رشک کیا کرتی تھیں اب تین تین دن کپڑے بدلنے کا بھی خیال نہ آتا۔

چھوٹی سی ستواں ناک میں موجود زرقون کی لونگ ہی وہ واحد چیز تھی جو اس کے چہرے پر اب تک اپنی چمک برقرار رکھے ہوئے تھی ورنہ جہاں چہرے کی چمک پھیکی پڑ چکی تھی وہیں آنکھوں کی پر اعتماد روشنی بھی اب ماند تھی۔

اور اسی بات کا اکمل کو دلی دکھ تھا کیونکہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھا کہ ندی اس جرم کی سزا کاٹ رہی ہے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ قسمت کی ستم ظریفی تھی یا حالات کی سازش کہ جس کے باعث اسے وہ قرض بمعہ سود کے ادا کرنے کا حکم صادر فرمایا گیا تھا جو اس نے کبھی لیا ہی نہیں تھا اور یہی بات وہ مکمل تفصیل کے ساتھ عائشہ کو بھی سمجھا چکا تھا مگر وہ اکمل کی کسی بھی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ ہوتی۔

آتے ہوئے بھی وہ ندی سے ملاقات نہیں کر پایا تھا سو اب نمبر سامنے آنے پر فون پر بنے گہرے ہرے

نشان پر انگوٹھے کا ہلکا سا وزن بڑھاتے ہوئے اس سے بات کرنا چاہی۔ ایک، دو، تین۔۔۔ اور پھر کئی بیلز جانے کے بعد بھی فون ریسیو نہیں ہوا تھا جو کہ یقیناً اس کے لیے ایک تشویش ناک بات تھی جبھی اس نے کونٹیکٹ لسٹ میں سے عائشہ کا لینڈ لائن نمبر نکال کر ایک بار پھر فون ملا دیا جسے ناصر بھائی کے لیے چائے بنانے کے لیے کچن میں جاتی عائشہ نے دوسری ہی بیل پر اٹھا لیا۔

"ہیلو۔۔۔"

کانوں کو مکمل طور پر چوکنا اور جسم کے ہر حصے کو کان بننے کا حکم دیتے ہوئے عائشہ نے آواز پہچاننے کی غرض سے ریسیور کان کے ساتھ دباتے ہوئے جواب کا انتظار کیا مگر اس وقت مایوسی ہوئی جب ایئر پیس سے ابھرنے والی آواز اپنے ہی بھائی کی معلوم ہوئی۔

"السلام علیکم۔"

"اوہ۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔ اکمل تم؟"

اکمل کی اس وقت کال چونکہ غیر متوقع تھی اس لیے لمحہ بھر میں یہ فیصلہ کرنا دماغ کے لیے ذرا مشکل تھا کہ جواب میں خوشی کا اظہار ہو یا کہ نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آواز میں موجود بے زاریت کا عنصر فطری تھا۔

"کیا کسی اور کی کال کا انتظار تھا آپ کو؟"

"ارے نہیں نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی، تم سناؤ کیا حال چال ہے؟"

"بس سب ٹھیک ٹھاک۔"

"دراصل ابھی کل ہی تو تم سے بات ہوئی تھی نا، اس لیے آج پھر تمہارا فون سن کر ذرا حیرت ہوئی۔"

انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اکمل تک اس وقت آواز کی بیزاریت پہنچ چکی ہے جبھی خوامخواہ صفائی دینے لگیں۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھے ضرور گیپ دے کر بات کرنی چاہیے ورنہ تو شاید آپ میرا فون بھی ریسیو نہ کریں روز روز۔"

"اچھا زیادہ فضول باتیں نہ کرو، سمجھے۔"

"جی جی بالکل سمجھ گیا اور آپ سنائیں گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"ویسے ہی ہیں اور ویسے ہی رہیں گے۔"

لاپروائی سے کریڈل پر سے انگلیوں کی مدد سے ہلکی ہلکی گرد صاف کرتے ہوئے وہ بولیں۔

"اور ندی۔۔۔؟"

"اُسے کیا ہونا ہے؟ ہونہہ، جو ہونا تھا اس سے جڑے سب رشتوں کو ہونا ہے بس عجیب منحوس لڑکی ہے۔۔۔ میں تو کہتی ہوں۔۔۔"

"میں نے خاص طور پر ندی سے بات کرنے کے لیے ہی ابھی فون کیا تھا۔"

اکمل نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے ناپسندیدگی ظاہر کی، مگر اس کا جواب سنتے ہی عائشہ کی پیشانی کے بل ایک دم بڑھ گئے تھے۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں، خاص طور پر بات کرنے کی۔"

عائشہ کے لہجے میں لفظوں سے کہیں زیادہ طنز اور کڑواہٹ موجود تھی۔

"موبائل سے تو وہ فون ریسیو نہیں کر رہی تھی، سوچا اسی نمبر سے شاید بات ہو پائے۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم پہلے موبائل پر کرتے رہے ہو کوشش، لیکن آخر بات کیا کرنی ہے پتا تو چلے۔"

"میں آپ کو کوئی بھی بات بتانے کا پابند نہیں ہوں آپی!"

"ہوں، تو پھر میں بھی تمہاری بات کروانے کی پابند نہیں ہوں چھوٹے بھائی۔"

عائشہ کا مسکراتا لہجہ اکمل کو گیلی لکڑی کی طرح سلگا گیا تھا ان سے اس قسم کے رویے کی امید اسے ہرگز نہیں تھی۔

"آپی۔۔۔! آپ یہ سب ٹھیک نہیں کر رہی ہیں۔"

"اور تم جو یہاں پر 'ماں کی سوکن کی بیٹی کی سہیلی' والا معاملہ کر رہے ہو وہ تو بالکل ٹھیک ہے، ہے نا!"

"آپ نے پہلے ندی کے بارے میں میری کی گئی کسی بات پر یقین ہی کب کیا ہے جو آپ سے کچھ

کہوں، مجھے لگتا ہے اب آپ میری بہن تو رہی نہیں ہیں صرف ندی کی بھابھی ہی بن کر رہ گئی ہیں آپ تو۔۔۔"

"دیکھو اکمل! اگر تو تمہارا اس سے بات کرنے کا مقصد محض ہمدردی ہے تو ٹھیک ہے، مجھے تمہاری بات کروانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن یاد رکھنا کہ اب تم دونوں کے درمیان کا تعلق رشتہ داری سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"عجیب نفسیاتی پرابلم ہے آپی کے ساتھ بھی۔" زیر لب کہتے ہوئے اس نے بغیر اللہ حافظ کہے رابطہ منقطع کر دیا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج کل کے جدید دور میں بھی وہ ندی سے بات کرنے کی صرف حسرت ہی کر سکتا ہے۔ موبائل فون جو کچھ دیر پہلے تک تو کالز ریسیو کر کے بیل کی صورت میں ایک یہ احساس تو کم از کم دلا رہا تھا کہ اگر ابھی نہیں تو کیا ہوا جب بھی ندی فون دیکھے گی اتنا تو ضرور جان لے گی کہ وہ اسے فون کرتا رہا ہے۔ مگر اب دوبارہ موبائل نمبر ملانے پر پاور آف کا پیغام سننے کو ملا۔

یعنی اس نے اکمل کی طرف سے رابطہ کرنے کی کوشش کو مس کالز کی صورت میں موبائل پر دیکھا تو ضرور مگر کال بیک نہیں کی۔

کیا وہ اس حد تک فرسٹریٹڈ ہے کہ اپنا دکھ بھی شیئر کرنا نہیں چاہا؟

اکمل نے ندی سے بات کرنے کے ہر ذریعے پر غور کرنے کے بعد ناکامی ہونے پر موبائل بیڈ پر پٹخ دیا۔

☆☆☆

یوں بکھرنے سے بچالے میرے مالک مجھ کو
ہاتھ جو پھر سے سمیٹیں گے اب کمزور ہوئے

گرمیوں کی تمازت بھری دوپہریں تو بالآخر رخصت ہو چکی تھیں اور اب ہلکی پھلکی ٹھنڈک کسی نازک اندام حسینہ کی طرح دبے پاؤں چلتے ہوئے موسم کی چک پھیری میں بس داخل ہونا ہی چاہتی تھی۔

رات کا کھانا امی کے ساتھ کھانے کے بعد ندی کچن میں برتن وغیرہ رکھ کے لوٹی تو وہ اپنے روزمرہ کے وظائف کی ادائیگی کے لیے عشا کی نماز ادا کرنا شروع کر چکی تھیں۔ جب تک بابا حیات تھے وہ وقت سے نمازِ عشا ادا کرنے کی عادی تھیں مگر اب چونکہ ان کے وظائف کی تعداد خاصی بڑھ گئی تھی اس لیے کھانے کے بعد اوائل میسر وقت میں وہ اللہ کے حضور حاضر ہو جایا کرتیں۔ اس دوران ندی کبھی تو ان کے ساتھ ہی نماز پڑھتی مگر کبھی لان میں یونہی بے مقصد گھومتے ہوئے اپنی زندگی میں آنے والے نشیب کے بارے میں سوچا کرتی۔

اس لان سے اس کی اور بابا سمیت تمام گھر والوں کی بے تحاشا یادیں وابستہ تھیں۔ اکثر یونیورسٹی سے واپسی پر اُسے امی، بابا اور عائشہ یہیں بیٹھے ملا کرتے اور اس کے گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی عائشہ فوراً اس کے لیے فریج سے جوس لانے کو اندر کی طرف رخ کرتی۔

مگر اب تو وہ قہقہے، وہ مسکراہٹیں حتیٰ کہ بل بیٹھنا بھی اک خواب سا محسوس ہوتا۔ ندی نے ایک نظر جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ رب تعالیٰ کے حضور جھکی ماں کو دیکھا اور پھر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولنے کے بعد ڈوری کی مدد سے باریک جالی کو نیچے کر کے مچھروں کے اندر نہ آنے کی یقین دہانی کرتے ہوئے امی کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں عین کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر کا مشاہدہ کرنے لگی۔ جہاں اندھیری رات سیاہ چادر اوڑھے پُرسہ دیتی معلوم ہو رہی تھی۔ پہلی مرتبہ نہ جانے کیوں اسے لان کا منظر انتہائی پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

آسٹریلین توتوں کا پنجرہ کیونکہ اب شام ہوتے ہی وہ اپنے کمرے میں لے آتی تھی اس لیے ان کی جگہ بھی خالی معلوم ہوئی۔ اتنے پھول پودوں کے ایک ساتھ ہونے کے باوجود اسے ایک ایک چیز تنہا لگ رہی تھی۔

چپ چاپ، خاموش اور افسردہ!

وہ جانتی تھی ان پھول، پودوں سے بابا کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ خود امی صبح سویرے موتیا اور چنبیلی کے پھولوں کو لان سے اکٹھا کر کے اپنے کمرے اور ڈرائنگ روم میں موجود انتہائی نفیس گلاس پاٹ میں رکھا کرتیں۔

شفاف پانی میں تیرتے پھولوں والے اس گلاس پاٹ کی بدولت آج تک انہیں روم فریشنر کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

رخ موڑ کر اس نے کمرے کے داخلی دروازے کے بالکل ساتھ رکھی شو کیس بورڈ کے اوپر موجود گلاس پاٹ کو خالی دیکھا تو جیسے دل پھر سے جکڑ گیا۔ اسی دل گرفتگی کے عالم میں گلاس پاٹ سے نظر ہٹا کر امی کو دیکھا جو کتنی ہی دیر سے سجدے میں تھیں۔

یوں بھی بیٹیاں جوان ہو جائیں تو ماں باپ کے سجدوں کی طوالت روز بروز بڑھنے لگتی ہے۔ ماں کی دعا کے بنا روک ٹوک کے اول آسمان تک رسائی ہونے کے یقین کے باوجود اٹھتے بیٹھتے وہی دعا مانگنا فرائض کے قریب تر لگنے لگتا ہے۔

بیٹیوں کے نصیب کا خوف اکثر اوقات والدین کو وقت سے پہلے بوڑھا کرنے لگتا ہے اور یہاں تو پھر معاملہ ہی مختلف تھا۔

ندی کو اچانک محسوس ہوا جیسے امی سجدہ کرنے کے دوران شاید لرزہ کی کیفیت میں ہیں۔ بجلی کی سی رفتار کے ساتھ وہ ان کی جانب کو ندی اور اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنا ان کے قریب ہونا ظاہر کیا تو لرزہ آہستہ آہستہ ہچکیوں میں بدل کر آخر کار سانس کے متوازن عمل کا حصہ بدلنے لگا۔

ندی کا یوں بھاگ کر ان کے قریب آنا ایک فطری مگر بے ساختہ عمل تھا، ورنہ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھی کہ اس وقت وہ جس اعلا ہستی سے مخاطب تھیں وہاں لفظوں سے کہیں زیادہ بہتے آنسوؤں کی وقعت خیال کی جاتی ہے۔ جہاں کسی کے سچے دل سے نکلا صرف ایک آنسو نصیب کی اول و آخر کی تمام سیاہی مٹا دینے پر اسی طرح قادر ہوتا ہے جس طرح

سیپ کے منہ میں جانے والا محض ایک قطرہ، جو پل بھر میں سیپ کو گہر کی حفاظت سونپ کر اسے انمول بنا دیا کرتا ہے۔

سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے سرخ آنکھوں سے ندی کو دیکھتے ہوئے فوراً اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس کا نصیب اچھا ہونے کی دعا دی تھی۔

اندھیری رات میں دور سے جھینگروں کے چلانے کے یا نہیں شاید رونے کی بڑی بے درد آوازیں آ رہی تھیں۔ ٹکر ٹکر اندھیرا کھلی کھڑکی سے اندر جھانکتا ماں بیٹی کو یوں زمین پر بچھے کارپٹ کے اوپر جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر سست روی سے پلکیں جھپکتا معلوم ہو رہا تھا۔ ان کے لان کے عین سامنے موجود لان میں لگا بڑ کا درخت دور سے ایک عمر رسیدہ جن کی طرح قد آور معلوم ہو رہا تھا۔ جس کا جسم تو ندی کے اپنے لان میں موجود درختوں کی وجہ سے مخفی تھا مگر اوپری حصہ قدرے فربہ مگر پراسرار لگ رہا تھا اور امکان غالب تھا کہ اگر ندی کے گھر کے تمام شیشوں والے دروازے اور کھڑکیاں بند نہ ہوتے تو وہ اندر بھی چلا آتا۔

"تم نے نماز پڑھ لی؟"

امی جائے نماز سے اٹھیں تو ندی کو جائے نماز تہہ کرتے دیکھ کر استفسار کیا۔

"نہیں۔۔۔" ندی نے ایک گہری سانس لے کر جائے نماز بک ریک کے سب سے نیچے والے خانے میں رکھی اور سست روی سے چلتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

امی کی سوالیہ نظریں البتہ ابھی تک اس کے مکمل جواب کے تعاقب میں تھیں۔

"پڑھ لوں گی تھوڑی دیر میں۔" نظریں چراتے ہوئے ندی نے جواب دیا تو امی گہری سانس لے کر سبز رنگ کے موتی دانوں سے بھرا چھوٹا سا باؤل لے کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

یہ موتی دانے ایک ایسے پودے سے حاصل کیے

گئے تھے جو اپنی ذات میں آپ ایک معجزہ تھا۔ دراصل یہ موتی اُس پودے پر پھولوں کی طرح اُگا کرتے تھے اور جب یہ موتی پودے پر اپنا جوبن دکھا لیتے تو انہیں ایک رات کے لیے کھلے آسمان میں شبنم تلے رکھا جاتا۔ رات کے اوقات میں پڑنے والی اوس یا علی الصبح پڑنے والی شبنم سے یہ موتی مختلف رنگ اپنا لیتے۔ سرخ تو کوئی نیلا، سبز تو کوئی سفید۔

یہی نہیں بلکہ یہ موتی عام طور پر آرٹیفیشل زیورات میں استعمال ہوتے موتیوں ہی کی ساخت کے ہوتے جن کے دونوں اطراف حیرت انگیز طور پر سوراخ بھی ہوتا۔ جس میں دھاگہ ڈالنے کے بعد ننانوے، ننانوے موتیوں کی تسبیح بنا کر امی اب تک بے شمار لوگوں کو تحفتاً بھی دے چکی تھیں۔ انہی موتیوں کی نسبت سے اس پودے کا نام "تسبیح دانہ" مشہور تھا اور یہ پودا ناصر بھائی کے ایک دوست نے انہیں خصوصاً سیالکوٹ سے اس لیے منگوا کر دیا تھا کہ وہ اس پودے کی ان تمام خصوصیات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

"پتا ہے نا امی! بابا کو تسبیح دانے سے کتنا پیار تھا۔" ہتھیلی پر تسبیح دانے سے حاصل کیے گئے موتیوں کو یہاں سے وہاں لڑھکاتے ہوئے ندی نے کہا تو سوئی کے ذریعے ریشم کی تار میں ان موتیوں کو پروتی امی کے ہاتھ رک گئے۔ انگشت شہادت اور انگوٹھے کی مدد سے ناک سے سلپ ہوتی عینک کو ٹھیک کیا اور بولیں۔

"ہاں۔۔۔ وہ کہتے تھے ساری رات یہ موتی کسی ظاہری پردے کے بغیر آسمان تلے پڑے اس پیدا کرنے والے کا نام اس خلوص سے لیتے ہیں کہ صبح تک ان کے اپنے رنگ پر ذکر کا رنگ غالب آ جاتا ہے۔" بابا کی بات کرتے کرتے امی کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے زندگی سے بھرپور لگنے لگی تھیں۔ مگر۔۔۔ لمحہ گزرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

ایک بار پھر آنکھوں سے ہٹتی عینک کی ڈنڈی پکڑ کر انہوں نے درست کیا۔

یوں بھی امی اب کمزور ہو چکی تھیں۔ اس لیے جتنے بھی فریم تھے وہ بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"آپ بھی تو پیدا کرنے والے کا نام اسی خلوص سے لیتی ہیں امی! پھر آپ کی قسمت کے رنگ پر اس کے ذکر کا رنگ غالب کیوں نہیں آتا؟"

"اس لیے کہ میرے کیے ذکر میں خلوص نہیں ہے بیٹا! غرض چھپی ہے۔" ندی نے اپنی بڑی بڑی کانچ سی آنکھیں پھیلا کر یوں دیکھا گویا ان کے منہ سے یہ بات اچانک ہی نکل گئی ہو۔ مگر ہاتھ میں سوئی پکڑے وہ ابھی تک اپنی کی گئی بات پر قائم تھیں۔

"یہ ذکر اذکار، یہ نوافل یہ سب تو میں اپنے مطلب کے لیے کر رہی ہوں نا، اپنی غرض پوری کرنے کے لیے، اپنی شہزادیوں سی بیٹی کا نصیب جگانے کے لیے۔۔۔" لمحہ بھر رک کر انہوں نے دونوں ہونٹوں کو اوپر تلے دبا کر شاید خود کو کمپوز کرنا چاہا تھا۔

"خلوص ہوتا تو یہ ذکر اذکار، نوافل، عبادات تو تب کرنے چاہیے تھے نا جب گھر میں خوشیوں کا بسیرا تھا اور زندگی تکمیل سے بھی بڑھ کر بھرپور اور آسودہ معلوم ہوتی تھی۔"

"لیکن امی۔۔۔! آپ تو تب بھی ہمیشہ پانچ وقت کی نمازی تھیں۔"

ندی کو لگا جیسے ان کے لفظوں میں پچھتاوے کی باس شامل ہونے کو ہے اسی لیے دفاع کے انداز میں انہیں یاد دلایا تو وہ اس کی بات پر مسکرا دیں۔

"پانچ وقت نماز تو ادا کرنی ہی ہے نا، کیونکہ پرچے کا پہلا اور لازمی سوال جو ٹھہرا اگر فرائض ادا کیے تو کیا احسان کیا۔ بات تو تب ہے جب مشکور ہو کر کچھ کیا جائے، ورنہ سچ کہوں تو بیٹا۔۔۔! زمانہ ہی کچھ ایسا ہے کہ اب ہماری اکثر عبادات بھی ہماری مطلب پرستی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لیکن چلو پھر بھی لوگ خوش قسمت ہیں کہ جنہیں پریشانی میں اللہ کو یاد کرنے اور اس سے مانگنے کی سدھ رہتی ہے ورنہ تو مصیبت کے ایام بھی لوگ ہائے اور کاش کے سہارے ہی وقت کاٹ کر پھر موردِ الزام قسمت کو ہی ٹھہراتے۔" امی کی بات پر ندی کو اپنا آپ شرمندگی کی عمیق گہرائیوں کی جانب کھنچتا محسوس ہوا تھا۔

"کیا آپ ان ڈائریکٹ لی مجھ سے مخاطب ہیں؟"

"ارے پاگل، وہ بیٹیاں ہی تو ہوتی ہیں جن سے مائیں ہر بات بالکل ڈائریکٹ کر لیتی ہیں۔" دھیما سا مسکرانے کے بعد وہ موتی اور سوئی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کی مسکراہٹ پر ندی کا دل خود کو پلیٹ میں خربوزے کے چھلکوں کی طرح بے وقعت لگنے لگا تھا۔

سر جھکا کر موتی پرونے کے عمل میں بار بار نیچے کی جانب پھسلتی عینک اور پھر اُسے دوبارہ ناک پر جماتی امی۔۔۔ جو بابا کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد فالتو سامان کی طرح گھر کے ایک کونے (جسے اُن کے بیڈروم کا نام دیا گیا ہے) میں پڑی تھیں۔ اسی ایک کونے میں انہیں وقتِ مقررہ پر کھانا بھی مل جاتا اور قیدیوں کی طرح ملاقات کے لیے اکثر ناصر بھائی بھی رات کے وقت اُن کے پاس آ کر رسمی کارروائی نبھا جاتے۔

ندی کا اس وقت بے ساختہ دل چاہا تھا کہ وہ امی کو لے کر اس گھر سے کہیں دور بہت دور ایسی جگہ چلی جائے جہاں کسی کو اُن کا دل دکھانے تو دور اُن کی کسی بات سے اختلاف بھی کرنے کی جراُت نہ ہو۔

لیکن کیلنڈر کی چپ چاپ دم سادھے مگر پر اسرار ہندسے گواہ ہیں کہ عورت ہمیشہ سے وہ سب کب کر پائی ہے جو اس کا دل چاہتا ہے۔ حالات سدا سے اس کے پاؤں میں رشتوں کی ایسی پائل پہنائے رکھتے ہیں جس کے اول و آخر سمجھوتے کے گھنگھرو قدم اٹھاتے ہی دل کی مخالفت پر ایسا دیوانہ وار رقص کرتے ہیں کہ محض معمولی سی داد، رشتوں کی ذرا سی تحسین کی خاطر اسی رقص میں کب زندگی کی شام ہونے لگتی ہے، خیال ہی نہیں آتا۔

دل نے کب، کیا خواہش کی تھی، چیونٹی کی طرح بار بار حوض میں کب گرا تھا۔۔۔ یاد ہی نہ رہتا، اور بس۔۔۔ زندگی گزر جاتی۔

یہی رشتے ہی تو ندی کے پاؤں کی بھی زنجیر بن گئے تھے ورنہ اب تک تو جانے کیا کر چکی ہوتی اور پھر جب بات امی کی بے قدری کی ہو تو۔۔۔

ظاہری آنکھ سے دیکھا جاتا تو ندی اور امی ایک طرف اور باقی سب دوسری طرف ٹرین کی لائنوں کی طرح متوازی اور ایک ساتھ نظر تو ضرور آتے تھے مگر یہ بات بھی سب ہی جانتے تھے کہ اب افق پر جا کر بھی ٹرین کی ان دو لائنوں یا دریا کے دو کناروں میں کسی بھی قسم کے ملاپ کے امکانات نہ تھے۔

ندی کو ایک بار پھر اپنا دل بھیگی ہوئی روئی کی طرح بوجھل محسوس ہوا۔

اُسی پل امی نے سر اٹھا کر اس کے ستے ہوئے چہرے پر بے بسی عصر کی دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی پائی اور ان کے دیکھنے کی دیر تھی کہ ندی کے آنکھوں کے دیے کچھ اس انداز میں جگمگائے جیسے اُن میں تیل کے بجائے بارش کی پہلی بوندیں گر رہی ہوں اور انہی بوندوں سے پل بھر میں خود امی کا دل بھی بھیگنے لگا مگر جل تھل کا یہ سماں آنکھوں کے رستے ظاہر ہونے کے بجائے حلق ہی میں پھندے کی صورت رک گیا اور سوئی باؤل میں رکھ کر انہوں نے ندی کو جو گلے لگایا تو وہ جیسے ان سے لپٹ ہی گئی کہ اس وقت وہ خود ان کے گلے لگنا چاہتی تھی۔

"ندی بیٹا! ایک بات پوچھوں؟"

چند لمحے اس کے ریشمی بالوں کو اپنی بوڑھی انگلیوں سے سلجھانے کے بعد انہوں نے ندی کو مخاطب کیا جو ان سے یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے ذرا سی گرفت ڈھیلی ہونے پر وہ اُس سے کہیں دور چلی جائیں گی۔

"دیکھو بیٹا۔۔۔!"

اُس کے اثبات میں سر ہلانے کے بعد انہوں نے اپنی بات شروع کی۔

"اگر تو یہ تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں تو پھر پریشان ہونے کی کیا ضرورت؟ اور اگر مسائل جوں کے توں ہی رہیں گے تو پھر پریشان ہونے کا کیا

فائدہ؟"

"امی کیا اب زندگی اسی طرح گزرے گی؟"

اب کی بار وہ ان سے الگ ہوئی تھی۔

"ہرگز نہیں میری جان! اللہ سے بہتری کی امید رکھو وہ ہمیشہ انسان کو آنے والے کل کی صورت میں زندگی بہتر سے بہترین بنانے کے لیے موقع ضرور دیتا ہے۔"

"لیکن مجھے بتائیں گھر سے باہر میں نہیں جاسکتی، موبائل میرے پاس نہیں ہے، لیپ ٹاپ سے انٹرنیٹ کا کنکشن تک ہٹا دیا گیا ہے، اتنی شدید نفرت اور اتنے انتہائی اقدام۔۔۔ آخر میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟ اپنے ہی گھر میں قیدی بنا دیا ہے ناصر بھائی نے۔"

"انسان قیدی اس وقت نہیں بنتا جب اسے چار دیواری میں بند کر دیا جائے بلکہ اپنے اندر موجود بے اعتمادی کا وہ لمحہ اسے قیدی بناتا ہے جب وہ یہ سوچ لے کہ بس اب شاید زندگی اسی چار دیواری میں کٹے گی۔ جب اسے اپنے رب کی تدبیر پر اعتماد نہیں رہتا نا، اسی لمحے وہ قیدی بن جاتا ہے۔۔۔ تاحیات قیدی!"

"اگر میں کل سے پھر اسی اعتماد کے ساتھ یونیورسٹی جاؤں تو۔۔۔؟"

"میری حمایت ہر صورت اور ہر وقت تمہارے ساتھ رہے گی، لیکن اگر تم مجھے ایک موقع دو تو۔۔۔"

"آپ کو موقع؟ مگر کس چیز کا؟"

"میں ایک بار ناصر سے بات کرنا چاہتی ہوں اگر وہ تمہارا یونیورسٹی جانا قبول کرتا ہے تو اس سے اچھی بھلا اور کیا بات ہوگی۔"

"اور اگر جو انہوں نے انکار کیا تو؟"

"مجھے امید ہے کوئی راستہ نکل آئے گا۔"

یہ ان کی زندگی کا مشکل ترین وقت تھا۔ جس نے انہیں ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جس کے دونوں طرف ان کی اپنی اولاد تھی اور وہ اس وقت سے حتی الامکان بچنا چاہتی تھیں جب انہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے۔

☆☆☆

اَسی کمی ویکھے تختاں تے
اَسی رلدے ویکھے شاہ
ساڈے زخماں اَساں نال ضدی کیتی
ساڈی مکن نہ دیندے چاہ
کئی وار انھیریاں رل پل کے
ساڈے گل وچ پایا پھاہ
اَسی رستے بن گئے جنگلاں دے
ساڈے سینے جم گئے گھاہ

ہالا کے محنتی کاریگروں کے ہنر مند ہاتھوں سے تیار کردہ شاہکار بیڈ پر ملکانی سائیں ٹانگوں پر کمبل ڈالے لیٹی چھت پر نقش و نگار کو خالی الذہن دیکھے جا رہی تھیں۔ اے سی کی رفتار موسم بدلنے کے باعث کم ضرور کی گئی تھی مگر ابھی تک مکمل بند نہیں کیے گئے تھے۔ شاہ سائیں آج شہر جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اس لیے اُن کا میک اپ بھی قدرے ہلکا تھا۔ ورنہ تو وہ شاہ سائیں کی موجودگی میں ہاٹ ہاؤس کے اُس سفید گلاب کی مانند لگا کرتیں جو ہر قسم کے گرم و سرد سے بے نیاز صرف آرائش، سجاوٹ یا دکھاوے ہی کے لیے بنا تھا۔

حسب توقع شاہ سائیں الیکشن جیت چکے تھے مگر اس کے باوجود ملکانی سائیں کی زندگی میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روپے پیسے اور زمین جائیداد کے ساتھ ساتھ اُن کے اندر کا دکھ، بے یقینی اور آنے والے کل کا خوف کہیں تیزی سے اپنے عالیہ جحم سے آگے بڑھ رہے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ یہ دکھ محض ان کی ذات سے جڑا تھا۔ بلکہ شاہ سائیں کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا مگر یا تو وہ اس کو رب کی رضا سمجھ کر قبول کرنے کے بعد اب مطمئن تھے اور یا پھر ملکانی سائیں کے مزید پریشان ہونے کا سوچ کر ان سے اس موضوع پر بات کرنے سے گریز برتا کرتے

جو کچھ بھی تھا مگر ملکانی سائیں چاہتی تھیں کہ ان کے اندر پکنے والے دکھوں کا یہ لاوا اب کسی طور باہر نکلے۔ لیکن بدقسمتی یہ بھی تھی کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے حلقہ احباب میں خاصی مشہور تھیں مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ انہی لوگوں سے ملا جلا کرتیں تھیں جن سے کئی برسوں کی میل ملاقات کے بعد بھی وہ اپنے دل کی بات تو ایک طرف گھر کی بات بھی شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔

اور صرف وہی نہیں اکثر بڑے لوگوں کا یہی المیہ ہے کہ وہ لوگ ایسے سوشل سرکل میں رہتے ہیں جہاں لوگ روز روز ایک دوجے سے ملتے ہیں مگر کوئی کسی کو نہیں جانتا۔ یہی سب سوچتے ہوئے ایک دم مہر بانو کا خیال آیا تو اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے کمبل کو ٹانگوں سے پرے ہٹایا اور سنگھار میز پر رکھے موبائل فون کی طرف بڑھ گئیں۔ عین سامنے لگی گھڑی کے مطابق وہ مہر بانو سے صرف پانچ سات منٹ ہی بات کر سکتی تھیں کہ اس کے بعد سونی کو نہلانے کا ٹائم ہو گیا تھا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے کنیزاں سے اپنا مخصوص آئل پوری باڈی پر لگوا کر مزے سے یہاں وہاں گھوم رہی تھی۔

☆☆☆

میری قسمت تیرا احسان نہیں بھولوں گی
دوست بخشے ہیں مجھے ماں کی دعاؤں جیسے

میری اور کنول پچھلے ایک گھنٹے کی محنت کے بعد ہاسٹل کے کچن سے کڑھی چاول بنا کر لوٹیں تو مہر بانو کو دائیں بازو پر سر رکھے کروٹ کے بل لیٹا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"اے لڑکی! کھانسی کا سیرپ پی کر لیٹی ہو کیا جو نشہ نہیں اتر رہا؟"

میری نے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کی نچلی سائیڈ کو گرما گرم کڑھی کے ڈونگے سے مس کیا تو ہڑبڑا کر پاؤں کو پیچھے کرنا اور آنکھوں کا کھلنا فطری تھا۔

"شاوا تے مہرو! ہم اتنی دیر کچن میں کھپتے رہیں اور تم اٹھ کر برتن بھی نہیں پکڑ رہیں۔"

کنول نے چاولوں کی دیگچی رکھتے ہوئے شکوہ کیا تو مہر بانو واقعی شرمندہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"رئیلی سوری یار! بس ایسے ہی ذرا۔۔۔"

کمر کے پیچھے تکیہ رکھ کر اس سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے کمر تک چھوتے بالوں کو ہاتھ کے ارد گرد لپیٹ کر سر پر باندھ دیے اور آخر کار بیڈ سے اتر ہی آئی۔

"ویسے کیا تم پورے گھنٹے سے لیٹی ہوئی تھیں یا ابھی ابھی آئی ہو باہر سے۔"

میری نے کارپٹ پر دستر خوان بچھانے کے بعد اوپر ڈسپوزیبل پلیٹس چمچ اور گلاس رکھے اور آلتی پالتی مار کر اس کی طرف متوجہ ہوئی جو ٹاول سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بھی اب تک سستی کا شکار لگ رہی تھی۔

"سچ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟ اتنی اداس کیوں ہو رہی ہو؟"

"آج اتنے دنوں بعد کچھ فراغت تھی تو سوچا کوئی ڈائجسٹ ہی دیکھ لوں مگر۔۔۔"

کنول اور میری دونوں کے اب تیور بدل رہے تھے۔

"مگر اتنا دردناک اینڈ ہوا ہے میری! کہ میرے تو آنسو ہی نکل آئے۔۔۔ تب سے دل پر بہت بوجھ ہو رہا ہے۔"

مہر بانو کی بات پر میری تو بے ساختہ ہنسنے لگی تھی مگر کنول کا ردعمل مختلف تھا۔

"پہلی تو غلطی تمہاری ہے کہ میڈیکل کی اتنی ٹف روٹین سے اگر کچھ سکون میسر آیا ہی تھا تو اتنی "اندوہناک" کہانیاں پڑھنے کو کس ادیب نے کہا تھا اور دوسری غلطی اُن رائٹرز کی جو افسانوں، کہانیوں کا اینڈ ہر ممکن طور پر اداس دکھا کر تحریر کو امر کرنے کی غلط فہمی میں رہتی ہیں۔"

میری نے پلیٹ میں چاول اور چاولوں کے اوپر ہی کڑھی ڈال کر اسے پکڑائی مگر اس نے اپنی بات کے تسلسل کو ختم نہ ہونے دیا۔

"یار! اُن سے کوئی جا کر پوچھے کہ پہلے کیا دنیا

میں کم دکھ ہیں جو تم لوگ کرب ناک کہانیاں لکھ کر انہیں مزید بڑھاتے ہو اور پھر کہانیوں کا ایسا اختتام بعض اوقات دل پر نقش ہو کر کئی دن قاری کا حوصلہ پست رکھتا ہے، کچھ اور پڑھنے کو من نہیں مانتا۔"

کڑھی کی اٹھتی اشتہا انگیز خوشبو نے اسے مزید بولنے سے روکا اور وہ چمچے کی مدد سے چاول اور کڑھی کو ایک دوجے کے رنگ میں رنگنے لگی۔

مہربانو بھی کنول کی بات سے پوری طرح متفق تھی۔

"اب تو خیر اتنا ٹائم ہی نہیں ہوتا ورنہ پہلے جب میں ڈائجسٹ پڑھتی تھی نا اینڈ پہلے سے دیکھ لیتی تھی۔"

میری نے اپنا تجربہ ہنستے ہوئے بیان کیا۔

"پتا ہے میرے ابا کہتے ہیں وہ تحریر جسے ہزاروں لوگوں نے پڑھنا ہو اس میں تو دکھوں کی اندھی گھپاؤں کو داخلے کی اجازت بھی نہیں ملنی چاہیے، خوش نما رنگوں کی باتیں ہوں، چاند کی کرنوں کے قصے ہوں اور مایوسی قریب بھی نہ پھٹکے۔"

"لیکن یہ سب بھی تو دنیا کے حقائق ہیں نا، ہوتا ہے سب اسی دنیا میں۔"

چاولوں میں ملانے کے بجائے صرف کڑھی کو چمچے سے کھاتے ہوئے مہربانو نے ذہن میں آئی بات زبان کے حوالے کی۔

"ہوتا ہے، میں مانتی ہوں، مگر اسی "ہونے" سے تو چند لمحے فرار حاصل کر کے بندہ ذہن کو ریلیکس کرنے کے لیے کچھ پڑھتا ہے نا۔"

کنول اپنی بات پر قائم تھی۔

"بات تو تم دونوں کی ٹھیک ہے لیکن حاصلِ بحث بات یہ ہے کہ تم دونوں کو صرف اینڈ سے مسئلہ ہے، بیچ میں جو مرضی ہو جائے مگر انت بھلا ہونا چاہیے۔"

میری نے بات اس طرح سمیٹی کہ دونوں ہی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں اور کھانا ختم ہونے تک شام کو باہر جا کر آئس کریم کھانے کا پروگرام ترتیب دے دیا گیا۔

☆☆☆

لے گئے وہ ساتھ ساری زندگی کی رونقیں
دل کا یہ عالم ہے ان کے دور ہو جانے کے بعد
جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوتِ مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

شاہ زین آج جب گھر لوٹا تو عصر اور مغرب کے وقت میں معانقے کا عمل جاری تھا۔ پرندے جوق در جوق اپنے آشیانوں میں رات گزارنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سبک ہوا کے ساتھ سرمئی کبود بدلیاں یہاں سے وہاں اٹھکیلیاں کرتی افق پر چہل قدمی میں مصروف تھیں۔ سورج کی پھیکی کرنیں گویا اقتدار نکل جانے کی وجہ سے بڑی اداس نظروں سے یہاں وہاں دیکھ کر موسم کے رنگ و روپ کو بے حد اداس کیے دے رہی تھیں۔ حسب معمول اماں اور ثمینہ داخلی دروازے کے نزدیک ہی پلاسٹک کی کرسیاں ڈالے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

شاہ زین نے داخل ہونے کے بعد انہیں سلام کیا اور ثمینہ کے سلام کا جواب دینے کے بعد وہیں بیٹھ گیا۔

اس کے لیے پہلے سے لا کر رکھے گئے سلیپرز پہن کر جوتے سائیڈ پر رکھے اور ثمینہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر پینے لگا۔

"بیٹا! کیسا گزرا آج کا دن۔"

یہ وہ سوال تھا جو اماں کی روزمرہ روٹین کا حصہ تھا۔ ثمینہ کالج سے آ کر ہاتھ منہ دھونے کے بعد ان کے پاس آ کر بیٹھتی تب بھی اور اگر شاہ زین باہر سے گھر آتا تب بھی۔

یوں بھی اماں بڑی قناعت پسند اور پرسکون رہنے والی خاتون تھیں۔ ان کے دل میں کن سوچوں کے شگوفے پھوٹ رہے ہیں اور کن سوچوں کے پتے زرد ہو کر بس گرنے کے قریب ہی ہیں، خبر ہی نہ ہوتی، بالکل اس شخص کی طرح جو چپ چاپ بنسی لگائے ندی کے کنارے مچھلیاں پکڑنے کو بیٹھا ہو، مل گئی تو بھی خوش اور اگر نہ ملی تو بھی مطمئن۔

"بس اماں! الحمدللہ ٹھیک رہا۔"

آدھا جملہ بول کر وہ ثمینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور تمہارا کالج کیسا چل رہا ہے؟"

"بالکل فضول ہے۔" ثمینہ نے منہ بنا کر کہا تو شاہ زین سمیت امی بھی چونک گئیں۔

"جب سے میں نے جانا شروع کیا ہے مجال ہے جو ایک بھی قدم چلا ہو، بچ جہاں تھا اب تک وہیں کھڑا ہے۔"

ثمینہ کی بات پر شاہ زین کے لبوں پر مخصوص انداز میں مسکراہٹ تیرنے لگی تھی۔ اماں نے بھی اس منظر کو مسکراتی آنکھوں سے دیکھا اور اس مسکراہٹ کے امر ہو جانے کی دعا بھی کر ڈالی۔

"ویسے بھائی! اک عجیب بات ہوئی آج۔"

مذاق کرتے کرتے وہ ایک دم کچھ یاد آنے پر سنجیدہ ہوئی تھی۔

"وہ کیا؟"

"کالج کے بعد جب گھر آنے کے لیے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ بس کی طرف آ رہی تھی نا تو ایک لڑکی میرے پاس آئی۔"

"تمہاری کلاس فیلو؟"

ثمینہ کا انداز بتا رہا تھا کہ بات سیریس ہے جبھی شاہ زین مکمل توجہ اور دھیان سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"یہی بات تو حیرت انگیز ہے، کلاس تو کیا میں نے تو آج تک اسے اپنے کالج میں بھی نہیں دیکھا۔"

"اچھا پھر؟"

نا صرف شاہ زین بلکہ اماں بھی مکمل سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھیں۔ باوجود اس کے گھر آتے ہی ثمینہ مکمل تفصیل سے انہیں آگاہ کر چکی تھی۔

"پھر کیا بھائی! بڑے فرینڈلی انداز میں میرا نام لے کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے بارے میں بتانے لگی، کہہ رہی تھی کہ وہ ابھی کالج میں نیو ہے اس لیے اسے میری ہیلپ کی ضرورت ہے۔"

"کس طرح کی ہیلپ؟ اور رہتی کہاں ہے وہ؟"

"ہیلپ کا تو کہہ رہی تھی گھر آ کر بتائے گی۔"

"لیکن اسے ہمارے گھر کا کیسے پتا؟"

ثمینہ نے بات کرنے سے پہلے جو سسپنس کری ایٹ کر دیا تھا۔ شاہ زین اُسی ڈائریکشن میں اس سے سوال کر رہا تھا ورنہ اپنی کالج لائف یا دوستوں کے متعلق وہ اکثر گھر میں باتیں تو کر رہی ہوتی مگر شاہ زین نے کبھی کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔

"وہ میرے ساتھ بس میں ہی آئی تھی اور ظاہر ہے کالونی کا گیٹ تو مین روڈ پر ہی ہے نا تو جب میں اتری اس نے دیکھ لیا مگر۔۔۔"

ثمینہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے کسی الجھن کا شکار معلوم ہو رہی تھی۔ شاہ زین نے خاموش رہ کر اسے بولنے کا موقع دیا۔

اماں بھی مکمل خاموش تھیں۔

"مگر مجھے وہ کچھ عجیب سی لگی کیونکہ ایک تو وہ عمر میں کالج گرل نہیں لگ رہی تھی اور دوسرا اس کے پاس کالج کی کوئی بک وغیرہ بھی نہیں تھی۔"

"ہوں۔"

شاہ زین نے کچھ سوچتے ہوئے اماں کی جانب دیکھا تو وہ بولیں۔

"میرا تو خیال ہے خوامخواہ یوں کسی پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ کل وہ کالج آئے گی تو اس کے بارے میں ساری معلومات لے لینا۔"

"نہیں اماں! اس کی والدہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ کہہ رہی تھی کہ شاید کچھ دن کے لیے وہ کالج نہ آ سکے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم ریلیکس ہو کر کالج جاؤ۔ ڈرنے یا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔" گہری سانس لے کر شاہ زین نے اس کی ہمت بندھائی اور اسی دوران ٹیلی فون کی ہونے والی بیل نے تینوں کو اپنی طرف متوجہ کر دیا۔

"ہیلو۔" شاہ زین نے ثمینہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہو کر خود فون اٹھایا۔

''ثمینہ سے؟ آپ کون؟''
''اوکے پلیز ہولڈ۔''
ثمینہ کو فون دے کر وہ خود واش روم کی طرف بڑھ گیا اور جب واپس آیا تو ثمینہ بات کرنے کے بعد فون کال کا رابطہ منقطع کر چکی تھی۔
''بھائی! اُسی بس والی لڑکی کا فون تھا، کہہ رہی تھی مجھ سے ٹیوشن پڑھنا چاہتی ہے۔''
''تم سے ٹیوشن؟ مگر تم نے تو ابھی گریجویشن بھی کمپلیٹ نہیں کی۔''
شاہ زین کا حیران ہونا لازمی تھا۔
''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر وہ مجھ سے جونیئر ہے نا، کہہ رہی تھی کہ جو کچھ وہ اب پڑھے گی وہ میرے مائنڈ میں تو ابھی فریش ہے نا اس لیے۔''
''ثمینہ تم خود اپنا پڑھ لو، یہی بڑی بات ہے، کسی دوسرے کی ذمہ داری ہرگز نہ لینا۔''
''امی! وہ اچھی خاصی فیس دے گی بدلے میں اور پھر کتنا اچھا ہوگا اگر میں بھی بھائی کے ساتھ مل کر گھر کے لیے کچھ کر سکوں، گھر میں ہی کرنا ہے' باہر تھوڑی جانا ہوگا۔''
فون کال ریسیو کرنے کے بعد سے اس کا جوش دیدنی تھا۔
بھائی کا بوجھ بٹانے اور اس کے ساتھ مل کر اپنے گھر کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اس کے اندر جیسے پارہ بھر چکا تھا۔
فون سننے کے بعد سے اسے اپنا آپ بڑا معتبر لگ رہا تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف بھائی سے جیب خرچ بٹورنے کے ہی قابل نہیں بلکہ اب وہ اس قابل بھی ہوگئی ہے کہ معاشی طور پر خود زیادہ نہ سہی مگر کچھ تھوڑا بہت تو گھر کے لیے کر ہی سکتی تھی۔ something is better than nothing کا طبل بڑی زور سے بس بجے ہی چلا جا رہا تھا اور اسی کے طفیل ثمینہ کے دل میں سردائی کی سی ٹھنڈک پڑتی محسوس ہونے لگی۔
''تم اپنا سارا دھیان پڑھائی پر دو، جب تک میں ہوں تمہیں گھر کے خرچے کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''
''شاہ زین کی بات بالکل ٹھیک ہے بیٹا!''
اماں نے بھی ثمینہ کے مخالف جبکہ شاہ زین کی حمایت میں فیصلہ دیا۔
''اور پھر اللہ نے ضروریات سے بڑھ کر وسائل دیے ہیں بیٹا! تم بھلا پریشان کیوں ہوتی ہو۔''
''وہ سب تو ٹھیک اماں! لیکن آپ خود سوچیں ویسے بھی تو میں اکثر دوپہر میں سو ہی رہی ہوتی ہوں نا، جاگنے کے بعد بھی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی، ایسے میں اگر ایک ڈیڑھ گھنٹہ کسی کو پڑھا دوں تو اس میں بھلا کیا حرج ہے۔''
اماں نے شاہ زین کی طرف دیکھا۔ جو فی الحال ثمینہ کے دلائل سے متفق نظر نہیں آ رہا تھا مگر ثمینہ بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھی جبھی آخری مگر جذباتی حربے کو استعمال کیا۔
''میں نے آج تک کسی کام کے لیے ضد نہیں کی، پہلی اور آخری دفعہ کسی چیز کے لیے اصرار کر رہی ہوں مگر پھر بھی۔۔۔''
ثمینہ نے منہ بسورا، مگر شاہ زین نے اسے لمحہ بھر ہونے والی بات چیت کا حوالہ دے کر کچھ یاد دلانا چاہا۔
''ذرا یاد کرو پیاری بہنا، اسی لڑکی کو ابھی کچھ دیر پہلے تم نہایت پراسرار بنا کر پیش کر رہی تھیں۔''
''ہاں کر تو رہی تھی۔۔۔''
ثمینہ نے خجالت سے سر کھجایا، مگر پھر سنبھل گئی۔
''مگر اب جب کہ وہ گھر آ رہی ہے اور روز آیا کرے گی تو ظاہر ہے ساری معلومات مل جائیں گی اس کے بارے میں اور وہ پراسرار بھی نہیں رہے گی۔''
''اچھا بھئی، ٹھیک ہے کرلو اپنا شوق پورا۔۔۔ لیکن اب کھانا بھی لے آؤ نا یا بھائی کا پیٹ بس باتوں سے ہی بھروگی۔''
اماں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے تو بھلا شاہ زین کو کیا اعتراض ہوتا۔ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا وہ بھی مسکرا دیا۔

☆☆☆

دوستوں کی پرکھ نہیں کرنا
مان ٹوٹے گا آزمانے میں

''کیا بات ہے لالے، یہ آج کل ہر وقت فون کے ساتھ تو ایسے مصروف رہتا ہے جیسے فون نہیں تیری نئی نویلی دلہن ہے۔''
بریگیڈیئر صاحب کے ساتھ ہونے والی میٹنگ بھگتا کر کمرے میں آنے سے پہلے ہی کھلی کھڑکی سے اکمل کو موبائل پر نمبر پریس کرتے دیکھ کر کمرے میں داخل ہونے کے بعد نبیل نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔
جواباً بے ساختہ ہنستے ہوئے اکمل نے تکیہ اٹھا کر اسے دے مارا۔
''او چل بک نا۔''
''چل تو بک لے، میں چپ کر جاتا ہوں۔''
تکیہ کیچ کر کے اس نے گھٹنوں پر رکھ لیا تھا۔
اکمل نے اسے سکون سے بیٹھتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کر موبائل چارج پر لگا دیا۔
''یار! میں نے کچھ پوچھا ہے تجھ سے۔۔۔''
''یار! جیسا تو سمجھ رہا ہے نا، ایسا کچھ نہیں ہے۔''
''چل جیسا بھی ہے بتا دے، میں سن لوں گا۔''
''اچھا چھوڑ یہ بتا۔۔۔''
''نا بابا، میں نے کوئی نہیں چھوڑنا، سیدھی طرح بتا دے، ناراض ہوگئی ہے نا ہماری ہونے والی بھابھی۔''
اکمل اس کی بات پر چونکا۔
''تیری ہونے والی بھابھی؟'' حیرت بجا تھی۔
''او نہیں، میری ہونے والی بھابھی۔'' نبیل نے چہرے پر معصومیت سجائی۔
''اوہ اچھا اچھا۔''
لمحہ بھر کے لیے اکمل، نبیل کی معصومیت سے دھوکا ضرور کھا گیا تھا مگر اگلے ہی پل چونک گیا۔
''او بکواسی، میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا نا۔''
''چل یہ تو تو مان گیا نا کہ تو بھابھی کو ہی فون ملا رہا تھا، مگر ظاہر ہے اگر ناراض ہیں تو پھر فون کیسے اٹھائیں گی۔''
''او بھینس کی دم، تو سو فیصد غلط ڈائریکشن میں جا کر گھاس کھا رہا ہے۔''
''اچھا۔۔۔؟'' اپنا اندازا غلط ہونے پر وہ مایوس ہوا تھا۔
''ویسے تیری بھابھی ہے تو سہی۔۔۔''
جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑنے کے بعد اکمل نے شرارتاً اسے دیکھا جس کے کان فوراً کھڑے ہو گئے تھے۔
''اسی دنیا میں۔ مگر نہ میں نے اسے اب تک دیکھا نہ کوئی نام پتے کا ہے اتا پتا۔''
''ڈینگی مچھر نہ بن انسان بن اور چھپ چھپ کر وار کرنا چھوڑ دے اب۔''
نبیل کا مزا کرکرا ہو گیا تھا ورنہ اس کا تو خیال تھا کہ اب اکمل کو دن رات تنگ کرنے اور چھیڑنے کے لیے اس کے ہاتھ ایک بات لگ گئی ہے مگر افسوس ایسا نہ ہوا۔
''اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ تیری ''وہ'' اب تک خبر سے بے دار ہو کر اسی دنیا میں ہے۔ تو مجھے اس فون کی حقیقت بتا ورنہ جان نہیں چھوڑوں گا، قسم ہے اپنے بیٹ مین کی۔''
اور اکمل کو پتا تھا کہ اب وہ واقعی جانے بغیر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ جبھی چند لمحے رک کر بولا۔
''لیکن یار یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔''
''واہ یار! اتنا ٹائم ٹریننگ میں اپنا آپ مار کر بھی کیا میں تجھے عمر شریف کا شاگرد لگ رہا ہوں؟''
اکمل نے تنبیہی انداز میں اُسے دیکھا تو اپنے سوال کا جواب اُس نے خود ہی دینا چاہا۔
''نہیں نا، تو پھر تو بول۔ سچ Now I am serious۔''
تھوڑی دیر وقفے کے دوران اکمل نے اس کا موڈ مکمل طور پر بدلتے دیکھا تو اپنے اور ندرت کے درمیان بچپن کی دوستی سے لے کر اس کے ساتھ

ہونے والی زندگی کی چھپن چھپائی تک سب کچھ بتا ڈالا۔ یہاں تک کہ عائشہ کا بدلا ہوا رویہ بھی اکمل نے اس سے نہیں چھپایا تھا۔

"ہوں۔۔۔" تمام باتیں گہری سنجیدگی سے سننے کے بعد نبیل نے گود میں لیا ہوا تکیہ دیوار کے ساتھ رکھ کر پیچھے کی طرف اس انداز میں ٹیک لگائی کہ جوتے ابھی تک زمین کو چھو رہے تھے۔

"تیرے گھر والوں کو یہ ڈر ہے کہ کہیں تُو ندی سے شادی نہ کرلے اور تیرا اپنا کیا خیال ہے؟"

"ندی میرے لیے دنیا کی سب سے اچھی دوست ہے مگر میں نے اُسے اِس نظر سے کبھی نہیں دیکھا لیکن I am afriad کہ عائشہ آپی کے اس بی ہیویر کی ضد میں آکر مجھے کوئی انتہائی قدم نہ اٹھانا پڑ جائے۔"

"ضد میں آکر کیے گئے اقدامات ہمیشہ نقصان ہی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا کہ بعد میں اپنے اس عمل سے تم خود انصاف نہ کر پاؤ۔"

"ندی کے ساتھ ہونے والے اس واقعہ سے پہلے گھر والوں اور خود عائشہ آپی کا بے حد ارادہ تھا کہ ندی ہمارے گھر میں بہو بن کر آئے اور میں نے خود کتنی ہی دفعہ اس سے اِس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ میری کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہی مجھے اُس کی اور شاہ زین کی پسندیدگی کا علم ہو گیا بٹ آئی ایم ہیپی یار۔۔۔!"

"رئیلی؟"

"آف کورس، کیونکہ وہ میرے لیے ایک دوست ہی کی طرح تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔۔۔ کچھ بھی۔"

نبیل نے اکمل کے چہرے پر بکھری سچائی کو دیکھا۔ وہ واقعی ندی کے لیے پریشان تھا یہ بتانے کے لیے وہ کوئی لفظ استعمال نہ بھی کرتا تو لہجہ خود بخود بتا رہا تھا۔

"I just wanna see her happy at any cost" (میں صرف اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں، ہر قیمت پر)

"چل بس، تو نہ فکر کر، کچھ سوچتے ہیں نہ۔"

نبیل نے کہا تو اکمل ٹانگ ہلاتے ہوئے گنگنانے لگا محض اوپری دل سے۔۔۔!

☆☆☆

پرکھنا مت پرکھنے سے کوئی اپنا نہیں رہتا
کبھی بھی دیر تک آئینے میں چہرہ نہیں رہتا
بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا، دریا نہیں رہتا

شاہ سائیں آج پہلی مرتبہ اپنی فیکٹری کی نیو برانچ سے ملنے آئے تھے۔ کانفرنس روم میں اُن کے داخل ہونے سے پہلے کھلے دروازے سے اُن کے استعمال کردہ پرفیوم کی خوشبو سب عہدیداران تک جا پہنچی تھی جسے تم وبیش بھی نے گہری سانس لے کر پھیپھڑوں تک منتقل کرتے ہوئے اس کے شایانِ شان عزت و رتبے سے نوازا تھا۔ پل بھر کے بعد ہی شاہ سائیں برانچ کے آپریشنل ہیڈ کی سنگت میں کانفرنس روم میں داخل ہوئے تو شیشے کی مستطیل میز کے تینوں اطراف بیٹھے تمام افراد آن کی آن میں کھڑے ہو گئے۔

سفید کلف دار شلوار سوٹ، ڈائی شدہ بال، چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر سنہری رنگ کا مہنگا ترین نفیس سا چوکور فریم جس کے دونوں اطراف موجود اس کی کمپنی کا نام واضح طور پر درج تھا اور ہاتھ میں پکڑی سفید چمکدار دانوں کی ننھی سی مگر انتہائی خوب صورت تسبیح میز کے ایک سرے پر موجود اپنے لیے خالی نشست پر بیٹھ کر انہوں نے لمحہ بھر میں تمام اسٹاف کو اپنی تجربہ کار نظروں سے دیکھا اور دائیں طرف کی پہلی ہی سیٹ پر بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ بیٹھے شاہ زین پر جا کر آخر کار اُن کی نظر رک گئی۔

"Would you like to introduce yourself" (کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند کریں گے؟)

"Sure, why not."

شاہ سائیں کے کہنے پر شاہ زین نے ذاتی تعارف کے طور پر محض اپنا نام بتا کر اس فیکٹری کے حوالے سے اپنا مکمل تعارف کروایا۔

اپنے دائرہ کار میں ہونے والے کام اور اپنی ان تمام ڈیوٹیز کے بارے میں آگاہ کیا جس کے لیے اسے اس فیکٹری میں تعینات کیا گیا تھا۔ فیکٹری کی اس برانچ میں اپنے انڈر ہونے والے کام کا فرسٹ ڈے سے لے کر اب تک کا مختصر جائزہ پیش کرنے کے بعد شکریہ کہہ کر اس نے اپنی سیٹ سنبھالی۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے سبھی نے شاہ سائیں کو بریف کیا مگر جس طرح شاہ زین کا اندازِ بیاں اور چمکتی ہوئی سرمئی آنکھوں میں ذہانت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا کوئی اور نہ کرسکا۔

☆☆☆

جب ہم جواں ہوں گے
جانے کہاں ہوں گے
لیکن جہاں ہوں گے
وہاں تجھے یاد کریں گے
جب ہم جواں ہوں گے
اوں ہوں ہوں ہوں

پروگرام کے عین مطابق آئس کریم کھانے کے لیے باہر جاتے وقت اس وقت کنول بیڈ پر بیٹھی اپنے بیگ میں سے بریسلیٹ ڈھونڈتے ہوئے ساتھ ساتھ ایک پرانا سا گانا بڑی مگن ہو کر گنگنا رہی تھی جب شیشے کے سامنے کھڑی میری اسے گھورتے ہوئے عین اس کے سر پر آ پہنچی مگر اسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ پتا چلا تو تب، جب میری کی طرف سے ایک چپت کنول نے اپنے سر پر وصول کی۔

"یعنی ابھی تک تمہارا جوان ہونا فعلِ مستقبل میں شامل ہوتا ہے؟"

"صرف فعلِ مستقبل نہیں یار مستقبل بعید میں۔"

کنول نے بھی اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے جواب دیا تو میری کانوں کو ہاتھ لگاتی ایک مرتبہ پھر شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اسی دوران مہر بانو کمرے میں داخل ہوئی۔ کنول کے ہونٹوں پر پھر سے وہی گنگناہٹ جاری تھی۔

"خیر تو ہے کنول! آج کون یاد آرہا ہے تمہیں؟"

مہر بانو نے مسکراتے ہوئے اپنے کھلے بالوں کو گردن کے عقب سے ایک جگہ پر جمع کر کے انہیں بینڈ لگایا تو جیسے اس کی کمر پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہونے لگا کہ لمبے بال تو بہت سی لڑکیوں کے ہوتے ہوں گے مگر اس کے بالوں کا خاصہ وہ سیاہ رنگ تھا جو دیکھنے والوں کو دیر تک دیکھنے پر مجبور کردیتا۔

"بس ہے کوئی۔" کنول نے بریسلیٹ پہننے کے بعد جوتا پہنتے ہوئے اس کی اسٹرپ بند کرنے کے دوران مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"او۔۔" میری نے معنی خیز انداز میں ہونٹ سکیڑے۔

"یعنی یہ "بھی" کام سے گئی۔"

"بھی' کا کیا مطلب ہے ویسے؟"

مہر بانو نے اپنے شولڈر بیگ میں موبائل فون اور والٹ ڈالتے ہوئے اس کی بات پکڑی تھی۔

"اچھا تو چھپی رستم تم، ہاں۔" کنول نے بھی چھیڑا تو میری ہنسنے لگی۔

"ویسے آج ہم جا تو آئس کریم کھانے رہے ہیں مگر اندر کی بات بھی باہر آنی چاہیے۔" مہر بانو نے چادر نما بڑا سا دوپٹا سر پر اچھی طرح جمانے کے بعد کمر پر پھیلاتے ہوئے بالوں کو ڈھکا۔

اس کی بات پر اُن دونوں نے متفق ہو کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

اور اُسی دن یہ راز کھلا کہ کنول کی منگنی آج سے تین چار سال پہلے ہی اس کے کزن کے ساتھ ہو چکی ہے جبکہ میری ایک مسلمان لڑکے میں انٹرسٹڈ تو ہے مگر ابھی کیونکہ ہی سب جذبات پہلی منزل پر ہیں اس لیے وہ کوئی بہت زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ یوں بھی اُن دونوں کی شادی کوئی آسان بات نہیں تھی اس لیے وہ محض وقتی طور پر اس کے ساتھ دوستی رکھے ہوئے تھی۔

"اور تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ اگر منگنی وغیرہ نہیں ہوئی تو کیا آج تک کوئی بندہ اچھا بھی نہیں لگا تمہیں۔"

میری نے اسے کریدا تھا مگر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کے تمام تر سوالات کا جواب نفی میں دے دیا۔

"حیرت ہے یار! تم تو پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتی ہو۔"

کنول نے آئس کریم پارلر کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس حیرت کا اظہار کیا جو وہ پہلے بھی اکثر کیا کرتی تھی مگر جواب میں ہمیشہ کی طرح مہربانو مسکرا دی اور اردگرد لوگوں کا رش دیکھ کر ایک مرتبہ سر سے ڈھلکتی چادر کو اچھی طرح سر پر جمایا۔

"ویسے ایک بات کہوں، مائنڈ نہیں کرنا۔"

میری کی اس تمہید پر مہربانو نے چونک کر اسے دیکھا۔

کنول اُن دونوں — کا "فیورٹ فلیور" بتانے کے بعد اُن کی طرف سے اوکے کروا کر آئس کریم لینے کے لیے آگے بڑھی تھی جبکہ وہ دونوں ذرا کونے میں کھڑی اس کے اشارے کی منتظر تھیں تاکہ ان کی مطلوبہ آئس کریم تیار ہو جانے پر وہاں سے لا سکیں۔

اور یہ سب بھی صرف اس لیے کہ مہربانو رش والی جگہ پر بہت جلد گھبرا جایا کرتی تھی اور نہ ہی وہ اتنے لوگوں میں ایک طرف اکیلے کھڑی ہونا پسند کرتی۔ اس لیے ہمیشہ اگر ایسی صورت حال ہوتی تو ان میں سے ایک مہربانو کے پاس رکتی اور دوسری جا کر باقی کام سنبھالتی۔

"بولو۔۔۔ میں بھلا کیوں مائنڈ کروں گی۔"

"یار! میرا اور کنول کا حلیہ دیکھو اور اپنا۔۔۔ کیا تم ایزی فیل کرتی ہو ایسے؟"

مہربانو نے ایک نظر اسے دیکھا۔

سیدھے سادے شلوار قمیص کے ساتھ گلے میں دوپٹا لیے وہ اس کے سامنے تھی تو ٹراؤزر کے ساتھ لانگ شرٹ اور سر پر برائے نام دوپٹا ٹکا کر اسے گلے کے گرد لپیٹے کنول قدرے فاصلے پر کھڑی آئس کریم کے مطلوبہ فلیورز منہ سے بتانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کے اشارے سے بھی دکان دار کو سمجھا رہی تھی۔

"تم میری بات کا غلط مطلب نہ لینا۔ لیکن میں صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ خوب صورت اور قیمتی لباس تو ٹھیک ہے مگر تمہارا دوپٹا لینے کا انداز تمہیں بہت دقیانوسی ظاہر کرتا ہے۔ آئی مین ہم دونوں سے بڑی لگتی ہو تم اس اسٹائل میں۔" میری کے یوں اچھا درجے کی فکری مندی ظاہر کرتے ہوئے کہنے پر مہربانو اس کی بات پر بے ساختہ ہنس دی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ مہربانو کچھ جواب دیتی کنول کے اشاروں نے میری کو اپنی طرف بلا لیا جو کہ دور سے یہ بتا رہی تھی کہ میری کا بتایا گیا فلیور نہیں ہے اس لیے خود آ کر دیکھ لو کہ اب کون سا لینا ہے۔

میری کے جانے کے بعد بھی مہربانو کے لب سابقہ انداز میں مسکراتے رہے۔

اسے معلوم تھا کہ میری یہ سب اس کے پیار میں کہہ رہی تھی اور میری کے پیار پر اسے بھی ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

مگر اس حقیقت سے بھی وہ بلاشبہ بے خبر تھی کہ اُسی لمحے آئس کریم پارلر کے باہر پارک کی گئی گاڑی میں بیٹھتا اکمل پارلر کی شیشے کی دیوار میں سے اُسے دیکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتا — پھر باہر نکل آیا تھا۔

بڑی سی چادر میں لپٹی اس لڑکی میں جس قدر مشرقیت اسے نظر آئی تھی وہ شاید آج تک اس نے کبھی نہیں دیکھی۔

ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر اور دوسرا دائیں کندھے پر موجود شولڈر بیگ کے اسٹرپ پر رکھے وہ اکیلی ہی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔

اور تب جانے اکمل کو کیا ہوا کہ میکانکی انداز میں گاڑی بند کرتے ہوئے سیدھا اس تک جا پہنچا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اگر آج اس نے اس سے بات نہ کی تو آئندہ کبھی اس سے مل بھی نہیں پائے گا یا نہیں۔

یوں بھی فوج کی تمام تر ٹریننگ میں وقت کی اہمیت ہر چیز سے زیادہ بتائی اور سمجھائی جاتی ہے۔ جبھی اس نے بھی دل کی گھنٹی پر لبیک کہتے ہوئے وقت "ضائع" نہ کرنے کا سوچا۔

اور عین مہربانو کے سامنے والی ٹیبل پر پہنچ کر بات کرنے کا موقع ڈھونڈنے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی بہت لفنٹو ٹائپ انسان تھا مگر ہاں وہ مہربانو کے انداز سے اتنا ضرور سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے جس کا وہ انتظار کر رہی ہے اور وہ کسی کے بھی آنے سے پہلے صرف اُس کا نام وغیرہ پوچھنا چاہتا تھا اور بس۔

اس لیے اب وقت اور لفظوں کے درمیان جنگ سی چھڑی تھی۔

"آپ پلیز بیٹھیے نا۔"

کتنی ہی دیر سوچنے کے بعد جب کچھ سمجھ نہ آیا تو وہ ڈائریکٹ مخاطب کر بیٹھا۔

"جی؟"

مہربانو کے مسکراتے لبوں سے مسکراہٹ پل بھر میں پانی پر پھینکے پتھر کی طرح غائب ہو گئی تھی اور اب آنکھوں میں عجیب خوف تیرتا دکھائی دینے لگا تھا۔

"نو تھینکس۔"

کنول اور میری کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے مہربانو نے رکھائی کے اعلاترین درجے پر پہنچ کر جواب دے تو دیا مگر چہرہ اس کے لہجے کی مضبوطی کو اُن تاثرات کے ساتھ چیلنج کر رہا تھا جو اُس کے چہرے پر دل کی کھلی کتاب لیے موجود تھے۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں شاید۔۔۔" اکمل نے مسکراتے ہوئے اس امید کے ساتھ دیکھا کہ شاید ایک بار پھر وہ مسکراہٹ دیکھنے کو ملے جس نے ہرنی سی وحشت زدہ ان آنکھوں میں اس پل جگنو بکھیر دیے تھے۔

"دراصل میں یہاں بیٹھنے والا تھا، مگر آپ کھڑی رہیں اور میں بیٹھ جاؤں تو شاید اچھا نہ لگے۔" اکمل کے یوں دوستانہ انداز میں بات کرنے پر وہ کبھی حیرت سے اسے دیکھتی اور کبھی سہم کر۔ پھر بے بسی سے میری اور کنول کو دیکھتی جو میری کے فیورٹ فلیور کے لیے جانے کیا کر رہی تھیں اب تک۔

اور یک نہ شد دو شد ان کے پاس جانے کے رستے میں لگا لوگوں کا رش۔

"آگے کنواں پیچھے کھائی" کا محاورہ تو حقیقتاً اُسے آج ہی سمجھ آیا تھا۔

"دیکھیں آپ کو جو بھی کرنا ہے، جہاں بھی بیٹھنا ہے بیٹھیں مگر پلیز مجھ سے بات مت کریں۔"

مہربانو نے چاروں سمت نظریں دوڑا کر دیکھا۔ نہیں دیکھا تو بس اسے جو آج کل کے دور میں بھی اس کے یوں سہم جانے پر بڑی حیران مگر پُرشوق نظریں جمائے اس کو دیکھ رہا تھا۔

"If you dont mind, may I know your name please." (اگر آپ برا نہ مانیں، تو کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔)

اس مزید پیش قدمی پر مہربانو بغیر کچھ بھی کہے اپنا شولڈر بیگ ٹیبل پر رکھ کر اس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

دو بکس اور ایک ننھی سی ڈائری نکالنے کے بعد آخر کار موبائل ہاتھ آیا جس سے میری کو فون کر کے اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد جلدی آنے کا کہا تو وہ فوراً ہی ہاتھ میں اس کی بھی آئس کریم لیے آن موجود ہوئی۔

سامنے رکھی کتابوں سے ہی اکمل کو معلوم ہوا کہ اس کا نام مہربانو ہے اور وہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔ یا کم از کم لکھا تو یہ ہی تھا۔ اس خوش گوار معلومات کے حاصل ہونے پر دل نے لمبی سی سیٹی بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔

"سوری مہر! آج ان کے پاس اسٹرابری تو تھی مگر میرے لیے لیمن فلیور نہیں تھا۔ بس اسی میں دیر ہو گئی۔"

میری نے مہربانو کی طرف اسٹرابری فلیور بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے کچھ بھی جواب دینے کے بجائے جلدی سے باہر نکلنے پر اصرار کیا تو کنول اور میری کو بھی بادل ناخواستہ تقلید کرنی پڑی، مگر ابھی وہ تینوں آئس کریم پارلر کے اندرونی طرف سے دروازہ کھول کر باہر نکلنے ہی والی تھیں کہ اکمل کے ''ایکسکیوزمی'' کہنے پر پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ مہربانو نے مڑ کر اسے دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے رکنے کے باوجود رخ نہیں موڑا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی آئس کریم بھی اپنی ناقدری پر اب آنسو بہاتے ہوئے پگھلنے کو تھی۔

''جی فرمائیے۔''

کنول نے یوں فلمی انداز میں کسی کے پکارنے پر پہلے میری اور پھر اکمل کو دیکھا۔

''دراصل یہ شاید آپ کی دوست کی بک ہے جو وہ ٹیبل پر ہی بھولے جا رہی تھیں۔''

اکمل نے کنول کی طرف کتاب بڑھائی اور خود ایک سائیڈ سے ہو کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پہلا کام اُن تینوں کو چھوٹے چھوٹے قدم لے کر چلتے ہوئے دیکھنے کا کیا تھا جو یقیناً مہربانو سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔

☆☆☆

اُس گھر کو کبھی پھولتے پھلتے نہیں دیکھا
جس گھر کے مکینوں میں محبت نہیں ہوتی

امی نے آج عشاء کی نماز کی ادائیگی ذرا تاخیر سے کرنے کا سوچا تھا۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ناصر بھائی سے ندی کے یونیورسٹی جانے کے لیے ''اجازت'' لینا چاہتی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ ابھی تک ان کے انتظار میں بیٹھی جائے نماز پر تسبیح میں مصروف تھیں۔

ندی کو انہوں نے آج رات کمرے میں نہ آنے کا کہا تھا۔ مبادا اسے دیکھ کر ناصر بھائی کا پارہ نہ چڑھ جائے۔

اُن کی زندگی میں یہ عجیب مقام آیا تھا جب انہیں اپنے ہی بیٹے سے بات کرنے کے لیے پہلے لفظوں کو ترتیب دینا پڑ رہا تھا۔ جس بیٹے کو انہوں نے پہلا لفظ بولنا سکھایا تھا آج وہی بیٹا اُن کے سامنے فنِ خطابت کا وہ مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا کہ ان کے اپنے لفظ کہیں کھو سے جاتے۔

پھولوں کی طرح سینت سینت کر رکھنے والا بیٹا یقیناً ظاہری طور پر اُن سے کوئی بے ادبی نہ بھی کرتا مگر ندی کے ساتھ کیا گیا سلوک ہی امی کے لیے کسی نشتر سے کم نہ تھا۔ کبھی کبھار انہیں اپنا آپ اس رنگ برنگی تتلی کی طرح محسوس ہوتا جسے کسی نے دل بہلانے کے لیے بوتل میں بند کر دیا ہو اور اس بوتل میں ان کے زندہ رہنے کا سامان کرتے ہوئے ندی کی صورت میں ایک رنگین پھول بھی ان کے ہمراہ کر دیا ہو۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ تتلی اور پھول دونوں ہی اس طرح زندہ نہیں رہ پائیں گے۔

اسی دوران ہمیشہ کی طرح ناصر بھائی کمرے کا دروازہ بجانے کے بعد اندر چلے آئے۔

''السلام علیکم امی!''

''وعلیکم السلام بیٹا، جیتے رہو۔''

جائے نماز سے اٹھنے کی کوشش میں انہوں نے ایک ہاتھ گھٹنے پر اور دوسرا جائے نماز پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آج ناصر بھائی کی آمد کچھ مختلف انداز میں ہوئی تھی۔

ورنہ عام طور پر تو وہ ہمیشہ رات کے وقت ان کے پاس اپنے چھوٹے سے بریف کیس اور ہاتھ میں ایک دو فائلیں لیے یوں آتے کہ گویا ماں کے پاس نہیں اپنے دفتر کے باس کے پاس جا رہے ہوں۔

اس بریف کیس کے دو تین خانوں میں اُن کے مختلف کاغذات موجود ہوتے جنہیں فائلوں کو دیکھنے کے دوران انہیں اکثر اوقات نکالنا پڑتا۔ کافی دیر تک وہ انہی کاغذوں پر جھکے کبھی انہیں پڑھا کرتے اور کبھی بریف کیس کے ہی ایک خانے سے پین نکال کر کچھ

لکھنے لگتے۔ اس دوران امی اپنے بیڈ پر ٹیک لگا کر بیٹھی بس خاموش نظروں سے انہیں دیکھا کرتیں۔ کئی مرتبہ اُن کا جی چاہتا کہ ناصر بھائی اُن کے پاس آ کر بیٹھیں، اس طرح نہیں جیسے اب بیٹھا کرتے ہیں بلکہ اس طرح جیسے پہلے وہ ان کے پاس آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ دن بھر کی مصروفیات، خاندان یا رشتہ داروں میں ہونے والے روابط، مستقبل کی باتیں۔۔۔ کتنا کچھ تھا جو وہ ان کے ساتھ شیئر کیا کرتے تھے۔

مگر ہمیشہ ویسا ہی کب ہوتا ہے جیسا انسان کا دل چاہتا ہے۔ جبھی اکثر امی اپنی ان ہی سوچوں سے گھبرا کر بند کھڑکی کے آگے سے پردہ ہٹا ہونے کے باعث شیشے کے اس پار لان میں اور اس کے آگے درختوں کی اوٹ سے تانبے کی طرح چمکتی پر لان سے ابھرتی روشنیوں کے ملاپ کو دیکھنے اور انہیں الگ کرنے میں خود کو مصروف رکھنے کی لاحاصل سعی کرتیں اور اسی دوران ناصر بھائی خاموشی سے اپنے تمام کاغذات سمیٹنے کے بعد بریف کیس بند کر کے فائل ہاتھ میں لیتے اور حسب سابق ''اچھا امی! اللہ حافظ۔'' کہہ کر کمرے سے نکل جاتے۔

اُن کے منہ سے ندی کے بارے میں کوئی مثبت بات، ندی کے ساتھ روا رکھے گئے رویے پر پچھتاوے کا کوئی ایک حرف یا اس کی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی خوش گوار لائحہ عمل سننے کو وہ ترس گئی تھیں۔ روز اسی آس پر انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھتیں اور جاتے ہوئے پھر خاموشی سے اپنے بیڈ پر لیٹ جایا کرتیں۔

لیکن آج کا سورج ذرا مختلف انداز میں غروب ہوا تھا اور وہ یوں کہ ہمیشہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو ہی نئی امید کی علامت قرار دیا جاتا ہے مگر آج بات کچھ مختلف تھی۔ آج سورج کے غروب ہونے کے بعد سے اب تک امی کے اندر ایک نئی توانائی جنم لے رہی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر وہ ''گڑگڑا'' کر ناصر بھائی سے کچھ مانگیں گی تو وہ ہرگز بھی انکار نہیں کریں گے۔

اسی وجہ سے انہوں نے آج ندی کو اس وقت تک کمرے میں آنے سے منع کیا تھا جب تک ناصر بھائی اُن کے کمرے سے واپس نہ چلے جاتے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ندی سے اُن کا یہ فریاد کرتا لہجہ ہرگز برداشت نہیں ہو سکتا۔

مگر حیرت انہیں اس وقت ہوئی جب ناصر بھائی آج خالی ہاتھ ہی ان کے کمرے میں چلے آئے۔ نہ کوئی فائل اور نہ ہی بریف کیس۔۔۔ کچھ بھی تو آج ان کے پاس نہیں تھا۔

امی بیڈ پر بیٹھی ان کو بلاواسطہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

یقیناً وہ اُن سے کوئی بات کرنے آئے تھے مگر کیا۔۔۔

امی نے دل ہی دل میں اندازا لگایا۔

''پچھتاوے کا اظہار؟ شاید معافی؟

کیا واقعی آج ناصر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے؟ اسے اپنی بہن کی باتوں اور ماں کے آنسوؤں کے سچا ہونے کا اعتبار آ گیا ہے؟

صبح کا بھولا کیا واقعی شام کو گھر لوٹ آیا ہے؟''

اُن کے دل میں ناصر بھائی کے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر پل بھر میں جگہ بنا گیا تھا۔

بے شک یہی ماں کے رشتے کی لازوال سچائی ہے۔

بلاشبہ بہن بھائیوں کا رشتہ بھی اپنے اندر انوکھی کشش اور منفرد احساس رکھتا ہے مگر بہن بھائی آگے جا کر کئی نئے رشتوں میں بندھ جاتے ہیں، وہ محبت آپس میں برقرار نہیں رکھ پاتے جو ماں باپ کے ساتھ رہتے وقت ان کے دلوں میں ہوتی ہے۔ کبھی سسرال آڑے آتا ہے تو کبھی آگے جا کر اپنے ہی بچوں کی محبت بہن بھائیوں کے رشتے پر غالب آ جاتی ہے۔ بہن بھائی بعض اوقات ہمیشہ بہن بھائی ہی نہیں رہتے بلکہ نئے تعلقات اور رشتوں کے غلاف اوڑھ کر کبھی سمدھی تو کبھی جیٹھ جٹھانی۔۔۔

لیکن ماں باپ کا رشتہ دنیا کا واحد ایسا رشتہ ہے جو سو برس کی عمر ہو جانے پر بھی ہر اولاد کے لیے صرف ماں باپ ہی رہتا ہے۔

وہی لازوال پیار، بے لوث چاہت اور بے غرض

ام مریم

دعائیں۔

یہی وہ رشتہ ہے جو اٹھتے بیٹھتے بغیر کسی طمع ولالچ کے اپنی اولاد کے لیے دعائیں کرتے نہیں تھکتے۔

''امی۔۔۔!''

ناصر بھائی کے پکارنے پر امی خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئیں۔

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔''

دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑنے کے بعد دائیں ہتھیلی پر ہلکی سی برائے نام خارش کرتے ہوئے انہوں نے مدعا بیان کیا۔

''بات تو مجھے بھی تم سے کرنا ہے، بہت ضروری۔''

''لیکن پہلے تم بات کرلو، میں سن رہی ہوں۔''

''ہوں۔'' چند لمحے سوچ کی نذر ہوئے اور بالآخر ناصر بھائی نے امی کے کہنے کے عین مطابق اپنی ہی بات شروع کرنے کا سوچا۔

''جو بات میں آپ سے کرنے جارہا ہوں، اسے بڑے تحمل اور حوصلے سے سنیے گا اور پھر جذباتی ہونے کے بجائے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنا ردِ عمل ظاہر کیجیے گا۔''

ناصر بھائی کی تمہید نے امید کا پہلا کانچ توڑ پھینکا تھا۔

یعنی وہ جو معافی اور پچھتاوے کی خوش گمانی میں خوامخواہ انہیں معاف کر کے فوراً گلے لگا لینے کا ارادہ کیے بیٹھی تھیں ایسا کچھ نہیں تھا۔

ایک دبی دبی سی سسکی ان کے سینے میں اٹھی تھی۔

عرصے بعد بیٹے کو گلے لگا لینے کے منتظر بازو ایک دم ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

باہر آسمان پر شام کی اداسی میں نیا چاند طلوع ہو چکا تھا اور وہ بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہونے لگیں کہ صرف تمہید ہی سے جیسے ان کے دل پر گرنے والے آنسوؤں کی شدت سے ہونے والی بارش کی بدولت اتنے مرغزار اگ آئے تھے تو پھر جو بات وہ کرنے والے تھے اس کے حوالۂ سماعت ہونے کے بعد اس دل کا کیا بنے گا۔

''تم بے فکر ہو کر بات کرو۔۔۔ تحمل اور حوصلے کا تو اب تک تمہیں اندازا ہو ہی چکا ہوگا۔''

انہوں نے مضبوط لہجے میں بغیر کسی کپکپاہٹ یا کمزوری دکھائے جواب دیا۔

یوں بھی ایسے لوگوں کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کرنے کا کیا فائدہ، جو ہمیں کسی بھی طور طاقت دینے پر قادر نہ ہوں، اس لیے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی ہوگی کہ اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے خود کو کمزور ظاہر مت کیجیے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک مرتبہ خود کو کمزور ظاہر کر دیا تو ساری زندگی اسی احساس کے ساتھ جینا ہوگی۔ اس کے برعکس اللہ کے سامنے خود کو کمزور ظاہر کیا تو وہ آپ کی عاجزی پسند کرتے ہوئے اس قدر طاقت بخشے گا کہ لوگ آپ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے میں خود کو محفوظ خیال کریں گے۔۔۔ اور یہی میرا ایمان ہے۔

''دراصل میں اور عائشہ کافی دنوں سے اس مسئلے پر سوچ رہے تھے اور آخر کار ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس طرح زندگی گزارنا نہ ندی کے لیے ممکن ہے اور نہ ہم سب کے لیے۔''

ندی کے بارے میں سوچنے کا اختیار اور فیصلہ کرنے کا حق انہوں نے بنا پوچھے اور بغیر بتائے عائشہ کے اور اپنے ہاتھ میں لے کر امی کی اہمیت کو بالکل صفر قرار دے دیا تھا۔

''اس لیے ہم بہت جلد۔۔۔ یعنی کچھ ہی دنوں میں ندی کی شادی کر رہے ہیں۔''

امی کے چہرے پر پھیلتی پیلاہٹ ناصر بھائی ناخن سے دوسرا ناخن کھرچنے کے دوران دیکھ نہیں پائے تھے۔

ایک بم تھا جو ان کی سماعت پر پھوڑا گیا تھا، بائیں کہنی پر بوجھ ڈال کر انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھانا چاہا مگر کپکپاتے ہاتھوں کی لرزش سے گلاس پانی سمیت کارپٹ پر جا گرنے سے امی کے ہونٹوں سے ہلکی سی آہ نکلی۔

اسی وقت ناصر بھائی نے چونک کر انہیں دیکھا اور بجلی کی سی سرعت سے ان کی طرف لپکے۔

(باقی آئندہ)

فضا میں لیموں کے پھولوں کی ترش سی مہک پھیلی تھی اس کی سبز شاخوں میں سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیموں کے پیڑ نیا پھل دینے کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی گھٹنوں پر سر رکھے ان سنہرے پروں والی تتلیوں کا انتظار کرتی۔ جو ہر روز آتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے عمر کا بھی انتظار تھا جس نے جاتے سمے کہا تھا۔

"اگر مجھے دیکھنے اور ملنے کا دل کرے تو ایمانداری سے یاد کرنا۔" "میں آجاؤں گا۔"

اس نے نا صرف اسے یاد کیا تھا بلکہ وہ تو بہت شدتوں سے ہر سحر انتظار میں اس کے واپس پلٹ آنے کی بھی دل سے دعا کرتی تھی مگر۔۔۔ شام ڈھل رہی تھی۔ مسجدوں سے صلوۃ اور درود کی آوازیں لاؤڈ اسپیکر سے اٹھ رہی تھیں وہ ہمت جمع کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

نیم پختہ دیواروں کے پار نظر آتے کھیتوں کے وسیع سلسلے پہ ہر جانب ابھی بھی تیز دھوپ کی راجدھانی تھی، گاؤں کی جانب آتی ہوئی پگڈنڈی دور تک خالی تھی۔ اس کا دل پگڈنڈی کی طرح خالی اور ویران ہونے لگا۔ آنکھوں کی نمی پلکیں جھپک کر اندر اتارتی وہ کچن میں آگھسی۔ جہاں چولہے پہ سالن چڑھا ہوا تھا۔ اس نے کنستر سے آٹا نکال کر چھاننا شروع کیا۔ اندر اماں عصر کے بعد تسبیحات میں مشغول تھیں اور بابا ابھی دکان سے نہیں لوٹے تھے۔ اسے ان کی واپسی سے پہلے کھانا تیار کرنا تھا۔ اس کے باوجود کہ اب اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگتا تھا۔ وہ جاتے ہوئے اس کا چین سکون اور ساری خوشی بھی ساتھ لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
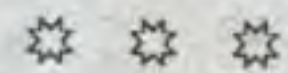
اس نے ہلکے سے دروازہ بجایا اور اجازت ملنے کا انتظار کیے بنا قدم اندر رکھ دیا۔ وہ اسے سامنے ہی نظر آگیا تھا۔ کرسی پہ بیٹھا ہوا میز پہ جھکا کچھ لکھنے میں مصروف۔۔۔ وہ اسے تکتی رہی۔ اس کی توجہ حاصل کرنے کی خواہش میں گمہائے ری یہ خواہشیں۔۔۔

"خیریت۔۔۔ ؟تم کیوں آئیں؟"

توجہ کی خیرات تو ملی تھی مگر لمحہ بھر کی۔ سوال میں البتہ بہت بے اعتنائی تھی۔ اسما کی جان جل کر خاک ضرور ہوئی مگر رواداری اور نسوانیت کے وقار کا تقاضا تھا کہ سارا غصہ پی جائے۔ ورنہ وہ یہ بھی جانتی تھی بالہا باری پر عمر ایسے ہی ماتھے پہ آنکھیں رکھ لیا کرتا تھا۔ جب اس سے کام ہوتا تو اس جیسا با اخلاق اور خوش مزاج دنیا میں دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مان، دھونس، منت، محبت، چاپلوسی تک اس پر ختم ہو جاتی۔ کتنا شوق تھا اسے کہ وہ کہانیوں کے ہیروز کی طرح ہوتا۔ خوددار، انا پرست اور مغرور مگر یہ تو ہر لحاظ سے الٹ تھا، سانولا رنگ، عام سے نقوش، درمیانہ قد، عام سا جسم، نہ بہت مضبوطی کا احساس دلاتا ہوا نہ بہت لمبا چوڑا مگر نخرے ان سب ہیروز سے سوا تھے۔ جن کو بہت حسرت سے سوچتی تھی وہ کہ عمر بھی ایسا ہی ہوتا۔

"چائے کا پوچھنے آئی تھی۔ بتادو اگر پیو گے۔ مجھ سے بار بار آگ نہیں جلتی۔"

اس نے بھی جواباً "لٹھ مار انداز اپنایا تھا۔ اونہہ، نہیں تو نہ سہی۔ اسے خود اس رشتے اور اس کی اہمیت کا احساس نہیں تو وہ کیوں دلائے۔ وہ نخوت سے سوچ گئی تھی۔

"یار پوچھنے کیوں آگئیں؟ سیدھی سیدھی بنا کر لے آتیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے شاعر اور ادیب چائے سے چلتے ہیں بالکل ویسے جیسے گاڑی سی این جی، پیٹرول ڈیزل سے۔"

"کیا۔۔۔ کیا کہا؟" وہ زور سے درمیان میں ہی چیخی۔ شدید صدمے کے باعث اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی ساکن ہو کر رہ گئی تھیں۔ آواز حلق سے پھنس کر نکلی۔ پانچ سالوں میں یہ تیسرا شوق چرایا تھا اسے، بیس سال کی عمر میں سنگر بننے کا تین سال اسی شوق کی تکمیل کے لیے خوب دھکے کھائے۔ جو جمع پونجی تھی اسی میں اڑا ڈالی کرایوں اور ہوٹلوں میں قیام کرتے کھانے کے بل بھرتے اسٹوڈیو کے باہر لائن میں کھڑے ہو کر قسمت کے مہربان ہونے کے انتظار میں اس خواری میں رنگت مزید جھلس گئی۔ تب یقین آسکا یہ اس کی قسمت میں نہیں لکھا۔

اس کے بعد وہ پینٹنگ پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ آؤٹ اسٹینڈنگ ہونا اسے شروع سے پسند تھا۔ جبھی تو وہ ہمیشہ ایسا کام کرتا تھا جس سے اسے یقین ہوتا وہ عنقریب شہرت کی بلندیوں کو جا چھوئے گا مگر سچی بات ہے ہوتا ہواتا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ہر بار چکنا چور خواب لیے واپس اس گھر کی دہلیز پہ آجاتا تو سائرہ (عمر کی چھوٹی بہن) اس کا مذاق اڑانا نہیں بھولتی تھی۔ ایک ہی فقرے کی تان اڑاتے ہوئے۔

"جھتے دی کھوتی اوتھے ان کھلوتی۔"

ایسے میں اسما اسے گھورتی۔ اماں دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر مسکراہٹ دباتیں۔ وہ بھی عمر کی ایسی سرگرمیوں کو سختی سے ناپسند کرنے لگیں۔ مگر پروا کسے تھی۔

"یہ انکشاف کب ہوا؟" وہ صدماتی آواز میں بولی۔

"کون سا؟" دوسری جانب بلا کی بے نیازی تھی۔

"یہی کہ تم میں ادیب یا پھر کسی شاعر کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔" جھنجھلاہٹ لہجے سے عیاں تھی۔

"یار اللہ کا شکر ہے میں نے ہمیشہ منفرد کام کیا ہے۔ مکمل طور پر آؤٹ اسٹینڈنگ پرسنالٹی ہے میری شہرت میرے نصیب میں لکھی ہوئی ہے بس مناسب وقت کا انتظار ہے۔"

وہ سابقہ جوش و خروش سے خود اپنی تعریفوں میں رطب اللسان مستقبل کی پیش گوئیاں کر رہا تھا پھر اسے دیکھ کر مسکراہٹ دبائی اور سائیڈ ٹیبل کی دراز کا دروازہ کھول کر ایک نوٹ بک نکالی۔ بلکہ اس کی جلد کے ساتھ ٹیپ سے چپکے صفحات کو احتیاط سے الگ کیا پھر اسے چمکتی نظروں سے تکتے ہوئے بول اٹھا۔

"یہ میری آنکھوں کا سنہرا خواب ہے اسما! دیکھو تم بھی۔ میرے خوابوں کی ہر تعبیر میں تم بھی شامل ہو تم سے چھپا نہیں میرا کوئی راز۔"

اس نے صفحات اس کے سامنے کر دیئے۔ اسما جو اس کی باتوں کے سحر میں گم تھی چونک کر متوجہ ہوئی یہاں اس کے ہاتھ کی تحریر موجود تھی۔

"نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر عمر آفاق گردیزی جن کی دل کو چھو لینے والی شاعری کے پہلے مجموعے "تم سے بچھڑ کے" نے تہلکہ مچا ڈالا کا تیسرا ایڈیشن عنقریب نئے سرورق کے ساتھ منظر عام پر آرہا ہے۔"

اسما نے نظریں اٹھا کر اس کے چمکتے چہرے کو بے حد تاسف کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گہرا سانس بھرا۔

"تم کیوں نہیں سدھر جاتے ہو عمر! کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔ پتا ہے بابا خفا رہنے لگے ہیں تم سے۔۔۔" وہ روہانسی ہوئی۔ عمر پر مجال ہے جو اثر ہوا ہو۔ ڈائری اسی انداز میں بند کر کے واپس دراز میں رکھنے لگا۔

"تم بابا کے ساتھ دکان پر کیوں نہیں جاتے۔ کل وہ کہہ رہے تھے کہ جب تک تم کوئی معقول کام نہیں کرو گے وہ شادی نہیں کریں گے تمہاری۔"

"میری شادی تو ہو چکی۔ یاد نہیں نکاح کر چکا ہوں تم سے اور اب جلدی کا ہے کی ہے تمہیں؟ مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہونے دو۔"

"کب ہو گے تم اپنے پیروں پر کھڑے؟ اور مجھے کوئی جلدی نہیں ہے شادی کی سمجھے؟" اسے غضب کا جلال آگیا۔

"جب میں اتنی نظمیں لکھ لوں گا جن کی کتاب چھپ سکے۔ تم دیکھنا کتنی پذیرائی ملتی ہے میری کتاب کو۔"

"ہاں اتنی ہی جتنی تمہاری پینٹنگز کو یا جتنی تمہاری گلوکاری کو۔" وہ جل کر بولی تھی۔ عمر نے جواباً اسے تادیبی نظروں سے گھورا۔

"شٹ اپ اسما! اگر تم اچھا نہیں بول سکتیں تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ بغیر لحاظ رکھے چیخا۔

"اللہ کرے میں واقعی دفع ہو جاؤں تمہاری زندگی سے تمہاری دنیا سے ہی۔"

☼ ☼ ☼

وہ خود کو بددعائیں دیتی وہاں سے چلی آئی۔

جھاڑو اٹھائے پائپ لگائے وہ دھلائی میں مصروف ہوگئی۔ آج بہت طوفان آیا تھا۔ آندھیاں چلی تھیں ایسی کہ درخت جڑوں سمیت اکھڑ گئے تھے۔ وہ کمرے میں بند اماں سے چپکی دہلتی رہی۔ چپکے چپکے آنسو بہائے گئی۔ وہ یہاں سے چلا گیا تھا مگر اس کے دل اس کے سوچوں میں ہنوز موجود تھا۔ جبھی تو ہر لمحہ اپنا احساس بخشتا تھا۔

"میں تو گاؤں کی زندگی یہاں کے ماحول اور رہن سہن سے ہی بے زار ہوں۔ بھاگ جانا چاہتا ہوں یہاں سے۔" تب بھی ایسی ہی شدید بارش ہو رہی تھی۔ جب وہ اس کے ہمراہ برآمدے میں کھڑا اپنے مخصوص انداز میں دھواں دھار بول رہا تھا۔

"میں تمہیں بھی یہاں سے لے جاؤں گا اسما! اک چھوٹی سی جنت۔۔۔ اور ہم دونوں۔"

"صرف ہم کیوں۔۔۔ اماں اور ابا بھی۔" اس نے برجستہ کہا تو وہ کھسیانا ہو گیا وہ اسے گھورنے لگی۔

"ہاں ہاں' اماں اور بابا بھی اور ہمارے پیارے بچے بھی۔" اب جھینپنے کی باری اسما کی تھی وہ اس کی گلابی رنگت کو لال ہوتا دیکھ کر حظ اٹھاتا ہوا قہقہے لگانے لگا تھا۔

"اف۔۔۔ کتنا شرماتی ہو تم۔ اس وقت شرمانا جب ہمارے بچے ہوں گے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"تمہارے خواب بہت اونچے ہیں عمر! اتنے بڑے خواب نہ دیکھا کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے اگر خدانخواستہ" وہ سہمی ہوئی کہنے کی کوشش کرتی مگر وہ بڑے آرام سے ٹوک دیتا۔

"ڈرامت کرو پگلی! میں ہوں نا سب ہو جائے گا ان شاء اللہ! ہماری گاڑی بھی ہوگی تم دیکھنا۔"

"کب۔۔۔ کیسے عمر؟"

"میں یہ نظمیں لکھ رہا ہوں نا کتاب چھپواؤں گا۔ بہت مشہور ہوگی دیکھ لینا۔ بس تم انتظار کرو ان ہی دنوں کا جب حالات بدل جائیں گے' جب بہت سارا پیسہ آجائے گا۔"

"خوشی' اطمینان اور آسودگی کے لیے بہت پیسہ ضروری تو نہیں عمر! ہم اتنے پیسے میں بھی خوش ہو سکتے ہیں اور۔۔۔"

"پلیز۔ اب تم یہ نہ کہنا کہ میں ابا کے ساتھ دکان پر جانا شروع کردوں۔ اسما یہ میرا اسٹینڈرڈ نہیں ہے۔ میں ایسا لائف اسٹائل پسند نہیں کرتا۔ تم نے غور کیا' سوچا؟ دنیا بھر میں جب بارش ہوتی ہے تو لوگ کتنا انجوائے کرتے ہیں۔ جبکہ یہاں انجوائے کرنے کی بجائے مصیبت سی ٹوٹ پڑتی ہے۔ ڈھور ڈنگر چھپر تلے کرنے کی مصیبت' ایندھن کو گیلا ہونے سے بچانے کے جتن' چارپائیاں بھیگنے سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد۔ اسما میں عمر بھر یہ نہیں کرنا چاہتا۔ کوشش سے قسمت بدل جایا کرتی ہے میں کوشش ہی کرنا چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو گی؟"

اس نے آس سے بھری آنکھوں کو اس کی نظروں سے چار کرکے سوال داغ دیا تھا۔ وہ اقرار نہ کرتی تو کیا کرتی کہ وہی تو اس کا سب کچھ قرار پایا تھا۔ دل کے بھی تمام بندھن اس سے بندھے تھے۔ پھر اس نے تو ساتھ دے دیا تھا مگر عمر کو بھی ساتھ نبھانا ہے وہ یہی اہم بات بھول گیا تھا۔

فرش دھلتا جا رہا تھا۔ گندے شاپر گارے سے لتے اور مٹی پائپ کی دھار کے ساتھ بہتا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا ساتھ ہی اس کی آنکھوں کا سیل رواں بھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا وہ خود بھی۔ بس عمر کے نہ ہونے سے کبھی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے بے دلی سے آنگن میں اڑتے خشک پتے جھاڑو سے اکٹھے کیے اور تار سے کپڑے اتارنے شروع کیے۔ صحن کی ٹونٹی خراب ہوئی تھی۔ ہر وقت پانی قطرہ قطرہ ٹپکتا۔ عمر سے اتنی بار کہا تھا پلمبر کو گھر بلا لائے مگر اسے کسی وقت فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ بابا دکان سے تھکے ہوئے گھر آتے تو اسے نظمیں لکھتے پاکر ان کا پارہ ہائی ہوتے دیر نہ لگتی۔ وہ کلستے ہوئے ڈانٹتے مگر

عمل ہے اس پر اثر ہو جائے۔ اماں اور سائرہ کی منت سماجت کے جواب میں کبھی وہ دکان پر چلا بھی جاتا تو بابا کی شکایتیں اس کے لیے مزید بڑھ جاتیں۔

"اسے گاہک سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ دکان داری کیسے چلائی جاتی ہے اس سیٹھ کو خبر ہی نہیں۔ کسی نواب کی اولاد ہے جیسے' اس سے تو بہتر تھا میری ایک اور بیٹی ہو جاتی۔"

وہ روہانسے ہو کر کہتے۔ اسما شاکی نظروں سے اسے تک کر رہ جاتی۔

"یار ابا بھی کبھی کبھی حد کر دیتے ہیں تمہارا حق مارنے کی۔" وہ اسے کاندھا مار کر بولا تھا۔ اسما نے اسے گھورا۔

"بدتمیزی مت کرو۔ انہوں نے میرا حق کبھی نہیں مارا سمجھے۔" وہ چیخی۔ بابا تایا تھے اس کے' امی بابا کے ایکسیڈنٹ میں ہونے والی موت نے اس خاندان کی کمر توڑ دی تھی۔ بابا اسے مستقل اپنے پاس لائے تو عمر کا اس سے نکاح کر دیا۔ ان کے خیالات ان کی سوچ یقیناً خیر خواہی کی تھی مگر عمر کے رنگ ڈھنگ انہیں اب مایوس کرتے جا رہے تھے۔

"تو یہ کیا ہے؟ میرے بجائے ایک اور بیٹی کے خواہش مند ہیں۔ پھر تمہاری شادی کس سے ہوتی؟ یہ رومنس کون کرتا تم سے؟" وہ ایک آنکھ دبا کر بولا تھا۔

اسما ——— سرخ پڑی تھی اس کی اس درجہ بے باکی و بے حجابی پر۔

"بکو مت' میں بیوی نہیں ہوں تمہاری! بہتر ہے ایسی باتوں سے اجتناب کیا کرو۔"

"منکوحہ تو ہو بیوی اور منکوحہ میں بہت زیادہ فرق تھوڑی ہوتا ہے یار۔"

وہ ڈھٹائی سے اپنے موقف پر جما رہتا۔ بابا اس کی انہی ڈھٹائیوں سے عاجز تھے۔ جب بھی اس سے منہ ماری ہوتی۔ وہ اسے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتے ہوئے سدھرنے کو کہتے مگر وہ سدھرا نہیں ہاں گھر سے ضرور نکل گیا۔ اس طرح کہ پھر زندگی میں کچھ باقی بچا ہی نہ تھا جیسے۔

☆ ☆ ☆

"اسما۔۔۔ اسما! کہاں ہو یار" وہ کچن دھو کر وائپر لگا رہی تھی جب عمر اسے پکارتا ہوا اندر آیا۔ اسما بری طرح جزبز ہوئی۔ برآمدے میں تخت پہ اماں اور سائرہ سلائی کا کام نبٹانے میں مصروف تھیں۔ کل آرڈر پورا کرکے دینا تھا۔ خود اسما بھی کام مکمل کرکے ان کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ اصولاً" وہ اب عمر کی ذمہ داری تھی مگر اس کی لاپروائی کے باعث شرمندگی کا احساس اسما کو ہوتا تھا۔ وہ بھی جانتی تھی بابا کی دکان سے آمدنی کتنی محدود ہے۔ اماں اور سائرہ سلائی کا کام اجرت پر کرتی تھیں۔ وہ بھی غیر محسوس انداز میں ہاتھ بٹانے لگی گویا عمر کے حصے کی مشقت خود کرنے لگی تھی۔

"تمیز سے بولا کرو عمر یہ یار وار کیا ہوتا ہے۔ اماں ہیں سائرہ ہے کتنا برا لگتا ہے۔" کن انکھیوں سے دروازے سے کام میں مصروف نظر آتیں اماں اور سائرہ کو تکتی ہوئی وہ تادیبی انداز میں بولی تھی۔

"اچھا خوامخواہ میرا موڈ خراب نہ کرو۔ بس میری نظم سنو ٹائٹل پوئم ہے۔" وہ پرجوش تھا۔

"ابھی نہیں عمر پلیز' ذرا فارغ ہولوں کام بہت ہیں آج۔ ابھی بابا کو کھانا بھی بھیجنا ہے۔ رکھا آتا ہوگا دکان سے۔" وہ آٹا چھاننے میں مصروف تھی۔

"میں لے جاتا ہوں ان کا کھانا۔ دراصل کاغذ ختم ہوگئے ہیں میرے۔ وہی لانے ہیں' سنو کچھ پیسے ہوں گے تمہارے پاس؟"

وہ پلاسٹک کا چھوٹا جگ اٹھا کر پانی لینے جا رہی تھی۔ رک کر اسے تکنے لگی۔

"وہ۔۔۔ یار اگر ابا سے مانگوں گا تو خوامخواہ ناراض ہوجائیں گے۔ مجھ پر گرم ہونے کا تو ویسے بھی بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔" سر جھکا کر کہتا وہ نہ شرمندہ تھا نہ خجل' اسما سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

"یار بیوی۔۔۔ نہیں منکوحہ کام کرتے تم نظم بھی تو سن سکتی ہو۔"

اس کے لفظ بیوی پر گھورنے پر وہ اٹکا اور خود ہی اپنی

کھینچ کر کے مسکرایا۔ اسما کو سرہلانا پڑا۔ عمر نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ نظم سنانی شروع کی تھی۔ اختتام پر داد طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ مگر اسما کے ہونٹوں پر مچلتی مسکان نے اسے حیران کر دیا۔

"کیا ہوا؟ جوک نہیں نظم سنائی ہے تمہیں۔" اسما کی مسکراہٹ اس کا موڈ خراب کرنے کا باعث بنی۔ جبھی تیکھے انداز میں ٹوکا۔ وہ اندر گئی اور واپس آکر بند مٹھی اس کی جیب میں کھول دی۔ وہ اس کی خودداری اور عزت نفس کی یونہی حفاظت کرتی پھرتی۔ دے کے جتلاتا تو دور وہ احساس بھی نہیں ہونے دیتی تھی۔

"اب کیا کہوں؟ رہنے دو خفا ہی ہو گے تم۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

"نہیں، نہیں تم کہو۔" وہ بضد ہوا۔ اسما نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تمہیں یہ کوشش ترک کر دینی چاہیے عمر! ادب پہ پہلے ہی کچھ کم برا وقت نہیں آیا ہوا۔"

"کیا مطلب؟" وہ بولا نہیں غرایا تھا۔ اسما ہنستے ہوئے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔

"تم سمجھو میں نے کچھ کہا ہی نہیں، ویسے بھی تم اپنی مرضی ہی کرتے ہو۔"

"تم جیلس ہو مجھ سے بس۔ دیکھنا جب میں فیمس ہو جاؤں گا تب تم ہی میرے پیچھے پھرو گی۔"

"ہاں۔۔۔ پتا نہیں کب آئے گا وہ وقت، کب دن بدلیں گے کب پیسے آئیں گے؟"

وہ متاسف تھی، دکھی تھی۔

☼ ☼ ☼

نیم کی چھاؤں میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ کچھ پیالے میں رکھے دانے سے اپنی طلب مٹاتی، کچھ پانی میں پر پھڑپھڑا کر نہانے میں مشغول۔ اس کی آنکھیں ہاتھ میں موجود میگزین میں چھپی تصویروں کو دیکھ کر نم ہوتی چلی گئیں۔ یہ سستا سا تیسرے درجے کا میگزین تھا جس میں غیر معروف شاعروں اور غیر معروف اداکاروں کے انٹرویوز چھپتے تھے۔ اسی میں عمر کی بھی تصویریں لگی تھیں۔ کوثر کا بھائی شہر سے بالخصوص ان کے لیے یہ رسالہ لایا تھا، صرف عمر کی وجہ سے جسے اماں نے نم آنکھوں سے دیکھا تھا جبکہ اسما کی تو آنکھیں کیا دل اور روح بھی جلنے لگی تھی۔ ٹائٹل پہ بھی وہی براجمان تھا اس ادھیڑ عمر کی شاعرہ کے ساتھ اور دوسرے صفحہ پر بھی اس کا انٹرویو اور تصاویر تھیں۔ وہ بے باک انداز میں جھک کر بیٹھی ہوئی تھی اور عمر سے۔ وہ بھی بہت عقیدت بھرے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ بقول اس کے وہ اس کی استاد تھی نا صرف شاعری کی اصلاح کرواتا بلکہ وہی تھی جس کی بدولت اس کی کتاب کی تین سو کاپیاں دھڑا دھڑ فروخت ہو گئی تھیں۔ انٹرویو پڑھتے وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس کا فگار دل کچھ اور مجروح ہوا تھا۔

سچ ہے ترقی اور کامیابی کے راستے لازمی نہیں سیدھے سبھاؤ ہی طے کیے جائیں۔ بے صبرے اور کمزور ایمان کے لوگ شارٹ کٹ بھی اختیار کرتے ہیں۔ اس بات کی پروا کیے بنا کہ نیک نامی، عزت و وقار اسی نفس پرستی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ اسے اس راستے پہ چلتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ اسے اسی گمراہی سے تو بچانا چاہتی تھی۔ پتا نہیں کتنا مشہور ہوا تھا، ہوا بھی تھا یا نہیں۔ اسے پتا تھا وہ کتنی مشکل سے فون کر پاتی ہے اس کے باوجود کال ریسیو نہ کرتا۔ اگر کبھی کر لیتا تو ڈھنگ سے بات کرنے کی فرصت نہ ہوتی۔ انداز کی عجلت یوں ظاہر کرتی گویا سارا پاکستان اس کے کاندھوں پر تو کھڑا ہے۔

"تم مشہور ہو کر بدل تو نہ جاؤ گے عمر؟" اس کی سماعتوں میں اپنی ہی آواز کی بازگشت گونجنے لگی اور آنکھ سے ایک آنسو پھسلتا گال پر آن ٹھہرا۔

"پہلے مشہور تو ہونے دو۔" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا تھا۔

"اور اگر تم بدل گئے۔۔۔؟" اس کی سوئی ایک جگہ پہ ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"تو پھر تم بھی مجھے بھول جانا۔" عمر دانت نکوسنے لگا اور اسما۔۔۔ اس نے بے دریغ اس کے کاندھے پہ مکوں کی برسات کر دی تھی۔

"ایسا کچھ سوچا بھی عمر تو یاد رکھنا۔ وہاں آکر جان لے لوں گی تمہاری۔"

"مجھے بھی پتا ہے تمہاری خونخواری کا۔ ایسی غلطی نہیں کروں گا باگڑ بلی!" وہ مسکراتا اور اسے تسلی دیتا۔

"لڑکیاں بھی تو شاعرہ ہوتی ہیں نا عمر!"

"ہاں ہوتی ہیں۔" وہ اپنے کام میں مصروف رہتا انداز سرسری ہوتا۔

"خوب صورت بھی ہوتی ہوں گی۔"

"بہو۔۔۔ بہت۔" وہ بہت کو لمبا کھینچتا اور آنکھ دبا کر مزا لیتا اس کی گھبراہٹ کا۔ وہ خفا نہ ہوتی البتہ متفکر ضرور ہونے لگتی۔

"مجھ سے بھی زیادہ؟" اس کی آنکھوں سے معصوم سی حیرانی جھلکنے لگی۔

"تم تو کچھ بھی نہیں ہو۔" وہ جان بوجھ کر اسے زچ کرنے کو غلط بیانی کرتا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ واقعی بہت حسین تھی۔ کانچ کی گڑیا جیسی نازک، بیلے کی کلیوں کی طرح ان چھوئی مہکتی ہوئی۔ میدے جیسی رنگت جو چھونے سے بھی میلی ہو جائے۔ یہ سچ تھا عمر نے اتنی جاذبیت، نزاکت اور دلکشی کبھی کسی میں یکجا نہیں دیکھی تھی۔ اس پر اس کی فطری معصومیت وہ اپنی تباہ کن دلکشی اور خوبصورتی سے لاعلم ہی تھی۔ اور لاعلم ہی رہتی اگر سائرہ اور عمر اس کی تعریفیں کر کے اس کو تھوڑا سا احساس نہ دلا دیتے۔

"پھر تو سن لو ادبی محفلوں میں تمہارے جانے پر پابندی۔ اگر جانا مجبوری ہے تو تم کسی بھی لڑکی کو نہیں دیکھو گے۔ یاد رکھنا کہ تم صرف میرے ہو عمر۔" اب کے اس کے لہجے میں دھونس تھی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"عمر تو بس ماروی کا ہوا تھا اور تم ماروی تو نہیں ہو۔" اسے ستا کر عمر کو مزا آتا تھا جبھی شرارت کو طول دینے لگا۔ اور وہ چلائے گئی۔

"اسما پتر۔ دیکھ آندھی آنے والی ہے بالن اندر کر لے میں بکریاں کھولتی ہوں۔"

اماں اسے پکار رہی تھیں۔ وہ چونکی مگر اٹھتے بگولوں اور فضا میں پھیلے غبار نے ہڑبڑا کے رکھ دیا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپلے سمیٹ کر ٹوکری میں ڈالنے لگی۔ فضا میں اڑتے گرد و غبار کے ساتھ خود اس کی آواز بھی ساتھ ساتھ ڈولتی پھر رہی تھی۔

"تم جتنے بھی مشہور ہو جاؤ عمر! لڑکیاں جتنا مرضی تم پہ مرنے لگیں۔ بس یہ یاد رکھنا کہ مجھے برا یہ نہیں لگے گا لڑکیاں کیوں تمہیں دیکھتی ہیں۔ مجھے برا یہ لگے گا کہ تم انہیں دیکھو گے۔" اسے لگ رہا تھا اس کی نصیحت یہیں رہ گئی ہے۔ عمر اگر اسے فراموش کر سکتا تھا تو اس کے نزدیک اس کی نصیحت بھلا کیا مقام رکھتی ہو گی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا ہے؟ اس طرح منہ لٹکا کر کیوں بیٹھے ہو؟" کمر پہ دونوں ہاتھ ٹکائے وہ جارحانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عمر نے اک نظر اسے دیکھنے پہ اکتفا کیا البتہ کہا کچھ نہیں۔

"بولو بھی۔" وہ چیخی۔

"تمیز سے بات کیا کرو۔ ماں نہیں ہو تم میری، اور ہو بھی بہت چھوٹی۔" وہ جھڑک کر غرایا۔ اسما ایک دم ساکن ہو کر رہ گئی۔ وہ معمول سے ہٹ کر سنجیدہ اور غصیلا تھا اور ایسا موڈ تب ہی ہوا کرتا جب اس کا دل کسی بھی وجہ سے دکھا ہوا ہو۔

"خیریت عمر! اداس کیوں ہو؟" وہ اس کے برابر مناسب فاصلہ رکھ کے بیٹھ گئی۔ انداز اپنائیت بھرا تھا عمر اسے دیکھتا رہا۔ اس کی مخملیں گلابیاں چھلکاتی رنگت، سیاہ گھنیرے بال اور جلد ایسی کہ روشنیاں پھوٹ رہی ہوں۔ وہ بہت حسین تھی۔ غیر معمولی حد تک جبکہ وہ اسی قدر عام سا انسان تھا۔ یہ احساس اسے ۔۔۔۔ دلانے والے دلا دیا کرتے ۔۔۔۔ اس کے دوست بھی بہت سفاک تھے۔

"کبھی میں سوچتا ہوں ابا نے عجلت میں فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں نہیں لگتا ہے اسما کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں؟" سوال ہوا تھا اور وہ ہونق رہ گئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو عمر؟ میں تو۔۔۔ ایسا کبھی نہیں سوچتی۔ اور کیوں سوچوں گی بہت اچھے لگتے ہو تم مجھے۔۔۔" وہ شاید اس کا مطلب سمجھ گئی تھی جبھی تو وضاحتیں دیتے پہلی بار اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔ مگر وہ کہاں اتنی جلدی مطمئن ہونے والا تھا۔

"ایسا کیا خاص ہے مجھ میں۔۔۔؟"

"عمر محبت یہ سب نہیں دیکھا کرتی۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد تمہارا نام اپنے نام کے ساتھ سنا۔ تم میرے نزدیک خاص اور اہم تھے۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

"تو کیا تم محبت کرتی ہو مجھ سے؟" مطمئن ہوا تھا جبھی شریر انداز میں اس پر گرفت کی۔

"تمہیں کوئی شک ہے؟" وہ اس کی شرارت نہیں سمجھی تھی جبھی سادگی سے اسے تکنے لگی۔

"بالکل شک ہے۔ کبھی منہ سے تو پھوٹا نہیں تم بھئی محبت ثبوت اور اظہار مانگتی ہے۔" عمر مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا۔

"اب کیسے ثبوت دوں میں تمہیں بھلا؟" وہ حیران نظر آنے لگی۔

"جیسے محبت کا اظہار کیا ہے ویسے ہی گلے لگا کر ثبوت فراہم کر دو۔" اب وہ کھل کر ہنس رہا تھا۔ اسما کی خفت اور شرم کا انت نہیں رہا۔ وہ اسے دونوں ہاتھوں سے گھونسے مارنے لگی۔

"بہت بدتمیز ہو تم اور کبھی بھی نہیں سدھرو گے۔" اس کے رخسار شفق رنگ کے ہو گئے۔ آنکھوں میں حیا کا خوبصورت رنگ تیرنے لگا۔ خمدار پلکیں عارضوں پہ بچھ گئی تھیں۔

"جیسے اظہار کروا رہا ہوں اسی طرح کسی دن تمہیں پتا کر یہ ثبوت بھی لے لوں گا وعدہ رہا۔" اس نے بہت اعتماد سے دعوا کیا تھا۔ اسما نے اسے جواباً آنکھیں دکھائیں۔

"منہ دھو رکھو' ایسی ویسی لڑکی ہی نہیں میں کہ یوں بے قابو ہو جاؤں۔"

"اس بات کی گواہی تو وقت ہی دے سکتا ہے۔" وہ کاندھے اچکا رہا تھا۔

"میں ہار رہی ہوں عمر! ٹوٹ رہی ہوں' پلیز لوٹ آؤ۔ اگر یہ میری آزمائش ہے تو ختم کر دو اسے۔" وہ سسک رہی تھی' وہ تڑپ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اسما۔۔۔ اسما کہاں ہو تم؟" وہ چیختا ہوا کمرے میں آن گھسا تھا۔ وہ سوئچ بورڈ والی دیوار کے ساتھ کپڑا بچھائے کپڑے استری کر رہی تھی۔ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ فرش پہ اس کے ساتھ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"اک بات مانو گی؟" وہ جھجک کر اسے تکنے لگا۔

"کیا بات؟" اس نے حیرانی سے اس کے گریز کو محسوس کیا۔

"مجھے کہیں سے کچھ پیسے ادھار مانگ کے لا دو۔ اپنی سہیلیوں سے۔۔۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا تھا۔ اور اسے امید افزا نظروں سے تکنے لگا۔ جو قدرے خفا لگنے لگی تھی۔

"تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟" وہ متاسف اور شاکی ہونے لگا۔

"میری سہیلیاں بھی میرے جیسی ہیں عمر! جانتے تو ہو تم۔" وہ مایوس اور دل گرفتہ تھی پھر ذرا چونکی۔

"کتنے پیسے چاہئیں۔۔۔؟"

"پچاس ہزار" ادھر جواب تیار تھا۔ اسما کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ کچھ بول نہ سکی۔

"اتنے پیسے۔۔۔؟ کیا کرو گے ان کا؟" وہ بھونچکی سی پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے نا اسما! میرے نزدیک میرے خواب کتنے قیمتی ہیں مگر میں نے سب پہ سمجھوتہ کیا اور خود کو سمجھا لیا مگر یہ خواب۔۔۔ اسما اگر یہ ٹوٹا تو خود بھی ٹوٹ جاؤں گا میں۔ ساری معلومات لے لی ہیں میں نے' اک پبلشر مان گیا ہے کتاب چھاپنے کو مگر پچاس ہزار کا بندوبست۔۔۔"

"ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔ پھر عمر خود سوچو اس کا فائدہ کیا

ہو گا؟" وہ سمجھانا چاہتی تھی۔

"کیوں نہیں ہو گا؟ میں عنقریب معروف شعرا کی طرح عوام کے دل میں دھڑکوں گا۔ براہ مہربانی تم روڑے نہ اٹکاؤ' ان مشہور لوگوں نے بھی پہلا قدم ایسے ہی اٹھایا تھا۔ جبھی آج نامور ہیں۔" وہ برا مان کر ٹوکتے ہوئے بول رہا تھا۔ اسما نے سرد سانس بھرا۔ وہ بے بس لگنے لگی تھی۔

"لیکن عمر اگر کتاب کو پذیرائی نہ ملی تو پچاس ہزار۔۔۔"

"تم منحوس باتیں نہ کرو تو بہتر ہے۔ یہ میری زندگی موت کا معاملہ ہے۔ مجھے چاہے لوٹ مار کر کے کیوں نہ کرنا پڑے یہ کام!" وہ بدمزگی سے چیخا اور اٹھ کر چلا گیا۔ اسما سناٹے میں گھر گئی تھی۔

"یہ رکھ لو تم۔" اگلے تین دن وہ اٹوائی کھٹوائی لیے کمرے میں بند پڑا رہا تھا۔ کھانا پینا جیسے نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ وہ بھی یہ قدم نہ اٹھاتی اگر یہ شخص اسے اتنا عزیز نہ ہوتا۔ وہ نہیں چاہتی تھی خواہش کی تکمیل اسے غلط راستوں پر چلائے۔

"کیا ہے یہ؟" وہ ابرو تان کر ناگواری سے پوٹلی کو تک رہا تھا۔

"کھول کر دیکھ لو' تمہارے کام کا انتظام کرنے کی کوشش کی ہے۔" اس نے نرمی سے کہتے پوٹلی اس کے سرہانے رکھ دی۔ عمر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے پوٹلی کھل چکی تھی۔ گلابی کپڑے پہ سنہرا کنگن چمک رہا تھا۔ عمر کی آنکھوں میں چمک اور تحیر اک ساتھ اترا۔

"یہ۔۔۔؟"

"میرا ہے۔۔۔ مطلب امی کا زیور۔ جو انہوں نے میری شادی کے لیے بنایا تھا۔ اس پہ صرف میرا حق ہے۔ اسے میں اپنی مرضی سے استعمال کر سکتی ہوں۔ میرا خیال ہے یہ پچاس ساٹھ ہزار کا بک جائے گا۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھی۔ لہجے میں کوئی ملال نہیں تھا۔ البتہ اس کی خوشی پوری کرنے کی طمانیت ضرور تھی۔

"تھینکس۔۔۔ تھینکس اسما۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر لبوں سے چھوا۔ انداز میں عقیدت بھری ہوئی تھی۔

"تم بہت خاص ہو اسما! تم نے ثابت کیا ہے کہ تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے۔" وہ ممنونیت سے کہہ رہا تھا۔ اسما نم آنکھوں سے مسکرانے لگی۔

"تھینکس کی ضرورت نہیں ہے عمر! تم سے بڑھ کر نہیں ہے یہ زیور۔"

"لیکن اماں۔۔۔ وہ تو کچھ نہیں کہیں گی؟"

"جب تک انہیں پتا چلے گا تمہارا کام ہو چکا ہو گا۔ میں طریقے سے انہیں سمجھا لوں گی۔ عمر میں نہیں چاہتی ہوں اس کام کی تکمیل کی خاطر تم کوئی بھی غلط کام کرو۔ وعدہ کرو اگر پھر بھی تم مشہور نہ ہوئے تو اسے اپنی قسمت سمجھ کر سمجھوتہ کر لینا سراب کے پیچھے نہ بھاگنا۔"

وہ جتنی سنجیدہ تھی اس سے کہیں بڑھ کر بلجی۔ مگر وہ اسی قدر خوش بھی تھا اور خوش گمان بھی۔ "ایک بار پھر بہت شکریہ اسما! تم دیکھنا میری کتاب ضرور کلک کر جائے گی۔ پھر بس میں تمہیں سونے میں تول دوں گا۔ بالکل شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ بس۔۔۔ بس پیسے آنے دو' دن بدلنے دو۔" وہ گنگنانے اور ہنسنے لگا۔ اسما بھی ہنس دی تھی۔ اس کے لیے یہی بہت کافی تھا کہ عمر کی اداسی دور ہو گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

"بلاؤ اس نانہجار کو مجھے ہر صورت اپنی بچی کی زندگی کا فیصلہ کرنا ہے۔ غضب خدا کا اس نے تو حیا شرم ہی مار ڈالی۔ سائرہ کی شادی کو بھی تین سال ہو گئے دو بچے ہیں اللہ کے فضل و کرم سے اور اسما کا نکاح تو بہت پہلے کا ہوا ہے۔"

وہ کمرے میں دبکی بیٹھی بابا کو گرجتے سن رہی تھی۔ آج ان کا قہر پھر ٹوٹا ہوا تھا۔ اور اس کا دل دہلا جاتا تھا۔

"ابھی وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کہہ رہا تھا ابھی اپنا نام بنائے گا۔" اماں اپنی جگہ دکھی تھیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کہو اس بے شرم سے کہ فارغ کردے میری بیٹی کو، رشتوں کی کمی نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کررہے ہیں خدا نا خواستہ؟ آجائے گا۔ میں خود بلاؤں گی اسے آپ غصہ نہ کریں۔" اماں بھی سہم گئی تھیں ان کے ارادے اور عزائم جان کر۔ اس بات سے تو بہت اچھی طرح آگاہ تھیں صرف عمر نہیں اسما بھی ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔ دونوں ہی اک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اور وہ ان کے دل اجاڑنے کے حق میں کیسے ہوجاتیں' اولادیں تھیں وہ ان کی۔

"کوشش کرو کیونکہ وہ نہیں آنے والا اور بات سنو اگر وہ اب بھی نہ سدھرا اور اپنے لچھن نہ چھوڑے تو میں ہرگز اپنی دھی اس کے حوالے نہیں کروں گا۔ میرے بھرا کی ایک نشانی ہے۔ قیامت کے دن نظریں نہیں ملا سکوں گا میں اس سے۔ اس عمر کمینے نے تو مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔"

ان کی اپنی آواز بھی بھرا گئی تو وہاں سے اٹھ گئے اور ایک بار پھر عمر کا نمبر ڈائل کرتی اسما کی انگلیاں اکڑنے لگیں۔ مگر وہ فون نہیں اٹھاتا تھا' پھر اس کا نمبر بند ہونے کی ٹیپ چلنے لگی۔ اسما کو لگنے لگا جیسے واقعی اب وہ اس سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ یہ احساس یہ سوچ اتنی تکلیف دہ تھی کہ اس کی آنکھوں کی جلن بے تحاشا بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

پھر کتاب چھپ گئی وہ خوشی سے ناچتا پھرتا تھا۔ صاحب کتاب ہونا اس کا ارمان تھا بلکہ جنون۔ جو پورا ہوا تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگا' فضاؤں میں تیرنے لگا۔ زمین اور زمین والوں سے تو اس کا ہر تعلق ہی ختم ہوگیا تھا۔ مگر چار دن کی تھی یہ چاندنی۔ پھر خمار اترنے لگا۔ پبلشر نے صرف کتاب چھاپی تھی۔ پانچ سو کی تعداد کا یہ ایڈیشن عمر صاحب کے گھر پہنچ چکا تھا۔ اب یہ اس کی دردسری تھی کہ وہ اپنی بک شاپس تک پہنچاتا یا گھر میں ذخیرہ کیے رکھتا۔ دور نزدیک کے دوستوں کو بھی دے کر تھک گیا۔ خریدنے پہ کوئی آمادہ نہیں تھا مفت تحفہ سمجھ کر ہر کوئی ہنس کر رکھ لیتا مگر اک اور بھی تو حسرت تھی جو دل میں دبی تھی مدح سرائی کی' ستائش کی۔ کتاب کا تحفہ بٹورنے والے یار دوستوں نے یا تو پڑھی نہیں تھی اگر پڑھی تو وہ باادب نہیں تھے۔ جبھی تو اس کی کتاب کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرتے اور ہنسی اڑاتے تھے۔

وہ کس سے جھگڑتا کس کس کو سمجھاتا۔ ایسے میں پھر اسما ہی تھی جو آگے بڑھی اور اسے شہر میں بک شاپس پر جاکر کتابیں رکھنے کا مشورہ دیا۔ صرف یہی نہیں وہ اس کے ساتھ خود کتابیں لے کر بھی خوار ہوئی۔ مگر عالم یہ تھا کہ دکان دار ان کی بات بھی سننا گوارا نہ کرتے نئے شاعر کو کون پوچھتا ہے' نئے شاعر کو کون پڑھنا چاہتا ہے۔ یہ تھا باہر کا رسپانس اور گھر کی صورت حال یہ تھی کہ ابا اس پچاس ہزار کے ڈھیر کو قبرستان میں دفنانے کے نادر مشورے دیا کرتے تھے۔

ایسے میں جب ہر سو مایوسی تھی امید کا اک تارہ جگمگا اٹھا۔ یہ جاتی سردیوں کی گلابی شام تھی جب اس کے سیل پہ انجان نمبر سے کال آئی۔ کرنے والی خاتون تھیں جو بن بن کر بولتی تھیں اور اسے کتاب کی اشاعت پر مبارک باد سے نواز رہیں تھیں شاعری کی تعریف کررہی تھیں۔ اور عمر۔۔۔ وہ تو بے ہوش ہی ہونے لگا۔ خوشی بے قابو' اشتیاق' انتہا کو پہنچا ہوا۔ خمار' بے خود کردینے پہ آمادہ۔ محترمہ نے بتایا تھا کہ انہوں نے میگزین کے ایڈیٹر سے اس کا نمبر حاصل کیا ہے اور کتاب سے استفادہ کیا۔ وہ خود بھی شاعرہ تھیں اور صاحب کتاب بھی۔ انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے لاہور میں عنقریب منعقد ہونے والے اپنے مشاعرے میں اسے بھی دعوت دی تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ عمر سر کے بل تیار ہوا۔ پھر بات صرف فون پر رابطے اور مشاعرے میں شرکت تک محدود نہ رہی۔ وہ مختلف تقریبات میں ملتے اور اک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ وہ عمر رسیدہ عورت جو دیکھنے میں اس کی ماں لگتی تھی مگر اسے دوسری نظر سے دیکھتی تھی۔ اسے کامیابی کے یقین دلاتی نئے نئے راستے دکھائی۔ اسما کی نصیحتیں' اماں کی منتیں اور ابا کی ناراضی و ڈانٹ سب بہت پیچھے رہ گئے۔ وہ آگے۔۔۔ بہت آگے کا سفر طے کرتا چلا گیا۔ اور اک دن وہ بھی آیا جب اس نے اس گھر کو چھوڑ دیا اور مستقل لاہور رہائش اختیار کرلی۔

☼ ☼ ☼

اس سے فون پر رابطہ نہیں ہوپایا تھا۔ اماں خود اسے لینے جارہی تھیں مگر ابا کے ساتھ نہیں' سائرہ کا شوہر شاید ساتھ تھا۔ بابا تو اتنے خفا تھے کہ صاف انکار کردیا تھا۔ اسما کا دل تو جیسے خزاں کی زد پہ آیا ہوا کمزور پتہ تھا۔ ہر دم کانپتا ہر لحظہ لرزتا ہوا۔ ساری امیدیں خوف کی چادر میں جا چھپی تھیں۔ اسے کامل یقین تھا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اگر آبھی گیا تو اسے نہیں اپنائے گا۔ کیا اس سے بہتر نہیں تھا وہ نہ آتا۔۔۔۔ مگر یہ وہ باقیوں کو کیسی سمجھاتی۔ اور پھر وہ آگیا۔ اماں سرشار جبکہ شاہد بھائی مطمئن تھے۔ اسماء خوش کیسے ہوتی اسے تو عمر کی بے گانگی اور چپ مارے ڈالتی تھی۔ اماں کا خیال تھا وہ سدھر گیا' ابا البتہ ابھی بھی مشکوک تھے۔

پھر آنا" فانا" ان کی شادی طے ہوگئی وہ چاند رات تھی جب وہ اماں کے کمرے سے رخصت ہوکر سادگی کے ساتھ عمر کے کمرے میں بھیج دی گئی۔ اس کا دل اس ارمانوں بھری رات میں بھی واہموں اور خدشوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ خاموش کیوں تھا؟ وہ کچھ بولتا کیوں نہ تھا۔ وہ آخر اب کیا کہے گا اس سے؟ کتنے سوال تھے جو اسے خوش نہیں ہونے دے رہے تھے۔ پھر دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اگلے لمحے وہ اس کے روبرو تھا۔ ویسا ہی خاموش' گم سم اور کھویا ہوا۔ اسما منتظر رہی وہ کچھ کہے مگر وہ لب بستہ تھا۔ اس نے لانبی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ پہلے سے کمزور ہوگیا تھا۔ رنگت بھی جھلسی ہوئی لگتی تھی۔ آنکھوں میں اداسی کا گہرا تاثر اسما کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ اسے کیسے بتاتی وہ اسے اداس نہیں دیکھ سکتی۔

"عمر۔۔۔ کیا ہوا؟"

وہ اٹھ کر اس کے قدموں میں آبیٹھی۔ چوڑی کھنکی، پازیب بجی کمرے کے ماحول میں ہر سو اس کی جھرنے جیسی آواز کا سرگم بکھر گیا۔ وہ چونکا اور اسے خالی نظروں سے تکنے لگا۔

"تم خفا ہو گی مجھ سے۔۔۔ مجھے۔۔۔ معاف کر دو۔ اسما میں نے تمہارا دل دکھایا۔" اسما تڑپ سی گئی اور شدت سے سر کو نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ پلیز!"

"وہ بہت جھوٹی تھی میں اسے سچی سمجھا۔ لوگ بہت مکار ہیں۔ دغاباز وہ مجھ سے نظمیں لکھواتی اور خود اپنے پاس محفوظ کر لیتی۔ میں اس کی چال کو سمجھ ہی نہ سکا۔ وہ ایسے ہی نئے آنے والے شاعروں کا کلام اپنے نام سے چھپواتی اور پیسے بٹورتی۔ میں اس کی سازش سمجھ نہ سکا جب سمجھا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔"

"چلو دفع کرو لعنت بھیجو۔" اسما نے نرمی سے اس کا ذہن بٹانا چاہا۔ وہ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"اس نے میری ساری کتابیں اپنے پاس رکھ لیں۔ بلکہ ضائع کر دیں۔ اسما پچاس کے پچاس ہزار ڈوب گئے اور میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کوئی ثبوت نہ دے سکا تمہیں اپنی محبت کا۔" وہ روانکھا ہو رہا تھا۔ اسما نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے تھپتھپایا۔

"کوئی بات نہیں عمر! مجھے پچاس ہزار ضائع جانے کا دکھ نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم صحیح سلامت لوٹ آئے۔" وہ بے حد اعلا ظرفی سے بولی۔ عمر اسے دیکھتا رہ گیا۔ عقیدت سے محبت سے۔ وہ شرمائی اور اس کی لانبی پلکیں جھک گئیں۔ عمر کے انداز میں پھر دکھ اترنے لگا۔

"میں نے تمہیں ایسے بیاہنے کا نہیں سوچا تھا اسما! کہ تمہیں دینے کو ایک انگوٹھی تک نہیں میرے پاس۔" وہ متاسف اور ملول ہو رہا تھا۔

"تم مجھے اپنی کوئی نظم سنا دو۔ میری رونمائی گفٹ کے طور پر مجھے ہمیشہ فخر رہے گا اس گفٹ پہ۔" اس کی بات نے ثابت کیا تھا اس کا دل بھی بڑا ہے اس کے ظرف کی طرح مگر وہ جیسے چونک گیا تھا۔

"نہیں نظم نہیں، میں اک ناول کا پلاٹ تم سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے اسما! مجھے لگتا ہے میں بہت بہترین ناول لکھ سکوں گا اور مزے کی بات یہ کہ ناول کی کتاب شائع ہونے پر پیسے بھی نہیں دینے پڑتے رائٹر کو بلکہ پبلشر خود پیسے دیتا ہے مصنف کو یعنی ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے۔ تم دیکھنا میں ناول نگاری میں کتنا نام کماؤں گا۔ میری دھڑا دھڑ کتابیں آئیں گی۔ میرے پڑھنے والوں کا کوئی شمار نہیں ہو گا پھر میں تمہیں زندگی کی سہولت دوں گا۔ بنا کے تم شہزادی کی طرح رہو گی۔ بس۔۔۔"

وہ پھر اس جوش و خروش سے بے تکان بول رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک، چہرے کی رونق بحال ہوتی جا رہی تھی۔ اور اسما۔۔۔ اسے پہلی بار اس کی یہ پلاننگ بری نہیں لگی، غصہ نہیں آیا۔ وہ بہت توجہ سے سنتے اس کے تھم جانے پر چونک اٹھی تھی۔

"بس۔۔۔؟" اس کی نظریں سوالیہ تھیں مگر شرارت سے لبریز جواباً" وہ مسکرایا اور شریر انداز میں اس پر جھک کر گنگنایا تھا۔

"بس۔۔۔ پیسے آنے دے، دن بدلنے دے۔" اسما بھی زور سے ہنس پڑی اور اس کے ساتھ ساتھ گنگنانے لگی۔

ہاں ہاں پیسے آنے دے
دن بدلنے دے۔

اور اس کا دل ان شاء اللہ کی گردان کر رہا تھا۔ وہ اس کی خواہش کی تکمیل کی ہمیشہ کی طرح اب بھی خواہش مند تھی۔ اور عید کا چاند مسکراتا ہوا ان کی طمانیت کا مظاہرہ دیکھتا چپکے سے اپنے سفر کی تکمیل میں آگے بڑھ گیا۔ ہر سو خوشی تھی محبت تھی جس نے ہر دل خوشی سے لبریز کر دیا تھا۔

☆ ☆

دیا شیرازی

آج صبح سے ہی مہمانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ چائے بنا بنا کر اور کھانا مہمان خانے میں بھیج بھیج کر کمر اکڑ گئی تھی۔ کب دوپہر ڈھلی کب شام کے سائے پھیل گئے اسے پتا ہی نہ چلا مغرب کی اذان ہو رہی تھی وہ آخری مہمان بھی نبٹا کے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی صبح سے بمشکل چند نوالے ہی کھا پائی تھی۔ اس نے بچا کھچا سالن نکال کے دیگچی ایک طرف رکھی اور وہیں باورچی خانے میں پیڑھے پہ بیٹھ کے کھانا کھانے لگی۔ تب ہی شہاب شاہ گھر میں داخل ہوا۔

"اسلام علیکم اداسائیں۔" اس نے دوپٹہ درست کرتے سلام کیا۔ شہاب کی تیوری پہ بل بدستور پڑے رہے اس نے ایک نظر بہن پہ ڈالی اور بغیر کچھ کہے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔ ضوفی نے جلدی جلدی باقی کا کھانا ختم کیا اور چائے کا پانی رکھنے لگی جانتی تھی ابھی چائے کا حکم صادر ہو گا اور تھوڑی سی تاخیر بھی شہاب کے غصے سے حویلی کے در و دیوار کو ہلا دے گی۔ اسے خود سے زیادہ اماں کی فکر تھی اس بڑھاپے میں بھی وہ جوان بیٹے سے ڈرتی رہتی تھیں کیوں کہ غصہ کسی پر بھی ہو گھوم پھر کے آخری نشانہ اماں ہی بنتی تھیں کیوں کہ وہ اکثر اس کے دفاع کے لیے آگے بڑھتی تھیں۔

اماں کو ضوافشاں سے بہت پیار تھا۔ وہ تھی بھی تو ایسی ہر وقت کام میں لگی رہتی ہر وقت دوسروں کے دکھ میں کڑھتی رہتی۔ شہاب کے غصے سے ڈری سہمی ضوفی بچپن میں ہی باپ کی شفقت سے محروم ہو چکی تھی وہ شہاب شاہ سے آٹھ برس چھوٹی تھی اور اکثر شہاب شاہ کے عتاب کا شکار رہتی تھی ضوفی کو جب بھی ڈانٹ پڑتی اماں اسے بچانے کو آگے بڑھتیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کی خاطر خواہ مدد نہیں کر پائیں گی سوائے اس کے کہ توپوں کا رخ اپنی طرف موڑ لیں۔

اپنے ہاتھوں سے پال پوس کر جوان کرنے والے بیٹے کے منہ سے غلیظ الفاظ سن کر دل خون کے آنسو روتا تھا لیکن وہ ضبط کر کے سنتی رہتی تھیں۔ اس نے اکثر اماں کو بہت اداس اور متفکر دیکھا تھا کبھی کبھار وہ کہہ دیتیں۔

"ضوفی مجھے تیری بڑی فکر ہے میرے بعد تیرا کیا ہو گا۔" اس کا دل ڈوبنے لگتا پتا نہیں اماں ایسی باتیں کیوں کرنے لگی تھیں۔ شاید مسلسل بیماری اور دکھ نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ وہ خاموش رہتی کہنے کو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہتی اپنے بارے میں اماں کے بارے میں' ایسی ہی سوچوں کے سرے تھامے کبھی کبھی وہ بہت دور نکل جاتی تھی۔

بچپن کا دور کسی ٹی وی وڈیو کی طرح آنکھوں کے سامنے لہرانے لگتا۔ بہت سے چہرے حسین مسکراہٹیں اس کے اردگرد جمع ہونے لگتیں۔ ہنستی مسکراتی بات بے بات ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے والی رانو اور موٹی موٹی اداس آنکھوں والی موی' وہ تینوں ساتھ کھیلتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھروندے، جو وہ تینوں اوڈ ذات کی عورتوں سے چاول اور پرانے کپڑوں کے عوض لیا کرتی تھیں ان کی کل کائنات ہوا کرتے تھے۔

مٹی کے گھر کو دیکھ کر ہمیشہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ چھوٹی سی گڑیا بن جائے اور اس گھر کے اندر چھپ کے بیٹھ جائے وہاں اسے کوئی ڈھونڈ نہ پائے۔ کتنا سکون کتنا امن تھا چھوٹے سے گھر کے اندر وہ آہ بھر کے رہ جاتی

رانو اور موی دونوں اس کی چچا زاد بہنیں تھیں دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رانو جتنی ہنس مکھ موی اتنی ہی سنجیدہ وہ جب بھی ان کے گھر جاتی موی کو اکثر اداس آنکھوں سے آسمان کو گھورتے پاتی جانے کیا تلاش کرتی رہتی تھی وہ اس کھلے آسمان میں موی کو یوں دیوانوں کی طرح آسمان کو گھورتے دیکھ کر کبھی کبھی اسے ڈر لگنے لگتا تھا کہیں موی پہ کسی بھوت کا سایہ تو نہیں ہو گیا بڑی پھوپھو کی طرح۔

ان دنوں ضوفی کو ہر بیماری بھوت کا سایہ ہی لگتی تھی کسی کے سر میں درد ہو کسی کی آنکھیں سرخ ہوں یا گلا بیٹھ جانے سے آواز میں بدلاؤ آیا ہو وہ اسے ان دیکھے بھوت سے ہی منسوب کرتی تھی جس کا نام لینے سے

ہی اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اس نے ایک دن رانو سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس کی بات سنتے ہی رانو حسب معمول ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"دیکھو ضوفی آج مجھے تو بتایا ہے اور کسی سے اپنے عظیم خیالات کا ذکر مت کرنا۔ کیوں کہ موی تو کسی بھوت پر سوار ہو سکتی ہے کوئی بھوت موی پر سوار نہیں ہو سکتا۔" اپنی اس بے تکی مثال پر پھر ہنسنے لگی اور ضوفی حیرت سے اسے دیکھنے لگی اسے رانو کی بات بالکل سمجھ نہیں آئی تھی۔

منظر کچھ بدلتا ہے اس کی آنکھوں میں الہڑ سی رانو اور اداس موی جوانی کی دہلیز پہ کھڑی ہیں۔ موی کی آنکھوں میں اب صرف اداسی نہیں اس کے ساتھ آنسوؤں کی ہلکی نمی بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ کسی بے حد پیاری چیز کو نا پا سکنے کی اذیت بھی ان آنکھوں سے مترشح ہوتی نظر آنے لگی۔ وہ رانو کے پاس بھاگی آئی۔

"تم نے دیکھا ہے رانو موی کچھ بدلی بدلی سی لگتی ہے آج کل مجھے لگتا ہے کچھ ہوا ہے۔"

"ہاں... اور اگر تم کچھ اور غور سے دیکھتیں تو ان آنکھوں میں تمہیں اپنا جواب بھی مل جاتا۔" رانو نے بڑے سنجیدہ انداز میں جواب دیا جو ضوفی کو بالکل سمجھ نہیں آیا اسے اپنی طرف گھورتا پا کر رانو پھر بولی۔

"دیکھو ضوفی تم ہر بات کو دیکھتی ہو محسوس کرتی ہو لیکن سمجھ نہیں پاتیں موی کی آنکھوں میں اگر نمی دیکھ ہی لی ہے تو اس نمی میں تیرتی تصویر کو بھی دیکھنے کی کوشش کرو۔"

"کیسی تصویر... کس کی تصویر؟" وہ حیرت زدہ ہو گئی۔

"ناصر کی..." رانو اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"ناصر...؟" ضوفی نے اپنے دماغ پہ بہت زور دیا لیکن ایسا کوئی نام اسے یاد نہ آیا۔ رانو کے رلی بناتے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے اب وہ کچھ سنجیدہ نظر آنے لگی۔

"شہر سے نیا آیا ہے یہاں گڈو کے اسکول میں ماسٹر لگا ہے۔" رانو نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"لیکن موی نے اسے کہاں دیکھا اور کیا وہ بھی موی سے۔" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔ کچھ باتیں اپنے ادھورے پن میں بھی اتنی مکمل ہوتی ہیں کہ انہیں پورا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

"آیا تھا یہاں گڈو کا پوچھنے گڈو بڑے ادا کے ساتھ شہر گیا تھا بابا زمینوں پر تھے' موی پوچھنے چلی گئی۔" رانو کے کام کرتے ہاتھ پھر رک گئے۔

"ضوفی... تم اسے سمجھاؤ... سید زادیوں کی شادیاں غیر مردوں کے ساتھ نہیں ہوتیں' اگر بابا کو پتا چل گیا نا..." وہ سراسیمہ نظر آنے لگی۔ اپنی بات مکمل کرنے کی خود اس میں بھی ہمت نہیں تھی۔ اس کی ادھوری چھوڑی ہوئی بات ضوفی نے پوری سنی تھی ایک ایک لفظ اور ہر لفظ کی کاٹ دار سچائی' اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

منظر پھر بدل گیا اس کے سامنے گھر عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ بہت ساری عورتیں ایک ساتھ رو رہی تھیں بین کر رہی تھیں اور ان آوازوں میں کہیں سے ایک ہنسی کی آواز آنے لگتی خوفناک ہنسی... انتقام کی آگ میں بھڑکتی ہوئی ہنسی گو اس نے اس آواز کو پہلے کبھی ہنستے نہیں سنا تھا لیکن وہ جانتی تھی وہ موی کی آواز تھی قریب سے کہیں ابھرتی ہوئی وہ بھی اپنی ادھ کٹی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ عورتوں کی آوازیں پھر منظر پر چھا جاتیں وہ رو رہی تھیں اپنی بے بسی کی فریاد کر رہی تھیں۔

ضوفی نے سامنے چارپائی پہ لیٹی موی کی طرف دیکھا وہ اب بھی آسمان کو گھور رہی تھی۔ لیکن اب ان آنکھوں میں اداسی نہیں تھی خوف تھا' موت کا خوف۔ اسے اپنے پورے وجود پہ ویسا ہی خوف چھاتا محسوس ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور ساتھ بیٹھی رانو کو دیکھا جو غائب دماغی میں اپنے ہی ہاتھ کی بنائی ہوئی رلی کے ڈیزائن پر انگلی پھیر رہی تھی اس کے آنسو

خشک تھے۔ اس رلی کو اس نے بڑے شوق سے اپنے جہیز کے لیے بنایا تھا اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے وہ موسیٰ کی ادھ کٹی لاش کو چھپانے کے لیے بنا رہی ہے تو وہ اسے کبھی نہ بناتی اس رلی کے ٹکڑے کر دیتی لیکن آہ انسان اپنے آنے والے وقت سے کتنا بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کاتب تقدیر نے اس کی معصوم بہن کی تقدیر لہو رنگ روشنائی سے تحریر کی تھی۔

منظر پھر بدل گیا۔ قدرت کے بھی عجیب کھیل ہوتے ہیں جسے کفن کی ضرورت تھی اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ کاری کا کوئی کفن نہیں ہوتا اور آج دلہن بنی رانو سر تاپا کفن میں ملبوس تھی۔ ضوفی کھڑکی کے قریب ہی کھڑی تھی کہ بارات آگئی ستر سالہ دولہا کو گھوڑے سے اتارنے کے لیے دو آدمی آگئے بڑھے وہ سہم کر پیچھے ہٹی تھی کھڑکی کے دونوں پٹ بدستور کھلے تھے لیکن اب کوئی امید کی کرن تازہ ہوا کا جھونکا اندر نہیں آنے والا تھا۔ اس نے کچھ الجھی کچھ احتجاج بھری نظر پلنگ پر بیٹھی رانو پر ڈالی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، وہ اتنی ہی ساکن تھی جتنا رات کا پچھلا پہر اس کے چہرے پہ کوئی تاثر کوئی سوال باقی نہ تھا۔ اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

Life is not a bed of roses. اس نے ایک مرتبہ رضیہ باجی سے سنا تھا۔ وہ ان دنوں چھپ چھپ کر رضیہ باجی سے کتابیں پڑھتی تھی لیکن زندگی اتنی تلخ اتنی سفاک بھی تو نہیں ہوتی جتنی ہماری رسموں نے بنا رکھی ہے۔

"باجی کیا سید زادی ہونا بہت بڑا جرم ہے لوگ ہمیں جینے کیوں نہیں دیتے۔ اسلام معاشرہ، قانون، رسمیں، رشتے، والدین کس کس زنجیر سے باندھا نہیں گیا ہمیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے میری زندگی کہیں گروی رکھ دی گئی ہے تو میں کبھی پیدا نہ ہوتی لیکن انسان کو یہ بھی اختیار کہاں ہے۔ زندگی بوجھ بنتی جا رہی ہے۔"

رضیہ باجی حیرت سے اسے دیکھتیں۔

"ضوفی تم اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھتی ہو۔" ادا جاتے اور وہ دونوں کتابیں چھپا کے رلی کے ڈیزائن میں گم ہو جاتیں۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ رلی بنائی جا رہی ہے۔ یہ سلسلہ تین سال چلتا رہا ابھی شاید اور چلتا جب ایک دن اچانک شہاب شاہ وہاں نہ پہنچتے سبق دوہراتی اس کی زبان گنگ رہ گئی تھی اور پھر وہ طوفان اٹھا کہ الامان..... اس کی جان سے عزیز کتابیں کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں۔

سی..... اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ اسے تھپڑ پڑنے پر اتنی اذیت نہیں ہوئی تھی جتنی کتابوں کے پھٹنے پر ہوئی تھی۔ بے بسی ہتک اور احساس شرمندگی وہ کس کس احساس کو دباتی دہکتے چہرے پر آنسو بڑے تو جیسے تھر کی پیاسی زمین پر بارش کی بوندوں نے جل تھل مچایا ہو۔ اللہ سے پھر شکوے بڑھنے لگے تھے۔ وہ واپس حال میں لوٹ آئی سفر لمبا تھا تھکن بھی اتنی تھی وہ اماں کے ساتھ ہی تخت پر بیٹھ گئی۔

"اماں ایک بات پوچھوں۔" وہ دونوں ہتھیلیاں سامنے پھیلا کر ان میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

اماں نے اس کے الجھے پن کو محسوس کیا۔

"پوچھو میری دھی۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"اماں یہ زندگی کیا ہے؟ ہمیں کیوں ملتی ہے یہ زندگی جب یہ ہماری اپنی بھی نہیں ہوتی۔ ہم اپنی زندگی خود کیوں نہیں جی سکتے اماں..... ہماری زندگی ہمیشہ ہمارے بھائی اور باپ کیوں جیتے ہیں۔" سالوں سے جمع کیا ہوا لاوا ایک دم سے پھٹ پڑا تھا جیسے۔

"تم تو کہتی ہو اللہ بہت انصاف والا ہے۔ پھر یہ سب کیوں....."

"نا بیٹا ایسا نہیں کہتے یہ سب تو لوگوں کے اپنے کرم ہیں اللہ نے تو یہ سب نہیں کہا وہ تو بڑا رحیم و کریم ہے۔"

"تدبیر اور تقدیر کے بیچ انسان کہاں پایا جاتا ہے جب تدبیر کی ترغیب دی گئی ہے تو تقدیر کیوں..... کیوں ہر جگہ تقدیر آکر ہمیں بے بس کر دیتی ہے۔" وہ سخت تھکی اور الجھی ہوئی لگ رہی تھی جیسے بہت لڑ چکی ہو خود سے۔

"دیکھو بیٹا تدبیر ہم کرتے ہیں پھر جو تقدیر میں ہو وہ ہمیں مل جاتا ہے اور جس میں ہماری بھلائی نہیں ہوتی وہ لاکھ کوشش کرنے کے بعد بھی نہیں ملتا۔ انسان کم عقل اور کم علم ہے اسے اپنے برے کا پتا نہیں ہوتا یہ تو اوپر والا بہتر جانتا ہے کہ جو ہوا اس میں کیا بھلائی پوشیدہ تھی۔"

"اماں اللہ سائیں نے عورت کو اتنا بے بس کیوں بنایا ہے وہ مرد کی طرح طاقت مند جرات مند کیوں نہیں ہے اور اگر ہمیں کمزور بنا کر ہماری رسیاں مردوں کے ہاتھوں میں تھمائی ہیں تو ہمیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کیوں دی، صرف اذیت ہی ملتی ہے ہمیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"ضوفی تو کیسی باتیں کرنے لگی ہے..... کیا ہو گیا ہے تجھے؟" وہ متفکر نظر آنے لگیں۔

"میں تھک گئی ہوں اماں دوسروں کے ہاتھوں بجنے والی ڈگڈگی پر ناچ ناچ کر میرے پاؤں لہولہان ہو گئے ہیں۔" وہ دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ چھپائے رونے لگی۔ اماں نے اس کا چہرہ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں لے لیا۔

"تو اس لیے تھکی ہے ضوفی کہ تو اللہ سے بہت بدگماں رہی ہے۔ اس بدگمانی نے تجھے تھکا دیا ہے۔ پگلی تجھ سے کس نے کہہ دیا ہے کہ اللہ نے ہماری ڈوری مردوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے۔ یہ سب انسانوں کا اپنا کیا دھرا ہے وہ تو بہت مہربان ہے۔ وہ تو سخت اور تلخ لہجے میں گفتگو کرنے سے بھی منع کرتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ عورتوں کے معاملے میں مجھ سے ڈرتے رہو ان کے بارے میں سختی سے پوچھ گچھ کی جائے گی۔

اگر یہاں عورت پر ظلم ہوتا ہے تو یہ مردوں کا اپنا نتیجہ عمل ہے اور اس کے بارے میں ان سے پوچھ گچھ ہو گی جزا و سزا مقرر کی جائے گی۔ اللہ سے اتنی بدگمانی اچھی نہیں ضوفی جاؤ جا کر سجدے میں گر کر معافی مانگو رحم کی بھیک مانگو اپنے لیے وہ بہت مہربان ہے معاف کر دے گا تمہیں۔"

دھند کے بادل چھٹنے لگے تھے ساری بدگمانی آنسوؤں میں بہہ گئی تھی۔ وہ جو ہر الزام اللہ پہ ڈال دیتی تھی اب سمجھی تھی کہ یہ سب تو اللہ کے پیغام سے دوری کا نتیجہ تھا، اس کے حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا۔ وہ سجدے میں گر پڑی اسے آج سارے گلے شکوے دور کرنے تھے۔

☆ ☆

حنا یاسمین

اللہ کے رنگ

ایک لمبی سی جمائی لیے وہ اوپر ورزش کے غرض سے آیا تھا۔ سفید ٹی شرٹ کے اوپر آرکسٹرا بجانے والوں کا ایک گروہ بنا ہوا تھا۔ گرمی سے بے حال اور لوڈشیڈنگ سے بے زار، اوپر سے چینلز کی بھرمار۔

دماغ صبح کی ہلکی سرخی اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے بھی ترو تازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ خیال تو یہی تھا کہ ایروبک کی چند مشقیں کرنے پر آج یوگا کے آسن جمانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا ورنہ دماغ ریلیکس ہو جاتا اور وہ ایک نکتے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر کے بڑے اچھوتے آئیڈیاز ذہن میں لا سکتا تھا۔

ابھی اجالا ہلکی نیند میں تھا۔ صبح اپنی بھرپور انگڑائی لیتی تو سفیدی ہر سو چھا چکی ہوتی۔ گرمیوں میں تو دن ویسے بھی جلدی نمودار ہو جاتا تھا۔

چڑیوں کا ایک غول چیں چیں کر کے سر کے اوپر سے گزرا۔ وہ ایروبک کی چند مشقیں دہرا کر اب سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تانکا جھانکی والی عادت نہ ہوتے ہوئے بھی بس یوں ہی ارد گرد نظریں دوڑانے لگا۔

دائیں طرف والی لان کے دوسرے گھر کی بالکونی پر موجود وہ لڑکی نماز سے فارغ ہو کر اب بڑے خضوع خشوع کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی۔ آنکھوں سے پھوٹتی آبشار اور ناک سے بہتا پانی وہ سوں سوں کر کے دوپٹے کے کونے سے پونچھے جا رہی تھی۔ بڑی دلجمعی اور بڑی دلگرفتی کے ساتھ وہ مسلسل گڑگڑا کر کچھ مانگ رہی تھی۔

آف... میں نے تو آج نماز بھی نہیں پڑھی۔" دماغ نے سرزنش کی۔

"پڑھی ہی کب ہے؟ رمضان میں؟ وہ بھی کبھی کبھار... جمعہ کی نماز؟ وہ بھی جب شوٹ نہ ہو... عیدین کی نماز؟ ہاں جی... وہ تو بڑی خوشی سے پڑھی جاتی ہیں۔" اب دل بھی آئینہ دکھانے لگا۔

بندہ کہیں نہ کہیں سے کوئی اچھی بات لے نہ لے، دل اور دماغ کے ہزاروں آئینے انسان کو اس کا اصل چہرہ دکھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ بس آئینوں پر پڑنے والے عکس کو کبھی تکبر کی مٹی گرد آلود کر دیتی ہے تو کبھی دنیا کی جگمگاہٹیں بصارت چھین لیتی ہیں پھر عکس پر نظر ڈالنا بھی کون گوارا کرے۔

اب وہ اس حالت کو دماغ کے پردہ خانے سے جھٹک کر دوسرے نہج پر سوچنے لگا۔

"ویل... بس یہی چہرہ تو چاہیے اس کے اگلے ڈرامے کے ایک مرکزی کردار کے لیے... بالکل کریکٹر بھی اس پر سوٹ کرے گا... ایسی ہی بی بی رانی چاہیے... سائیڈ رخ سے لڑکی خوب صورت بھی لگ رہی ہے۔ باقی کمال میک اپ آرٹسٹ کر دے گا... آج کل تو کوئی مسئلہ ہی نہیں... وہاں عام سے چہرے میک اپ آرٹسٹ کے ہتھے چڑھ کر خاص ہو جاتے ہیں... یہ لڑکی پھر بھی اچھی خاصی پیاری لگ رہی ہے۔"

ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تھا۔

اس نے نیچے جاتے ہی صائم کو کال کی تھی۔

"یارا! مجھے رائحہ کے کریکٹر کے لیے لڑکی مل گئی۔"

"ہیں؟ شکر ہے۔" دوسری طرف سے پہلے حیرانی اور پھر طمانیت کا اظہار ہوا۔ سر عثمان کو تو کوئی چہرہ بھا ہی نہیں رہا تھا۔

"کہاں سے ملی؟ کدھر رہتی ہے۔" صائم کی جان چھوٹی تو خوشی سے پوچھنے لگا۔

"خلا میں رہتی ہے۔ ابھی زمین پر ایلین اسے چھوڑ کر گئے ہیں۔" وہ چڑ گیا تھا۔ کیونکہ ابھی معاملہ آدھا تھا۔ جبکہ آدھی بات اور ادھورے یقین پر دل کو اطمینان نہیں دلا دینا چاہیے۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" وہ حسب توقع چڑ کر بولا۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ سر عثمان کے زیر عتاب تھا۔ جبکہ عمران کا کام اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا تھا۔ صرف کاسٹنگ صائم کو سونپی گئی تھی۔ مگر جتنی صائم کی ہو چکی تھی وہ خود ہی اس کی مدد کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ رائحہ کے کردار کے لیے کوئی چہرہ ہی نہیں مل پا رہا تھا۔ جو بھی وہ دونوں ڈھونڈتے سر ایک منٹ میں انکار کر دیتے

اتنے دنوں سے نجل خواری ہو رہی تھی۔

"یار! سر کو عثمانیہ دور کی کوئی دوشیزہ چاہیے۔ معصوم' پاکیزہ چہرہ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ گول چہرہ۔ ستواں کھڑی ناک۔ بس ایسی عزبنیں ہی ہو سکتی ہیں۔ لڑکی نے کبھی ہلکنگ نہ کروائی ہو۔ بندہ پوچھے کہ لڑکی شوبز میں آجائے اور ہلکنگ نہ کروائے۔ اسٹرینج بلکہ فنی۔ ایسی مزاحیہ باتیں سر عثمان ہی کر سکتے ہیں۔" صائم کے ڈھونڈے گئے چہروں کو جب پے در پے ریجیکشن برداشت کرنی پڑی تو اس نے جل بھن کے عمران کے آگے غصہ نکالا تھا۔

"یار! وہ لڑکی سول سوسائٹی کی ہے۔ شوبز سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ میں نے صرف چہرہ دیکھا ہے۔ پتا نہیں وہ کس طرح کی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ مانے گی بھی کہ نہیں۔" عمران کی وضاحت نے صائم پر پھر سے مایوسی طاری کردی۔

"لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" اس کی امید افزا بات پر اس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

اگلا مرحلہ ان کی توقع سے بھی دشوار تھا۔ پہلا مشن تو ان محترمہ کا گھر ڈھونڈنا تھا۔ قابل ذرائع کے مطابق یہ اس کے انکل کا گھر تھا جہاں اسے پہلی دفعہ دیکھا گیا۔

خیر گھر ڈھونڈ ہی لیا۔ وہ بھی عمران کی مہربانی تھی۔ ورنہ سر عثمان کے ہاتھوں دبے دبے طنز سن سن کر صائم ویسے ہی ہلکان ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دنیا میں کچھ لوگ بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ اتنے عجیب کہ آپ سمجھ نہیں پاتے کہ عجائبات سے لدی دنیا میں ان کی کیا ضرورت ہے؟ یوں لگتا ہے کہ تاریک رات کی کوئی سیاہی اجالوں کی سرزمین پر آگئی ہو۔ سیاہی رہتی ہے۔ اپنے پر پھیلاتی ہے۔ بے ہنگم بیل کی طرح چیختی ہے۔ روٹھے چکور کی طرح پھڑپھڑاتی ہے۔ لیکن اس کی ساری محنت رائیگاں چلی جاتی ہے۔ سیاہی کے مقدر میں یہ طے ہوتا ہی نہیں کہ وہ اجالوں میں مدغم ہو سکے۔ وہ اپنے اصل سے کیسے ہٹے؟

اس کی ماں اس عمر میں بھی اتنی خوب صورت تھی کہ اس کی خوب صورتی ان دونوں بہنوں کو بھی مبہوت کردیتی۔ اتنی بڑی بڑی موٹی۔۔۔ چمک دار آنکھیں۔۔۔ جب وہ اپنی لمبی پلکیں اٹھاتیں تو انہیں لگتا ماں کی آنکھوں کی روشنی نے ان کی زندگی کی تلخیوں کو دھو ڈالا ہو۔ اس کے خوب صورت بھرے بھرے سرخ ہونٹ اور صاف' بے داغ چمکدار جلد جس سے نیلی نیلی باریک رگیں صاف نظر آتیں۔ مناسب قدو قامت اور سراپے نے انہیں ایسا بنا دیا تھا کہ کبھی کبھی سحر کے منہ سے نکل جاتا۔

"آپی! اماں کیسی ریاست سے بھاگی ہوئی شہزادی تو نہیں؟"

جہاں صورت پیاری وہاں سیرت۔۔۔ لوگ ہرنی سی آنکھیں' یاقوتی ہونٹ۔۔۔ گلابی رنگت کو کیا دہراتے۔۔۔ مگر اخلاق و کردار وہ آبگینے تھے۔ جن سے ظاہر کی خوب صورتی بھی ماند پڑ جاتی۔ صبر۔۔۔ حوصلہ۔۔۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی فکر میں سرگرداں عورت۔۔۔ اور۔۔۔ کس کے ساتھ۔۔۔؟"

انسان کو کبھی مکمل۔۔۔ چیز نہیں ملتی۔ ہر چیز سے اسے آزمایا جاتا ہے۔۔۔ تب احساس ہوتا ہے کہ دنیا آزمائش کی آماجگاہ ہے۔ جہاں زبان کی حرکت اور آنکھ کے اشارے پر بھی آپ کو آزمایا جاتا ہے۔ آپ کی ہنسی۔۔۔ آپ کا رونا۔۔۔ آپ کا سراپا۔۔۔ ہر حرکت۔۔۔ ہر جنبش آپ کو آپ کے وجود کے لیے امتحان میں ڈال رہی ہے اور امتحان کی مدت کتنی ہے؟ "عمر کی مدت تک؟" عمر تمام۔۔۔ تو سکون میسر۔۔۔ یا پھر چند لمحے یا چند گھنٹے۔۔۔ چند گھنٹوں کی کسوٹی پر جو پرکھ ہو رہی ہے۔ وہ تو قابل برداشت ہے۔ لیکن اگر عمر بھر کے لیے پرکھا جائے۔۔۔ وہ اذیت۔۔۔ شاید دنیا کی ساری ڈکشنریاں بھی کھنگھال لی جائیں تو اس درد کا' اس اذیت کا اظہار کرنے کے لیے کوئی لفظ نہ ڈھونڈ پائیں۔

"مشعل آپی! میں نے پانچ سو روپے جوڑ لیے ہیں۔ ہم آج چلیں لنڈا بازار؟"

"ہاں مگر پہلے مشین لگا کر میرے ساتھ کپڑے دھلوا

دو۔ ورنہ اماں خود ہی شروع ہو جائیں گی۔ آج صبح سے ان کے بازو میں درد ہو رہا ہے۔"

"پھر تو وقت زیادہ ہو جائے گا۔" وہ اپنے چھوٹے سے لیدر کے کالے پرس پر گن کر پیسے رکھتی فکر مندی سے بولی۔

"نہیں بس زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔ آج سعد نے مجھے ہزار روپیہ بھی دیا ہے۔ گھر کے لیے کچھ راشن بھی لاتا ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے' پھر شروع کرتے ہیں کام۔" وہ راضی ہو گئی۔

مشعل نے مشین سیڑھیوں کے نیچے سے نکال کر تھوڑی صحن میں کرلی۔ وہ نائیلون کی بوریوں کو جوڑ جوڑ کر بنائی گئی شیٹ نکال لائی۔ وہ ٹب ٹونٹی کے قریب کھینچ کر وہ لکڑی کی پیڑھی پر بیٹھی۔ پائپ لگا کر پہلے نائیلون کی بوری والی شیٹ دھو کر بچھائی۔

"تم! ابا کے کپڑے بھی لے آؤ۔" وہ مشین سے کپڑے نکالتی سحر سے بولی۔

"بس کردیں آپی! ہر دفعہ منگواتی ہیں۔" وہ بے زار ہوئی۔

"یہ ہمارا فرض ہے۔" وہ حسب معمول اماں کی کاپی تحمل سے بولی۔

"آپ اپنا فرض نبھاتی رہیں۔۔۔ پر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ابا اپنا سرف کا پیکٹ لا کر نہار منہ اپنے کپڑے دھو چکے ہیں۔"

سحر کی بات سن کر وہ آہ بھر کر رہ گئی۔ امید بھی یہی تھی۔ وہ بس سوچ ہی سکی۔

"آپ تایا ابو کی طرف گئی تھیں' کوئی کام بنا؟" وہ سفید کپڑے رنگ دار کپڑوں سے علیحدہ کرتے ہوئے بولی۔

مشعل صابن کاٹتے کاٹتے ایک دم ساکت ہو گئی۔ صرف اسی ایک سوال سے بچنے کے لیے وہ کل رات سے جان بوجھ کے کسی نہ کسی کام میں مشغول رہی۔

بہر حال وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جب تک سحر کو جواب نہیں دے گی' تب تک وہ سوال پہ سوال کرتی رہے گی۔

"گئی تھی تو انہوں نے بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔۔۔ کھانا کھایا' نماز پڑھی۔۔۔ پھر واپس آگئی۔" وہ بڑے مگن انداز میں کہتی صابن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ایک تھیلی جو کپڑے کی بنائی گئی تھی' میں ڈال کر مشین کے اندر پھینک چکی تھی۔ ایک دفعہ مشین کو بغیر کپڑے ڈالے خالی ہی پانی اور صابن ڈال کر چلا دیا گیا۔ صابن سے اٹھتے جھاگ اور مشین کے پانی سے بنتے گول گول چکر۔۔۔ سحر کا دماغ اس کی بات پر یوں ہی چکرا گیا۔

"آپی! پیسوں کا پوچھا ہے؟ یہ نہیں پوچھ رہی کہ آپ نے ادھر کیا' کیا کام کیے۔"

مشعل ٹونٹی سے ہاتھ دھو کر سیدھی ہو گئی۔

"مجھ سے پیسے مانگنے کی ہمت ہی نہیں ہو سکی۔" بالآخر اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کر ہی لیا۔

"کیوں؟ آپی! میرا ایڈمیشن۔۔۔؟"

اس کی بات سن کر وہ دکھ سے ٹھہر ٹھہر کے بولی۔

"سحر! اللہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔ اصل میں جن کو بیٹھا ہوا بندہ نظر نہیں آرہا۔ اسے کھڑے ہو کر کیا دکھانا؟ اپنے منہ سے مانگنے پر اٹھائے جانے والی شرمندگی اور خودداری پر پڑنے والی ضرب سے بہتر ہے۔ بندہ صبر کرلے۔۔۔ ویسے بھی سعد کو ایک ہوٹل میں نوکری مل رہی ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو تمہارا اسی سال ایڈمیشن بھیج دوں گی۔۔۔ ورنہ اگلے سال پیپرز دے لینا۔"

"آپی! پورا سال ضائع کروں۔ ایف اے کر لیتی تو کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل جاتی۔۔۔ کسی گلی محلے کے اسکول میں۔۔۔" "اچھا! کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔"

اس سے زیادہ اس نے خود کو تسلی دی۔

سحر کے چہرے کی جگمگاہٹیں مدھم ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"اف۔۔۔ یہ گھر ہے؟" گھنٹہ بھر سے وہ دونوں اس گلی میں خوار ہو رہے تھے۔ پرانی' بوسیدہ لکڑی کا

دروازہ۔ جس کا رنگ روپ کب سے کھو چکا تھا۔ غالباً" اس گھر کا گیٹ تھا۔ جس کو کھٹکھٹانے پر سفید لباس اور ٹوپی میں ملبوس عام سے نقوش والا ایک درمیانی عمر کا شخص باہر آیا تھا۔ یہاں آنے کی اور دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت تو کر لی تھی۔ لیکن اب دونوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہیں بات سنورنے کی بجائے بگڑ نہ جائے۔ یہ بڑے میاں ان پر برس ہی نہ پڑیں۔

وہ شخص بغیر بولے ٹکر ٹکر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم جی۔۔۔ میں عمران اور یہ میرا دوست صائم۔۔۔" عمران نے ہی بوکھلاہٹ میں تعارف کروایا۔ جیسے بڑے میاں کو دلچسپی ہو' ان کے متعلق کہ وہ کون ہیں؟

"ہمیں اصل میں اس ڈرامے کے لیے کچھ سلجھی ہوئی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔" تھوک نگلتے اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ جیسے لڑکیوں کی نہیں 'کسی اشتہاری کمپنی کے لیے پروڈکٹس کی ضرورت ہو جبکہ صائم متوقع بے عزتی کے ڈر سے دائیں سے بائیں گلی میں پھیلے کچرے کی طرف بڑی بے چارگی سے دیکھ رہا تھا۔

"میں کیا کروں؟" بڑے میاں نے منہ بنا کر پوچھا۔ لہجہ اتنا سپاٹ اور بے لچک تھا کہ دونوں کی بولتی بند ہو گئی۔

"آپ کے گھر میں جو ایک لڑکی ہے۔ شاید آپ کی بیٹی لگتی ہو۔۔۔ یا کوئی بھتیجی 'بھانجی' دراصل وہ مناسب چہرہ ہے ہمارے ڈرامے کے لیے۔"

عمران نے جی کڑا کر کے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ اب دھلائی ہو یا نہ ہو۔۔۔ آخر یہ موقع بھی تو نہیں گنوایا جا سکتا تھا۔

صائم نے متوقع بے عزتی کے ڈر سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی بجائے یوں پھاڑ لیں۔ جیسے ابھی باہر کو گول گول ڈیلے نکالنے کا ارادہ ہو۔

وہ شخص خاموشی سے باہر نکل آیا۔ دونوں سٹپٹا کر پیچھے ہٹے۔ "بھا۔۔۔ گ۔۔۔" اس سے پہلے کہ صائم پورا لفظ بول پاتا۔ انہیں حیرت کا جھٹکا اتنا زور کا لگا جیسے کسی نے پانچ سو وولٹ کا کرنٹ لگا دیا ہو۔ وہ شخص اسی سپاٹ خاموشی کے ساتھ ان کی سائیڈ سے نکل کر گلی کے دائیں طرف ناک کی سیدھ پر چلا گیا۔

عمران کی رکی ہوئی سانس خارج ہوئی۔ جبکہ صائم نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا۔

"ڈر تو ہم یوں گئے تھے۔ جیسے مار پڑے ہی والی ہو۔" عمران کھسیا کر بولا۔

"یار! یہ کوئی ویسے ہی ان کے گھر آیا ہو گا۔" صائم نے منہ بنایا۔

"چلو دروازہ بجاؤ۔"

اور عمران نے ایک بار پھر دستک دی۔ اس دفعہ ایک معقول صورت لڑکی باہر آئی۔

"جی' کس سے ملنا ہے آپ کو۔" وہ لڑکی بھی سخت لہجے میں ہی بولی۔

سلیقے سے سر پر جمایا دوپٹا ذرا بھی نہیں پھسل رہا تھا۔ انداز مودب' پر لہجہ سخت تھا۔

"اب جن سے ملنا ہے ان کا نام تو نہیں آتا۔ صرف چہرہ یاد ہے۔ آپ سے بھی کافی ملتا جلتا ہے۔" صائم نے بغیر تذبذب کے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ سراسیمگی بھی پھیل گئی۔

"محترمہ گھبرائیں نہیں' ہم ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تخریب کار نہیں۔" عمران نے اسے تسلی دی۔

"ایک منٹ میں آتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر پھر لکڑی کے اس بوسیدہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ "یار یہ کن احمقوں سے واسطہ پڑ گیا ہے۔" صائم جھنجلا کر بولا۔

جبکہ میں بھی گرمی کی شدت سے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھنے لگا۔ پھر اسی رومال سے خود کو ہوا دی۔ وہ لڑکی تو یوں غائب ہوئی تھی کہ جیسے اشتہاری مجرموں کو دیکھ لیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہو ہی گئی۔

"آیئے پلیز' میرے ساتھ اندر۔۔۔" وہ اب کی بار قدرے شائستگی سے بولی۔ وہ ہمیں ایک بڑے سے کمرے میں لے گئی۔ پورا کچا مٹی کا صحن پار کر کے ہم اس مستطیل کمرے میں آئے تھے۔ جہاں زمین پر قالین بچھا تھا اور سائیڈ پر دیوار کی طرف لکڑی کے دو بیڈ' جن پر ہاتھ کی کڑھائی کی قالین سے ہم رنگ چادریں ڈالی گئی تھیں پڑے تھے۔ پلاسٹک کی ہم رنگ کرسیاں اور میز۔۔۔ ڈائریکٹر کی نظر مشاہداتی اعتبار سے بڑی وسیع ہوتی ہے۔ اسی لیے میں بھی پورا معائنہ کر رہا تھا۔ مگر جس بات نے مجھے چونکایا تھا وہ بیڈ پر بیٹھا وجود تھا۔ جو کمرے کی کسی بھی چیز سے مشابہت نہیں رکھ رہا تھا۔

وہ خاتون جو کوئی بھی تھیں۔ اس عمر میں بھی بڑی خوب صورت تھیں۔ کرسی پر وہ ہی لڑکی بیٹھی تھی۔ جسے میں نے روتے دیکھا تھا۔ دونوں لڑکیاں پیاری تھیں۔ مگر بیڈ پر آنٹی نما خوب صورت عورت کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہ تھے۔ حسن سو نہ۔۔۔ بلیک چادر سے سر کے بالوں کے ساتھ پورے وجود کو ڈھانپے وہ جو کوئی بھی تھی آنے والے ہر اجنبی کو ٹھٹک کر ایک نظر مزید دیکھنے پر مجبور کر دیتیں۔

"بیٹا! آپ لوگ ادھر بیڈ پر آجاؤ۔" میری طرح صائم بھی کنفیوژ تھا۔

ہم دونوں خاموشی سے آکر بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ایک عجیب سی خاموشی ہمارے درمیان آکر ٹھہر گئی۔ ہمیں بھول گیا کہ ہم کیا کہنے آئے ہیں۔ آنٹی خود ہی بولیں۔

"بیٹا! آپ لوگ کون ہو؟"

"میں۔۔۔" ابھی لفظ میرے منہ میں ہی تھا۔

"مجھے پتا چل چکا ہے کہ آپ لوگ کسی ٹی وی چینل کی طرف سے آئے ہو اور کسی ڈرامے کے سلسلے میں میری بیٹی کو لینا چاہ رہے ہو۔" میں اور صائم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

وہ ہماری حیرانی بھانپ چکی تھیں۔

"اصل میں جب آپ ان کے ابو سے بات کر رہے تھے تو میری چھوٹی بیٹی نے ہی سن کر مجھے بتایا ہے۔" وہ اب بھی نرمی سے ہی بولیں۔

"بڑی تیز سماعت ہے۔" صائم نے سرگوشی کی۔

"شروع سے ہی ہے۔" میرے بجائے اسی لڑکی نے ٹھاہ کر کے جواب دیا۔ میرے ساتھ ساتھ اس کی بہن اور ماں کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"اصل میں ہم لوگ ٹی وی وغیرہ پر جانا معیوب سمجھتے ہیں اس لیے بیٹا یہ ناممکن ہے۔" آنٹی نے متوقع جواب ہی دیا۔

"نہیں آنٹی! میری پروڈکشن میں آپ کو فیملی ماحول ہی ملے گا۔ یہ میڈیا اتنا بھی برا نہیں یہاں لوگ اگر برے ہیں تو اچھے لوگ بھی ہیں۔ شریف اور سلجھے ہوئے خاندان کے۔"

صائم نے جلدی سے جواب دیا۔ اس کی بے صبری اور ان لوگوں کا عذر مجھے سمجھ آ رہا تھا۔

"ہم کیسے مان لیں کہ آپ شریف اور سلجھے ہوئے ہیں؟" چھوٹی محترمہ پھر بولیں۔ صائم کی بولتی بند ہو گئی۔

"جب آپ ہمارے ساتھ کام کریں گی' تو آپ کو خود ہی احساس ہو جائے گا۔" اب کی بار میں نے جواب دیا۔

"لیکن مجھے تو آپ کے ساتھ کام کرنا ہی نہیں۔" پہلی دفعہ وہ لڑکی بولی تھی جس کے لیے ہم آئے بیٹھے تھے۔ انداز انتہائی قطعی تھا۔

"آپ کو اچھا پیکیج ملے گا' فیملی ماحول۔۔۔ پھر مالی طور پر آپ مستحکم بھی ہوں گے۔" صائم نے پھر کوشش کی۔ پر آخری جملہ بول کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

"آپ کو کس نے کہا ہے کہ ہم مالی طور پر مستحکم نہیں؟ ہمارے جو بھی حالات ہیں ہم سروائیو کر رہے ہیں۔" چھوٹی محترمہ کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

وہ خوبصورت آنٹی اب اپنی نرم آواز میں پھر بولیں۔

"بیٹے! ہمارا ماحول نہیں بس ہم لوگ نہیں کام کر سکتے۔"

"آنٹی! آپ ان سے تو پوچھیں۔" اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اگر کوئی موزوں چہرہ مل جاتا تو والدین کے نہ ماننے پر

بھی لڑکی کو منالیا جاتا۔ پھر وہ خود ہی گھر والوں کو راضی کر لیتی۔ صائم وہی گر آزمانے کے لیے پھر بولا۔۔۔

"یہ ڈراما چلے گا بھی معروف و مشہور چینل پر۔ بندہ دنوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔" اس نے چٹکی بجائی۔

اب میری بولتی بند تھی چونکہ ان تینوں کے تاثرات سے میں اندازا لگا چکا تھا۔ یہاں دال نہیں گلنے والی۔

"جب ایسا کام کرنا ہی نہیں جو اللہ کو ناراض کرے تو مشہور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ لڑکی انتہائی تحمل سے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں گرائے اس کا سکون قابل دید تھا۔

تین قسم کا حسن عورت ذات میں ہوتا ہے۔

بے حد خوب صورت مگر سخت چہرہ۔

بے حد حسین اور نرم چہرہ۔

بے حد پیاری عورت اور باوقار چہرہ۔

بلکہ جسم کی ہر جنبش سے ایک وقار اور ایک ٹھہراؤ جھلکتا ہے ایسی عورتوں کے ناز و انداز سے' یہ وہ عورت ہوتی ہے جس کے حسین چہرے کو دیکھ کر احترام کا جذبہ دل میں جاگتا ہے۔ یہ لڑکی ایسا ہی حسن رکھتی تھی جبکہ اس کی ماں خوب صورت اور نرم چہرے کی حامل تھی۔ بادشاہ کے حرم میں چودہ خوب صورت کنیزیں اور صرف ایک پر مرمٹنے والی بادشاہ کی کیفیت مجھے آج سمجھ آئی تھی۔

ہر مرد کی ہو سکتا ہے اپنی پسند ہو۔ کوئی خوب صورت چہروں کے دلربا اندازوں پر فدا ہوتے ہوں۔ مگر رعب حسن سے احترام کا جذبہ دل میں گھر کر جائے تو عقل مند بندہ بھی فاتر العقل ہو جاتا ہے۔ محبت اور عشق کے درمیان میں کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے بڑی مشکل سے میں نے خود کو کنٹرول کیا۔

"کیا آپ اللہ کو ناراض کرنے کے کوئی اور کام نہیں کرتی ہوں گی؟" میرے منہ سے خود بخود انسونی بات نکلی۔ لڑکی کے چہرے کی رنگت ماند پڑ گئی۔

"مثلاً"۔۔۔" اب پھر چھوٹی محترمہ چمک کر بولی۔

"آپ دو نامحرم لڑکوں کو جو اجنبی بھی ہیں۔ سیدھے اپنے کمرے میں بلوا رہی ہیں حالانکہ ڈرائنگ روم میں بھی ڈیل کیا جا سکتا ہے اور آپ کے والد صاحب بھی یہ مسئلہ حل کر سکتے تھے۔ بجائے اس کے آپ تینوں خواتین ہمیں یہ سب کہتیں۔" میری بات پر اب غصے میں اس چھوٹی محترمہ کے ساتھ ساتھ صائم بھی آیا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ چلو اٹھو۔۔۔ چلیں۔" صائم رک رک کے بولا۔

"بولنے دیں انہیں۔" باوقار چہرہ پھر پر سکون ہو گیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ہمارے گھر کوئی ڈرائنگ روم نہیں جس کمرے میں آپ بیٹھے ہیں یہی کمرہ ہے ہمارے گھر میں ہاں اس کے علاوہ کچن بھی موجود ہے اگر آپ کو یہاں بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے تو آپ پلیز کچن میں نمک مرچوں کے ڈبوں کے پاس جا کر بیٹھ جائیں۔ رہی ابا حضور کی بات تو وہ ہمارے وجود سے انکاری ہیں۔ تو آپ کو۔۔۔"

"شٹ اپ اٹ۔۔۔ سحر!" باوقار چہرے نے اس کی بولتی بند کروائی۔

"تمہارا ہر بات میں بولنا ضروری ہوتا ہے۔" نرم چہرے والی آنٹی نے بھی اسے جھڑکا۔

جبکہ ان کی آنکھوں کی نمی نے مجھے شرمندہ کر دیا۔

"اب آپ جا سکتے ہیں۔ جو بات نرمی سے کسی کو سمجھائی جا سکتی ہو۔ ادب کے دائرہ میں رہ کر وہاں بدتمیزی کرنے یا سخت لہجہ اپنا کر بات کرنے کا فائدہ؟ ہم لوگ مانتے ہیں کہ ہم دو اجنبی لوگوں پر اعتماد کر بیٹھے ہیں اس میں ہم سے زیادہ آپ کے شائستہ طور اطوار کا قصور ہے۔ بڑے سمجھدارانہ طریقے سے کیا گیا تجزیہ ہے آپ کا۔ ہمارے ابا کے بارے میں بھی آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ وہ بات سنتے ضرور ہیں لیکن اپنی مرضی سے جواب دیتے ہیں۔ اگر انہوں نے آپ کو جواب دینا ہوتا تو ہمیں آپ کو بلوانے کی کیا ضرورت تھی۔" باوقار چہرہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ صائم اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے لگا کہ کمرے میں موجود اس مقناطیسی وجود نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ مجبوراً" صائم کو مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھانا پڑا۔ ہم دونوں ان کا شکریہ ادا کر کے واپس ہو لیے۔

"کیا ضرورت تھی بلاوجہ کی بکواس کرنے کی۔" صائم برس پڑا۔" سر عثمان کو کیا کہیں گے اف اللہ پرسوں کا دن رہ گیا۔ اسی چلا کو مناہل کو میک اپ کی مدد سے معصوم چہرہ بنا دیں گے۔" وہ پتا نہیں کیا کیا بڑبڑ کرتا رہا جبکہ میں پورا راستہ خاموش ہی رہا تھا۔ میرے سارے الفاظ خاموشی کی نذر ہو گئے۔ سارے وجود پر سناٹے یوں چھا گئے جیسے ماں کے چلے جانے پر تھے اور زبیر۔۔۔؟

زندگی کی کانٹوں بھری باڑ اس کے لیے طویل سے طویل ہوتی جا رہی تھی جس کو پار کرتے تھکن اترنے لگی تھی اور تھکن کیا ہوتی ہے جب اعصاب چٹخنے لگے جب روح نڈھال ہو جائے یا جب وجود پر یادوں کے کوڑے پڑنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

سورج آگ برسا رہا تھا۔ "آج تو لگتا ہے پچاس ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت ہو گا۔"

"آپی! ایک جوتا لے دیں یہاں دو سو کی سیل لگی ہے۔"

کتنی دیر سے دل میں مچلنے والی خواہش کو روکے رکھنے کے باوجود بھی اسے صبر نہیں آیا تھا۔

"اب دو سو ہی رہ گئے ہیں گرمی کی شدت دیکھو اور آج کے لیے ابھی سبزی بھی لینی ہے۔ تمہارے سینڈل بالکل ٹھیک حالت میں ہیں۔ ہم سو روپے میں بوتل پی لیں گے اور چنا چاٹ کھائیں گے اور سو روپے کی سبزی لے لیں گے۔"

اس نے جلدی جلدی چھوٹی بہن کو سمجھایا۔

عصر سے پہلے گھر پہنچنا تھا سعد کے آنے کا وقت ہو جاتا اس کے لیے کھانا بنانا تھا۔ پھر اماں بھی پریشان ہوتی رہتیں۔

وہ دونوں سڑک پار کر کے دوسری طرف آ گئیں اب وہ شہر کی مشہور شاہراہ پر تھیں۔

وہ سامنے مشہور بوتیک سے نکل رہا تھا اس کی نظر فرقان کے انتظار میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھی وہ اس کی گاڑی لے کر گیا ہوا تھا اور ایک گھنٹے کی اجازت میں بھی دو گھنٹے لگا دیئے تھے ٹائم نکلا جا رہا تھا کتنے ہی لوگ اس کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے زیادہ ڈر ان نخریلے اداکاروں کا تھا جو اسے موجود نہ پا کر کوئی بہانہ بنا کر پھر سے کھسک جاتے۔ وہ سیٹ پر مزید تاخیر سے پہنچ کر مزید اپ سیٹ ہی ہو جاتا۔

بار بار کال ملانے پر بھی آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے" کا جواب موصول ہو رہا تھا۔ جھنجلاہٹ میں وہ اس سے پہلے کہ صائم کو کال کرتا کہ وہ اپنی گاڑی بھیج دے۔ سامنے کھڑے دو نفوسوں نے اس کی جھنجلاہٹ' بے زاری' پریشانی سب ختم کر دی تھی۔

وہ سب بھول بھال کر سڑک پار کر کے ان کی طرف آ گیا ان دونوں نے ابھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو سینتیس نمبر کی بس کے انتظار میں کھڑی تھیں گرمی میں دونوں کی رنگت گلابی پڑ گئی تھی اور چہرے پر اڈنے والے پسینے کے قطرے وہ بار بار دوپٹے کے پلوؤں سے پونچھ رہی تھیں۔

"السلام علیکم!" ان کے قریب پہنچ کر اس نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

"وعلیکم السلام" چونکنے کی بجائے بڑی بہن نے تحمل سے جواب دیا۔

"جی فرمایئے کیسے۔" چھوٹی محترمہ نے سوال داغا۔

"بس ایسے ہی آپ کو دیکھ کر چلا آیا۔ وہ سامنے لیزا نام سے جو بوتیک ہے وہ میرا ہے میں باہر شوٹنگ پر جانے کے لیے نکلا تو سوچا۔۔۔"

"کہ دونوں بے چاری لڑکیاں کھڑی ہوئی ہیں انہیں اپنی گاڑی کی آفر کروں اور گھر چھوڑ آؤں اکثر فلموں اور کہانیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

چھوٹی محترمہ نے اپنے مخصوص انداز میں بات کاٹ کر ٹکڑا جوڑا۔

"جی نہیں گاڑی تو میرے پاس ہے نہیں۔ میں تو خود گاڑی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ ضروری نہیں کہ

اللہ اپنے بندوں کو فلمی چچویشن کریٹ کرکے ہی ملوائے۔ بعض دفعہ بغیر اتفاق کے بھی قصدا" آپ مل سکتے ہیں۔"

جواب چھوٹی محترمہ کے لیے تھا۔ مگر میری نظر اس پر تھی اس کے چہرے کی متانت اور سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا بس اس نے اپنی گھنیری پلکیں اٹھا کر مجھے ذرا کی ذرا دیکھا پھر رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

بھری دھوپ میں مجھے پل بھر کے لیے بادل کے سائے کا احساس ہوا تھا اور پھر پیلی پیلی دھوپ۔۔۔

"قصدا" سڑک پر کھڑے ہو کر نہیں ملا جاتا۔"

اب کی بار اس نے جواب دیا تھا۔ "آپ فکر نہ کریں میں قصدا" گھر آکر ملوں گا۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"پر آپی آپ کے ڈرامے کے لیے نہیں مانیں گی۔"

"زندگی کے ڈرامے کے لیے تو مان جائیں گی نا۔"

میرے کہنے پر پھر گھنی پلکیں اٹھی تھیں میری آنکھوں کے کئی راز فاش ہو گئے تھے۔

"چلو سحر بس آگئی۔" وہ اسے بازو سے تھام کر بنا گھبرائے متانت سے چلتی بس میں جا بیٹھی۔

جبکہ میں وہاں ہی کھڑا رہ گیا۔ سنجیدگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے نہ وہ گھبرائی نہ شرمائی بس بیزار ہوتی بنی اپنے نازک سراپے کا بوجھ سنبھالے مضبوطی سے چلتی وہاں سے دور میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

نجانے کتنے ہی دن حبس کی نذر ہو گئے آج ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ معروف شہروں کے چھوٹے اپارٹمنٹ میں نہ تو صحن ہوتے ہیں نہ لان۔ بس بالکونی ہوتی ہے جہاں ہوا کی گزرگاہ ہو۔ کچھ منی پلانٹ بھی میں نے دیوار کے مشرقی جانب لگائے جہاں رات کی رانی اور موتیا کی خوشبو نے ماحول کو خوشگوار کر دیا تھا۔

ہوا پھولوں کی ساری خوشبو اردگرد بکھیر رہی تھی۔ میں نے ٹیرس پر آکر چند گہری سانسیں لیں چاہے مجھے کتنی بھی تھکاوٹ ہو۔ سحر خیزی سے پیاری شے مجھے کوئی نہیں لگتی۔ صبح اٹھ کر کوئی ایکسرسائز نہ کروں تو لگتا ہے سارے جسم پر منوں بوجھ پڑ گیا ہو سستی اور کاہلی کا نہار منہ اٹھ کر ورزش کرنے پانی پینے اور صبح کے اجالے کو انجوائے کرنے کا جو مزا میں لیتا ہوں اس خوشی اور مزے پر میں پورا تھیسز لکھ دوں۔ من اندر چاہے جتنی بھی آگ لگی ہو صبح کی نماز کے بعد یوگا کے آسن جمالوں تو بس اعضا اتنے پرسکون ہو جاتے تھے جیسے ایک سرور اور نشے کی کیفیت رگ وپے میں سرایت کر گئی ہو۔ صبح کو کوئی شوٹنگ سیٹ نہیں کرتا تھا۔ میں اکثر اپنے دوستوں سے کہتا تھا کہ مجھ سے میرا سارا وقت دن کا لے لو بس میری صبح میرے پاس رہنے دو۔ پڑھائی بھی طالب علمی کے زمانے میں صبح کے وقت ہی کرتا۔ یہ صحیح معنوں میں میری ذات کا اور میرے پروردگار کا وقت ہوتا اتنی پیاری نعمتوں میں، میں اس ایک نعمت کا شکر ادا کرتے نہ تھکتا۔ اتنے پیارے اللہ نے ہمارے لیے اتنی پیاری برکتوں والی صبح بنائی ہے۔

اس کے بارے میں سوچ کر ایک امید سی جاگی تھی میں صائم کی امی کو لے کر آج ان کے گھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا پر ارادے تو ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں ارادہ تو وہ ہوتا ہے جو رب کی طرف سے ہو ہمارے ارادے اگر پایہ تکمیل تک پہنچ جائیں تو ہم سے بڑا خوش قسمت ہی کوئی نہ ہو۔

☼ ☼ ☼

آج ہی وہ دونوں بہنیں فرحت باجی کی شادی سے لوٹی تھیں۔ فرحت باجی کی امی نے دونوں کے جوڑے اور شوز خود خریدے تھے۔ مشعل کی خوددار طبیعت پر یہ سب گراں تھا پر خالہ نے اتنی محبت وچاہ سے بنائے اور پھر انہیں بلوایا۔ ان کے پاس انکار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی جب وہ دونوں اور اماں گھر پہنچے تو سعد ابھی نہیں لوٹا تھا۔

ابا کچن میں کھڑے ہو کر اپنی روٹی پکا رہے تھے۔ تینوں نے ایک تھکی تھکی نگاہ ان پر ڈالی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

"اماں ساری عمر کیسے گزارا کر لیا۔" سحر نے بیسیوں دفعہ پوچھا ہوا سوال دوہرایا اور جہاں آرا نے نظر بھر کے بیٹی کی جانب دیکھا۔

بے مروتی، تنہائی، کم مائیگی اور کسی کی بے حسی کا اعجاز ان کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

"سو جاؤ سحر! کافی تھک چکے ہیں۔" مشعل ماں کی کیفیت سمجھتی تھی۔

پر آج وہ خود ہی ماضی کے ٹرانس میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کئی دفعہ کی دہرائی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی یادوں کو آج انہوں نے جامع پیرائے میں بتانا شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ظفر محی الدین سے اس کی منگنی اس دور میں ہوئی تھی جب ابھی لڑکیاں کچے پکے خواب دیکھ رہی ہوتی ہیں جب شادی کے صحیح مفہوم کا بھی انہیں پتا نہیں ہوتا بس اماں نے ایک دن بتایا کہ تمہارے چچازاد ظفر سے ہم نے تمہاری منگنی کر دی ہے۔ دو ماہ بعد تمہاری شادی ہے وہ تو شادی کے نام پر ہی خوشی سے اچھل پڑی۔

اس نے اپنی ماموں زاد، خالہ زاد کزنوں کو ننھیال میں جا کر بتایا کہ اس کی شادی ظفر سے ہو رہی ہے۔

"ہائے جہاں آرا تم اتنی خوب صورت اور وہ ظفر۔۔۔ اللہ پھپھو کو کیا سوجھی۔" پہلا حملہ زینب آپا نے کیا۔

"تو اور کیا ہماری جہاں آرا کے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک شہزادہ۔۔۔ یہ سوکھے منہ والا ظفر ہی رہ گیا تھا۔" خالہ زاد سونیا نے بھی تیر پھینکا غرض بھانت بھانت کی باتیں سن کر وہ واپس شیخوپورہ آگئی۔

"اماں! سوکھے منہ والا ظفر۔۔۔ میرے لیے تو شہزادہ ہونا چاہیے۔"

ماں الگنی سے کپڑے اتارتے بیٹی کی بات پر یک دم چونکی۔

"ارے، ادھر آ۔۔۔ تجھ سے یہ ساری باتیں کس نے کیں۔"

"زینب آپا، سونیا، شازی سارے کہہ رہے ہیں کہ جہاں آرا تو، تو اتنی خوب صورت۔۔۔ اور وہ ظفر سوکھا سڑا۔۔۔ میرے لیے کوئی شہزادہ ہونا چاہیے۔"

"تو پھر ڈھونڈ لے خود ہی کوئی شہزادہ۔" اماں نے جھنجلا کر کہا۔

"تو میں کیسے ڈھونڈوں؟" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اماں مجھے سنبل کا چھوٹا بھائی بڑا پیارا لگتا ہے۔ سنہری سنہری آنکھیں یا پھر زینب آپا جو ہمیں سات سمندر پار دیس کے شہزادے والی جو کہانی سناتی ہیں۔ وہ لمبا اونچا، گورا۔۔۔ آہ ہاہ شہزادے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔" وہ تصور کی شبیہہ سے مزا اٹھاتے بولی۔

خالہ چچی کے گھر وہ آم لے کر آیا تھا کانوں میں پڑنے والی جہاں آرا کی آواز نے جیسے صور اسرافیل پھونک دیا ہو۔ عرصے سے دل میں چھپا احساس کمتری پوری شدت کے ساتھ محسوس ہوا۔ وہ وہیں سے پلٹ آیا مگر ہزاروں کدورتوں اور بدگمانیوں کے ببول دل کی سرزمین پر اگ آئے تھے۔

جہاں آرا کی ـــــ باتوں کی وجہ سے اماں نے اس کا ننھیال جانا بند کر دیا اور شادی سے پہلے اس کی خوب برین واشنگ کی۔ اس کے لیے ظفر ہی زینب آپا والی کہانی کا شہزادہ بن گیا۔

یوں ہی پیاری سی شکل والی جہاں آرا جب دلہن بنی تو مسمرائز کر جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس دن کوئی ایسی عورت نہ تھی۔ جس نے ظفر کی ماں کو مبارک باد نہ دی ہو، پر جہاں آرا کے لیے زندگی کی نئی راہ کانٹوں سے لد گئی۔۔۔ اس کے احساس کمتری نے پہلے دن سے ہی اس کا جینا حرام کر دیا۔ اس کے ہنسنے، رونے، بولنے پر اعتراض۔۔۔ وہ اگر چپ کر جاتی تو چپ کرنے پر وہ اس کا منہ پکڑ کر جاہلوں کی طرح تھپڑوں کی برسات کر دیتا۔ جہاں آرا ماں کے پڑھائے سبق کی وجہ سے سب سہے گئی۔

جہاں آرا کے ہاں پہلی اولاد مشعل ہوئی تھی۔

جہاں اسے بیٹی کی خوشی ہوئی وہیں اماں کے چلے جانے پر دنیا کی ساری کشش ختم ہوگئی۔ ظفر کا ٹارچر سیل کمرے کی حد تک محدود ہوتا۔ دنیا کے سامنے وہ چپ رہتا۔ پھر سعد کی پیدائش کے بعد وہ اپنے بھائی سے جھگڑا کرکے اپنا بوریا بستر اٹھائے ملتان آگیا۔ جہاں آرا کے ابو کی طبیعت ٹھیک نہ رہتی تھی۔ جہاں آرا یہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہاں کم از کم ابو کی خبر گیری تو ہوجاتی۔ اتنی دور جاکر وہ اس ظالم کے ہاتھوں مزید شکنجے میں آگئی تھی۔ ظالم اپنا ظلم کررہا تھا اور وقت دبے پاؤں سرکتا جارہا تھا۔ ایک دن ابو کے بھی دنیا چھوڑ جانے کی اطلاع آگئی۔ جہاں آرا نے اس دن چیخیں مار مار کر اپنے آخری آنسو بھی گرائے۔ اس کے بعد وہ بے حس ہوگئی تھی۔

سحر کے ہونے کے بعد اس نے ظفر محی الدین سے طلاق کا مطالبہ کردیا تھا۔ اتنی اذیت ناک زندگی سے یہی بہتر تھا کہ وہ لوگوں کے گھروں کا کام کرکے اولاد پال لیتی۔ ظفر نے اس کو طلاق دینے سے صاف انکار کردیا تھا۔

جہاں آرا نے اپنی ساری ضروریات خود سے پوری کرنی شروع کردیں۔ جس محلے میں وہ رہ رہی تھی۔ وہیں اس کی ملاقات عالیہ زریں سے ہوئی تھی۔ وہ جہاں آرا کی خوب صورتی سے کافی متاثر ہوئی۔ مگر اتنی پیاری لڑکی کے نجی حالات سن کر وہ بڑی افسردہ ہوئی۔

عالیہ پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی اور ایک اچھے ادارے میں ہیڈ کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔

اس نے جہاں آرا میں ہمت پیدا کی تھی۔

"دیکھو جہاں آرا! تم زندگی کی آزمائش میں اس حد تک آگئی ہو کہ رینگ کر چلنے پر مجبور ہو۔ پر اگر اوپر اس رب کی ذات پر حوصلہ رکھو گی تو رینگنے سے چلنے پر بھی آجاؤ گی۔ زندگی کی آزمائشیں نہ حسن دیکھتی ہیں، نہ خوب صورتی۔۔۔ نہ پیسہ، ان کا کام ہے کہ یہ آپ کے مقدر میں اگر لکھی ہیں تو ہو کر ہی رہنی ہیں۔۔۔ بس ہمارا کام ہے کہ ان سے نمٹنے کے لیے کیا اسباب اختیار کیے جائیں۔"

عالیہ نے اسے قرآن کا ترجمہ پڑھایا تھا۔ زکوٰۃ فنڈ اس کے لیے مختص کروادیا۔ جہاں آرا کو لگتا کہ جنگل میں پٹنے والے اس جانور کی جنگلی کے ہاتھوں رہائی ہوگئی تھی۔ جس کو پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیوں پٹ رہی ہے۔

اس نے اپنے بچوں کی تربیت شروع کردی۔ نماز میں سکون ڈھونڈا۔ ظفر محی الدین کے سامنے چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ہاتھ پھیلانا چھوڑ دیا۔

جہاں آرا کے طرز زندگی میں تبدیلی نے ظفر کو مزید اتاولا کردیا تھا۔ جب مالک کو لگتا ہے کہ اس سے مار کھانے والا جانور اب پہلے کی طرح چیختا چلاتا نہیں بلکہ خاموشی سے پٹے جارہا ہے، تو اس کی شیطانیت کسی حد تک کم ہو ہی جاتی ہے۔

اس نے سعد کو دنیا کے دوسرے ہی سبق پڑھانے شروع کردیے۔ نتیجتاً" سعد چھوٹی عمر میں ہی ایک ہوٹل میں کام کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی کرتا رہا۔ قرآن پاک کی تعلیم نے تو اس کی دنیا ہی بدل دی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مومنوں کے لیے دنیا آزمائشوں کی آماجگاہ ہے۔ جہاں آرا کی میٹھی زبان نے پڑوس میں بھی اس کی اچھائی ثابت کرنا شروع کردی۔

انسان جب اللہ کی راہ پکڑ لیتا ہے تو اللہ بھی دنیا میں اس کی عزت، خوش حالی اور سکون کی راہ کو تھام لیتا ہے۔ محلے کے کئی بچے قرآن پاک اس سے پڑھنے لگے۔ کچھ خواتین اس کی مالی مدد بھی کرتیں۔ ظفر محی الدین کے اندر انا پرست مرد نے اس کا دل بیوی اور بچوں سے مزید متنفر کردیا۔ وہ اب عجیب سے رویے پر اتر آیا تھا۔ اس نے ایک روپیہ بھی گھر دینا بند کردیا۔ جہاں آرا نے اس پر بھی صبر کیا۔ اس نے اپنی ضرورتوں کے لیے اپنے بچوں اور بیوی تک کو مخاطب کرنا چھوڑ دیا۔ اپنا سرف لاکر خود اپنے کپڑے دھوتا۔ اپنا کھانا خود بناتا۔ یوں لگتا کہ اس گھر میں اس کے بیوی، بچے کرائے داروں کی طرح رہ رہے ہوں۔ بلکہ کرائے داروں کو تو پھر بھی انسان بلا ہی لیتا ہے۔ مگر ان سے بات چیت بھی بند ہوگئی تھی۔ اگر جہاں آرا کہتی کہ لائیں

میں آپ کے کپڑے استری کردوں، تو وہ بس کہتی رہ جاتیں۔ ان کی بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوتا۔ اگر مشعل، سحر ماں کے کہنے پر کھانا باپ کو دینے جاتیں تو روٹی وہیں پڑے پڑے اکڑ جاتی۔ وہ شخص خود اٹھ کر کھانا لیتا۔ بچوں سے پیار کرنا تو دور کی بات، وہ دیکھتا تک نہ تھا۔

ایک دفعہ سعد نے جہاں آرا سے پوچھ ہی لیا۔

"امی! ابو واقعی ہمارے ابو ہیں؟" بیٹے کی آنکھوں کی حیرانی نے جہاں آرا کا ضبط توڑ ڈالا تھا۔ وہ جی بھر کے روئی۔

پر اب اس نے اپنی برداشت بڑھالی تھی۔ ظفر محی الدین نفسیاتی کیس تھا۔ جس سے نمٹنا اب اس کے بس میں نہ تھا۔ جہاں آرا نے پھر اللہ سے ہی مدد مانگی تھی۔ وقت نے اور اللہ کی مدد نے اس کے بچوں کو بھی سمجھ دار کردیا تھا۔ سعد نے یوں ہی محنت مزدوری کرتے میٹرک کرلیا۔ مشعل نے محلے کے بچوں کو پڑھا پڑھا کر اپنی اور سحر کی تعلیم جاری رکھی۔ جہاں آرا نے محنت کرکے گھر کا چھوٹا موٹا خرچ اٹھالیا۔ وہ سب بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔

ظفر محی الدین روز نئے سے نیا لباس زیب تن کرتا۔ جبکہ وہ ماں، بچے بمشکل ہی دو، تین سوٹوں کو بار بار دھو کر اور سی کر پورا کیے رکھتے۔

اتوار بازار سے ہفتے بھر کی سستی سبزیاں لائی جاتیں۔ ابا سے ایک دفعہ مشعل نے گھر کی مرمت کا کہا تھا۔ جب بھی بارش ہوتی تو کچے کمرے اور صحن میں سیلاب اتر آتا۔ کھٹمل، مچھر اور کیڑے مکوڑے کاٹ کاٹ کر بے حال کردیتے۔ ابا نے مشعل کی وہ عزت افزائی کی کہ بے چاری بولنے سے بھی رہ گئی۔ یہ تو بھلا ہو دادا ابو کا جنہوں نے بیٹے کے چلن دیکھ کر ہی اپنی زندگی میں ہی یہ گھر جہاں آرا کے نام کردیا ورنہ وہ سڑک پر ہوتے۔ ان تینوں بہن بھائیوں نے لنڈا بازار سے سستے قالین پیسے جوڑ کر لیے اور وہ ہی دو کمروں میں مٹی کے فرش پر پہلے شیٹ بچھائی، پھر یہ بھاری بھرکم قالین بچھائے۔ سعد اور جہاں آرا نے اپنے پیسوں کی کمیٹیاں ڈال ڈال کر اوپر کی چھتیں پکی کروائیں۔

اماں ہم اپنی دنیا بنائیں گے۔ سحر عزم سے کہتی۔

"پر اس کے لیے صبر، خودداری اور حوصلہ ہونا چاہیے۔"

مشعل مٹی کے صحن کی لپائی کرتے مسکرا کر بولی۔

"بالکل۔۔۔" سعد نے بھی مسکرا کر تائید کی۔

"بس مشعل تمہارا ایم اے انگلش ہوجائے۔ سحر کا بی اے۔۔۔ پھر سعد کو باہر بھجوائیں گے۔" اماں کہتی۔

"نہیں اماں، آپ کو چھوڑ کر باہر نہیں جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر ماں کی گردن کے گرد بازو حمائل کرتا۔

ماں کی اذیتوں کی کہانی نے بیٹیوں اور بیٹے کو بہت کچھ سکھایا تھا۔

جہاں آرا دور سے مسکرا اٹھتیں۔

"نہیں بیٹا! بہنوں کی بھی شادیاں کرنی ہیں۔ تم ویلڈنگ کا کام سیکھو۔ میں عالیہ سے کہہ کر سعودی عرب بھجواؤں گی۔" سعد چپ سا ہوجاتا۔ ظالم باپ کے ہاتھوں وہ ماں، بہن کو نہیں چھوڑ کر جاسکتا تھا مگر روزگار زندگی۔

مون سون کی بارشیں شروع ہوچکی تھیں۔ سحر نے خوب دل لگا کر اپنے اور مشعل کے لیے نارنجی رنگ کے کاٹن کے سوٹ پریس کیے۔ مشعل نے آج مارکیٹ جانے کا عندیہ دیا تھا۔ یہ واحد عیاشی ہوتی تھی سحر کے لیے۔

وہ نہا دھو کر تیار ہوئی۔ "اتنی تیاری کس لیے؟ اوپر چادر اوڑھ کر ہی جانی ہے۔" مشعل نے اس کی تیاری دیکھ کر چھیڑا۔

"کوئی بات نہیں آپی! اپنا دل تو خوش ہو ہی جاتا ہے۔" وہ کھل کر مسکرائی۔

اس نے رشک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ سحر ہمیشہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں سے خوشیاں کشید کرلیتی تھی۔ جبکہ وہ خوش ہونا چاہتی ہی نہ تھی۔

دونوں اماں کو بتا کر دو رویہ سڑک پر نکلنے کی بجائے سبز کالونی کی طرف مڑ گئیں۔ جہاں گھروں کے بجائے سحر کے محل تعمیر تھے۔ سحر کو سبز کالونی والا راستہ زیادہ

پسند تھا۔ اس کے خیال میں کم از کم خوب صورت گھر دیکھنے کو تو مل جاتے۔

وہ بائیں موڑ پر مڑی تھیں اور مشعل کو پتا تھا کہ اب سارے راستے سحر کی زبان چلنی ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ خود بھی اس کی باتیں انجوائے کرتی۔ وقت گزرنے اور لمبے راستے کا احساس ہی نہ ہو پاتا۔

آپی یہ سرخ پتھروالا گول گھر تم بنوالینا۔ مجھے تو وہ نیلے ماربل سے بنی آبشار والا گھر بہت پسند ہے۔ میں بھی ایسا ہی بنواؤں گی۔ بوگن ویلیا کی بیل لگواؤں گی۔ ایلو ویرا کے پودے لگواؤں گی۔ اسکن کے لیے بھی اچھے اور بالوں کے لیے بھی۔

اس کی بات پر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"سحر! تمہاری اسکن آل ریڈی اتنی اچھی ہے۔" وہ اس کی سرسوں کی مانند کھلتی گندمی رنگت اور بے داغ چمکدار چہرے کو دیکھ کر بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے آپی! پر آج کل اتنی آلودگی ہے تو تھوڑا بہت تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔ پھر ایلو ویرا تو ایک قدرتی ٹانک ہوگا جلد کے لیے... پیسوں کی بھی بچت۔"

"ماشاء اللہ خواب اتنے بڑے اور بچت کی بھی خوب سوجھی۔ میری بھولی بہن یہاں ان عمارتوں میں رہنے والے پیسوں کو استعمال کرنے کے سو سو طریقے سوچتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑی فکر کی بات ہی یہی ہوتی ہے کہ اتنا سارا پیسہ لگائیں کس جگہ؟ پیسہ نہ ہونا جہاں بذات خود ایک بڑی مصیبت ہے۔ وہاں بے تحاشا پیسہ بھی ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔ مصیبت تو ختم ہو ہی جاتی ہے پر آزمائش کا ٹلنا بڑا مشکل ہے۔"

"پھر آپی! پیسے میں اتنی کشش کیوں ہے؟ کیوں دل کھنچتا چلا جاتا ہے۔ کیوں دل ان محلوں میں آ ٹکتا ہے۔ ان مرسڈیز میں گول گول چکر کاٹتا ہے؟ زرق برق ملبوسات پر عجیب لے پر دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔" وہ بڑی یاسیت سے بولی۔

"سارا وبال اسی دل کا ہی تو ہے۔ دل کو تو بس کوئی نہ کوئی مرض چاہیے ہوتا ہے۔ جس کو وہ خود سے چمٹا کر مریض بننا چاہتا ہے۔ کسی کو عشق کا مرض لاحق ہو جاتا ہے، کسی کو دولت کا، کسی کو ہوس کا، تو کسی کو شہرت کا۔ یہ مریضان دل ہی ہیں جو گردش دوراں میں اپنی ہستی کی اصل پہچان سے محروم ہیں۔ تم انتظار کیوں نہیں کرتیں؟ اچھے دنوں کا۔" وہ ہمیشہ اس کی برین واشنگ کرتی آئی تھی۔ پر پھر بھی اس کے لہجے سے محرومیوں کی آنچ آنی شروع ہو جاتی تھی۔ مشعل کو لگتا کہ اس کی محنت رائیگاں ہو جاتی ہے۔

"پتا نہیں، اس دنیا میں کب اچھے دن آئیں گے؟" سحر بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

"پھر اس دنیا کا انتظار کرو، جہاں صبر کرنے والوں کے لیے خوب صورت نعمتوں کا وعدہ ہے۔ جہاں دنیا میں موجود مصیبت زدگان کو سب سے پہلے ملے گا۔"

"پتا نہیں... آپی! کب جنت آئے گی میرے لیے... جب ابا مر جائے گا یا جب ہمارے گھر میں بھی کوئی اچھی چیز پکنا شروع ہو جائے گی یا..."

"بس اسٹاپ اٹ! ابا کے لیے اتنا برا مت سوچا کرو اور ناشکرا پن نہ ظاہر کیا کرو۔" مشعل خفگی سے بولی۔

"کیوں؟ ابا نہ بھی ہوتے تو کیا تھا اور اگر ہیں بھی تو نہ ہونے کے برابر۔" وہ اپنی گیلی آنکھیں رگڑنے لگی۔

مشعل نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ جذباتی جھٹکوں کی زد میں تھی اور جھٹکوں میں ہچکولے کھاتے جسم و دماغ کو کبھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ لیزا بوتیک والی سڑک پر آگئیں۔ یہاں سے انہیں ہاف ریٹ پر ملنے والی بک شاپ پر جانا تھا۔

لیزا بوتیک سے نکلنے والے وجود کو دیکھ کر وہ چونکی تھی۔

"یہ ہمیشہ ادھر کیوں مل جاتا ہے؟" اس نے اشارے سے سحر کو متوجہ کیا۔

"ہو سکتا ہے آپی! کہ یہ یہیں کہیں رہتا ہو۔"

"ہوں، اچھا پھر تیز چلو اس سے پہلے کہ یہ ہمارے سر پر آجائے۔"

وہ سحر کو تیز تیز قدم بڑھانے کا کہنے لگی۔

جبکہ سحر کسی خیال کے تحت اس کے قریب جا کر رک گئی۔

"السلام علیکم!" وہ کسی لڑکے کے ساتھ باتوں میں محو تھا۔

بلیو جینز میں مائیکل ایرن کی آڑی ترچھی لکیروں سے بنی شرٹ پہنے اور سن گلاسز بالوں پر جمائے بلاشبہ وہ ایک ڈیشنگ پرسنالٹی رکھتا تھا۔

مرد میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ بے اعتنائی اور بے نیازی بھی ہو تو وہ اس کی شخصیت کے لیے اضافی چارجنگ ثابت ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے کتنا فیورٹ ہوگا۔ مشعل کو اندازا تھا مگر وہ اس کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

وہ باپ کی شخصیت کو لے کر سارے مردوں سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تصویر کے ہر رخ کو دیکھنے والی سمجھدار لڑکی تھی۔ جو چیزوں کو اپنانے کے لیے اس کو انتہائی حد تک جانچتی اور پرکھتی تھی۔ وہ اس شخص سے دوسری دفعہ مل کر بھی ایک خیال کو دماغ تک آنے سے روک نہ پا رہی تھی اور اب سحر کی اس بے تکی حرکت پر اسے پھر سے رکنا پڑ گیا۔

بعض دفعہ سیدھے چلتے رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ راستے میں رکنا اتنا مہنگا پڑ جاتا ہے کہ قیمت بھی ادا نہیں ہو پاتی۔

وہ دونوں کو دیکھ کر ذرا بھی نہ چونکا تھا۔ اس کا انداز انتہائی لیا دیا سا تھا۔ پہلی دو ملاقاتوں والی گرمجوشی مفقود تھی۔ سحر بلاوجہ فری ہوئے گئی۔ اس نے اپنا کارڈ سحر کو دیا تھا۔ بقول اس کے کہ کبھی کوئی جاب وغیرہ کی ضرورت پڑے تو اس سے رابطہ کر لیا جائے۔

مشعل کی خودداری پر برابر ضرب پڑ رہی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات چاہے جتنی بھی مشکل لکیروں سے گنجلک نقشہ بنا ڈالیں سامنے والے شخص کو سارے نقشے کی سمجھ آرہی تھی۔

اس سے ملنے کے بعد وہ تقریباً سارے راستے سحر پر برستی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کی تاریکی میں بس وہ سوتا تھا۔ اتنی تھف روٹین میں بھی وہ نماز پڑھنے کا عادی تھا۔ اسے بس اتنا کسی نے بتایا تھا کہ جب جسم جلنے لگے اور روح میں شگاف پڑنے لگیں تو سکون کے لیے نماز پڑھا کرو۔ اس نے نماز کو ورزش کے طور پر لیتے ہوئے یہ چیلنج بھی قبول کر لیا تھا۔

مگر پہلی دفعہ کی سکھائی گئی اس ورزش نے اسے سمجھایا تھا کہ جو میٹھی میٹھی پھوار اس کے بھانبھڑ کی طرح جلتے وجود پر پڑی ہے۔ اس کا نعم البدل نہ یوگا ہے، نہ کوئی اور ایکسرسائز۔

پھر باقی بہت ساری روٹین کی چیزوں کی طرح نماز پڑھنا بھی اس کی روٹین میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ مستقل مزاج بندہ دیگر چیزوں کی طرح نماز کا بھی عادی ہوتا چلا گیا۔

اس کی فیلڈ کے لوگ محض اس کے پانچ وقت نماز پڑھنے پر ہی اسے ماڈرن ملا کہہ کر پکارتے تھے اور وہ مسکرا دیتا۔

اس پریشان بھوت نگری میں جس کو بھی سکون کی ضرورت ہوتی، چاہے وہ اس کے نیو کمرشل میں کام کرنے والی کوئی ماڈل ہوتی یا اسپاٹ بوائے ہوتا یا سیٹ کا کوئی دوسرا شخص، وہ سب کو نماز کا مشورہ دے ڈالتا۔

لوگ اسے مذہب کا بخار قرار دیتے یا اس کی بات مذاق میں اڑا کر پیروں، فقیروں یا سائیکاٹرسٹ کے پاس بھاگ کھڑے ہوتے۔

وہ اکتا جاتا... لوگوں کی روش پر غصہ ہوتا۔

پھر اس کے قبیل کے ایک صابر صاحب جو سینئر ایکٹر تھے۔ انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

"دیکھو عمران! اللہ کے بڑے رنگ ہیں۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ اس نے کون سا رنگ کس پر جمانا ہے اور کتنا گہرا جمانا ہے۔ تم پر جو رنگ ہے وہ دوسروں کو نظر نہیں آتا تم اپنے رنگ کو دوسروں کے مذاق کی دھوپ میں مت اڑانا انہیں وہ ہی کرنے دو جو وہ کرنا چاہتے ہیں تم وہ کرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔"

بات کافی حد تک اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

تاریک راتوں سے اسے چڑ تھی چونکہ وہ اسے بے

چین کر دیتی تھیں۔ سیاہی کی تہہ اس کی تکلیفوں کو یوں دباتی جیسے مٹی کی تہیں مردے کو قبر میں دبا دیتی ہوں۔ وہ گناہ گار نہیں تھا پھر بھی وہ مجرم تھا۔ وہ چیختا تھا روتا تھا۔ پھر سکون لینے کے لیے نماز پڑھتا اور پڑھتا ہی چلا جاتا۔ باقی دن تو چکا چوند کی نذر ہو ہی جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بی بی جی! چھوٹا منا بڑا ہی رو رہا ہے۔ آج تو جی اس بڑا ہی تیز بخار ہے۔ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ آپ ایک دفعہ دیکھ لو۔"

اس کے ابرو اچکا کر گھورنے پر وہ گڑبڑا کر بولی۔

"ڈاکٹر کو دکھالاؤ میں ڈاکٹر نہیں۔۔۔"

اس کے روکھے پن پر وہ منہ تکتی رہ گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ ڈاکٹر نہیں پر ماں تو ہیں نا۔۔۔ مگر لفظ کو وہ منہ سے باہر نکلنے سے بمشکل روک پائی۔ بشریٰ نے جاتے ہوئے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر نوکری کرنی ہے۔ تو بی بی کی کسی بات سے کوئی اختلاف نہیں کرنا اور وہ نوکری کرنا چاہتی تھی اپنے بچوں کی خاطر۔۔۔ دوسروں کے بچے سنبھال کر۔۔۔

"میں شام پانچ بجے آؤں گی۔ تب تک زبیر کو نہلا کر بھیج دینا۔ اب اسے اپنے گھر لے جاؤ اور عمران کو ڈاکٹر کو دکھا دینا۔" وہ پانچ پانچ سو کے دو نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر بولی۔ اس کی تو گویا مراد بر آئی تھی۔ آج رانی کے لیے سستے بازار سے دو جوڑے لے لے گی۔ کاکے کو آلو بخارے کھانے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ اس کے لیے دو کلو لے لے گی۔ وہ دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگی۔ بی بی جا چکی تھی۔

وہ اپنی میلی چادر سے زبیر کا منہ ناک صاف کر کے اس کے کپڑے بیگ میں گولا بنا کر ڈال کے فریج سے دودھ نکالنے چلی گئی۔ سارا دودھ بوتلوں میں پلٹا اور بچا کھچا سالن جمع کیا۔ پیکٹ میں تھوڑی پتی اور چینی نکالی پھر سب اپنی گٹھری میں چھپا کر گھر کی راہ لی۔

یہ نوکری تو اس کے وارے میں تھی۔ بیگم صاحبہ اپنی رنگ رلیوں میں مگن تھیں۔ جبکہ وہ سارے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے وہ ملازمہ ہوتی نگران کے جانے کے بعد وہ مالکہ بنی پھرتی رہتی پورے گھر کی صفائی ستھرائی کر کے تالا لگا کے چیزیں سمیٹے، چابیاں چوکیدار کو دیے وہ بیگم صاحبہ کے دونوں بچوں کو لیے اپنے گھر کو ہو لیتی۔

عمران کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا اس نے کوئی تردد نہ کیا۔ گھر آ کر اپنی بیٹی سے کہہ کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے سر پر رکھیں۔ اسٹور سے بخار کی گولی لا کر پیس کر کھلا دی۔ بس پھر اللہ اللہ خیر صلا۔

زبیر کو وہیں مٹی کے فرش پر چھوڑا۔۔۔ بچہ انجانے میں مٹی اور گند کھاتا رہا۔ اپنے کاکے کو اٹھا کر منہ ہاتھ دھلا کر زبیر کا نیا سوٹ پہنایا اور اسی کا فیڈر اپنے کاکے کے منہ کو لگا دیا۔ زبیر بچہ تھا، پر بچہ ایک سال میں ہی اپنی چیزیں پہچان لیتا ہے۔ وہ بھی اپنا فیڈر پہچان گیا تھا۔ وہ لینے کے لیے لپکا اور کاکے کے منہ سے فیڈر کھینچ لیا۔ کاکا زار و قطار رونے لگا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ بس کاکے کے رونے پر زور کا تھپڑ زبیر کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ بھی بھل بھل رونا شروع ہو گیا۔

"مرن جوگیا کی ہو گیا جے انہیں تیرا فیڈر پی لیا۔۔۔ کار تاڑے بھتیرا کھان نوں اے (مر جاؤ تم کیا ہو گیا؟ اگر اس نے تمہارا فیڈر پی لیا۔ تمہارے گھر کھانے کو تو بہت کچھ ہے۔)" زلیخا نے اپنا غصہ نکالا۔ تین سالہ عمران کی ساری حسیات جاگ گئی تھیں۔ ننھا ذہن رشتوں کی کچی پکی پگڈنڈیوں کو سیدھا سادا سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ نفرت اور بے زاری کی لذت سے آشنا ہو گیا تھا۔

سارا وقت جو اس کا زلیخا کے ہاں گزرتا اتنا تکلیف دہ ہوتا کہ وہ اپنی عمر کے برعکس چپ چاپ ہوتا چلا گیا۔ اس کی چپ اسے زلیخا کے ہاتھوں پٹنے نہ دیتی مگر زبیر کی ضد اس کو روز مار پڑواتی۔ وہ زبیر کو صرف دودھ ہی دیتی۔ بلکہ کبھی کبھی دودھ بھی نہ دیتی۔ ان کو ان کے گھر لے جانے سے پہلے وہ انہیں خوب سارا پاؤڈر لگاتی۔ بے بی لوشن لگاتی۔ صاف ستھرا بنا ڈالتی اور سارے راستے عمران کو خاموش رہنے کی تاکیدیں کرتی۔ ورنہ

اگلے دن کی مار کا ڈراوا دیتی تھی۔ وہ جو اپنی مما کو سب کچھ بتانے کا سوچتا۔ زلیخا کی کرخت خوفناک آنکھوں سے ڈر کر کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔

حسرتوں کو کبھی بھی دل کا مکین نہیں بننا چاہیے یہ خواہشوں کے دروازے کی کنڈی کھول دیتی ہیں اور خواہشوں کا ریلا اصل نقل سب کچھ بہا دیتا ہے۔ بکل مار کر عزت خاموش ایک کونے کھدرے میں جا گھستی ہے۔ وہ اپنی بے بسی کا تماشا دیکھتی ہے۔ ایک تماش بین کی طرح دنیا کی تماشا گاہ کا حصہ بن کر اپنا آپ لٹا کر خواہشوں کے منہ زور ریلے پر کچی اینٹوں کی کھوکھلی دیواریں چنوا دیتی ہے۔ جس پر پھر سے سیمنٹ اکھڑ جاتے ہیں۔ اینٹیں ٹوٹ جاتی ہیں اور نئے راہگیر نئی اینٹیں بن کر خواہشات کو تشنگی مٹانے کا موقع فراہم کر دیتے ہیں۔

اس کی شادی ایک بڑی عمر کے مرد سے ہوئی تھی۔ ماں باپ نے مالدار آسامی ڈھونڈلی تھی۔ وہ جو ہیرو کے خواب دیکھتی۔ ایک بانکے سجیلے خوب صورت نقوش والے مرد کے۔۔۔ یہاں کہانی ہی الٹی پڑ گئی۔ وہ تو وحید مراد، رشی کپور کے خواب دیکھتی۔ اسے ملا بھی لئیق علی۔۔۔ جو اتنا لمبا اور موٹا تھا۔۔۔ اسے لگا وہ دولہا نہیں دولہا کا باپ ہے۔

وہ عین نکاح پر ہی رو پڑی۔ ماں باپ نے جیسے تیسے نکاح کروایا۔ رخصتی کی۔۔۔ وہ ہی جانتے تھے۔

غزل کے لیے تو دنیا زیرو کے اندر بس کر رہ گئی۔ وہ چاروں جانب گھومتی، سر پٹختی مگر زیرو کی چار دیواری اسے۔۔۔ گھما کر اسی مقام تک لے آتی۔ اسے اپنا آپ جال میں پھنسی مچھلی کی مانند لگتا۔ جو تڑپتی ہے، روتی ہے، پر بے بس ہے۔ اس کا جال لئیق علی کی موت پر ٹوٹا تھا۔

پنجرے سے آزاد پنچھی کو آزادی کیسی نعمت لگتی ہے۔ اس کی سانسیں پوری ہوا پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتی ہیں۔ اس کی رگوں کا خون خوشی و ترنگ کا ہر احساس جذب کر لینا چاہتا ہے۔ دنیا کسی دلہن کی طرح اس کے لیے سج سنور جاتی ہے۔ اس کے ماہ و شب آزادی پا لینے کے بعد وقت کا ایک ایک لمحہ قید کر لینا چاہتے ہیں۔ وہ بھی آزادی کی خوشی کو پوری طرح منانا چاہتی تھی۔ وہ روز سجتی سنورتی نئی نئی راہیں تلاش کرتی، نئی دوستیں بناتی۔ نئی منزلوں میں بھٹکتے ہوئے خواہشوں کی تشنگی کو مٹانے لگی۔ اس کے کتنے ہی نوجوان لڑکے دوست بن گئے تھے۔ عمران کے لیے سارے اس کے انکل تھے۔ اسے زلیخا نے کہا تھا کہ یہ تمہاری ماں کے "یار" ہیں۔ اسے "یار" کا مفہوم نہیں آتا تھا۔ چوکیدار چچا نے اسے بتایا تھا۔ "یار" دوست کو کہتے ہیں۔ وہ اپنی مما کے دوستوں سے بڑی محبت سے ملتا۔ مما بڑی تھیں مگر مما کے دوست چھوٹے چھوٹے تھے۔ زلیخا بتاتی کہ تمہاری ماں کے یار انیس بیس سال سے زیادہ کے نہیں ہیں بڑے لڑکوں سے وہ ڈرتی ہے اسی لیے چھوٹوں کو دوست بناتی ہے۔ عمران کو لگتا مما صحیح کرتی ہیں کلاس میں بھی تو بڑے لڑکے ہمیشہ چھوٹوں کو مارتے ہیں۔

پھر مما کے پاس پیسہ ختم ہونے لگا تھا۔ ایک دن مما لاؤنج میں رو رہی تھیں۔ عمران کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ وہ خوشی سے رو رہی ہیں۔ انہوں نے ایک نیا کاروبار شروع کیا ہے۔ اس میں انہیں ڈھیروں پیسے ملیں گے۔ پھر وہ باہر چلے جائیں گے۔ عمران کو بھی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ وہ زلیخا سے دور کہیں دور چلے جائیں گے۔ جہاں پھر وہ انہیں نہ مارے گی نہ ڈرائے گی۔

زبیر دن بہ دن کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ مما ایک دفعہ ایک انکل کے ساتھ اپنے کمرے میں ہی رہ گئی تھیں۔ زبیر کو عمران نے اٹھانے کی بے انتہا کوشش کی مگر وہ جاگ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ مما کو بلانے چلا گیا۔ مما نے انہیں اپنے کمرے میں بلا اجازت آنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ مگر وہ زبیر کی پریشانی میں بلا اجازت کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

"اندر کا منظر۔۔۔" اس کا ننھا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا۔ انکل اور مما۔۔۔ وہ بھاگتا ہوا چوکیدار چچا کے پاس گیا تھا۔ بارش کی طرح برستی آنکھیں نجانے کس

احساس کے تحت برس رہی تھیں۔ وہ چوکیدار چچا کو بتاتے روتے روتے ان کے گلے سے لگ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ تو ایک نئی دنیا میں آگیا ہے بے ہوشی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ وہ زندگی میں باربار سوچتا کہ کاش وہ اسی بے ہوشی کی نذر ہو کر زبیر کی طرح یہ دنیا چھوڑ جاتا مگر وہ زندہ تھا۔ پاؤں کے نیچے زمین نہ ہونے کے باوجود بھی پورے قد کے ساتھ کھڑا تھا۔

شعور کی منزل کی طرف پہلا قدم ۔۔۔ اس کا ہاتھ تھاما تھا چوکیدار چچا نے ۔۔۔ اور اسے مذہبی تعلیم چوکیدار کی بیوی خالہ بشریٰ نے دی تھی۔

وہ اکثر و بیشتر بد کردار عورت کا جہنم میں کیا حشر ہوتا ہے' اسے بتاتی رہتیں۔ چچا ۔۔۔ ڈانٹتے' منع کرتے کہ وہ بچے کے سامنے ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں مگر ان کا اپنا نقطہ نظر تھا' ان کا خیال تھا کہ وہ اسے ان کی ماں سے متعلق عذاب کی وعید سنا کر تسلی دے رہی ہیں۔ مگر وہ جانتا تھا اور اس کا دل ۔۔۔ کہ وہ تسلی دے رہی ہیں یا اسے مزید عذاب میں مبتلا کر رہی ہیں۔ عمر رواں کا ہر سال اس کا ماضی اس کے سامنے آشکار کر رہا تھا۔ ماضی چاہے کتنا ہی بوسیدہ' تلخ اور کڑوا ہو۔ انسان کے دماغ میں اس کی یادداشت پوری جزئیات کے ساتھ واضح ہوتی ہے۔ وہ ایک منظر کسی آسیب کی طرح اس کی دماغ کی دیواروں سے چمٹ گیا تھا۔ دنیا کا کوئی کلینزر بھی اسے نہ مٹا سکتا تھا۔ وہ بس ٹیومر تھا جو بڑھتا جاتا اور وہ تکلیف اسے راتوں کو جگاتی۔

وہ اسٹڈی میں بے انتہا محنت کرنے لگا۔ چچا نے صرف اسے دس جماعتیں پڑھائی تھیں۔ باقی کی تعلیم اس نے اپنی محنت کے بل بوتے پر پوری کی۔ اسکالر شپ پر وہ این ای ڈی یونیورسٹی چلا گیا۔ وہاں اس کی ملاقات سلیمان صاحب سے ہوئی تھی۔ اس کی محنت اور لگن نے اسے آج میڈیا کا کارآمد کارندہ بنا دیا تھا۔

اس کی ماں کئی سال پہلے جیل کی سلاخوں کی نذر ہو گئی تھی۔ اسے نوجوان لڑکیوں کو اسمگل کرنے کے الزام میں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس نے کبھی ماں کی شکل نہ دیکھی تھی۔ وہ تو ابھی اس کے پرانے نقوش ذہن سے مٹانے کے جتن کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح سے وہ کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ کن من برستی بوندوں نے موسلا دھار بارش برسائی تھی۔ اماں کی طبیعت خراب تھی جب کہ سحر خراب موڈ لیے کمرے میں لیٹی تھی۔ خود ہی ٹھیک ہو کر ابھی ساتھ آکر کام کروا دے گی۔ وہ خود کو تسلی دے کر کاموں میں جت گئی۔ پہلے ناشتا بنایا پھر چارپائی سرف اور برش کے ساتھ رگڑ رگڑ کر دھوئی۔ برستی بارش نے چھت پر موم جامے کی شیٹیں بچھانے کے باوجود کونے سے ٹپکنا شروع کر دیا تھا۔ سارا پانی ان کے واحد بڑے کمرے میں ٹپک ٹپک کر بیڈ پر اور قالین پر گند مچا رہا تھا۔ وہ مٹی کو ٹب میں ڈالے چھت پر لے آئی۔ اس کا خیال تھا تھوڑا اسے گوندھ کر کونے سے لپائی کر دے گی۔ وہ سحر کو آوازیں دینے لگی مگر آج اس نے ڈھیٹ پن کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ وہ غصے سے نیچے آگئی۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟" مشعل نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"کیوں؟ سارے کام ہم نے ہی کرنے ہیں۔" بلاوجہ آنسو آنکھوں میں اُمڈ آئے تھے۔ اس کا ایف اے کا رزلٹ نہیں آیا تھا۔ بورڈ میں جا کر خود لانا تھا۔ سعد کی ڈیوٹی اتنی سخت تھی وہ بے چارہ اتوار کو فارغ ہوتا اور اس دن بورڈ والوں کا آفس بند ہوتا۔ جبکہ وہ دونوں اتنی دور جانے کی متحمل نہ تھیں۔ ابا کو صبح کہا تو ہمیشہ کی طرح وہ کان لپیٹے سنتے رہے۔ جواب ندارد۔ ایسی زندگی سے تو بہتر ہے نہ ہی زندہ رہو ۔۔۔ وہ جھنجلا پڑی۔ کام ۔۔۔ کام ۔۔۔ کام گھر کے بھی اور باہر کے بھی اسے روز سے زیادہ ابا پر غصہ آیا۔

"جو لوگ کاموں کو بوجھ سمجھتے ہیں۔ تو اللہ بھی ان پر سے کاموں کی برکت کو اٹھا دیتا ہے۔ وہ بوجھ سمجھنے والوں کو بوجھ بننے والے کام ہی عطا کرتا ہے۔ اسی لیے انہیں معمولی معمولی کاموں پر بھی الکسی اور سستی پڑی رہتی ہے۔ چھوٹا سا کام بھی انہیں بھاری لگتا ہے اور تمہاری زندگی کئی لوگوں سے بہتر ہے ہر وقت ناشکری نہ کیا کرو۔" مشعل نے اسے خوب لتاڑا۔

"آپ کو تو ہر وقت نصیحتیں کرنے کے لیے میں ہی نظر آتی ہوں۔ براہ مہربانی میرے کام کا بھی بتا دیں کہ کیا کروں؟" وہ اس کے چہرے کا اطمینان کو دیکھ کر مزید جھنجلائی۔

مشعل بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی انتہائی سکون میں رہتی۔ جبکہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی کڑھتی رہتی تھی۔

"میں عمران بھائی سے کہتی ہوں۔۔۔"

وہ یکدم کسی خیال کے تحت چونکی۔

"کون عمران بھائی؟" جانتے ہوئے بھی مشعل نے ابرو اچکائے۔

"آپ جانتی ہیں۔۔۔" سحر نے مسکراہٹ دبائی۔

"خبردار دو تین بار کی ملاقات پر کسی اجنبی کو منہ لگایا۔" وہ اسے گھرکنے لگی۔

"جب اپنے کام نہ آئیں تو اجنبی سے مدد لینے میں کیا حرج ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"نہیں بالکل نہیں ۔۔۔ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔ جب تم نے اس کا وزٹنگ کارڈ پکڑا تھا۔ تب ہی مجھے تم پر شک ہو رہا تھا۔ کہ تم باز نہیں آؤ گی۔" وہ سحر پر باقاعدہ برسنے لگی۔

"آپی! مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آپ کو اتنا غصہ کیوں آرہا ہے؟" وہ بھی غصے سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

جبکہ مشعل خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے چھت پر آکر ان دراڑوں کی لپائی شروع کر دی۔ جن کی وجہ سے چھت ٹپک رہی تھی۔ مٹی سے لتھڑے ہاتھوں کے ساتھ وہ وہیں تھک کر بیٹھ گئی۔ بے خیالی میں اپنے ہونٹ کچلنے لگی۔ یہ تو بے جان چھت تھی جس کی دراڑیں وہ مٹی کی لپائی سے ٹھیک کر سکتی تھی۔ مگر سحر کی شخصیت میں پڑ جانے والی دراڑوں کو وہ کیسے پر کرتی۔ بہت سی باتوں کو ہمیشہ کی طرح اس نے اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔

عمران نے سحر کی کال پر دوسرے ہی دن اس کا رزلٹ کارڈ لا دیا تھا۔ بلکہ اسے اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کال آپریٹر کی جاب بھی آفر کی تھی۔ تنخواہ پر کشش تھی۔ مشعل نے سنتے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔ سحر کا منہ بن گیا۔ بھلا ایف اے پاس کو اتنی جلدی اتنی اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر آپی کی بھی اپنی ہی وضع داری تھی۔ عمران نے سنتے ہی ان کے گھر کا دوبارہ چکر لگایا تھا۔

اب کی بار اس کا مخاطب جہاں آرا تھیں۔ اس نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پردے کے سامنے نہ سہی ۔۔۔ پردے کے پیچھے کال آپریٹر کی جاب اتنی بری بھی نہ تھی۔

"آپ کو اتنی ہمدردی کا بخار کیوں چڑھا ہوا ہے؟" مشعل ضبط کی انتہاؤں پر پہنچ چکی تھی۔

یہ اس کا لہجہ نہ تھا۔ مگر سحر کی ہٹ دھرمی جو زندگی میں وہ پہلی دفعہ محسوس کر رہی تھی اور عمران کے باربار کے چکر نے اسے غصہ دلایا تھا۔

عمران کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ اس کی اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"آنٹی! اگر آپ کو اس میں کوئی برائی نظر آتی ہے تو بے شک آپ سحر کو نہ بھیجیں جاب پر ۔۔۔ جہاں تک ہمدردی کی بات ہے۔ تو میں ہمدردی نہیں صرف مدد کر رہا ہوں۔ خوددار لوگوں سے ہمدردی نہیں کی جاتی۔ ان کی مدد کی جاتی ہے۔ میں نے خود ایک سیلف میڈ لائف گزاری ہے۔"

وہ خاموشی سے چابیاں اٹھا کر وہاں سے چلا آیا۔

"تمہیں ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی بیٹا! ضروری نہیں ہر شخص برا ہو۔ اللہ نے بندے کو اتنی تو پہچان کی نظر عطا کی ہے۔" جہاں آرا نے مشعل کو سمجھایا۔ سحر پہلے ہی خفگی سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔ جبکہ وہ صرف اس کی "سیلف میڈ" پر ہی ٹکی رہ گئی۔

سحر نے دو دن موڈ آف کیے رکھا۔ مشعل کو پہلی دفعہ اس سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔

"آپی پتا ہے مسئلہ کیا ہے؟ آپ ہر وقت بدگمان رہتی ہیں اور بدگمان لوگ دنیا میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کرپاتے۔"

سحر نے دال بھگوتی مشعل کے بلانے پر اس پر ٹھنڈا ٹھار طنز کیا تھا۔

وہ دال کو خاموشی سے بھونے مسالے میں ڈالنے لگی۔

"بدگمانی کے پیچھے بے سائبانی کا ڈر کارفرما ہے۔" اس نے سحر سے کہا۔

"چچ چچ۔۔۔ اللہ پر اتنا اعتقاد اور ابھی بھی بے سائبانی کا ڈر؟ آپی یقین اور اعتقاد کے درمیان ہمیشہ ایک پتلی پرت ہوتی ہے جب اعتقاد ڈولتا ہے تو یقین وہ پرت پھاڑ ڈالتا ہے ہلکی بے یقینی اس کی اوٹ سے جھانک کر آپ کا اندر کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اسی لیے تو مسلمان۔۔۔ مسلمان ہوتے ہوئے بھی نام کی حد تک محدود رہ جاتا ہے۔۔۔ یقین کریں اس رب پر تو پورا۔۔۔ ورنہ کریں ہی نا۔۔۔"

وہ سحر زدہ ہو کر سحر کے الفاظ سننے لگی۔

"یہ تمہارے الفاظ نہیں ہو سکتے اتنا تو میں تم کو جانتی ہوں۔" وہ ٹرانس کی کیفیت میں بولی۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا۔۔۔ یہ عمران بھائی کے الفاظ ہیں۔ انہوں نے آپ کی شخصیت کو مد نظر رکھ کر ہی کہا تھا۔" وہ اطمینان سے گاجر کترنے لگی۔

"تمہارا اس کے ساتھ رابطہ ہے۔۔۔"

"ہاں ہے۔۔۔ اور اصلی بہنوں والا۔" وہ فخر سے مسکرائی۔

"منہ بولے بہن بھائی نہیں ہوتے۔" وہ ابھی مزید کچھ کہتی۔ مگر سحر نے قطعیت سے اس کی بات جھٹک دی۔

"سگے تو پھر "باپ" بھی نہیں ہوتے۔ جب سگے باپ صرف منہ بولے باپ بن کر رہ جائیں تو منہ بولے بہن بھائی کیوں نہیں؟" وہ اس کی بات پر ششدر رہ گئی۔

سحر کی ذہنی رو جدھر بہہ رہی تھی۔ وہ اسے روکنے سے قاصر تھی۔

"اور ہاں کل سے میں جاب پر جاؤں گی۔ امی نے مجھے اجازت دے دی ہے۔"

بہت سارے سوالات اس کے ہونٹوں کی دونوں لکیروں میں ہی کھو گئے۔ وہ بغیر نے اپنی سنا کر چلی گئی۔

جبکہ وہ باقی ماندہ برتن دھو کر مزید زندگی کے اگلے رخ کا سوچنے لگی۔

سحر کے جاب کرنے پر گھر میں رونق آگئی تھی۔ وہ گھر جہاں صرف اینٹیں بچھا رہی تھا۔ اب صحیح معنوں میں گھر لگنے لگا تھا۔ سحر نے اپنے اور مشعل کے کمرے میں لکڑی کی الماری بنوالی۔ ایک عدد ٹی وی خرید لیا۔ کارپٹ ڈلوالیا۔

اماں کے لیے انسولین کے ٹیکے باقاعدگی سے آنے لگے۔ ان کی حالت بھی پہلے سے بہتر رہنے لگی۔ گھر کی دیواروں سے زندگی جھانکنے لگی تھی۔ مشعل نے آخری سمسٹر کے پیپرز بھی دے لیے تھے۔ وہ بہت اچھی لکھاری تھی۔ ایک مقامی اخبار سے اُسے سب ایڈیٹر کی نوکری کی آفر ہوئی تھی۔ سحر نے سنتے ہی خوشی کا اظہار کیا۔ سعد نے بھی اسے جاب کا مشورہ دیا۔

"ہم سب کمیٹی ڈال کر گھر پکا کروائیں گے۔" سعد کی خواہش کو وہ رد نہ کر سکتی تھی۔ یہ اس کا وہ بھائی تھا جس نے بہت بچپن سے ہی ان دونوں بہنوں کے لیے بڑی قربانی دی تھی۔ ان کی خاطر تعلیم کو خیرباد کہہ کر چھوٹی عمر میں ہی بھاری ذمہ داریاں اٹھالی تھیں۔

"عمران بھائی کہتے ہیں لڑکیوں کو کبھی کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ یونہی سر اٹھا کر بہادر بن کر زندگی کی بقا کے لیے لڑنا چاہیے۔ رونے دھونے اور قسمت کوسنے سے صرف وقت ضائع ہوتا ہے۔ باہمت اور ثابت قدمی سے اپنی منزل پانی چاہیے۔ دنیا میں کہیں نہ کہیں ہمارا حصہ ضرور چھپا ہوتا ہے۔"

"عمران بھائی کے اقوال پر تم ایک کتاب ہی کیوں نہیں لکھ لیتیں۔"

مشعل خوامخواہ چڑ جاتی

"آپی! آپ میرے سے اچھا لکھتی ہیں۔ آپ ہی بسم اللہ کریں۔" سحر شرارتی ہو جاتی۔

عمران کی اماں اور سحر سے خوب بنتی اب تو سعد سے بھی دوستی تھی۔ صرف اس کی موجودگی میں وہ خاموش رہتا۔ وہ بھی ادھر ادھر ہو جاتی۔

سعد شیف کا کورس کر کے دبئی چلا گیا۔ اچھے دنوں نے ان کا گھر جگمگا دیا تھا سحر اور مشعل نے وہی گھر پکا کروا لیا۔ اماں نے کمیٹیاں ڈال کر ضروری سامان بھی خرید لیا۔ اب فریج بھی تھا اے سی بھی۔۔۔

سحر نے ایلوویرا کے پودے لا کر رکھے جبکہ مشعل نے سب ایڈیٹر سے ایڈیٹر کی تقرری ہونے پر نیلے پتھروں کی اسے چھوٹی سی آبشار بنوا دی۔ بوگن ویلیا کی بیل بھی لگائی گئی۔

اپنی محنتوں سے انہوں نے اس چھوٹے سے گھر کو ہی خواہشوں کا محل بنا دیا۔ اماں کی عبادتیں اور سخاوتیں پہلے سے بھی بڑھ گئیں۔ یہ سب ان کے صبر کا انعام تھا۔

مگر آزمائشوں کا دور ابھی اختتام پذیر نہیں ہوا تھا۔

وہ دونوں سردیوں کی اس سرمئی شام میں جب گھر واپس آئیں تو اماں کی حالت دیکھ کر چیخ پڑیں۔ ابا نے اماں کو بے تحاشا پیٹا تھا بلا سبب، بے دریغ۔

وہ نفسیاتی مریض تھا یا کچھ اور۔۔۔ سحر اور مشعل کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔

"میں اس شخص کو ابھی گھر سے نکالوں گی۔" سحر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"نہیں۔۔۔" اماں نے درد کی شدت سے بمشکل اسے اس فعل سے باز رکھا۔

"اماں! ظلم کی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ چیخی تھی۔ جبکہ مشعل کا آج خود بھی چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

"سعد نہیں ہے، تم ان کو ایسی کوئی بات نہیں کہو گی۔" مشعل نے خود پر ضبط کیا۔

"نہیں یہ ہمارا گھر ہے۔ ابا یہاں سے چلے جائیں۔" وہ غصے کی شدت میں تھی۔

ابا اپنی ٹوپی سیدھی کیے جونہی گھر میں داخل ہوئے وہ تیر کی طرح ان کی جانب بڑھی۔

مشعل نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ جبکہ جہاں آرا نے بھی اپنے شکستہ وجود کے ساتھ خود کو باہر گھسیٹا۔

"ابا! نکلیں اس گھر سے۔" اس نے ابا کو دہلیز پر ہی روک دیا۔

انہوں نے نفرت بھری نگاہ سے چھوٹی بیٹی کی طرف دیکھا۔ جو ہمیشہ سے ہی ان کی نظر میں زور آور تھی۔

"ابھی اور اسی وقت۔۔۔ ورنہ میں پولیس کو بلوالوں گی۔" اس کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ بے حس وجود میں حرکت پڑی۔ انہوں نے بیٹی کے بال نوچنا چاہے مگر وہ جہاں آرا نہیں تھی۔ باپ کا احترام کیا ہے۔ وہ اس سے بھی نابلد ہو چکی تھی۔ اس وقت اس کے سامنے صرف ایک وحشی شخص تھا۔ جو ہمیشہ اس پر اور اس کی ماں، بہن پر ظلم بڑھاتا آیا تھا۔ اس نے ابا کو زور کا دھکا دیا۔ ابا شاید اس کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ منہ کے بل گر پڑے۔ ان کی ناک سے اور ماتھے سے خون کی لکیریں نکلی تھیں۔

مشعل کی چیخ نکل گئی۔ جبکہ سحر بے تاثر چہرے کے ساتھ نفرت سے باپ کو دیکھ کر بہن کو کھینچتی کمرے میں لے آئی کہ مبادا وہ گرے ہوئے شخص کو پھر سے نہ اٹھا دے۔

ظفر محی الدین کے اندر نفرتوں کی توڑ جوڑ شروع ہو گئی۔ پیٹ میں بڑی کئی گرہیں کھلی تھیں۔ جو جذبہ وہ خود نہیں محسوس کرتے تھے۔ آج انہوں نے اپنی بیٹی میں دیکھا تھا اور خود پر نفرت کا بیتنا کیسا ہوتا ہے؟ اس کا پتا خود پر آشکار ہونے کے بعد ہی پتا چلتا ہے۔ اپنی تنگ نظری اور نفرت کے ہاتھوں دوسروں کو پامال کرنا آسان ہوتا ہے۔ ویسے بھی دوسروں پر کیا جانے والا تجربہ ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ خود پر کیا جانے والا تجربہ ویسا ہی ہے۔ جیسا اس سائنسدان نے کیا تھا جو تیزاب کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا اور موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔

وہ اندر کی پکڑ دھکڑ کو سنبھالے کمرے میں بمشکل

آئے تھے۔ مگر آج کے بعد ان کے لیے سارے کمروں میں دروازے بند ہو گئے تھے۔

سعد کو سحر نے میل کر کے بتایا تھا۔ وہ اگلے ہی دن کی فلائیٹ سے پاکستان آگیا۔

انہوں نے گلستان کالونی میں چھوٹا سا نیا گھر لے لیا تھا۔ سپنوں کا محل، بوگن ویلیا، آبشار، ایلوویرا کے پودے، چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشیں، تشنگی آمیز بچپن، محرومیاں، اور ابا اسی گھر میں رہ گیا تھا۔ سب کچھ پیچھے چھوڑے سارے سپنے بھلائے وہ اماں کو لے کر نئے گھر آباد ہو گئے تھے۔

عمران بھائی سے ملاقات کو کتنے ہی دن بیت گئے۔ سحر سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اور مشعل اپنی صحافتی ذمہ داریوں میں مصروف سعد واپس چلا گیا تھا۔ اماں کا وہ پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتیں۔ اماں نے بارہا انہیں ابا کا پتا کرنے کو کہا۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح ٹال جاتیں۔

مشعل نے عید کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ وہ سحر کو اس کے آفس سے لینے آئی۔ عمران صاحب کے بارے میں آج کل ایک خبر بڑی شد و مد کے ساتھ اخباروں میں گردش کر رہی تھی۔

مشعل کا ارادہ ان سے ملنے کا بھی تھا۔ اس نے سحر کو اپنے آنے اور عمران صاحب سے ملنے کا عندیہ دیا۔ یہ اتنے عرصے میں پہلی دفعہ ہوا تھا کہ مشعل خود اس سے ملنا چاہ رہی تھی۔

سحر نے اسے عمران صاحب کا دفتر بتایا۔ اس کا تھوڑا سا کام رہ گیا تھا۔

"تم اپنا کام مکمل کرو۔ تب تک میں ہو کر آتی ہوں۔"

"ضرور ضرور۔" سحر نے مسکراہٹ دباتے کہا۔ جبکہ مشعل نے اس کی مسکراہٹ کو گھورتے ہوئے مصنوعی خفگی دکھائی۔

وہ دستک دے کر کمرے میں آئی۔ وہ جیسے اسی کا منتظر تھا۔

مشعل خود اعتمادی کو ادھر ادھر اڑتا محسوس کرنے لگی۔ اس نے بلیک شرٹ اور جینز پہنی ہوئی تھی اور اتفاق سے وہ بھی آج بلیک کرتا شلوار میں تھی۔

اس شخص کی آنکھیں جتنی خوب صورت تھیں۔ اتنی ہی بولتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ ان آنکھوں کو بمشکل دیکھ سکی۔

جہاں احترام، عزت، رشتوں کا مان اور کچھ اور رنگ بھی بڑے نمایاں تھے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔

"ایسے فضول نہ دھڑکو، خبردار کوئی فلمی سچویشن کری ایٹ کی۔" وہ دل کو ڈپٹ کر بولی۔ جو بلاوجہ سنجیدہ صورت حال میں بھی اپنی ہی ڈگڈگی بجانے لگتا۔

ویسے بندہ پرسنالٹی والا ہے۔ اس کی سحر انگیز شخصیت آج معمول سے زیادہ شدید طریقے سے محسوس ہونی شروع ہوئی تھی۔ وہ خود سے بے زار ہو گئی۔

"جی فرمائیں۔۔۔" وہ مشعل کی چپ پر خود ہی مسکرا کر بولا۔

"وہ در حقیقت میں۔۔۔ میں یہاں۔۔۔" اسے سب بھول گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے اور کیا کہنے لگی ہے۔ وہ کم از کم اس خبر کی بابت پوچھ کر اتنے اچھے شخص کے چہرے پر دکھ کی لکیر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ بہت اچانک سے اس پر انکشاف ہوا تھا۔ میں اس شخص کے لیے ایک بھی تکلیف نہیں برداشت کر سکتی۔

ایک ہلکی سی سنسناہٹ پورے وجود میں پھیل گئی اور وہ ساکت بیٹھی چپ چاپ خود کو بے بس دیکھ رہی تھی۔

"مشعل! آپ جو پوچھنے آئی ہیں۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ جس طرح میری پیدائش میرا قصور نہیں۔ اسی طرح غزل احسان کا میری ماں بننا بھی میرا قصور نہیں۔۔۔"

وہ بلا سبب نہیں آسکتی تھی اور وہ کیوں آئی تھی؟ وہ جانتا تھا۔ اس کا گریز اور اس کے لفظوں کا کھو جانا اسے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ اسے بتانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے پاس ابھی ایسا اس کے ساتھ کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ ورنہ وہ بڑی شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ اس کو بتائے کہ وہ اسے کتنی اچھی لگتی ہے اس کے خوددار، بارعب طور اطوار، مردوں سے گریز کیا دیا انداز اور بے ریا، معصوم چہرہ اسے کتنی راتیں جگاتا ہے۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اصل خوب صورتی عورت کی کیا ہے؟

"حیا" جو اس کے گھر کی تینوں عورتوں میں تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ عورت کی عزت کیسے کی جاتی ہے۔ اسی نے اسے سکھایا تھا کہ جو عورتیں اپنی عزت خود کروانا جانتی ہیں دنیا ہمیشہ ان ہی کی عزت کرتی ہے اس کے باپ کی شخصیت نے اسے سمجھایا تھا کہ اس کی ماں یا دنیا کی ساری عورتیں ہی بری نہیں ہوتی بلکہ کچھ مرد بھی برے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کے رنگ ہیں اور اللہ کی مرضی کون سا رنگ کس پر کس طرح سے جما دے۔ کسی کو خواہشات کا رنگ مل جاتا ہے۔ جس کے آگے کچھ نظر نہیں آتا تو کسی کو تنگ دلی، تنگ نظری اور بے حسی دان کر دی جاتی ہے۔ ہر کوئی اس عجائب گھر (دنیا) میں اپنے اپنے رنگوں میں رنگا رہ جاتا ہے۔

بس سب سے اچھا رنگ تو اللہ کا ہے۔ اللہ کا رنگ پاکیزہ، حیا والا، احترام والا پکا رنگ۔۔۔ جو اس میں رنگ جائے اس کی دنیا و عاقبت دونوں ہی سنور گئیں۔

☼ ☼ ☼

جہاں آرا نے دونوں جگہوں پر ماں کا رول نبھایا تھا۔ ایک ریاضت کاٹ کر انہیں خوشیاں نصیب ہوئی تھیں۔ مشعل اور عمران کی جوڑی اتنی زبردست لگ رہی تھی۔ سحر نے کلک کلک کر کے ڈھیروں تصویریں بنا ڈالیں۔

جبکہ تنہائی میں بیٹھے دو وجود اپنے ماضی کے کارناموں پر سر پیخ رہے تھے۔ ان کی سزا دنیا میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ ایک جیل میں بیٹھا وجود اور دوسرا بوگن ویلیا کی بیل کے نیچے زار و قطار روتا وجود۔۔۔

"میں اپنے بیٹے کا نام عبداللہ رکھوں گی۔" جہاں آرا نے مشعل کے بیٹے کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں اس کا نام میں نے زبیر رکھا ہے۔" عمران نے چونک کر مشعل کا چہرہ دیکھا۔

"اچھا ٹھیک ہے، زبیر رکھ لو۔" اماں فوراً مان گئیں۔

وہ کافی دنوں سے عمران سے ضد کر رہی تھی اور عمران کو آخر ماننا ہی تھا۔ وہ مشعل کی ضد سے ہار مان گیا تھا۔ مشعل کے آنسو، عمران کو ہمیشہ پسپا کر دیتے وہ دونوں جیل سے غزل احسان کو چھڑا لائے تھے۔ بائیس سالوں کی قید اور گناہوں کی فہرست نے انہیں خوب صورت دوشیزہ سے کٹے پھٹے چہرے والی مائی بنا دیا تھا۔

ابا کو فالج ہو گیا تھا۔ جہاں آرا، سحر اور سعد کو حکمیہ انداز میں باپ کو گھر لانے کا کہہ چکی تھیں اور دونوں کے لیے ماں کا حکم ماننا ضروری تھا۔

"معاف کرنا مشکل تھا مگر اللہ کا رنگ لینے کے لیے معاف کرنا ضروری تھا۔" جہاں آرا کے سمجھانے پر اور مشعل کی نیک فطرت نے دو گنہگار والدین کو رلنے سے بچا لیا تھا۔

"سزا دینے والے ہم نہیں جو رب نے سزا دے ڈالی ہے اتنی ہی کافی ہے۔"

سحر کو سمجھاتے ہوئے جہاں آرا نے کہا تھا۔ جسے سمجھانا ہمیشہ ہی ان کے لئے مشکل ہوتا تھا۔

☼ ☼

بقیہ سروے

★ "بہت اچھا محسوس ہوا ہوگا۔۔۔ حکومتی سطح پر کوئی ایوارڈ ملا؟"

✳ "ہاں۔۔۔ مگر بہت اچھا نہیں۔۔۔ صوبائی لیول پہ رؤف صدیقی نے پروگرام کیا تھا نومبر 2007ء میں اور نعت خوانی کے لوگوں کو بلا کر باقاعدہ جیوزی کو بیٹھا کرا ایوارڈ دیے تھے اور وہ پروگرام لائیو ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔"

★ "کتنی سی ڈیز آچکی ہیں اور فیوچر میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

✳ "میری 16 یا 17 سی ڈیز آچکی ہیں اور یہی میرا فیوچر ہے۔ بس سلسلہ رکنا نہیں چاہیے۔ اللہ میری آواز کی حفاظت کرے اور مجھے پڑھنے کی طاقت دے۔"

★ "آپ نے کہا تھا کہ میں نے ایک مرتبہ ڈائجسٹ پڑھنا چاہا تو والد صاحب نے ڈانٹا کہ اس میں اچھی باتیں نہیں لکھی ہوتیں تو پھر انٹرنیٹ اور فیس بک جس میں سب کچھ اوپن ہے اس کو استعمال کرنے کی اجازت کیسے مل گئی؟"

✳ "بس ایک ہی بار ڈانٹا تھا اس کے بعد میں نے خود ہی نہیں پڑھا اور اب میں بچی نہیں ہوں، میری شادی ہو چکی ہے اور فیس بک پہ میرے بہت فینز ہیں میرا اپنا ایک پیج ہے مگر مصروفیت کی وجہ سے زیادہ ٹائم نہیں دے پاتی جب میں میلاد میں سے واپس آتی ہوں تو پھر اپنی بیٹی کو ٹائم دیتی ہوں۔"

★ "میں نے تحریم منیبہ شیخ کا انٹرویو کیا تھا تو وہ بتا رہی تھیں کہ انہوں نے رمضان المبارک میں ایک چینل سے لائیو پروگرام کیے تھے سحری کے۔۔۔ آپ کو ایسی آفرز ہیں؟"

✳ "جی میں کافی پروگرام ہوسٹ کرتی ہوں اور کافی عرصے سے "کیو ٹی وی" سے کر رہی ہوں پہلے بچوں کا پروگرام کرتی تھی اس میں بچے نعت خوانی سیکھا کرتے تھے اور اب ذرا بڑی بچیوں کے ساتھ یہ پروگرام چل رہا ہے۔ اس میں ہم ایکسپرٹ لوگوں کو بلاتے ہیں جو سکھاتے ہیں اس طرح میں نے "لبیک" چینل میں رمضان المبارک کی ہوسٹنگ کی ہے اب تو یہ چینل نہیں آتا۔ اسی طرح "زم زم" چینل پہ لائیو پروگرام کیے ہیں مجھے لائیو پروگرام کرنے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ ریکارڈنگ میں وقت بہت لگ جاتا ہے اور لائیو میں سچ بات ہے کہ ہم اتنی احتیاط سے پروگرام کر رہے ہوتے ہیں کہ غلطی ہوتی بھی نہیں ہے۔"

★ "اب کچھ فیلڈ سے ہٹ کر بات کرتے ہیں۔۔۔ فارغ وقت میں کیا کرتی ہیں اور فیشن سے لگاؤ ہے؟"

✳ "فیشن کا شوق تو ہر عورت کو ہوتا ہے اور مجھے بھی ہے۔ میرا اسٹائل ذرا مختلف ہوتا ہے۔ میں اسکارف اور عبائے کا استعمال کرتی ہوں۔"

★ "عبایا بھی تو اب فیشن بن گیا ہے اب تو کپڑوں سے زیادہ خوب صورت عبائے ہوتے ہیں؟"

✳ "اگر ہم تھوڑے فینسی عبائے پہن لیتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔"

★ "مگر جب آپ اتنے خوب صورت عبائے پہن کر باہر نکلتی ہیں تو مردوں کی نظریں بھی تو آپ پر پڑتی ہیں نا؟"

✳ "صرف عبائے والیوں پر پڑتی ہیں اور خواتین جو فیشن کر کے بغیر دوپٹوں کے نکلتی ہیں کیا ان پر نہیں پڑتیں۔"

★ "وہ تو اس لیے پڑتی ہیں کہ وہ ہوتی ہی بے پردہ ہیں۔ آپ لوگ تو پردے میں ہوتی ہیں؟"

✳ "ہمیں بیلنس کام کرنا چاہیے۔ ہمارے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم مذہبی یا دینی لوگوں پر زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور باقی خواتین کو ان کے حال پہ چھوڑ دیتے ہیں اپنی سوچ کو اچھی راہ کی طرف لے کر آئیں۔"

★ "گھریلو ذمہ داریوں سے کتنا لگاؤ ہے اور ڈرامے وغیرہ دیکھتی ہیں؟"

✳ "میں سب کچھ کر لیتی ہوں۔ جب ٹائم ملتا ہے کوکنگ بھی کرتی ہوں ہماری جوائنٹ فیملی ہے اور زیادہ تر کوکنگ وغیرہ تو میری ساس ہی کرتی ہیں کہ انہیں مصروف رہنا اچھا لگتا ہے اور ڈرامے بہت کم دیکھتی ہوں۔ کیونکہ جس ٹائم ڈرامے آتے ہیں اس ٹائم میں کسی نہ کسی میلاد میں مدعو ہوتی ہوں۔"

★ "مزاجا" کیسی ہیں بچپن سے لے کر اب تک؟"

✳ "میں اکثر لوگوں کے لیے بہت کول ہوں اور ایک زمانے میں میں مشہور تھی کہ میں غصے کی تیز ہوں اور غصہ بھی آتا ہے۔ کیونکہ جیسے لوگ ہوں ویسا ہی ان کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔"

★ "شاپنگ کا کتنا شوق ہے؟"

✳ "اب تو زیادہ تر شاپنگ بیٹی کے لیے کرتی ہوں یا پھر گھر کی ڈیکوریشن کے لیے کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی ہوں۔"

★ "آپ کے شوہر آپ کی نعت گوئی کو کتنا پسند کرتے ہیں اور آپ کی شادی ارینج ہے یا پسند کی؟"

✳ "الحمد للہ، بہت پسند کرتے ہیں اور مجھے ان کی بہت سپورٹ حاصل ہے اور وہ جب کسی محفل میں میرے ساتھ ہوں تو فرمائش کر کے کوئی نہ کوئی نعت ضرور سنتے ہیں اور ہماری ارینج میرج ہے۔"

★ "چلتے چلتے کوئی بات کہنا چاہیں گی اپنے مداحوں سے؟"

✳ "میں یہ کہوں گی کہ ہم جہاں پر ہیں اس سے آگے جانے کے لیے ہمیں اپنے بڑوں کی عزت کرنی چاہیے تاکہ ہمیں پتا چلے کہ وہ اس مقام تک کیسے پہنچے تھے۔"

☼ ☼

فوزیہ ثمر بٹ

اِدارہ

★ "آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"

✳ "فوزیہ' امی جی فوزی کہتی ہیں۔ نک نیم بےبی ہے ویسے اب میں بےبی ہوں نہیں۔"

★ "کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟"

✳ "جی! آئینہ مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے اور میں آئینے کو دیکھ کر ہنستی ہوں۔ شکر ہے اس ذات کا جس نے کوئی کمی نہیں رکھی۔"

★ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

✳ "میرا وہ وقت جب میں اپنے رب کو یاد کرتی ہوں یا پھر اپنی امی جی کی خدمت اور اب اپنی پیاری ہانیہ اور آمنہ کی مسکراہٹ ان کی ہنسی۔"

★ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

✳ "محبت آفاقی جذبہ ہے۔ محبت عزت کے ساتھ ملے تو بیش بہا انعام ہوتی ہے۔ میرے خیال میں انسان ادھورا ہے اس کے بغیر۔ اب یہ تو خود پہ منحصر ہے کہ آپ محبت کو کس عینک سے دیکھتے ہیں۔"

★ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"

انسان جو چاہے پلان کرلے۔ ہوتا وہی ہے جو ازل سے آپ کے نصیب میں مقرر ہے۔ پھر بھی اک خواہش ہے ہمارا گھر بن جائے اور میں حج کی سعادت حاصل کرلوں۔ اک عرصے کی خواہش ہے کہ زمین کربلا دیکھوں؟"

✳ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور و مطمئن کیا؟"

مجھے خوش ہونے کے لیے کسی بڑی کامیابی یا بڑی خوشی کا انتظار نہیں ہوتا۔ میرے لیے ہر وہ لمحہ باعث خوشی ہے جس میں میرا بھائی عمران خوش ہے۔ کیونکہ اپنی ماں کے بعد واحد خوشی میری وہی ہے اس میں آپ ہانیہ کو بھی شامل کرلیں۔"

★ "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

✳ "اپنے رب سے اپنے اچھے مستقبل کی امید۔"

★ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

✳ "خوش مزاج' نرم دل' حساس۔"

★ "کوئی ایسا ڈر' جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"

✳ "گزشتہ زندگی نے اچھا سلوک نہیں کیا بس آنے والے وقت سے خوف آتا ہے پتا نہیں کیسا ہوگا۔"

★ "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"

✳ "میرے اپنے' اپنوں کا پیار۔"

★ "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

✳ "بہت زیادہ ہنس کر' بہن بھائی کے ساتھ شیئر کرتی ہوں ان لمحات کو۔"

★ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

✳ "ہاتھ کی میل ہے یہ دولت۔ آج میری ہے تو کل کسی اور کی۔ بس اگر پاس ہے تو اچھا استعمال کریں۔"

★ "گھر آپ کی نظر میں؟"

✳ "عورت کی پناہ گاہ۔"

★ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کردیتی ہیں؟"

✳ "بھولتی نہیں' پر معاف کردیتی ہوں کیونکہ یہ فعل میرے رب کو بہت پسند ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے۔"

★ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟"

✳ "میری ماں کی دعاؤں اور میرے رب کا احسان کیونکہ مجھے جو بھی ملا ہے دعاؤں سے ملا ہے۔"

★ "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے کاہل کردیا یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

✳ "کیسی ترقی' انسان جانور سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔"

★ "کوئی عجیب خواہش؟"

✳ "کاش میں گجرات کی سڑکوں پہ گاڑی چلا سکوں۔"

★ "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

✳ "موڈ پہ منحصر ہیں اچھا ہے تو نہا کر' اگر نہیں تو پھر رو کر۔"

★ "آپ جو ہیں' وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"

✳ "میرے خیال میں' میں جو ہوں ویسی ہی ٹھیک ہوں مطمئن ہوں خود سے۔"

★ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

✳ "رات کے پچھلے پہر اپنے رب سے باتیں کرتی ہوں یا پھر شاپنگ کر کے مجھے خرچ کرنا اچھا لگتا ہے۔"

★ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

✳ "دوسروں میں خلوص' خود کی خوش مزاجی' بقول شازی کے فوزی تمہاری تو شوخیاں ہی نہیں ختم ہوتیں اور ہانیہ کی ہنسی۔"

★ "کیا آپ نے اپنی زندگی میں وہ سب پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

✳ "ناشکرا پن کروں تو پھر گلے شکوے ہیں رب سے مگر میں ناشکرا پن نہیں کرتی۔ جتنا دیا ہے میرے رب نے میرے اوقات سے بڑھ کر ہے۔ ہر پل اس پاک ذات کے شکر میں گزرتا ہے۔"

★ "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

✳ "خوبی نرم دل' حقوق العباد اور حقوق اللہ پوری دیانتداری سے پورے کرتی ہوں خامی شاید یہی ہے کہ معاف کردیتی ہوں' جس سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اس نے کون سا بولنا ہوتا ہے۔"

★ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کردیتا ہو؟"

✳ "نہیں کوئی خاص نہیں جو بیان کرسکوں۔"

★ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہوجاتی ہیں؟"

✳ "دونوں کام نہیں کرتی بس اللہ پہ چھوڑ دیتی ہوں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

★ "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟"

✳ "میرے حسین' ابن انشاء' دیوداس۔"

★ "آپ کا غرور؟"

✳ "میری رحم دلی' میری خوش مزاجی' میرا درگزر کرنا۔"

★ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کردیتی ہو؟"

✳ "بہت سارے دکھ ہیں جو کبھی کبھی رلاتے ہیں۔"

★ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہوا؟"

✳ "نہیں مجھے کبھی حسد محسوس نہیں ہوا۔ میں نے ہمیشہ اپنی چادر کو دیکھا ہے' ہاں بھارت کے اداکار امیتابھ کی زندگی پہ افسوس ہوتا ہے کتنا امیر کبیر شہرت یافتہ انسان ہے مگر مسلمان نہیں۔"

★ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

✳ "ایک اچھا دوست تنہائی کا بہترین ساتھی۔"

★ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

✳ "امام حسین۔"

★ "ہمارا پیارا پاکستان سارا کا سارا خوب صورت ہے۔ آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

✳ "میرے خیال میں گجرات شہر سب سے اچھا ہے کیونکہ اس کے علاوہ میں کہیں نہیں گئی۔"

☼ ☼

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

سات ہلاک کرنے والے گناہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔" صحابہ کرام نے عرض کیا "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ سات گناہ کون سے ہیں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، اپنی جان بچانے کے لیے جہاد میں اسلامی لشکر کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ جانا اور پاک دامن، ایمان والی اور بری باتوں سے بے خبر عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ (صحیح بخاری)

حمیرہ مہتاب۔ سعودی عرب

ایک بادشاہ کی اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم

بادشاہ "ناصر الدین محمد" کے ایک خاص مصاحب کا نام محمد تھا، بادشاہ اسے اسی نام سے پکارا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے خلاف معمول اسے تاج الدین کہہ کر آواز دی۔ وہ تعمیل حکم میں حاضر تو ہو گیا، لیکن بعد میں گھر جا کر تین دن تک نہ آیا۔ بادشاہ نے اس کی غیر حاضری کو شدت سے محسوس کیا اور اسے بلا بھیجا اور تین دن غائب رہنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا! عالم پناہ، آپ ہمیشہ مجھے "محمد" کے نام سے پکارا کرتے تھے، لیکن اس دن آپ نے تاج الدین کہہ کر پکارا، میں سمجھا کہ آپ کے دل میں میرے متعلق کوئی خلش پیدا ہو گئی ہے، اس لیے میں تین دن حاضر خدمت نہیں ہوا۔ ناصر الدین بادشاہ نے کہا "واللہ (اللہ کی قسم) میرے دل میں آپ کے متعلق کسی قسم کی کوئی خلش نہیں، تاج الدین کہہ کر میں نے اس لیے پکارا تھا کہ اس وقت میرا وضو نہیں تھا اور محمد کا مقدس نام بغیر وضو کے لینا میری طبیعت نے گوارا نہیں کیا۔

صغریٰ یاسین۔ کراچی

کرنیں

(1) جو شخص اپنی جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور اسی حالت میں مر گیا تو جاہلیت کی موت مرا۔

(2) خدا تمہاری صورت اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

(3) کسی بندے کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی چیز عطا نہیں ہوتی۔

(4) ہر دین کا امتیازی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔

(5) جو عہد پورا نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں۔

(6) جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی روزی میں وسعت کی جائے اور اس کی اجل میں تاخیر کی جائے تو وہ اپنا خاندانی رشتہ پیوست کرے۔

(7) نیکی حسن خلق کا نام ہے اور گناہ وہ چیز ہے جو تیرے سینے میں خلش پیدا کرے، اور تو اسے برا سمجھے کہ لوگ اس سے واقف ہوں۔

(8) اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا فہم و شعور عطا کرتا ہے۔

فاکہہ فردوس، بہاولپور

حرف دانش

☆ حد درجہ کی شیریں محبت جس وقت اپنا خاصہ بدلتی ہے تو نہایت تلخ اور مہلک نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

☆ جو شخص اپنے خلوص کی قسمیں کھائے اس پر کبھی اعتبار مت کرو۔

☆ دوست کی نسبت، دشمن کو معاف کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔

☆ توقعات، تعلقات کے خاتمے پر بھی ختم نہیں ہوتیں۔

☆ ہر لمحہ ایک خوشی ہے، لیکن آپ کی سوچ کا محتاج ہے۔

☆ تکلف کی زیادتی محبت میں کمی کا باعث بنتی ہے۔

☆ محبت بھری نظروں سے دیکھنے والے ضروری نہیں خیر خواہ بھی ہوں۔

☆ زہر تو حسد کا ہے، جس کا کوئی تریاق بھی نہیں۔

☆ خواہشات انسان کو متحرک رکھتی ہیں۔

☆ عقل کی کوئی حد ہو سکتی ہے، مگر بے عقلی کی کوئی حد نہیں۔

☆ اپنے اندر روگ مت پالیں، اس دنیا میں آپ ایک ہی تو ہیں۔

انیقہ انا۔ چکوال

چاند رات

کوئی بتائے کہ جشن بہار کیسے منائیں
ایک ایسی بیل جو صحن چمن سے باہر ہو
کبھی کبھی تو دل مضطرب یہ چاہتا ہے
کہ چاند رات ہو اور سامنے سمندر ہو

فوزیہ ثمروٹ، گجرات

عید نظم

عید کے روز
خوشیاں منانے سے
فرصت ملے تو
یہ سوچنا ضرور
بہت مصروف ہونے کے باوجود
تمہاری یاد کا لمحہ لمحہ
کسی کے ساتھ رہا ہے

صابرہ یار محمد۔ اسلام آباد

رعایا کا خیال

ملک شاہ کے عہد میں سلجوقیوں کی طاقت بام عروج پر تھی۔ ایک دن ملک شاہ طوس کی جامع مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلا تو اس نے اپنے وزیر نظام الملک طوسی سے پوچھا
"آپ نے نماز کے بعد کیا دعا مانگی؟"
"وزیر نے کہا میں نے دعا کی کہ آپ اپنے بھائی کے مقابلے میں فتح یاب ہوں۔" ملک شاہ نے کہا۔
"لیکن میں نے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! میں اور میرے بھائی دونوں میں سے جو بھی رعایا کا اچھی طرح خیال رکھے اور بہتر طریقے سے حکومت کر سکے اسے فتح نصیب کر۔۔۔!"

حافظہ فوزیہ سلیم۔ چیچہ وطنی

رزق

ایک شخص نے حضرت بایزید بسطامی سے کہا۔
"میری عیال زیادہ اور معاش کم ہے۔"
آپ نے فرمایا "اپنے گھر میں جس کو تو دیکھے کہ اس کا رزق مجھ پر ہے، اس کو نکال دے اور جس کو دیکھے کہ اس کا رزق اللہ پر ہے، اس کو گھر میں رہنے دے۔"

روبینہ ناز۔ کراچی

عید کارڈ

اس نے پھر عید کارڈ میں مجھ کو
لفظ اک بے دھیان لکھا ہے
پھر میری عید کرکری کر دی
پھر مجھے بھائی جان لکھا ہے

رابعہ۔ کراچی

صبح کا ستارہ

محمد بن قاسم نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”زبیر! دیکھو یہ ستارہ کس قدر اہم ہے لیکن اس کی زندگی کس قدر مختصر ہے، یہ دنیا کو ہر صبح آفتاب کی آمد کا پیغام دینے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سورج کے چہرے سے تاریکی کا نقاب الٹ کر اپنے چہرے پر ڈال لیتا ہے لیکن اس کے باوجود جو اہمیت اسے حاصل ہے، وہ دوسرے ستاروں کو حاصل نہیں۔ اگر یہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح تمام رات چمکتا تو ہماری نگاہوں میں اس کا رتبہ اس قدر بلند نہیں ہوتا۔ ہم تمام رات آسمان پر کروڑوں ستارے دیکھتے ہیں لیکن یہ ستارا ہمارے لیے ان سب سے زیادہ جاذب توجہ ہے۔ عام ستاروں کی موت و حیات ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، بالکل ان انسانوں کی طرح جو دنیا میں چند سال بے مقصد زندگی گزارنے، بسر کرنے کے بعد مر جاتے ہیں اور دنیا کو اپنی موت و حیات کا مفہوم بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زبیر! مجھے اس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اس کی زندگی جس قدر مختصر ہے، اس قدر اس کا مقصد بلند ہے۔ دیکھو یہ دنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر اظہار تاسف مت کرو، قدرت نے مجھے سورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! میں بھی اس ملک میں آفتاب اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے صبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں۔

(محمد بن قاسم، از نسیم حجازی)

صبا عبدالستار شیخ، شکارپور

کورا کاغذ

کاغذ کے ایک سفید ورق نے کہا۔ ”میں بے داغ بنایا گیا ہوں اور ہمیشہ بے داغ ہی رہوں گا اور میں جل کر سفید راکھ میں تبدیل ہونا زیادہ پسند کروں گا بجائے اس کے کہ سیاہی مجھے چھوئے اور داغ میرے قریب آئے۔“ جو کچھ سفید کاغذ نے کہا، دوات نے سنا اور اپنے تاریک دل میں ہنس دی، لیکن اس کے قریب جانے کی جرات نہ کی۔ رنگ برنگی پنسلوں نے بھی سنا، وہ بھی اس کے نزدیک نہ پہنچ سکیں، اور کاغذ کا سفید ورق اسی طرح بے داغ رہا، بے داغ اور صاف لیکن کورا۔“ (خلیل جبران)

حرا قریشی، بلال کالونی ملتان

کیا خوب زمانہ

اپنی ایک کتاب میں ہم نے ابن بطوطہ کا تعاقب تو کیا لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہ آیا، کہیں سراندیپ کی طرف نکل گیا اپنے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے.....؟ بے شک اس زمانے میں بھی بہت سے لوگ سیدھے سیدھے منہ کالا کر لیا کرتے تھے لیکن شرفا پہلے ہاتھ پیلے کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس زمانے میں سفر کا ایک لطف یہ تھا کہ نور کے تڑکے کسی نئے شہر کے دروازے پر پہنچتے اور وہاں کا بادشاہ وہ بھی اسی رات مرا تو لوگ پکڑ کر سر پر تاج رکھ دیا کرتے تھے۔ آدمی کے پیچھے اپنے کام کا کتنا بھی ہرج ہوتا اور وہ کتنی عرض و معروض کرے، اسے پشت در پشت بادشاہی کرنی ہی پڑتی تھی۔ اب تو شہر کا دروازہ کھولنے سے پہلے ویزا دیکھتے ہیں، ہیلتھ سرٹیفکیٹ کا پوچھتے ہیں، مسافر کا تلچھ کھلواتے ہیں کہ پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔

(ابن انشاکی کتاب سے اقتباس)

ماہ رخ خلیل مغل، حیدر آباد

سلطان کا انصاف

تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ سلطان کا لقب پانے والے سلطان محمود غزنوی کو ایشیائی فاتحین میں بلند مقام حاصل ہے۔ وہ ایک منصف اور بے دار مغز سلطان و حکمران تھا۔

ایک مرتبہ دربار میں رعایا کے ایک فرد نے دہائی دی

کہ ”اے سلطان تیری فوج کے ایک ترک سپاہی نے میرے خاندان کی بے حرمتی کر کے ہمیں گھر سے نکال دیا ہے اور گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔“ سلطان اپنی تلوار بے نیام کر کے اس شخص کے ساتھ ہو لیا۔ گھر میں داخل ہونے سے قبل اس نے تمام شمعیں گل کرنے کا حکم دیا اور مجرم کو تاریکی میں ہی ختم کر دیا۔ شمعیں روشن ہوئیں تو وہ سجدے میں گر گیا اور پھر فریادی سے یوں گویا ہوا۔

”جب تم نے مجھ سے اپنا گھر لٹنے کی فریاد کی تو میرے دل میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا کہ کہیں میرا اپنا بیٹا ہی اس فعل کا ذمہ دار نہ ہو کیونکہ میری فوج کے کسی سپاہی کو یہ جرات نہیں ہو سکتی۔ میں نے شمعیں گل کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ میرا انصاف اندھا اور بے رحم ہو اور میں سجدہ ریز اس لیے ہوا کہ مجرم میرا بیٹا نہیں تھا۔“

کنول شاہین جلال پور جٹاں

چہار کہاوتیں

- ہر نئی افتاد سچائی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (چینی کہاوت)
- نصیحت ایسی چیز ہے جس کی عقلمندوں کو ضرورت نہیں اور بے وقوف اسے قبول نہیں کرتے (عربی کہاوت)
- کوئی بھی شخص اپنی صلاحیتوں کا اندازہ اس وقت تک نہیں لگا سکتا جب تک کہ انہیں استعمال نہ کرے (لاطینی کہاوت)
- تعریف گالیوں کی بنیاد ہے۔ (جاپانی کہاوت)

نازیہ شاہین، جلال پور جٹاں

شادی شدہ

ایک عورت نے ایک وکیل سے پوچھا۔ ”طلاق لینے کے لیے کیا شرائط لازمی ہوتی ہیں۔“ وکیل نہایت سنجیدگی سے بولا۔

”طلاق لینے کے لیے آپ کا شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔“

فوزیہ ثمرٹ، گجرات

خالق

ایک دفعہ ایک دہریہ ہارون الرشید کے دربار میں گیا اور کہنے لگا۔

”اپنی سلطنت کے سب سے بڑے عالم کو طلب کر لیجیے۔ کہ میں وجود باری تعالیٰ پر مناظرہ کروں گا اور اسے قائل کر لوں گا کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔“

خلیفہ ہارون الرشید نے امام اعظم کو بلا بھیجا امام اعظم نے فوراً آنے کا وعدہ کیا لیکن دربار میں کافی تاخیر سے پہنچے دہریے کو موقع مل گیا اور اس نے شور مچا دیا کہ اتنے بڑے عالم نے وعدہ خلافی کی ہے اور وقت کی پابندی کا خیال نہیں کیا ہارون رشید کے دریافت کرنے پر امام اعظم نے فرمایا۔

”میرا گھر دریا کے کنارے پر ہے یہاں آنے کے لیے مجھے دریا عبور کرنا تھا لیکن گھاٹ پر کوئی کشتی نہیں تھی میں سوچ کے عالم میں کھڑا تھا کہ دریا کے کنارے سے ایک درخت ٹوٹ کر گرا اور خود بخود اس کے تختے بن گئے اور ان تختوں سے فوراً ہی ایک کشتی بن گئی اس کشتی نے مجھے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا ہے۔“

یہ سن کر دہریہ چلایا اور کہنے لگا۔

”بالکل لغو اور بکواس ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کشتی بنانے والا نہ ہو اور خود بخود کشتی بن جائے۔“

امام صاحب نے جواباً فرمایا۔

”جب ایک چھوٹی سی کشتی خود بخود تیار نہیں ہو سکتی تو پھر یہ اتنی بڑی اور حیرت انگیز کائنات بغیر کسی خالق کے کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔“

یہ سن کر دہریہ چپ کا چپ رہ گیا۔

امیر گل، جھڈو (سندھ)

✡ ✡

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

انیقہ انا، کی ڈائری میں تحریر
داغ دہلوی کی غزل

غضب کیا، تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

ہم ایسے محو نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا
مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا

فسانہ شب غم ان کو اک کہانی تھا
کچھ اعتبار کیا اور کچھ نہ اعتبار کیا

یہ کس نے جلوہ ہمارے سر مزار کیا
کہ دل سے شور اٹھا، ہائے بے قرار کیا

تڑپ پھر اے دل ناداں کہ غیر کہتے ہیں
آخر کچھ نہ بنی، صبر اختیار کیا

تمہیں تو وعدہ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں
وہ بے قرار رہے جس نے بے قرار کیا

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر
پروین شاکر کی نظم

گئے برس کی عید کا دن کتنا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھا تھا
فضا میں کیٹس کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیض کا مصرعہ تھا
دعا کے بے آواز الوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا
ہاتھ اٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا
ہوا مجھ آج کی شب کا بھی احوال سنا
کیا وہ بھی اپنی چھت پر آج اکیلا تھا
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی اور اس نے
چاند کو دیکھ کر اس کا چہرہ دیکھا تھا

نمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
ایک نظم

تم جو ملو تو عید ہو
یہ چاندنی کھلی ہوئی
ہزاروں سال سے یونہی
کہیں ہنسی، کہیں خوشی
ہزاروں رنگ میں ملی
مگر نظر کی تشنگی
کسی طرح نہ مٹ سکی
ہمارے واسطے بھی تو
یہ عید خوش نصیب ہو
جو تم ملو تو عید ہو
جو تم ملو تو عید ہو

سارہ یہ چوہدری، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

گویا انداز تعظیم ہے امیروں جیسا
میرے اندر کا انسان ہے فقیروں جیسا

ہم نے چہرے پہ سجا رکھی ہے دنیا کی رونق
اور دل کا عالم ہے ویران جزیروں جیسا

اس کے اوصاف و خصائل نے جیت لیا ہے مجھ کو
مرے مریدوں میں تھا اک شخص پیروں جیسا

اس سے پہلے تھی اسیری بھی رہائی جیسی
اب کے آزادی میں بھی حال ہے اسیروں جیسا

اس کو گنوا کے خسارے ہیں اب تک محسن
میرے پاس تھا جو اک شخص ہیروں جیسا

مدحت آصف، کی ڈائری میں تحریر
ناصر کاظمی کی نظم

ساری رات جگاتی ہے
بیتے لمحوں کی جھانجھن
لال کھجوروں نے پہنے
زرد بگولوں کے کنگن
چلتا دریا ڈھلتی رات
ہونٹوں پر برسوں کی پیاس
آنکھوں میں کوسوں کی تھکن
پہلی بارش میں اور تو
زرد پہاڑوں کا دامن
پیاسی جھیل اور دو چہرے
دو چہرے اور ایک درپن
تیری یاد سے لڑتا ہوں
دیکھ تو میرا پاگل پن

نوشین اقبال نوشی، کی ڈائری میں تحریر
ڈاکٹر بشیر بدر کی غزل

مجھ سے بچھڑ کر خوش رہتے ہو
میری طرح تم بھی جھوٹے ہو

اک دیوار پہ چاند ٹکا تھا
میں یہ سمجھا، تم بیٹھے ہو

اجلے اجلے پھول کھلے تھے
بالکل جیسے تم ہنستے ہو

مجھ کو شام بتا دیتی ہے
تم کیسے کپڑے پہنتے ہو

دل کا حال پڑھا چہرے سے
ساحل سے لہریں گنتے ہو

تم تنہا دنیا سے لڑو گے
بچوں سی باتیں کرتے ہو

سدرہ وزیر، کی ڈائری میں تحریر
عدیم ہاشمی کی غزل

کہا ساتھی کوئی دکھ درد کا تیار کرنا ہے
جواب آیا کہ یہ دریا اکیلے پار کرنا ہے

کہا ہر راستہ بخشا ہے ناہموار کیوں مجھ کو
جواب آیا تجھے ہر راستہ ہموار کرنا ہے

کہا کہ چمکا دیا اتنا بڑا سورج
جواب آیا ہمیں سایہ پس دیوار کرنا ہے

کہا لفظوں سے پھولوں کی مہک آنے لگی کیسے
جواب آیا محبت کا تجھ کو اظہار کرنا ہے

کہا مجھ کو بنایا تو پھر یہ دوسرے کیوں ہیں
جواب آیا کہ تجھ کو دوسروں سے پیار کرنا ہے

کہا میں لاڈلا تیرا ہوں مٹی میں کیوں اتروں
جواب آیا سب کو یہ سمندر پار کرنا ہے

مجھے یہ شعر پسند ہے

شگفتہ سلیمان

شازیہ ریاض ______ گھارو

عید کے چاند کا پیغام یہی ہے یارو
کہ ہر دل میں محبت کی کرن جلگے

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

اس کی یادوں میں اُس کی باتوں میں
کہیں میرا عکس بھی جھلملاتا ہوگا
لاکھ مصروف ہوگا وہ اپنے کاموں میں
وہ عید کا تہوار تو ضرور مناتا ہوگا

فوزیہ مجید بٹ ______ گوجر خان

آنے والی رُتوں کے آنچل میں
کوئی ساعت عید کیا ہوگی
گل نہ ہوگا تو جشن خوشبو کیا
تم نہ ہوگے تو عید کیا ہوگی

ہانیہ عمران ______ گجرات

پھر بیتے بارہ ماہ، پھر آئی عید ہے
پھر خوشیاں بکھیریں کہ موقع عید سعید ہے
دیکھیے کس رنگ میں ملیں گی ہمیں خوشیاں
کہ لوگوں نے تیرے آنے کی سنائی نوید ہے

سدرہ وزیر ______ پپل (خوشاب)

پھر کہیں دُور سے اک بار صدا دو مجھ کو
میری تنہائی کا احساس دلا دو مجھ کو
تم چاند ہو تم کو میری ضرورت کیا ہے
میں دیا ہوں کسی چوکھٹ پہ جلا دو مجھ کو

سونیا بانی ______ قاضیاں محلہ بالا

آؤ اس عید پر بھلا دیں پرانے غم!
جن کے کھو گئے حادثات میں ان کے بن جائیں ہم
عید تو مل جل کے ہنسنے مسکرانے کا نام ہے
تو پھر ان روتے چہروں کو ہنساتے جائیں ہم

صائمہ جبی ______ کراچی

عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں تیرے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گا

سمیرا عزل صدیقی ______ کراچی

لوگ کہتے ہیں عید کارڈ جسے
یہ روایت ہے اس زمانے کی
ایک دستک ہے ان کے ذہنوں پہ
جن کو عادت ہے بھول جانے کی

سعدیہ عرفان ______ گارڈن

اور اٹھ جاتی ہے بھولی ہوئی یادوں کی کسک
عید کا دن تو فقط زخم ہرے کرتا ہے

زینب احسان ______ گجرات

یہ عید تیرے واسطے خوشیوں کا نگر ہو
کیا خوب ہو ہر روز تیری دید اگر ہو
ہر رات مسرت کے نئے گیت سنائے
لمحات کے پیڑوں پر بھی شبنم کا ثمر ہو

نمرہ اقراء ______ کراچی

ملیں تمہیں نہ دُکھ زندگی میں
پھول کی طرح تم مہکو خدا کرے
زندہ رہے نام ابد تک تمہارا
عید کی خوشیاں تمہیں مبارک خدا کرے

کشور غفار اوڈ ______ عبدالحکیم

کتنے جھوٹے تھے ہم محبت میں
وہ بھی زندہ ہے ہم بھی زندہ ہیں

سارہ چوہدری ______ ڈوگہ گجرات

بدل گئے موسم میرے تو یاد اب آئے
غموں نے چاٹ لیا مجھ کو تو غم گسار اب آئے
یہ وقت تو نہیں اس طرح رونے کا فرحت
میں کیا کروں میرے سوگوار اب آئے

ندا، فضہ ______ کراچی

بدن میں آگ لگی ہے اور آنکھ روتی ہے
کہیں پہ دُھوپ کہیں بارشوں کا موسم ہے

مہر النساء ______ ہری پور ہزارہ

رفاقتوں کے نئے خواب خوشنما ہیں مگر
گزر چکا ہے ترے اعتبار کا موسم

افشاں ______ کراچی

رُتوں کا قاعدہ ہے یہ وقت پہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رُک گیا فریاد کا موسم
نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

عنبرین ______ کراچی

ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

عائشہ ______ گوجرہ

آنکھ تازہ منظروں کی آس میں کھو جائے گی
دل پرانے موسموں کو ڈھونڈ تا رہ جائے گا

زبیدہ ریاض ______ کراچی

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
مری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لا دے

اقصیٰ ناصر ______ کراچی

تمہاری یاد کے موسم بھی رُخ بدلنے لگے
ہوا تھمی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے

عظمیٰ غلام نبی ______ کراچی

کتنا نازک ہے وہ پری پیکر
جس کا جگنو سے ہاتھ جل جائے
خشک پیڑوں کی تالیاں سن کر
زرد موسم نہ پھر بدل جائے

رضیہ طاہر ______ کراچی

ہم نے تو پھونک پھونک کر رکھا قدم مگر
موسم ہی میرے شہر میں رسوائیوں کا تھا

نسیم چوہدری ______ میرپور آزاد کشمیر

جو پایا ہے وہ تیرا ہے
جو کھویا ہے وہ بھی تیرا ہے

خنساء حبیب ______ عبدالحکیم

ازل سے بس گئی ہے سر بلندی اپنی فطرت میں
ہمیں بس ٹوٹنا آتا ہے جھک جانا نہیں آتا

کرن، بینش ______ کراچی

ملتے رہتے ہیں بہت لوگ تمہارے جیسے
یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میں ہی کیا ہے
میں نے یہ سوچ کے روکا نہیں اُسے
بعد میں بھی تو یہ ہی ہوگا ابھی سے کیا ہے

حنا کنول ______ حویلی لکھا

بوندیں گریں تو آنکھ میں آنسو بھی آگئے
بارش کا اس کی یاد سے رشتہ ضرور تھا

حرا قریشی ______ ملتان

پہلے تو میری یاد سے آئی انہیں حیا
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو

انیقہ انا ______ چکوال

دل سا چراغ کیا بجھا، آنکھیں دھواں دھواں ہوئیں
کہنے کو اپنے آس پاس کتنے ہی مہتاب تھے

رضیہ طاہر ______ ڈیفنس کراچی

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم اُلفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

ندا، فضہ ______ فیصل آباد

وہ روایت خوب ہوئی مل کے دیکھیں چھت پہ چاند
رسم کی طرح لوگوں نے نبھائی یہ عید
خوشیوں کے لمحات میں شامل رہا احساس عید
جلتی بجھتی روشنیوں سے سجائی یہ عید

ماڈل	فرینا، ایشا، ثنا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
ٹرانسپیرنسی	موسیٰ رضا

ریحانہ امجد بخاری

مسکراتی کرنیں

وجہ تسمیہ

شاعر ناصر کاظمی جوتے خریدنے کے لیے بازار تشریف لے گئے۔ دکاندار ناصر صاحب کا دوست اور پر مزاح طبیعت کا مالک تھا۔ ناصر صاحب نے کئی جوتے پہنے اور کہنے لگے۔ "پہلے تو مجھے چھوٹا نمبر پورا آجاتا تھا لیکن اب وہ نمبر پاؤں میں چھوٹا پڑ رہا ہے۔"

دکاندار نے کہا۔ "جناب! اس کی وجہ یہ ہے کہ اب آپ کا پاؤں بھاری ہو گیا ہے۔"

فضا علی حسن۔۔۔۔ بھیرو

وضو

ایک آدمی وضو کر رہا تھا۔ ایک شخص نے دیکھا وہ وضو ٹھیک طریقہ سے نہیں کر رہا۔ اس آدمی نے وضو کرتے ہوئے آدمی سے کہا آپ وضو ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں آپ کو وضو کا طریقہ بتاتا ہوں۔ اس آدمی نے اسے وضو کرنے کا صحیح طریقہ بتایا پھر وہ چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں کی پھر ملاقات ہوئی۔ اس شخص نے اس سے پوچھا اور سنائیں کیا حال ہیں نمازیں تو آپ پڑھتے ہیں نا اور ٹھیک طریقے سے وضو کرنا آپ کو آ گیا ہو گا۔ پہلا آدمی بولا۔

"پیرو مرشد! نمازیں تو میں پڑھتا ہوں۔ مگر وضو تو وہی ہے جو آپ کروا گئے تھے۔"

فوزیہ ثمر بٹ' گجرات

نوے روپے

بیوی! "میں نے میکے جانا ہے آپ رکشا لے آئیں۔"

شوہر چلا گیا۔ خاصی دیر کے بعد شوہر واپس آیا۔ تو اس کے سر اور بازو پہ پٹی باندھی ہوئی تھی۔ بیوی حیرانی سے بولی۔ "یہ آپ کو کیا ہوا ہے آپ تو رکشا لینے گئے تھے۔" شوہر درد سے کراہتے ہوئے بولا۔ "میں نے رکشے والے کو 50 روپے کرایہ کہا مگر وہ 100 روپے مانگ رہا تھا۔ اس بحث میں اس نے مجھے ایک ہاتھ مارا۔ میں نے اسے پھر دو لگائے۔ اس نے مجھے پھر چار لگائے۔ بس بات تھانے تک چلی گئی۔ شکر کرو بیگم۔ اب وہ رکشے والا نوے روپے میں رضامند ہو گیا ہے۔"

حنا فرحان۔ کراچی

مشورہ

ایک صاحب پریشانی کے عالم میں ایک کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں بیٹھے ہوئے صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "میں ذہنی اور اعصابی سکون کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

وہ شخص کاغذات سے سر اٹھاتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "لیکن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں ڈاکٹر نہیں وکیل ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔۔۔" آنے والے صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "میں طلاق کے سلسلے میں مشورے کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

ناہید امید علی۔۔۔ کراچی

بے چارگی

ایک صاحب نے اپنے نفسیاتی معالج سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کو یاد ہے' گزشتہ گرمیوں میں آپ نے مشورہ دیا تھا کہ بے پناہ کاروباری مصروفیات کا بوجھ سر سے اتار پھینکنے کے لیے مجھے خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے۔"

"جی ہاں!" نفسیاتی معالج نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے' اچھا بتایئے' اس سے آپ کی زندگی پر کیا اثر پڑا؟"

"اثر تو بہت بڑا ڈاکٹر صاحب! مگر کیا اب آپ کوئی ایسا نسخہ تجویز کر سکتے ہیں' جس سے میرا دماغ پھر کاروبار کی طرف متوجہ ہو جائے۔" ان صاحب نے بے بسی سے مشورہ طلب کیا۔

فرحین راجا' ڈیرہ اسماعیل خان

وجہ تسمیہ

ایک صاحب کو رات سوتے وقت اچانک بہت بھوک لگی' تلاش کرنے پر انہیں ایک میز کے خانے سے دو بسکٹ مل گئے۔ انہوں نے وہ بسکٹ کھائے تو بہت لذیذ لگے۔ وہ اپنی بیوی سے کہنے لگے کہ وہ ایسے بسکٹ اور بھی لے آئے۔

دوسرے روز ان کی بیوی بسکٹ خریدنے گئیں تو دکاندار نے کہا۔ "آپ اتنے زیادہ بسکٹ کا کیا کریں گی' آپ کا کتا تو ایک ہی ہے۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "میرے شوہر کو یہ بسکٹ بہت لذیذ لگتے ہیں۔"

"مگر یہ بسکٹ تو خاص طور پر کتوں کے لیے تیار کیے جاتے ہیں' انسان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔" دکاندار نے تنبیہہ کی۔

مگر وہ خاتون ہر روز بسکٹ لے جاتیں اور ان کے شوہر شوق سے وہ بسکٹ کھاتے۔ ایک دن خاتون نے اس دکاندار سے کہا۔ "کل میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔"

دکاندار نے کہا۔ "میں نہ کہتا تھا کہ انہیں کتوں کے بسکٹ نہ کھانے دیں' وہ مر جائیں گے۔"

عورت نے جواب دیا۔ "مگر وہ بسکٹ کھانے سے تو نہیں مرے بلکہ وہ تو کاروں کے پیچھے بھاگنے سے فوت ہوئے ہیں۔"

حنا رفیق۔۔۔۔ جلال پور پیروالا

پرہیز

ٹرین کے ڈبے میں ایک صاحب کو سگار سلگاتے دیکھ کر ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی خاتون نے نرمی سے کہا۔ "تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔" وہ صاحب ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔

"محترمہ! ایسی صورت میں تو میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی سے پرہیز کیا کریں۔"

عائشہ صدیقہ۔۔۔۔ درابن کلاں

آخری خواہش

ایک کنجوس نے ساری عمر سخت محنت کر کے ڈھیر ساری دولت جمع کی تھی مگر خرچ کرنے کے معاملے میں وہ انتہائی بخیل تھا۔ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے محبت تھی تو وہ صرف پیسہ تھا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی بیوی کو بلا کر وصیت کی۔

"جب میں مر جاؤں تو تم میری ساری دولت میرے ساتھ تابوت میں دفنا دینا' میں دوسری دنیا میں بھی اپنی دولت لے جانا چاہتا ہوں۔" اصرار کے بعد اس نے بیوی سے وصیت پر عمل کرنے کا وعدہ لے لیا۔ جب وہ مر گیا اور اسے قبر میں اتارا جانے لگا تو اس کی بیوی نے ایک بکس اس کے تابوت میں رکھ دیا۔ گورکن نے تابوت لاک کر کے دفنا دیا۔

خاتون کی دوست نے اس سے کہا۔ "تم اتنی پاگل تو نہیں ہو سکتیں کہ ساری دولت قبر میں دفنا دو۔"

"ہاں۔۔۔! میں نے سب کچھ وعدے کے مطابق ہی کیا ہے' میں ایک اچھی کرسچین ہوں اور میں

جھوٹ نہیں بولتی۔" خاتون نے جواب دیا۔
"تمہارا مطلب ہے کہ تم نے تمام کی تمام دولت تابوت کے ساتھ دفن کر دی۔" دوست نے حیرت سے پوچھا۔
"بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔" خاتون نے جواب دیا۔
"میں نے ساری دولت اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کی اور اس کل رقم کا چیک لکھ کر اسے تابوت کے ساتھ دفن کر دیا۔"

مصباح شاہد۔۔۔ بورے والا

آزادی نسواں

ڈپارٹمنٹل اسٹور کے کاسمیٹک کاؤنٹر پر ایک شخص پہنچا اور اس نے کلرک سے درخواست کی۔
"اگر تم برا نہ مانو تو لپ اسٹک کا ایک چھوٹا سا دھبا میرے کالر پر ڈال دو۔"
کاؤنٹر کلرک نے اس انوکھی فرمائش کی وجہ دریافت کی تو اس شخص نے کہا۔ "دراصل میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی آزادی نسواں کے مضر رخ سے بھی آگاہ ہو جائے۔"

رمشا احمد۔۔۔ بدین

مجبوری

"یار! تمہیں وہ دن یاد ہے، جب ہم نہر کے کنارے چلے جا رہے تھے کہ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں دھڑام سے پانی میں گر گیا۔ میں تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گا کہ تم میرے پیچھے پانی میں کود پڑے تھے اور میری جان بچائی تھی۔" ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔
"اونہہ۔۔۔ یہ یاری داری کچھ نہیں۔۔۔"
دوست نے جواب دیا۔ "تمہارے پاس میرا قیمتی طلائی سگریٹ لائٹر تھا، اگر میں نہر میں نہ کودتا تو اور کیا کرتا؟"

نائلہ انجم۔۔۔ ژوب کینٹ

پریکٹس

حجام کی دکان میں ایک شخص داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ کر شیو بنانے کے لیے کہا۔ حجام کے نوعمر نائب نے حجام سے درخواست کی۔ "براہ کرم مجھے ان صاحب کا شیو بنانے کی اجازت دیجیے۔ میری کچھ پریکٹس ہو جائے گی۔"
"ٹھیک ہے! تم ان صاحب کا شیو بناؤ لیکن ذرا ہوشیاری سے شیو بنانا، کہیں اپنے ہاتھ زخمی نہ کر لینا۔" حجام نے نوعمر نائب کو ہدایت کی۔

جویریہ نعمان۔۔۔ فیصل آباد

غلط فہمی

ڈرائنگ روم میں ایک لڑکا اور لڑکی راز و نیاز میں مصروف تھے۔ لڑکی کے والد آئے اور علیک سلیک کے بعد معذرت کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔
ان کے جانے کے بعد لڑکے نے کہا۔
"ڈارلنگ! آپ کے پاپا تو بڑے گریٹ ہیں، ہمیں اس طرح دیکھ کر بھی انہوں نے کچھ نہیں کہا۔"
لڑکی نے جواب دیا۔ "ڈیئر! یہ بات نہیں ہے۔ میرے پاپا تو بہت سخت مزاج ہیں، دراصل آپ کے لمبے بالوں اور حلیے کی وجہ سے وہ آپ کو میری گرل فرینڈ سمجھتے ہیں۔"

نسیم اختر، بورے والا

وجہ تسمیہ

شوہر نے غصے میں بیوی سے کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ تم نے بچپن میں امرود بہت کھائے ہیں۔"
بیوی نے تعجب سے پوچھا۔
"لڑائی جھگڑے سے بھلا امرود کا کیا تعلق ہے؟"
"تعلق یہ ہے کہ تم میری ہر بات میں ہمیشہ کیڑے نکالتی رہتی ہو۔" شوہر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

نجمہ حفیظ، چکوال

بڑی خوبی

ایک موجد اپنی ایجاد کردہ گھڑی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اس گھڑی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اس سے سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔"
"تب تو یہ بہت مفید ایجاد ہے۔" ایک اخباری نمائندے نے کہا۔
"اس سے کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک عورت کو اپنی بات سے پھرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

رمضا بوٹا، شور کوٹ

اظہار خیال

ایک آرٹسٹ نے کئی ہفتے کی زبردست محنت کے بعد ایک شاہکار پینٹنگ مکمل کی۔ اس نے عالم نزع میں ایک شخص کی منظر کشی کی تھی، وہ موت کی ہولناکی کو اجاگر کرنا چاہتا تھا۔ اسی روز اس کے ایک دوست آ گئے۔ جو پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ آرٹسٹ نے بڑے فخر سے اپنی پینٹنگ دکھائی اور ان کی رائے دریافت کی۔
ڈاکٹر صاحب کافی دیر تک مختلف زاویوں سے پینٹنگ کا معائنہ کرتے رہے۔ پھر بولے۔
"میرے خیال میں تو یہ شخص ملیریا سے مر رہا ہے۔ ویسے اسے نمونیا بھی ہو سکتا ہے، بہتر ہے کہ تم کسی اسپیشلسٹ کی رائے بھی لے لو۔"

شازیہ پروین، کورنگی

تفریحی ٹیکس

ایک خاتون پر اپنے شوہر کی دوسری بیوی پر تشدد کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔ جرم ثابت ہونے پر جج صاحب نے دس ہزار دو سو دس روپے جرمانے کی سزا سنائی۔
مجرمہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ "دس ہزار روپے تو ٹھیک ہیں۔۔۔ لیکن یہ دو سو دس روپے کا حساب سمجھ میں نہیں آیا۔"
"یہ تفریحی ٹیکس کی مد میں ہے۔۔۔" جج صاحب نے وضاحت کی۔

رمنا علی، عارف والا

غلط فہمی

ایک صابر قسم کے شوہر نے اپنی بیوی سے کہا "تمہاری والدہ بیس سال سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ اب وہ اپنا الگ گھر لے کر رہنے لگیں؟"
"میری والدہ۔۔۔؟" بیوی حیرت سے چلا اٹھی۔
"میں تو اب تک یہی سمجھتی رہی کہ وہ تمہاری والدہ ہیں!"

سیمی ملک، لاڑکانہ

بے چارگی

محاذ جنگ سے بھاگتے ہوئے ایک سپاہی کو دیکھ کر کمانڈر نے غصے سے کہا۔ "تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"
"جناب! وہ تو جنگ میں ہلاک ہو گیا ہے۔"
"۔۔۔اور تم اسے وہیں چھوڑ آئے ہو۔ جاؤ احمق، اس کی لاش لے کر آؤ۔"
"مگر جناب! میری لاش اٹھا کر کون لائے گا؟"
سپاہی نے بے بسی سے کہا۔

فیروزہ خان، کراچی

تشویش

افسر نے اخبار میں ایک سروے پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر اختر کو مطلع کیا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں ساٹھ لاکھ ٹی وی اور چالیس لاکھ باتھ روم ہیں۔"
"اچھا۔۔۔! لیکن اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"
اختر نے افسر کو گھورا۔
"یہی کہ بیس لاکھ آدمی نہائے بغیر ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔" افسر نے سر کھجاتے ہوئے ذرا تشویش سے کہا۔

سفینہ صباح، فیصل آباد

حسنِ و صحت

ادارہ

چہرہ اور آپ کی توجہ

گرمیوں کا خاص تحفہ گرد و غبار، دھوپ کی تپش ہے جس کی وجہ سے چہرے کی نازک اور حساس جلد متاثر ہوتی ہے اور اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو چہرہ بے رونق اور مرجھایا ہوا نظر آتا ہے جسم کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی توجہ کا طالب ہے۔ دن بھر گھر کے کام کاج میں خاص طور پر کچن میں کام کرنا خصوصاً" وہ خواتین جو ملازمت کے سلسلے میں گھر سے باہر دھوپ، گرمی اور دھوئیں میں سے گزر کر لوٹتی ہیں ان کے چہرے پہ دن بھر کا میل جمع ہوتا رہتا ہے اور پھر یہ ہی میل دانوں کی شکل میں چند دنوں میں نمایاں ہوتا ہے اور اس سے چہرہ بدنما نظر آنے لگتا ہے۔ اس مسئلے کا صرف یہ ہی حل ہے کہ دن بھر کے چوبیس گھنٹوں میں سے خود اپنے لیے بھی وقت نکالیں گھر سے باہر نکلنے سے پہلے اور رات کو سونے سے پہلے اچھی کریم ضرور لگائیں اور مہینے میں ایک بار فیشل کروائیں اس سے چہرے پر مثبت نتائج برآمد ہوں گے اور جلد چمکدار اور بے داغ نظر آنے لگتی ہے۔

اسی لیے آج ہم چہرے کی خوب صورتی اور تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے فیشل کے اسٹوکس بتا رہے ہیں اس سے مساج اور ماسک با آسانی سمجھے جاسکتے ہیں۔ مساج کے اسٹوکس میں گردن، ٹھوڑی، گالوں اور ہونٹوں کا اوپری حصہ ناک آنکھوں، ماتھے وغیرہ پر مختلف انگلیوں اور انگوٹھے کی مدد سے اسٹوکس کیے جاتے ہیں۔

1 - سب سے پہلے چہرے اور گردن کو کسی اچھی کلینزنگ کریم کی مدد سے صاف کیا جاتا ہے اور چہرے کی صفائی کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ ہاتھوں کی حرکت بہت ہی آہستہ اور نرمی کے ساتھ اوپر سے نیچے کی جانب کی جائے۔

2 - اس کے بعد فیشل شروع کرتے ہیں اور کلینزنگ کریم کی مدد سے یا کلینزنگ ملک کو ہاتھوں میں لے کر انگلیوں کی مدد سے چہرے پر لگایا جاتا ہے اس میں ایک انگلی استعمال کی جاتی ہے اور ہاتھوں کی حرکت اوپر کی جانب ہوتی ہے۔

3 - اس کے بعد دو انگلیوں کا استعمال کرتے ہیں اور دونوں انگلیوں کو اس انداز سے ملایا جاتا ہے کہ جڑی ہوئی محسوس ہوں اور بہت ہی آرام سے آہستہ آہستہ ہاتھوں کو ٹھوڑی سے شروع کرتے ہوئے گالوں اور پھر پیشانی پر اس اسٹوک کو ختم کیا جاتا ہے۔

4 - دونوں انگلیوں کے ساتھ انگوٹھے کو بھی ملایا جاتا ہے یعنی اس طرح آپ انگلیوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے جاتے ہیں پھر بھنوؤں کے آخری حصے پر دونوں انگلیوں کی مدد سے مساج کرتے ہوئے جلد کو دبایا جاتا ہے اور اس طرح اس عمل کو تین دفعہ کرتے ہیں اور اس جگہ کو ٹینشن پوائنٹ کہتے ہیں۔

5 - تیسرا ٹینشن پوائنٹ ناک کے آخری حصے پر ہوتا ہے۔ اس عمل کو بھی ناک کے ابتدائی حصے سے شروع کیا جاتا ہے اور آخری پر ختم کیا جاتا ہے۔ یہ اسٹوک بھی تین دفعہ کرتے ہیں۔ اس طرح تمام مساج کرنے میں پندرہ منٹ درکار ہوتے ہیں۔

6 - مساج کے مکمل ہونے کے بعد اسٹیم لیتے ہیں ایک پتیلی میں پانی بھر کر بھیگا ہوا تولیہ اس طرح رکھیں کہ اس کی بھاپ ضائع نہ ہو بھاپ پانچ منٹ تک لیتے ہیں۔

7 - اسٹیم لینے کے بعد تمام چہرے کو ٹھنڈے پانی سے بھیگے کپڑے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے اس سے چہرے پر موجود میل وغیرہ جو کہ مسام کے اندر جمع ہوتے رہتے ہیں یہ تمام کھل کر باہر آجاتے ہیں۔

8 - پھر مساموں سے ریموور کی مدد سے بلیک ہیڈز نکالے جاتے ہیں جس سے جلد میں نمایاں فرق کا اندازا ہوتا ہے۔ ٹشو پیپر سے چہرہ صاف کرنے کے بعد ماسک لگاتے ہیں۔

9 - ماسک اپنی جلد کی قسم کو مدنظر رکھ کر لگاتے ہیں۔ جیسے چکنی اور خشک جلد کے لیے الگ الگ طرح کا ماسک ہوتا ہے۔ ماسک لگانے سے پہلے آنکھوں کو روئی سے ڈھانپ دیا جاتا ہے اور پھر انگلی کی مدد سے ماسک لگایا جاتا ہے۔ ماسک چہرے کے علاوہ گردن پر بھی لگایا جاتا ہے۔ بیس منٹ کے بعد ماسک صاف کریں اور پانی سے چہرے کی صفائی کریں۔

اس طرح فیشل مکمل ہوتا ہے۔ آپ بھی خوب صورت نظر آنے کے لیے اپنے آپ پر توجہ دیں اور آج ہی سے اپنا خیال رکھنا شروع کریں۔

☼ ☼

سانحہ ارتحال

ہماری اور آپ سب کی پسندیدہ مصنفہ عنیقہ محمد بیگ کی والدہ محترمہ مختصر سی علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

عنیقہ اور اہل خانہ کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا ہے۔ ادارہ کرن عنیقہ محمد بیگ کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور عنیقہ و دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین)

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

یوگرٹ مٹن

ضروری اشیا :

بکرے کا گوشت (دھولیں) 1 کلو
دہی 1 پاؤ
پیاز (باریک کاٹ لیں) 2 عدد
ادرک لہسن پیسٹ 2 کھانے کے چمچے
ہری مرچ (درمیانی سائز کی) 1/2 کپ
نمک حسب ذائقہ
گرم مسالا پاؤڈر 1 چائے کا چمچہ
تیل 1/2 کپ

ترکیب :

دیگچی میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر گولڈن ہونے تک تلیں۔ گوشت نمک اور ادرک لہسن پیسٹ ڈال دیں۔ دو منٹ تک بھون کر تقریباً" چار گلاس پانی گوشت میں ڈال کر گلنے کے لیے چھوڑ دیں (اور اگر پانی خشک ہو جائے اور گوشت نہ گلے تو تھوڑا سا پانی ڈال دیں) آدھی ہری مرچیں گرائنڈر میں پیس لیں۔ جب گوشت گل جائے تو دہی پھینٹ کر اس میں ملا دیں اور ساتھ ہی پسی ہوئی ہری مرچ بھی ملا دیں۔ جب دہی کا پانی بھی خشک ہو جائے تو باقی کی ثابت ہری مرچوں کو درمیان میں سے کٹ لگا کر گوشت میں ڈال دیں۔ ہلکی آنچ پر مزید دس منٹ پکائیں۔ جب تیل اوپر آجائے تو اوپر سے پسا ہوا گرم مسالا ڈال دیں۔ مزے دار یوگرٹ مٹن تیار ہے' روغنی نان اور سلاد کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

ہانڈی کباب

اجزا :

گائے 'بکری کا قیمہ ایک کلو
لال مرچ (کٹی ہوئی) آدھا کھانے کا چمچہ
خشک دودھ دو کھانے کے چمچے
نمک حسب ذائقہ
لیموں دو عدد
ہری مرچ تین ثابت' تین باریک کٹی
پیاز ایک ڈلی (کچی پیس لیں)
تیل ایک پیالی
بیسن دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ ایک چائے کا چمچہ (کٹی ہوئی)
ڈبل روٹی کے سلائس دو عدد
ادرک لہسن (پسا ہوا) ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر (باریک کاٹ لیں) آدھا کلو
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا) ایک گٹھی
لیموں تین سے چار عدد

ترکیب :

سب سے پہلے قیمے میں سلائس کا درمیانی حصہ' بیسن (ایک کھانے کا چمچہ) گھی میں بھون لیں' کٹی ہوئی ہری مرچ اور نمک ملا کر چوپر میں پیس لیں۔ ایک انڈا ملا کر اچھی طرح گوندھ کر چھوٹے چھوٹے سیخ کبابوں کی طرح کباب بنا کر ہلکی آنچ پر ڈیپ فرائی کر لیں' جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال لیں۔ ایک دیگچی لے لیں یا مٹی کی ہانڈی ہو تو بہت اچھا ہے۔ ہانڈی میں تیل اور پسی پیاز ڈال کر ہلکی گلابی کر لیں' جب گلابی ہو جائے تو ٹماٹر' سرخ مرچ' کالی مرچ' ادرک' لہسن' نمک اور ہری مرچ ڈال کر پکنے دیں جب پانی سوکھنے لگے تو ہلکا سا بھون لیں' پھر تلے ہوئے کباب پھیلا کر ڈال دیں اوپر سے لیموں کا رس اور ہرا دھنیا ڈال کا ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں دس منٹ بعد مزے دار ہانڈی کباب تیار۔ گرم گرم نان یا پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

ڈھاکہ ناریل گوشت

اجزاء :

گوشت ایک کلو (گول بوٹیاں)
گھی یا مکھن پچاس گرام (چار کھانے کے چمچے)
پیاز دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
پسا ہوا لہسن دو کھانے کے چمچے
ادرک دو انچ کا ٹکڑا (باریک کٹی ہوئی)
ہلدی ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسی ہوئی سرخ مرچ دو چائے کے چمچے
پسی ہوئی کالی مرچ ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی میتھی دو چائے کا چمچہ
ناریل کا دودھ ڈھائی کپ
نمک حسب ذائقہ

ترکیب :

گھی میں پیاز سرخ کر لیں۔ ادرک' لہسن اور دوسرے مسالے ڈال کر پانچ منٹ تک بھونیں۔ مسالا خشک معلوم ہو تو تھوڑا سا پانی ڈال دیں۔ اب اس مسالے میں گوشت ڈال کر سنہری ہونے تک بھون لیں۔ اس میں ناریل کا دودھ ڈال دیں' جوش آجائے تو سوا گھنٹے تک ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ گوشت گل جائے تو اتار کر میتھی اور پودینہ ڈال کر چند منٹ ڈھانپ دیں۔ ڈھاکہ ناریل گوشت تیار ہے۔

ثمر شیریں

ضروری اشیاء :

رنگین خوشبودار سویاں (ابال لیں) 1 کپ
دودھ 2 کپ
لال شربت 3 کھانے کے چمچے
چینی 8 کھانے کے چمچے
تخم ملنگا (پہلے سے پانی میں بھگو کر رکھیں) 2 کھانے کے چمچے
کریم 1 1/4 کپ
روح کیوڑہ چند قطرے
خربوزہ (کیوبز کاٹ لیں) 1 عدد
آم (کیوبز کاٹ لیں) 2 عدد
کیلے (چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں) 6 عدد
سیب (کاٹ لیں) 1 عدد
اسٹرابیری (موٹے سلائس کاٹ لیں) 10-8 عدد
بادام' پستے (کاٹ لیں) 2 کھانے کے چمچے

ترکیب :

رنگین خوشبودار سویوں کو ابلتے پانی میں 7-5 منٹ کے لیے ابال لیں۔ یہاں تک کہ ایک کنی رہ جائے اس کے بعد چھلنی میں ڈال کر گرم پانی گرا کر ٹھنڈا پانی گزار دیں اور اس میں 1 کھانے کا چمچہ تیل ملا کر سویوں کو ایک پیالے میں نکال لیں۔

دودھ میں لال شربت اور چینی ڈال کر بلینڈ کر لیں اور اسے پیالے میں ڈال کر اس میں تخم ملنگاں' روح کیوڑہ' خربوزہ' آم' کیلے' سیب اور اسٹرابیری ڈال کر مکس کر لیں۔ اس کے بعد اس میں خوب پھینٹی ہوئی کریم اور رنگین خوشبودار سویاں شامل کریں اور سرونگ ڈش میں نکال لیں۔ اوپر بادام پستے چھڑک کر خوب ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔

☼ ☼

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذوالقرنین

شمگی شیخ۔۔۔ حیدر آباد

س - کیوں بھئی! تمہارا مسافر تو واقعی ہی چلا گیا چلو اچھا ہے۔ نام کی لاج رکھ لی۔ جلد بولو۔ چپ کیوں سادھ لی۔

ج - پہلے ہی کچھ کم لوگ مجھے جلا رہے ہیں جو مزید آپ بھی مجھے جلانے آگئیں۔

ممتاز کنول۔۔۔ کراچی

س - ایک لڑکی کو سب عقل سے پیدل کہتے ہیں بتائیے کہ وہ عقل پر سوار کس طرح ہو۔ کیا عقل کسی گھوڑے گدھے یا کسی سواری کا نام ہے؟

ج - آپ کے اس سوال پر تو میں خود ہی پیدل ہو گیا۔

فوزیہ میمن۔۔۔ کراچی

س - ہیلو نین جی سنا ہے کچھ بیمار و یمار تھے اب کیسے ہو؟

ج - تم نے صرف سنا ہے ابھی تک؟

بیلا شبنم۔۔۔ خیرپور میرس

س - جب تقدیر اور تدبیر دونوں زندگی کو حقیقی خوشی سے دور لے جائیں تو سر پیٹنے کے علاوہ بندے کو کیا کرنا چاہیے۔

ج - بی بی ذرا صبر کر فریاد کے دن تھوڑے ہی ہیں۔

زوبیہ۔۔۔ کراچی

س - نین بھیا۔ پہاڑ کی چوٹی اور بالوں کی چوٹی میں کیا فرق ہے؟

ج - پہاڑ کی چوٹی اوپر جاتی ہے بالوں کی چوٹی نیچے کی طرف۔

آر رانا بوبی۔۔۔ سیالکوٹ

س - بھیا ذرا جلدی سے بتائیں کہ میرے حسن کا راز کیا ہے؟

ج - کہ تم مرد ہو کر لڑکی بنتے ہو۔

س - تمہاری پہلی اور آخری خواہش کیا ہے؟

ج - کاش تم واقعی لڑکی ہوتے۔

گل رعنا۔۔۔ حیدر آباد

س - ذوقی بھیا انسان کو شیطان بے وقوف بناتا ہے یہ بتائیے کہ شیطان کو کون بے وقوف بناتا ہے؟

ج - بتادوں؟

مس تنقید۔۔۔ مردان

س - بھئی آج کل بہت سیریس ہو گئے ہو۔ کیا وجہ

ہے؟

ج - کبھی کبھی جی چاہتا ہے۔

ریحانہ غلام حسین۔۔۔ گکھڑ منڈی

س - بھیا جی۔ کیا آپ کو نماز آتی ہے چلو خیر نماز نہیں آتی تو چھ کلمے تو آتے ہوں گے چلو اس میں بھی رعایت کر دیتے ہیں۔ تین کلمے تو ضرور آتے ہوں گے۔

ج - ہاں۔ مگر کروانا کیا چاہتی ہو مجھ سے؟

ناگ رانی۔۔۔ وادی زیارت

س - ڈیئر نین میں ناگن ہوں میرا ایک جگہ ٹھکانہ کہاں کبھی ادھر اور کبھی ادھر اگر آپ پسند کریں تو جناب کے من میں بسیرا کر لوں ساری عمر کے لیے۔

ج - بہنیں متوجہ ہوں اس سوال کی طرف۔

نازش مجاہد علی۔۔۔ خیرپور میرس

س - نین جی مجھے تو یوں لگتا ہے کہ آپ حصار ذات میں قید ہیں۔ کبھی بیماری کا بہانہ۔ کبھی کسی اور طرح سے اپنی اہمیت کا احساس دلانا۔ آخر یہ سب ہے کیا؟

ج - اتنی سچی باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟

الزبتھ پیٹر۔۔۔ کراچی

س - اپنے آپ کو کون سا ہیرو تصور کرتے ہو جو اتنے کھرے جواب دیتے ہو؟

ج - آپ کا کیا خیال ہے کہ صرف ہیرو ہی کھرے جواب دے سکتا ہے۔

رفعت علی زئی۔۔۔ ڈی آئی خان

س - بھائی جی۔ چند دن پیشتر بازار جانے کا موقع ملا تو ایک ٹھیلے والا شور مچا رہا تھا سیب چور سیب چور پکڑو مگر جب لوگوں نے پکڑا تو آدھا سیب آپ کے منہ میں تھا اور آدھا غائب۔ سچ بتائیے آدھا سیب کدھر غائب گیا؟

ج - اپنا حصہ لے کر بھول جاتی ہو؟

طاہرہ مرزا۔۔۔ واہ کینٹ

س - ذوالقرنین بھیا۔ زندگی کو جاوداں بنانے کا راز کیا ہے؟

ج - پیہم رواں۔

شاہانہ۔۔۔ سرگودھا

س - اگر آپ کو اکٹھا ہی کرکٹ اور ہاکی کی ٹیموں کا کپتان بنا دیا جائے تو؟

ج - مگر بنائے گا کون؟

عنبرین کوثر۔۔۔ جہلم

س - بھیا ذوالقرنین سسرال کے تمام رشتے "س" سے کیوں شروع ہوتے ہیں۔ مثلاً "س سے ساس، س سے سسر، س سے سالا، س سے سالی؟

ج - لگتا ہے تمہاری شادی نہیں ہوئی ورنہ سسرالی رشتہ داروں میں "ن" سے نند د سے دیور اور ج سے جیٹھ بھی ہوتے ہیں۔

ساجدہ بشیر۔۔۔ جلال پور جٹاں

س - بھیا ناول لکھتے لکھتے تھک گئے یا بھول گیا ہے اب بیماری کا بہانہ بنا کر پیچھا چھڑانے کی کوشش نہ کرو۔ جلدی سے اٹھ جاؤ ورنہ پتا ہے کیا ہوگا۔

ج - کیا ہو گا؟

شاہدہ رحمان مغل۔۔۔ جگہ نامعلوم

س - اپریل کے خواتین میں کیا او نگی بونگی تصویریں کھنچوائے بیٹھے تھے؟

ج - تم نے اب دیکھی ہیں

شاہدہ چوہان۔۔۔ کراچی

س - کونین کی گولی کی طرح کڑوے نین جی! کیا آپ کے سر میں لگا وہ زخم ٹھیک ہو گیا۔ جو کہ ایک پاگل کو چھیڑنے کی صورت میں پتھر سے لگا تھا؟

ج - اچھی نشانہ باز ہو۔ اب خبر لی تم نے؟

مدیرہ

خاص میرے نام

نشانورین..... بوتالہ جھنڈا سنگھ

جولائی کی گرمی اوپر سے بجلی کا آنا جانا اف کہاں جائے عوام۔ ہمارے ہاں گرمی سے بچنے کے لیے کچھ لوگ نہر کا رخ کررہے ہیں اور کچھ ٹیوب ویل کی طرف مگر بہت سے کاروبار ٹھپ ہیں اس بجلی کی وجہ سے کیا بنے گا اس پاکستان کا خدا ہی وارث ہے۔

مقابل ہے آئینہ میرا فیورٹ سلسلہ ہے مکمل ناول تینوں ہی اچھے تھے "وہ ایک پری ہے" یہ تحریر دل کو چھو جاتی ہے افسانوں میں انا اور مات اے دن تھے یادوں کے دریچے میں کس کی تعریف کروں کس کی نہیں خیر فوزیہ ثمر بٹ، ہما، امبر گل کا انتخاب اچھا لگا مجھے یہ شعر پسند ہے میں ہر ایک نے اپنی طرف سے اچھا ہی لکھا ہے اور صبا قمر کا انٹرویو پڑھ کر مزا آیا آواز کی دنیا میں 106 گوجرانوالہ کے بھی ڈی جے ز کا انٹرویو لیا کریں۔

وثیقہ زمرہ..... فیض پور

کرن 12 کو ملا ٹائٹل موسم کی مناسبت سے تھا بہت اچھا لگا ڈائجسٹ کھولتے ہی میرے نام میں اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی اور کچھ ہمت بندھی دوبارہ خط لکھنے کی سب سے پہلے حمد و نعت سے مستفید ہوئے پھر سلسلے وار ناول کی طرف دوڑ لگائی "دست کوزہ گر" اور "در دل" دونوں کی اقساط زبردست تھیں کہانیوں نے نیا موڑ لیا ہے اب دیکھیں کیا ہوتا ہے رومیلہ کے مسئلے حل ہوئے ہیں تو نمل کے شروع ہوگئے ہیں دوسری طرف دل آور اور علیزے کی شادی تو ہوگئی اب زری کو پتا چلے گا تو اس پر نہ جانے کیا گزرے گی ہمیں تو اس کی شدتوں سے بھی ڈر لگتا ہے مکمل ناول "میرے ہمنوا کو خبر کرو" کی دوسری قسط بھی اچھی تھی ناصر پر بہت غصہ آیا کیا وہ اپنی بہن کو جانتا نہیں ہے جو اس پر ذرا اعتبار نہیں کیا۔

سحر ساجد کا "طاقت پرواز" بہت عمدہ تحریر تھی مصنفہ نے ایک نئی انرجی سے ہمیں متعارف کرایا جو ہمیں پہلے سے پتا تو تھی پر احساس نہیں تھا بہت خوب سحر ساجد۔ شازیہ جمال نیر کا "تیرے پاس آکے جو گزری" بہت اچھا لگا ان کا اپنا انداز ہے جو مجھے بہت پسند آیا۔ شہناز صدیق کی کیکٹس بہت اچھی تحریر تھی۔ افسانے سبھی پسند آئے اور مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔

آصفہ نذیر..... فیض پور

اس ماہ کا کرن 15 تاریخ کو ملا کرن میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن یہ کہ آپ نے ہمارے گاؤں کا نام غلط لکھا ہمارے گاؤں کا نام فیض پور ہے خیر پور نہیں پلیز اسے بھی ٹھیک کردیں باقی سارا رسالہ اچھا رہا سلسلے وار ناول بھی اچھے جارہے ہیں ناول ناولٹ افسانے اور مستقل سلسلے بھی بہت اچھے تھے ——— انیقہ آپی اور سباس آپی کے خط بہت اچھے لگے۔ آپی رمضان کا مبارک مہینہ آگیا ہے اس لیے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔

ساریہ چوہدری..... ڈنگہ گجرات

میری طرف سے تمام قارئین کرن کی ٹیم کو سلام اور ڈھیروں عید مبارک، میرا تعلق کرن شعاع اور خواتین سے دس سال پرانا ہے پہلے میری بڑی بہن پڑھتی تھی اس سے پہلے 1990ء سے میرے تایا ابو کی بیٹی پڑھتی تھیں اب میں اور میری چھوٹی سسٹر ربیعہ ہمیں اکثر خواتین اور شعاع میں لکھتی ہوں شعاع میں شاعری سچ بولتی ہے میں میرا انتخاب شائع ہوچکا ہے۔ خواتین میں میرا تعارف بھی اور کبھی کچھ لکھوں تو وہ بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔

میں نے تبصرہ کبھی نہیں کیا مگر آج رہا نہیں گیا اور وجہ نبیلہ عزیز ہیں میری فیورٹ رائٹر نبیلہ عزیز اور نایاب جیلانی ہیں۔ "در دل" پہلی قسط سے بہت دلچسپ اور زبردست تھا۔ مجھے بہت پسند تھا اور ہر ماہ اس کی قسط کا شدت سے انتظار ہوتا تھا بہت برا کیا نبیلہ آپ نے زری کے ساتھ اور جس طرح دل آور شاہ نے زری کو اگنور کیا جو لفظ استعمال کیے یقین مانیں مجھے لگا زری کی جگہ میں کھڑی ہوں اس طرح لگا کوئی شیشہ ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا ہے کوئی بہت بری طرح بکھرا ہو کوئی بری طرح بے اعتبار ہوا ہو دل چاہ رہا ہے نبیلہ آپی آپ سامنے آؤ اور آپ سے پوچھوں جیسے زری دل آور شاہ سے چیخ چیخ کر پوچھ رہی تھی۔ کیوں کیا ایسا آپی کیوں؟ آپ کو ذرا ترس نہیں آیا، جب محبت میں کوئی ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو کچھ نہیں بچتا آپ نے زری کے پاس بھی کچھ نہیں چھوڑا، میں کون سے الفاظ میں آپ سے شکوہ کروں مجھے لگ رہا ہے آپ نے یہ سب زری کی جگہ میرے ساتھ کیا ہے۔ بہت بہت بہت دکھ ہو رہا ہے اور یہی موڑ ہے جو ناول کو امر کردے گا ہمیشہ یاد رہے گا یہ اک شاہکار ناول ہے۔

ایک بات اور شاید آپ نے نبیل کو اس کی محبت کا صلہ دینے کا سوچ رکھا ہے۔

حرا قریشی..... ملتان

"کرن ڈائجسٹ" میں پہلی دفعہ حاضری دی ہے پر امید ہیں کہ ہمارے ان ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو جگہ فراہم کی جائے گی اور آئندہ شرکت پر بھی حوصلہ افزائی کی جائے گی

"کرن" 23 جولائی کو ملا۔ کرن کی بدولت رمضان کی برکتوں سے متعلق معلوماتی کتاب "فورا" پڑھ ڈالی جس کو پڑھنے کے بعد ذہن پر پڑے پردے پے در پے کھلتے گئے۔ حمد و نعت پڑھ کر ہمیشہ کی طرح سرور کی ان چھوئی کیفیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بقول ارشد ملک کے.....

کرو ذکر میرے حضور کا
کہ کھلے دریچہ شعور کا.....!

یمنیٰ زیدی سے ملاقات اچھی رہی ان کے حوالے سے ان کی نانی کے خیالات جان کر مسکراہٹ نے خود بخود لبوں کا احاطہ کرلیا۔ صبا قمر کی بھی سنی، ان کا اپنی محترم والدہ کو تحفہ و نتائج میں بے اختیار ان پر پیار آگیا۔ واقعی والدین کی خدمت اور چاہت کا کوئی نعم البدل نہیں۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" ڈیئر فاخرہ گل جی شاعری کی بنیاد پر بائے چانس آپ کا ناول پڑھ ڈالا آخر میں باقی آئندہ دیکھ کر سارے لطف پر گڑھوں پانی پڑ گیا۔ بہرحال ہم متجسس ہیں کہ ندی کا موبائل کیسے اسے مل پائے گا؟ شاہ زین کی غلط فہمی کیسے دور ہوگی؟ عائشہ بھابھی کے دماغ پر سوار حکمرانی اور حسد کا خبط کیسے منظر عام پر آئے گا؟ خدا خود پسندی کے شر سے ہر ذی روح کو محفوظ رکھے آمین!

"خواہشوں کے جگنو" پڑھی تو بے ساختہ ماہ ملک کی "میرے خواب ریزہ ریزہ" یاد آگئی۔ حقیقت ہے اگر خواہشوں کا قفس پھیل جائے تو رہائی کے راستے مسدود ہونے لگتے ہیں۔ صد شکر کہ بشریٰ سیال نے بادصبا کو حمزہ سے ملا دیا۔ "طاقت پرواز" پڑھی ڈیئر سحر ساجد "انرجی کی ایک نئی فارم جان کر دل حیرت کی اتھاہ گہرائیوں کے سمندر میں ڈوب کر ابھرا حکمت کے کئی نایاب گہر اپنے دامن میں سمیٹنے کی سعی کرتا رہا۔ چشم نم نے عائشہ کے دادا محترم اور علی کے سانحے کو بہت قریب سے محسوس کیا۔ بہت خوب صورت لکھا آپ نے یقین مانیے (اور ایک بات انرجی کی فارمز اب بخوبی یاد رہیں گی) خدا ہمیں نہایت خشوع خضوع اور عاجزی و انکساری کے ساتھ دعا مانگنے کا سلیقہ عطا فرمائے آمین!

"تیرے ساتھ جو گزری" ایک ڈرامائی اور ایڈونچر سے بھرپور تحریر تھی گویا ٹی وی اسکرین پر فلم چل رہی ہو۔ "پرورش" ایک ہاٹ ایشو پر مبنی تھی جانے آج کل کے والدین کیوں اپنی جابز میں مگن اپنے نونہالوں سے غافل رہتے ہیں؟ بچے کی تو پہلی درسگاہ ہی ماں کی گود ہے اگر وہیں سے صحیح راہنمائی کا آغاز نہ ہو تو کیسے غلط اور صحیح کے فرق میں امتیاز کیا جاسکتا ہے؟ "مات" بھی ایک ہلکی پھلکی تحریر لگی۔

"نصیب کی سیاہی" ڈیئر دیبا شیرازی بھئی آپ کے قلم کی گرفت نے ہمارے انہماک کو کہیں نہ کھونے دیا "ایک اور حوا اپنی ہستی کو سپرد خاک کرکے نفس کے بنے پتلے اپنی انا کے خول میں بند آدم کے سامنے ڈھیر ہوگئی۔ ام حسن نے "انتساب زندگی" میں ایک خوب صورت پیغام دیا۔ ایثار اور محبت کا "کیکٹس" دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ استخارے کی اہمیت کو شہناز صدیق نے احسن طریقے سے واضح کیا۔ انیلا کرن علی نے "توازن" میں بہت ہی خوب صورت انداز میں بہنوں میں تعاون کی فضا قائم کی۔ آپس میں ایک دوسرے کا احساس بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک ہی فرد کو مشقت کی چکی میں نہیں پیسنا چاہیے گریٹ جی!

"کرن کرن خوشبو میں" "احساس" پڑھ کر عجب آگہی کے احساس نے گھیر لیا "محتاجی" بھی قابل ذکر تھا۔ "مینارہ نور" بہت خوب رہا "یادوں کے دریچے" سے گلزار کی نظم نے دل موہ لیا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں مریم شہباز کے اعلا ذوق کی داد دی۔ "حسن و صحت" اور "کرن کا دستر خوان"

ہمیشہ کی طرح آزمودہ تھا سو دعا ہے ہماری دل کی گہرائیوں سے کہ رب سوہنا کرن ڈائجسٹ سے منسلک لوگوں کو کامیاب کرے۔

فوزیہ ثمروٹ، گجرات

آداب آپ سب اسٹاف، قارئین کو ماہ رمضان کی بہت بہت مبارک ہم سب کو رب عظیم اس بابرکت مہینہ میں زیادہ سے زیادہ عبادت اور نیکیاں کرنے کی توفیق فرمائے آمین۔ رب عظیم اس بابرکت مہینے میں ہماری آتی جاتی ہر سانس کو بھی عبادت میں شامل کرتے ہیں تو ہمیں بھی چاہیے اس مہینے کو نہایت اداب و احترام سے گزاریں۔

جولائی کا شمارہ اس بار مجھے چودہ تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل نہایت ہی خوب صورت تھا جتنی تعریف کروں کم ہوگی سلیقے سے ڈھانپے سر اور روشن آنکھوں والی ماڈل خوب صورت لگ رہی تھی۔ میرون ڈریس اور مہندی سے رنگے ہاتھ اور بولتی نظریں ہم سا کوئی ہے تو سامنے آئے عید کا ٹائٹل بھی سپرہٹ ہونا چاہیے۔

انٹرویوز ففٹی ففٹی رہے۔ حیرت ہوتی ہے جب ہماری اداکارائیں یہ کہتی ہیں کہ ہمارا تعلق فلاں گاؤں سے ہیں۔ "مقابل ہے آئینہ" درصالحہ آپ کا گھر آپ کی جنت ہے اپنی نظر ضرور اتارے گا۔ اچھا لگا آپ سے ملاقات کرکے۔

"میرے ہمنوا کو خبر کرو" اس بار کہانی کچھ خاص نہیں لگی ہاں شاعری اس میں کمال کی تھی اب میران کیا غضب ڈھانے والا ہے ندرت پہ۔ پلیز کچھ تو ایسا رائٹر صاحبہ سامنے لائیں کہ ندرت کا جرم گھر والوں کے سامنے دھل جائے اور اس کا اعتماد بحال ہو۔

طاقت پرواز اس مہینہ کا بہترین ناول۔ تمام اسٹوری لاجک کے ساتھ بیان کی سحر ساجد نے میرے لیے کافی معلوماتی اسٹوری تھی۔ اس میں ایسی کئی باتیں تھیں جو میرے علم میں نہیں تھیں کہانی کی اصل حقیقت دعا سے تقدیر کو بدلا جاسکتا ہے ایک دعا ہی تو ہوتی ہے بندہ اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا ذریعہ "تیرے ساتھ جو گزری" کہانی کچھ خاص متاثر کن نہیں تھی ایسی اسٹوری پہ تو کئی فلمیں بھی دیکھ چکے ہیں پرانا موضوع تھا۔

"خواہشوں کے جگنو" صبا کی ناشکری پہ حیرت ہوئی۔ چلو اپنے گھر میں تو غریبی تھی مگر حمزہ تو ٹھیک ٹھاک امیر تھا پھر کیوں اس نے نادانی کی۔ کاشف قلرٹی کے ہاتھوں اپنی ذات کو پامال بھی کیا اور حمزہ سے بے وفائی بھی، وہ تو حمزہ کو سچی محبت تھی جو اس نے صبا کو اپنا لیا۔

افسانے "نصیب کی سیاہی، کیکٹس، مات" بھی مجھے ایک جیسے لگے۔ وہی پرانے موضوع کو دہرایا گیا مجھے "نہلے پہ دہلا" اس بار بھی دلچسپ لگا اس میں کتنے نام ہیں کیا وہ سب یاد ماضی ہوچکے ہیں پلیز اگر کوئی ہے تو حال کے کرن میں حاضری لگوائیے۔

مستقل سلسلے اس بار پھیکے پھیکے لگے۔ شاید اس ٹائم مجھے روزہ لگ رہا ہے اس لیے۔ "یادوں کے دریچے" تنی خود کی غزل اچھی لگی۔ شاعری کچھ خشک سی لگی رخشی کا شعر اگرچہ ایک مشہور شعر ہے پھر بھی پڑھتے ہوئے لطف آیا۔

"مسکرائیں" مسکراہٹ پہ مجبور نہ کرسکیں۔ چکن پکوان اچھا تھا آج کل روزہ کی وجہ سے افطاری پر کافی کچھ بنانا پڑتا ہے اس لیے پکوڑوں کی ہر ریسپی نرالی ہورہی ہے۔

"نامے میرے نام" میں عائشہ خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ اف کتنی باریک بینی سے مطالعہ کرتی ہیں کرن کی قاری۔ بڑی بات ہے کرن پڑھنے کا صحیح حق ادا کیا ہے آپ نے عائشہ خان، شمع مسکان کے تبصرہ سے لگتا ہے ان میں کچھ لکھنے کے جراثیم ہیں۔ مطلب ان کے الفاظ کا چناؤ جملوں کی صحیح اور ٹھیک پہچان، میرے خیال میں کوشش تو ضرور کرنی چاہیے ان بہنوں کو.....

اگست میں جب کرن آئے گا عید ہوچکی ہوگی اس لیے میری طرف سے ایڈوانس میں آپ سب کو تمام اسٹاف، قارئین بہنوں کو امبر گل، انیقہ انا، نواب زادی سونگی، در ثمن اور ہاں ایک ہوتی تھی کنول شاہین ان بہنوں کو بھی جن کے ابھی مجھے نام یاد نہیں سب کو عید سعید کی بہت بہت خوشیاں مبارک ہوں۔

قرۃ العین بنت یوسف۔۔۔ فیصل آباد

امید کرتی ہوں کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگا خوب صورت سرورق سے سجا "کرن" پندرہ تاریخ کو میرے ہاتھوں میں تھا۔ خاص طور پر ماڈل کے ہاتھوں پر موجود مہندی کا ڈیزائن خوب تھا۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے "دردل" پڑھا واہ کیا خوب نبیلہ عزیز لفظوں

کی جادوگری کے ذریعے سحر زدہ کرتی ہیں۔ میں تو پورا ماہ اس سحر سے آزاد نہیں ہوپاتی۔ پلیز نبیلہ آپی! علیزے اور دل آور کو ایک دوسرے کے ساتھ مخلص رکھیے گا پوری کہانی میں میرا سب سے پسندیدہ کردار علیزے اور دل آور شاہ کا ہے وجہ دونوں کا بے حد مضبوط کردار کا مالک ہونا ہے جبکہ مجھے زری بالکل اچھی نہیں لگتی ویسے بڑی شرم و حیا کی پیکر بنتی ہے اور دل آور کے سامنے اس کی بولڈنیس کی کوئی حد نہیں ہوتی لہٰذا اس زری نامی آسیب سے دونوں کا پیچھا چھڑوائیں اور علیزے کو ایسی معصوم، شرمیلی مگر سمجھ دار ہی رکھیے گا اور جلد از جلد علیزے دلاور دونوں کی انڈرسٹینڈنگ کروادیجیے۔ مجھے نبیلہ ابر راجہ اور نبیلہ عزیز بہت پسند ہیں۔

"طاقت پرواز" بہت اچھے موضوع پر سحر ساجد نے قلم اٹھایا اور بہترین انداز میں لکھا۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" میں مجھے ناصر بھائی پہلے ہی ناپسند تھے ایسے مرد جو توازن کے ساتھ رشتے نہیں برتتے وہ یونہی کبھی بیوی پر ماں بہنوں کو فوقیت دیتے ہیں کبھی بیوی کے پلو سے لٹک کر ماں بہنوں کو ذلیل کرتے ہیں حقیقت میں کمزور مرد! بہرحال فاخرہ گل کا انداز تحریر متاثر کن ہے۔

شازیہ جمال نیر کا ناول اور بشریٰ سیال کا ناولٹ خاصے ٹھنڈے میٹھے سے تھے۔ افسانے سارے ایک سے بڑھ کر ایک تھے مگر مجھے ذاتی طور پر کیکٹس بہت پسند آیا۔

"دست کوزہ گر" میں فوزیہ یاسمین نے کبھی بھی دلچسپی کم نہیں ہونے دی مجھے ان کے ناول "زخم کو ضد تھی مسیحائی سے" نے بہت ہی متاثر کیا تھا۔ نہلے پہ دہلا جب بھی پڑھوں تو دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اچھے لوگ اتنی جلدی دنیا سے کیوں چلے جاتے ہیں؟

انعم نور۔۔۔ لاہور

اس ماہ کرن 12 تاریخ کو ملا۔ نامے میرے نام میں بہت آرزو ہے اپنا نام آنے کی بھی بہت بار دل چاہا کہ میں بھی لکھوں اور کہانیوں کے بارے میں تبصرہ کروں لیکن ہر بار ایک ڈر، ایک جھجک آڑے آجاتی کہ پتا نہیں ہمارا خط پسند بھی آئے گا یا سیدھا گولا بن کر ڈسٹ بن میں چلا جائے گا اور آخر کار آج ہم لکھ رہے ہیں اور پھر امید کے دیے کو بھی ساتھ میں روشن کردیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ آپ میرے اس دیے کو بجھاتے ہیں یا مزید روشن کرتے ہیں۔

اب آتے ہیں تبصرے کی طرف، ٹائٹل اچھا تھا معصوم سی لڑکی سر پر دوپٹہ لیے بہت اچھی لگی اور خاص طور پر اس کی مہندی اچھی لگی۔

ڈائجسٹ کھولتے ہی سب سے پہلے "دردل" کو پڑھا۔ نبیلہ عزیز بہت زبردست لکھ رہی ہیں دل آور شاہ کا ٹوٹا ہوا انداز پڑھ کر دکھ ہوا کہ ذہن میں جو تشبیہ بنی ہوئی تھی وہ پراعتماد، اگلے بندے کو چپ کروادینے والا انداز ہی سوٹ کرتا تھا اس تشبیہ میں اور وہی انداز ہمیں پسند ہے۔ علیزے کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی پھر اسے نبھانے کا پڑھ کر خوشی ہوئی ایسی ہی سوچ تو ایک مضبوط مرد کی ہوتی ہے جو ہر حال کو فیس کرنا جانتا ہو اور پھر مقابلہ کرنا بھی مجھے دل آور شاہ کا یہ فیصلہ اور علیزے کے ساتھ رشتہ کو نبھانا اچھا لگا چاہے زبردستی ہی سہی۔

فاخرہ گل بھی اچھا لکھ رہی ہیں ندرت کے گھر والوں کے سلوک کو دیکھ کر اور اس کی خوشی اور یقین کو ایسے ٹوٹتے دیکھ کر حقیقی معنوں میں بہت دکھ ہوا۔ عائشہ کا طرز عمل ندرت کے اتنے اچھے رویے کے بعد بھی اتنا برا ہے اور اسے دوسروں کی نظروں میں گرانے کی بھی کوئی حد نہ چھوڑی ایسی جلن اور حسد کہ ایک انسان کو سب کی نظروں سے گرادیا۔ ندرت کو شاہ زین سے علیحدہ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن مجھے لگتا ہے وہ مل جائیں گے اور عائشہ کا سچ بھی سب کے سامنے آئے گا۔

"طاقت پرواز" سحر ساجد نے ایک اچھے موضوع پر لکھا "ہمارا ایمان اسلام پر ہے" اور اسلام دین کو کبھی نہ چھوڑنا ہی ہمارا مقصد ہے بلکہ اسے پھیلانا مقصد میں شامل ہے شازیہ جمال نیر نے بھی ایک مزے کی سٹوری لکھی جسے پڑھ کر مزا آیا "توازن" میں بالکل ٹھیک کہا ہر چیز میں توازن ہونا چاہیے تب ہی زندگی کا گزارا ہے۔ باقی افسانے کچھ پڑھے کچھ نہ پڑھے جو پڑھے وہ بھی اچھے تھے باقی بھی اچھے ہوں گے کرن کرن خوشبو میں سب اچھا تھا شعر بھی اچھے لگے۔ انٹرویو میں سب اچھا تھا میرا خط ضرور شامل کیجیے گا امید کا دیا روشن ہے۔

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ خط کے آغاز سے پہلے ایک التجا، فرمائش کہ کرن میں خط کی آخری تاریخ

بیس سے بڑھا کر چوبیس یا پچیس کر دی جائے۔ اب کرن ملتا جو تاخیر سے ہے۔ امید ہے غور فرمائیں گی۔ سرورق! واہ کیا خوب دل خوش ہو گیا۔ ویسے مشرقی حسن کی اپنی الگ ہی پہچان ہے۔ کرن کتاب بھی خوب رہی، مگر پکوان کچھ خاص شامل نہیں کیے گئے۔

میں بدستور معذرت خواہ ہوں کہ نبیلہ عزیز کا ناول "در دل" دن بہ دن مجھے بور کر رہا ہے۔ علیزے کا ہنوز شاہ کو ڈرائیور کہنا بہت برا لگتا ہے اور تیس اقساط گزرنے کے باوجود ابھی تک منصور اور زہرہ اور بتول شاہ کے قصوں سے پردہ نہیں ہٹایا گیا۔ کہانی جمود کا شکار ہے۔ بس پورا ناول پچھلے چار' پانچ ماہ سے زری اور شاہ کی محبت' علیزے کے آنسوؤں اور شاہ کی مضبوطی اور وجاہت کے گرد ہی گھوم رہی ہے۔ نبیلہ جی! تقریباً" تین برس ہو گئے ہمیں ناول کے ساتھ رہتے ہم زری کی شدید محبت' علیزے کے حسن' شاہ کی وجاہت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں ۔ لہٰذا پلیز اب ماضی کے قصوں پر جمی گرد جھاڑیے اور ناول کو آگے بڑھایئے تاکہ ناول میں دلچسپی واپس آئے (امید ہے برا نہیں مانیں گی)

"دست کوزہ گر" میں اس بار نمل پر جی بھر کر غصہ آیا اب اتنا بھی کیا غصہ یا بدگمانی کہ وہ اب تک خرم کے کردار پر یقین نہیں کرتی دوسری جانب رومیلہ کے شگفتہ غفار کی باتوں پر جو تاثرات' فوزیہ نے بیان کیے ہمیں یقین ہوا کہ رومیلہ ایک نارمل انسان ہے۔ ویسے یہاں (کھانے کی میز پر گفتگو کا منظر) فوزیہ نے نہایت خوب صورتی اور پوری جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ زوبیہ کے ساتھ از حد ہمدردی ہے۔ خدا جانے مصنفہ نے اس کے متعلق کیا سوچا ہے؟

شازیہ جمال کا مکمل ناول اچھا لگا۔ اگرچہ کچھ کمزور پہلو بھی تھے۔ جیسے حیدر کا آغاز میں اتنا برا امیج کہ وہ باپ کو کہہ دیتا ہے کہ "ماہی کو گردیزی کے حوالے کر دیں" کہاں یکدم اختتام میں ہر خواہش سے دستبرداری اور جب وہ باپ کو گردیزی سے ایسی ڈیل کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو اتنا بچہ تو نہیں تھا کہ ایک جوان لڑکی کو غیر مرد کے حوالے کرنے کا مطلب نہ سمجھے؟ تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے باپ کے "کرموں" سے واقف نہ ہو؟ ان چند باتوں سے قطع نظر "ماہی" کا کردار اور خصوصاً" اس کی ڈریسنگ اور بلتو کا کردار بہت پسند آئے۔

"طاقت پرواز" سحر ساجد کی خوب صورت تحریر تھی دعائے انرجی والی اصطلاح ہمیں بھی خوب لگی۔ اصلاحی رنگ لیے ناول اچھا لگا۔ خصوصاً" عائشہ کے رشتے کے لیے علی کی ذہنی کشمکش بہت عمدگی سے بیان کی گئی۔

تیسرا ناول "میرے ہمنوا..." کو خوامخواہ طویل کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس ماہ کی قسط کچھ باقی آئندہ دیکھ کر اور کچھ وقت کی کمی کے باعث (تبصرہ جو کرنا تھا) یوں سمجھیے ورق گردانی کرتے کرتے تقریباً" پورا ناول پڑھ لیا۔ عائشہ بھابی مکمل حاسد عورت کے طور پر سامنے آئی "عورت ہی عورت کی دشمن ہے" ثروت آپا اور ناصر بھائی عجیب سر پھرے لوگ ہیں کم از کم اگلے بندے کو صفائی کا موقع تو دیا ہی جانا چاہیے۔ ناول میں فاخرہ گل کی ایک بات بہت بری لگی۔ "مڈل کلاس کم پڑھی لکھی لڑکی۔" "یار لڑاکا اور جھگڑالو عورتیں ہر طبقے میں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں صرف مڈل کلاس عورتیں ہی "جاہل" ہوں۔ بعض امیر پڑھے لکھے بھی جاہل اور اکثر مڈل کلاس جاہل بھی عالم ہوتے ہیں۔

بشریٰ سیال کا ناولٹ پسند نہیں آیا۔ ایک تو موضوع پرانا دوسرے مصنفہ نے پرانے موضوع میں جدت پیدا کرنے کی قطعاً" کوشش نہیں کی)۔ یوں لگا جیسے پوری کہانی آغاز سے اختتام تک نہایت عجلت میں لکھی گئی ہو۔ بے ربط سی (معذرت) افسانے کچھ پڑھے کچھ رہ گئے۔ جو پڑھا ان میں "مات" عجیب مصنوعی سا لگا مطلب کہ حلیمہ کی باتیں' افسانے کا پس منظر غیر حقیقی سا۔

"پرورش" میں' میں مصنفہ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ آج کے والدین بچے کی غلطی ہونے پر بھی استاد پر ہی چڑھائی کرتے ہیں (اس قسم کے حالات سے میں اکثر اسکول میں ساتھی ٹیچرز کو گزرتے دیکھتی ہوں۔ بھئی میں اس لیے بچی رہتی ہوں کہ اسکول کی موسٹ سینئر اور ناتھری کلاس کی انچارج ہوں' ہیں بھی سب لڑکے (میرے لاڈلے اور چہیتے بچے) تو ہم آپس میں ہی مسئلے مسائل حل کر لیتے ہیں) خیر بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔

اب آپ مجھے اجازت دیجیے تاکہ میں خواتین اور شعاع کے سروے کو بھی دیکھ سکوں مجموعی طور پر کرن ففٹی ففٹی رہا' اپنا خیال رکھیے گا۔

☆ ☆